ماہنامہ
حجاب کراچی
ستمبر 2016ء کے شمارے کی ایک جھلک
میرے خواب زندہ ہیں
نادیہ فاطمہ رضوی کا سلسلے وار ناول
دل کے دریچے
صدف آصف کا سلسلے وار ناول
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
تحسین انجم انصاری کا خوب صورت مکمل ناول
خلش کے پار
مصباح علی کا خوب صورت مکمل ناول
ماموں جی بس کردیں
ام ایمان قاضی کا منفرد ناولٹ
تیرے لوٹ آنے تک
سلمیٰ فہیم گل کے قلم سے ناولٹ
ام اقصیٰ، ثمینہ طاہر، افشاں شاہد، حمیرا قریشی، اقبال بانو، عالیہ حرا
سمیت دیگر بہنوں کی خوب صورت تحریریں
قارئین کے ذوق کے عین مطابق مستقل سلسلوں میں پڑھیے
طب نبویؐ، بزم سخن، کچن کارنر، آرائش حسن، عالم میں انتخاب
شوخیٔ تحریر، حسن خیال، ہومیو کارنر، شوبز کی دنیا، ٹوٹکے
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں/ (021-35620771/2)

ماہنامہ نئے اُفق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
عمران احمد
مدیر معاون
اقبال بھٹی
مدیر منتظم
طاہر احمد قریشی
معاونین
نورالدین

جلد	40
شمارہ	10
ستمبر	2016

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........500 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

10 دستک — مشتاق احمد قریشی
12 گفتگو — عمران احمد
28 اقرأ — طاہر قریشی
30 انٹرویو — یاسین صدیقی
44 الف لام میم — ملک شمشیر
78 جرم آزادی — جویریہ سلیم
84 وقت آزادی — دستگیر شہزاد
92 غریب شہر فغاں — ندین قمر
110 ایک سو سولہ چاند کی راتیں — عشنا کوثر سردار
138 خون کی گواہی — ریاض بٹ

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

148
طلوع سحر
طیبہ نذیر
162
جال
عامر زمان عامر
172
بدلتے رنگ
ممتاز احمد
178
نیا فیصلہ
خلیل جبار
186
منزل مراد
امجد جاوید
214
اسمگلر
انجم فاروق ساحلی
217
فن پارے
252
ذوق آگہی
سباس گل
256
خوش بوئے سخن
نوشین اقبال نوشی
260
پل صراط عشق
ریاض حسین شاہد
خط و کتابت کا پتہ: "نئے افق" پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 ایک از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل editorufaq@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ایک زمانہ تھا جب کشمیروں کی بہادری کے اظہار کے لیے ایک جملہ بڑا معروف ہوا کرتا تھا کسی من چلے نے کشمیریوں کی امن پسندی کو ان کی کمزوری اور ڈر وخوف سمجھ کر یہ جملہ کہا جو کافی مشہور بھی ہو وہ تپ سی تے آپی ٹھس کرسی اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ کشمیری اتنے کمزور اور خوف زدہ ہیں کہ بندوق میں گولی بھر کر اسے چلانے کے بجائے دھوپ میں رکھ کر انتظار کرتے ہیں کہ جب دھوپ سے بندوق گرم ہو جائے گی تو اپنے آپ ہی چل پڑے گی لیکن آج کا کشمیری جوان ہو بوڑھا ہو یا بچہ سب کے سب جوش ولولے سے بھرے اور اپنی مادر وطن کی آزادی کے لیے سر سے کفن باندھے طاغوت سے برسرپیکار ہیں 1947ء جب ہندوستان تقسیم ہوا اس وقت جموں کشمیر میں جو مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا بلکہ پورے ہندوستان میں ہی مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا کشمیری اپنی آزادی کی جدوجہد میں بھارتی استبداد کے ہاتھوں تقریباً 6 ساڑھے چھ لاکھ افراد کی جانوں کا نذرانہ دے چکے ہیں 1989ء کے بعد سے آزادی کی تحریک نے کشمیر میں ایک نئے رنگ نئے انداز سے جنم لیا تو بھارتی حکمرانوں نے اپنی ایک لاکھ فوج وہاں جمع کردی اور فوج کو کھلے عام قتل وغارت کے احکامات دے کر انہیں کھلی چھٹی دے دی جس کے نتیجے میں کئی لاکھ افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں اور تقریباً 25 ہزار خواتین بیوگی کا شکار ہو چکی ہیں اس کے باوجود آزادی کے متوالوں کا زور ٹوٹنے یا کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جارہا ہے۔

گزشتہ دنوں حزب المجاہدین کے نوعمر کمانڈو برہان مظفر وانی کی شہادت نے آزادی کی اس تحریک کو ایک نیا رنگ دے دیا، مظفر وانی کی شہادت کے خلاف احتجاج جو سری نگر سمیت تمام وادی میں مکمل ہڑتال اور پرزور مظاہرے کر کے کیا گیا جس میں جگہ جگہ پاکستانی پرچم لہرائے گئے اس احتجاج نے آزادی کشمیر کے دو مخالف دھڑوں کو ایک کر دیا ایک گروہ جو خود مختار آزادی کا حامی اور طرف دار تھا پاکستان سے الحاق نہیں چاہتا تھا دوسرا گروہ جو پاکستان سے الحاق کے حق میں تھا اس احتجاج نے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا اور سب نے متفقہ طور پر ایک آواز ہو کر پاکستان کے پرچم کو سربلند کیا اس طرح آزادی کشمیر کی تحریک میں نئی روح پھونکی گئی ہے آزادی کے متوالوں کی یہ تحریک اور مضبوط وتوی ہو کر اپنے مشن کی تکمیل کے لیے سرگرم ہو سکے گی کشمیر کا بچہ بچہ آج بھارت کے چنگل سے آزاد ہونے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ اس احتجاج نے بھارتی حکمرانوں اور کشمیریوں کی کٹھ پتلی انتظامیہ میں کھلبلی مچادی ہے، سری نگر اور دیگر شہروں میں احتجاج کرنے والوں پر بھارتی فوج نے انہیں روکنے اور کچلنے کے لیے بے دریغ فائرنگ اور شیلنگ کا اپنا پرانا طریقہ آزمایا جس کے نتیجے میں بیس افراد ہلاک اور تین سو کے قریب زخمی ہو گئے حالات پر قابو پانے کے لیے فوج کے تازہ دم دستوں کو نئی دہلی سے بلانا پڑ گیا پر امن مظاہرین نے ردعمل کے طور پر تین پولیس اسٹیشن اور سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی جس کے نتیجے میں سو

سے زائد بھارتی فوجی اور پولیس والے زخمی ہوئے۔ احتجاج کرنے والے بے گناہ شہریوں پر بھارتی فوج اور پولیس کا طاقت اور جارحیت کا استعمال قابل مذمت ہے ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے کشمیری عوام کے حق آزادی کو دبایا نہیں جاسکتا، کشمیری اب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اب وہ اپنی بندوق خود چلانے کے اہل ہو چکے ہیں مگر وہ اب بھی بڑے صبر وتحمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں وہ دن دور نہیں جب نوجوان اپنے جوش وجذبے کو دبانے کے بجائے کھل کر میدان عمل میں کود پڑیں اور اسلحہ کا جواب اسلحہ سے دینا شروع کر دیں آج کی دنیا میں اب اسلحہ کا حصول ہر طرح سے حاصل کر لینا آسان ہو چکا ہے مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق اگر کشمیری نوجوانوں نے بھارتی افواج کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تو بھارتی افواج اور بھارت نواز انتظامیہ کو بھاگنے کا راستہ بھی نہیں مل سکے گا۔ حیرت کی بات ہے کہ پاکستانی حکمران اس ساری کارروائی پر خاموش ہیں حالانکہ ان محب وطن لوگوں کے لیے جنہوں نے جموں کشمیر میں بھارتی تسلط کے ہوتے ہوئے پاکستانی پرچم لہرا کر اپنے پاکستان حمایت نظریہ کا برملا اظہار کر کے الحاق پاکستان کا اعلان عام کر دیا ہے یہ بھارتی حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے نہ صرف کافی ہے بلکہ پاکستانی حکمرانوں کے لیے بھی ایک نوید ہے اس کا جواب پاکستان کے حکمرانوں کو بھرپور طریقے سے دینا چاہیے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھارت کے خلاف قرارداد لانی چاہیے۔ بھارت کو سلامتی کونسل کی قرار داد یاد دلانی چاہیے اور بھارت کے ظالمانہ جارحانہ درندگی کے خلاف پرزور احتجاج ریکارڈ کرنا چاہیے اور بھارت کے خلاف ایک ہنگامی اجلاس بلانے کی درخواست کرنی چاہیے اور سلامتی کونسل پر زور ڈالنا چاہیے کہ وہ بھارت پر دباؤ ڈالے کہ وہ کشمیر سے متعلق سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عمل کرے اور ان کی روشنی میں کشمیریوں کو ان کا حق خود ارادی دے کر اس مسئلے کو حل کرے تاکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان اس طویل ترین تنازع کا حل نکل سکے اور خطے میں امن بحال ہو سکے بھارتی حکمرانوں اور فوج کے بے جا مظالم کے باعث کشمیری نوجوانوں اور تمام اہل کشمیر میں ہر روز ایک نیا جذبہ نیا ولولہ پیدا ہو رہا ہے ان کے جوش وجذبے میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا ہے افواج کے مظالم ان کے جذبوں کو دبانے کے بجائے مزید ابھار رہے ہیں کشمیریوں کی نئی نسل سر سے کفن باندھ کر پیدا ہو رہی ہے ایسے دیوانوں کو بھارت آخر کب تک دبا کر رکھ سکے گا پاکستانی حکمرانوں کو شرم آنی چاہیے کہ وہ بھارت نوازی کے جنون میں مبتلا ہیں اور مظلوم کشمیریوں کی آہ وبکا پر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی، وہ اپنے پانامہ لیکس کے لگے زخموں کو چاٹنے میں لگے ہیں انہیں اپنے پانامہ لیکس زخم تو نظر آ رہے ہیں انہیں کشمیریوں کی ہر روز گرتی لاشیں ہر روز لگتے نئے سے نئے زخم نظر نہیں آ رہے وہ کب تک پاکستان سے اپنے الحاق کے نعرے لگاتے رہیں گے ایک نہ ایک دن وہ بھی آزاد اور خود مختاری کی راہ اپنا لیں گے اور پاکستانی حکمران یہ سچ ثابت کر دیں گے کہ بھارت کا اٹوٹ انگ کا نعرہ درست تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کی آنکھیں کھولے اور انہیں اچھے برے کی توفیق عطا کرے، آمین۔

گفتگو

عمران احمد

"حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے، تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔" (البخاری، باب حلاوۃ الایمان)

عزیزانِ محترم...... سلامت باشد!

تمام قارئین کو عید آزادی مبارک ہو۔

آزادی اک نعمت ہے آزادی جو قربانیوں کے بعد ملتی ہے آزادی جو خراج مانگتی ہے اور اس وقت تک قوموں کے پاس رہتی ہے جب قومیتیں ایک قوم بن کر اس کی قدر کرتی ہیں۔ کیا ہم لاکھوں جانوں اور عصمتوں کی قربانی دے کر ایک قوم بن سکے ہیں؟ کیا ہمارے حکمران اور عوام اس آزادی کی قدر کر سکے ہیں؟ ہم اس حوالے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کا فیصلہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ فرصت کی گھڑیوں میں سے کچھ لمحے کشید کر کے اس پہلو پر سوچیں کیا ہم 18 کروڑ لوگوں کا ایک انبوہ کثیر ہیں یا ایک قوم؟

جس وقت ہم یہ سطریں رقم کر رہے ہیں ٹی وی پر کوئٹہ میں بم دھماکے کی سلائیڈ چل رہی ہے جس میں ساٹھ سے زائد افراد کے جاں بحق ہونے کی اطلاع ہے اللہ تعالیٰ جاں بحق ہونے والوں کی مغفرت اور زخمیوں کو صحت کاملہ عطا کرے اگر یہ تباہی غیر ملکی دہشت گردوں کی کارروائی ہے تو پھر سوچیے ان غیر ملکی دہشت گردوں کو اپنی صفوں میں جگہ دینے کی غلطی کس کی ہے کیونکہ یہ لوگ اچانک ہی آسمان سے نہیں ٹپکے ہوں گے اگر یہ ہم میں سے ہیں تو پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔

رواں ماہ سے عشنا کوثر سردار کی نئی سلسلے وار کہانی "ایک سو سولہ چاند کی راتیں" شروع ہو رہی ہے جو تقسیم ہند کے پس منظر میں ہے گو عشنا کوثر نے آزادی کے وہ لمحات کا بچشم خود جائزہ نہیں لیا لیکن ان کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ آپ خود کو اس دور میں محسوس کریں گے اور آزادی کی خارزار راہوں پر سفر کرنے والوں کا کرب اور تکالیف کو محسوس کریں گے۔

اب آیئے اپنے خطوط کی طرف دیکھیے خلق خدا کیا گفتگو کر رہی ہے۔ **ریاض بٹ** کا حسن ابدال آپ سلام کے بعد فرماتے ہیں! ماہ اگست کا شمارہ اس بار 20 جولائی کی ایک گرم دوپہر کو نظروں کے سامنے آیا، جشن آزادی کے حوالے سے سرورق اچھا لگا، دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب اس بار ایدھی صاحب کے متعلق لکھ رہے ہیں وہ واقعی نعمت الٰہی تھے، انہوں نے جو کچھ کیا جس طرح کیا وہ روز روشن کی طرح سب کے سامنے ہے ایسے انسان دوست فقیر درویش صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ ایک ادارہ تھے اور اپنی مثال آپ تھے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی رہی
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سوگوار دل، برستی آنکھیں لیے اپنی محفل گفتگو میں داخل ہوئے ریحانہ سعیدہ بہن خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں، بہن میری تفتیشی کہانی میں طلعت کا کردار ایک نفسیاتی کردار تھا ویسے تو وہ اپنے شوہر کی وفادار رہی لیکن اس کے دل میں جو ایک پھانس تھی اس کو اس نے چھپانے کے لیے یہ سب کچھ کیا، بہر حال آپ کو کہانی اور یہ بات اچھی لگی، کے ایف آئی آر میں طلعت کا نام بھی درج کیا گیا۔ آئندہ بھی آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ صائمہ نور، بہن کیسی ہو، آپ نے جو کچھ لکھا وہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے واقعی دہشت گردی کی وجہ سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے، میرٹ نام کی کوئی چیز ملک میں نہیں ہے، غریب کے بچے ڈگریاں لے کر بھی بے روزگار ہیں میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ جاوید احمد صدیقی صاحب کیسے ہو بھائی آپ کا تبصرہ مدلل اور سندر ہے، آپ کے خیالات کے کیا کہنے اگر آپ مجھے اپنا موبائل نمبر دے دیں تو شکر گزار ہوں گا، میرا تبصرہ اور کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ، خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں کیونکہ یہی زندگی کی معراج ہے، احسن ابرار رضوی میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، علی حسنین تابش آپ کا تبصرہ بھی اچھا ہے ایم اے راحیل آپ نے انڈیا کے متعلق بالکل صحیح لکھا کہ اس نے دل سے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا اور ہم ہیں کہ اس کے ڈرامے بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں اب یہی دیکھ لیں کہ اس نے ظلم و بربریت کا بازار مقبوضہ کشمیر میں گرم کر رکھا ہے میری کہانی اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، مہربانی، ناظم بخاری صاحب ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں آپ تو دل میں بستے ہیں یاد کرنے کا شکریہ۔ محمد رفاقت صاحب مجھے اتنی پذیرائی بخشنے پر یہ بندہ ناچیز مشکور و ممنون ہے، آپ کا اس بار کا تبصرہ بھی خوب ہے میری کہانی سب سے پہلے پڑھنے اور اس کو پسندیدگی کی سند دینے پر علیحدہ سے مہربانی خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین، عنبرین اختر اور ایم حسن نظامی مختصر تبصرے کے ساتھ پرچے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں فلک شیر ملک بھائی آپ کا تبصرہ بہترین ہے میرا تبصرہ اور کہانی آپ کو بھی پسند آئی جس کے لیے شکریہ آپ قارئین کی حوصلہ افزائی ہی میرے اندر لکھنے کی جوت جگائے ہوئے ہے، عبدالجبار رومی انصاری شادی خانہ آبادی مبارک ہو، آپ نے مجھے نظر انداز کر دیا خیر خوش رہیں ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، علی اصغر انصاری، ناظم حسین شاہد، پرنس افضل شاہین، سید عبداللہ توفیق، شجاع بخاری اور احسان سحر آپ کے خیالات اور تبصرے تعریف کے قابل ہیں، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ مجید احمد جائی بھائی آپ کے ایس ایم ایس آتے رہتے ہیں جس سے دل کو تسکین رہتی ہے ملتان میں گرمی کا کیا حال ہے اور آپ کی صحت کیسی ہے ضرور آگاہ کریں آپ کو میری تحریر کردہ کہانی چور کی داڑھی کا پلاٹ اچھا لگا بہت شکریہ، مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ میری کہانی کو بڑی باریک بینی سے پڑھتے ہیں باقی غلطی کا امکان تو ہر جگہ رہتا ہے برآمدوں کے دروازے نہیں ہوتے یہ فقرہ غلطی سے احاطہ تحریر میں آ گیا ہے قلم زد کر دیجیے اقرا پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے یہ ایک بہترین سلسلہ ہے۔ خوش بوئے سخن میں صغریٰ کوثر کی حمد باری تعالیٰ، عائشہ اعوان کی غزل، پرنس افضل شاہین کی عید، شجاع بخاری کی غزل، عمر فاروق ارشد کی غزل ریاض حسین قمر کی غزل بہترین رہیں، باقی انتخاب بھی اچھا ہے ذوق آگہی میں سارا انتخاب اپنی مثال آپ ہے کسی ایک کی زیادہ تعریف کرنا زیادتی ہوگی، کہانیوں میں ابھی صرف عقیدت کے پھول (راجہ بنارس)، کانٹا (خلیل جبار) پڑھ سکا ہوں دونوں اچھی کاوشیں ہیں لکھاریوں کو مبارکباد اس ماہ کے لیے اتنا ہی والسلام۔

عبدالحمید..... کھلا بٹ، ہری پور۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب اور اسٹاف کو رمضان

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

شریف کے روزے اور عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ اگست کا شمارہ بیس جولائی کو ملا۔ اتنا لیٹ کیسے ہوا اس سے پہلے شمارہ پندرہ سولہ تاریخ تک ملتا رہا ہے سرورق بہتری کی طرف گامزن ہے شاہین اپنے پروں پر پاکستان کا پرچم بنائے فضاؤں میں پرواز کر کے پاکستان کی پہچان اہمیت اور انفرادیت کو اجاگر کر رہا ہے نیچے ایک معصوم اور خوب صورت چہرہ نہ جانے اداس نظر (آنکھوں) سے کس کو دیکھ رہا ہے کس قدر خوب صورت منظر ہے دستک میں آپ نے عبدالستار ایدھی کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ آج ایدھی صاحب نہیں بلکہ انسانیت کا انتقال ہوا ہے قریشی صاحب آپ نے درست فرمایا ہے ایدھی صاحب کے انتقال پر بیس کروڑ عوام جن میں مرد، عورتیں، بچے، بچیاں، بوڑھے، جوان اپنے اور پرائے دھاڑیں مار کر رو رہے تھے ہر آنکھ اشک بار تھی ایسی عظیم ہستی صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے ہم ایک مخلص عظیم انسان، ان داتا، مسیحا، فقیر منش اور بے لوث انسان سے محروم ہو گئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ان کے بچے اور دیگر مخلص ساتھی ان کے مشن کو جاری رکھیں ایسی فرشتہ صفت شخصیت پر کچھ عاقبت نا اندیش لوگوں نے کرپشن اور اسلحہ سپلائی کا الزام بھی لگایا ان کے متعلق ایدھی صاحب نے کیا فرمایا۔ مختصراً بیان کر رہا ہوں۔ (کرپشن الزام) میری آمدنی اور اخراجات کو دیکھتے ہوئے شبہ ظاہر کیا گیا کہ ان کا تعلق (ایدھی صاحب) کسی ایسے گروہ سے ہے جو انہیں دولت فراہم کرتا ہے میں نے کہا وہ کون سی ایسی تہمت ہے جو اب تک مجھ پر نہ لگی ہو جب میں چند سو روپوں سے لوگوں کی مدد کرتا رہا تو مجھ پر جھوٹا چوری کا الزام تھا بات اب کروڑوں روپوں تک پہنچی ہے تو بڑے الزامات عائد کیے جا رہے ہیں مگر مجھے کسی کی پروا نہیں مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے ایسے لوگ دوسروں کے بارے میں جو دل چاہتا ہے کہانیاں بناتے رہتے ہیں (عبدالستار ایدھی)۔

(اسلحہ سپلائی الزام) ایک نامی گرامی لیڈر نے اخبار میں بیان دیا کہ میں نے سنا ہے کہ ایدھی کی گاڑی میں اسلحہ سپلائی ہوتا ہے کسی نے پوچھا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ کبھی ایسا ضرور ہوا ہے کہ ایدھی ٹرسٹ کی کسی گاڑی کو مع ڈرائیور کے اغوا کر کے اسلحہ لے جایا گیا ہو تو اس کی ذمہ داری ایدھی کے سر پر کس طرح ڈالی جا سکتی ہے۔ نوٹ۔ یہ تحریر مصنفہ رفعت عباس کی کتاب "عبدالستار ایدھی" سے لی گئی ہے ہم ایک عجیب قسم کے لوگ ہیں ایسی کوئی اہم شخصیت جو زندگی میں اچھا کام کرتا ہے عوام کے دکھ، درد میں شریک ہوتا ہے عوام کے مسائل حل کرتا ہے خود سوکھی روٹی کھاتا ہے جبکہ عوام کے لیے دسترخوان سجاتا ہے سیکڑوں لوگ اس کے دسترخوان سے مستفیض ہوتے ہیں جب ایسا کوئی شخص دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو ہم دکھاوے کے لیے آنسو بہاتے ہیں اپنا ماتھا پیٹنے لگتے ہیں گریبان چاک کر کے آہ و بکا کرنا شروع کر دیتے ہیں یہ سب دکھاوا ہوتا ہے یہ صرف چند دن ہوتا ہے پھر کیا ہوتا ہے ہم اس کی اچھائیوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں ان کا نام تک بھول جاتے ہیں اچھے کاموں کی تعریف کرنے کے بجائے ہم ان میں احساس فراموشی کے کیڑے نکالنا شروع کر دیتے ہیں ایک دن ہم عبدالستار ایدھی کو بھول جائیں گے جس طرح ہم قائداعظم کے مقصد حیات اور شاعر مشرق علامہ اقبال کے خواب پاکستان کو بھلا چکے ہیں اب ہم کو کسی اور مسیحا کی تلاش کرنا ہوگی وہ کون ہوگا کیا نام ہوگا وہ کہاں سے آئے گا ہم بھی اس کا انتظار کریں گے آپ بھی کریں۔ گفتگو خطوط کی تعداد بائیس ہے ریحانہ سعیدہ، صائمہ نور، جاوید احمد صدیقی، احسن ابرار، علی حسنین، ایم اے راحیل، مجید احمد جائی، ناظم بخاری، محمد رفاقت، فلک شیر ملک، ریاض بٹ، عبدالجبار رومی، پرنس افضل شاہین، احسان سحر، عنبرین اختر، ایم حسن نظامی،

اویس اویسی، احسن جاوید، علی اصغر انصاری، ناظم حسین شاہد، سید عبداللہ، شجاع بخاری بہترین اور بھرپور تبصرے کیے گئے ہیں یہ تبصرے رسالے کے ماتھے کے جھومر ہوتے ہیں اس سے رسالے کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے اور پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے ریحانہ سعیدہ صاحبہ نے کچھ پر تنقید بھی کی ہے اور تعریف بھی کی ہے کہانیوں پر تنقید اور تعریف کرنا ہر قاری کا حق بنتا ہے اگر کسی قاری کو کہانی نہ پسند آئے تو وہ تنقید کرتا ہے وہی کہانی دوسرے اچھے لگے تو وہ اس کی تعریف کرے گا ہر قاری کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے محترمہ نے پل صراط عشق پر تنقید کی ہے۔ میں نے اس کی پہلی قسط پڑھنا شروع کی چند صفحات پڑھنے کے بعد بوریت ہونے لگی پڑھنا چھوڑ دی یہ ایک سست رفتار کہانی ہے میں محترمہ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اقرا ایک ایمان افروز سلسلہ ہے موجودہ شمارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی صفات بیان کی گئی ہے اللہ تعالیٰ طاہر قریشی کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے اقرا پڑھ کر ایمان میں تازگی اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے شمارہ اگست 2016ء کا فنٹاسٹک شمارہ ہے ہر کہانی شاہکار ہے۔ پہلی کہانی سے آخری کہانی تک ہر کہانی کو میں نے ایک نشست میں پڑھا بس جولائی کو رسالہ ملا اکیس جولائی کو ختم کیا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کہانی کو نمبر دوں سب کہانیاں نمبر ون تھیں دیگر پڑھنے والوں کی پسند اپنی اپنی خیال خیال اپنا اپنا۔ وہ لکھاری جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے ڈائجسٹوں میں دھوم مچائی تھی ان میں سے چند رائٹروں نے نئے افق کے موجودہ شمارے میں انٹری دی ہے وہ محترم ہستیاں راجہ بنارس، شہاب شیخ اور عارف شیخ ہیں ان سے نئے افق کے ساتھ دیرینہ تعلق رہا ہے ان کی کہانیاں تیز رفتار ہوتی ہیں ان میں سسپنس، ایکشن، پر اسراریت اور وہ سب کچھ جو قاری کی چوائس ہوتی ہے موجودہ شمارے میں پہلی کہانی راجہ بنارس کی عقیدت کے پھول ہے۔ شہاب شیخ کی شب زاد اور عارف شیخ کی کالا باغ موجود ہیں۔ سلیم کرد، سفیان بٹ، میاں صداقت حسین انہوں نے پہلی انٹری دی ہے شمارے میں سلیم کرد کی کہانی عذاب حرص، سفیا بٹ جنت کا خواب میاں صداقت حسین میں نہیں جانتی موجود ہیں۔ سلیم کرد منجھے ہوئے رائٹر دکھائی دیتے ہیں ان کی پہلی کہانی نئے افق اپریل 2016ء کے شمارے میں فن پارے میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ مستقل لکھنے والے رائٹر نوشاد عادل قیامت امجد جاوید عورت زاد سلسلے وار کہانی، راحیلہ تاج دہشت گرد خلیل جبار کاشا کے ایم خالد چندا مند اور مہتاب خان یہ سلسلے بھی شامل ہیں۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ امید ہے آپ اور نئے افق سے وابستہ بھی احباب بخیریت ہوں گے پرچہ اپنی تمام تر رعنائیوں سنگ جلوہ گر ہوا اس کی کمپوزنگ، پرنٹنگ اور پروف ریڈنگ سبھی کچھ اچھا معیاری اور منفرد پایا، اس میں سبھی لکھنے والے اپنے اپنے اور دیکھے بھالے سے لگے صائمہ نور، جاوید احمد صدیقی، احسن ابرار رضوی، علی حسنین تابش، ایم اے راحیل، ناظم بخاری، مجید احمد جائی، محمد رفاقت، عنبرین اختر، فلک شیر ملک، ریاض بٹ، عبدالجبار رومی، علی اصغر انصاری سبھی احباب نے خوب محفل سجائی اور سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ساون میں رنگا رنگ پھول اور ڈالیاں جھوم جھوم کر اپنی بیکراں محبتوں کا اظہار کر رہی ہوں، طاہر قریشی صاحب کی باتیں ایمان کو منور کر گئیں، جو حاصل زندگی پائیں عقیدت کے پھول، عذاب حرص دونوں تحریریں بلاشبہ اچھی اور معیاری پائیں اور لکھاری ایک دوسرے کے مقابل پائے قیامت اور جنت کا خواب بھی الفاظ و فقرات کے حوالے سے بہت خوب رہی۔ عمر کی شہادت پر دکھ ہوا، عورت زاد، فاتح کی صورت اختتام پذیر ہوئی، ایک سو چاند کی راتیں کا انتظار ہے، پل صراط عشق میں جناب ریاض

حسین شاہد نے اپنی بھرپور صلاحیتیں اجاگر کرتے ہوئے محبت کے عنوان کو اپنے دلی جذبات سے کرداروں کی زبانی عملی طور پر اچھے اور خوب صورت انداز سے بیان کیا اور مختلف روپ میں محبت کو زندہ رکھا، انہوں نے مجاز سے عشق کی منزل تک کا سفر خوب صورتی سے طے کیا، محترمہ ریحانہ صاحبہ شاید لکھاری کی تحریر کے مفہوم کو سمجھ نہیں پائی تھیں انہوں نے بلاوجہ ہوٹنگ کی اور تحریر کو بوگس قرار دیا۔ کاشا ہمدردی سے مزین تحریر کئی چہروں کی آئینہ دار پائی نائلہ کے کردار پر حیرت ہوئی، چندا ماموں دور حاضر کی یادگار تحریر پائی کے ایم خالد کے قلم میں بے پناہ نکھار پایا فن پارے کی سبھی تحریریں اپنا اپنا معیار برقرار رکھ پائیں۔ ذوق آگہی اپنی نوعیت کا منفرد سلسلہ ہے بہت سی باتیں دلچسپی کا سامان مہیا کر گئیں خوش بوئے سخن میں اچھی اور معیاری شاعری پڑھنے کو ملی، پرچے کی آخری تحریر شب زاد، پراسراریت سے مزین اور دلچسپی سے بھرپور پائی لوجی پرچہ پہ تبصرہ اختتام پذیر ہوا اپنا خیال رکھیے محبتوں کو نفرتوں پہ فوقیت دیتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھیں ان شاء اللہ ہمارا ساتھ ہمارے لیے بیکراں خوشیوں کا سامان ہوگا اور پھر یہ دن نئے افق سے طلوع ہوگا جو ہماری زندگیوں میں مسرتیں بکھیر دے گا۔

نوبہار علی...... شمسی آرکیڈ۔ محترم عمران صاحب السلام علیکم، نئے افق کا تازہ شمارہ بروقت ملا، ٹائٹل پر شاہین کے پروں پر پاکستانی پرچم خوب سجا اللہ ہمارے ملک کو ترقی کی بلندیوں پر شاہین کی پرواز جیسی اڑان دے۔ میں نئے افق کا ایک خاموش قاری ہوں مگر اس دفعہ میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گیا ہوں گفتگو میں شامل ہونے والے خطوط شمارے کی تحریروں پر تبصرہ برائے نام یا بہت کم حد تک کیا جاتا ہے ایک دوسرے کے خطوط پر زیادہ تبصرہ ہوتا ہے۔ ذاتی گفتگو اور اپنے خط کو بے مقصد طوالت دینا کچھ اچھا نہیں لگتا چند مخصوص تبصرہ نگار ہیں جو صرف ایک دوسرے کی کہانی شائع ہونے پر تبصرہ کرتے ہیں تعریف کرتے ہیں باقی لکھنے والوں کا ان کی نظر میں کوئی مقام نہیں معذرت کے ساتھ میرے بھائی تمام لکھاری اپنی محبت پر آپ سب کی آرا کے منتظر ہوتے ہیں اور آپ ذاتی خیریت، موسم کا حال پوچھنے پر گفتگو کے قیمتی صفحات کا ضیاع کرتے ہیں، اس شمارے کی پہلی تبصرہ نگار ریحانہ سعیدہ صاحبہ نے بھرپور تبصرہ لکھا مگر مجھے ان کی ذہانت پر اس لمحے دلی تکلیف پہنچی جب انہوں نے سلسلے وار کاوش پل صراط عشق کو ایک بوگس کہانی قرار دیا۔

ظہور احمد صائم...... مانگا منڈی لاہور۔ السلام علیکم اگست کا نئے افق وقت مقررہ پر موصول ہو گیا۔ ٹائٹل پر یوم آزادی کے حوالے سے پرواز کرتا ہوا شاہین کافی اچھا لگا، طویل عرصہ بعد حاضری دے رہا ہوں امید ہے کہ تمام پرانی لغزشوں کو بھلا کر نئے جذبوں سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ مجھے نئے افق کی یہ خاصیت بہت پسند ہے کہ اس میں شاعری کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اس بار بھی محفل مشاعرہ زبردست رہی ریاض قمر بھائی کی غزل ٹاپ پر کہی جاسکتی ہے اس کے علاوہ انتخاب بھی پیارے ہوتے ہیں مگر براہ مہربانی غزل کے آخر پر شاعر کا نام ضرور لکھ دیا کریں تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے کہانیاں بھی تمام عمدہ تھیں گفتگو کی محفل کی بات کریں تو اس بار کافی نام غائب تھے یا پھر آپ نے غائب کر دیے جیسے کہ ریاض قمر صاحب، عمر فاروق بھائی وغیرہ بخاری صاحب نے اپنے لیٹر میں عمر صاحب کو خاص لتاڑا ہے میرے خیال میں عمر بھائی کی پچھلے ماہ والی غزل واقعی وزن اور عروض کے لحاظ سے کمزور تھی اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، مگر مجھے خدشہ ہے کہ اگر مدعی الیہ نے جواباً کوئی میزائل داغ دیا تو نئے افق کی فضا دھواں دھار ہو جائے گی دیگر ساتھیوں کے تبصرے عمدہ تھے ایک غزل ارسال خدمت ہے امید ہے کہ پذیرائی ملے گی، رب راکھا۔

حق نواز...... بھاولنگر۔ عمران بھیا سلام مسنون امید کرتا ہوں سب احباب خیریت سے ہوں گے پہلی بار حاضر ہوا ہوں مجھے نئے افق بہت پسند ہے اس معیار کا اس دور میں اور کوئی شمارہ نہیں ہے۔ مشتاق صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں سب سے اہم بات نئے افق کی کہانیاں بہت معیاری ہوتی ہیں کہانیاں قیامت، جنت کا خواب، عورت زاد اور کانٹا مجھے بہت پسند آئی ہیں زندہ رہے تو پھر ملیں گے۔

خواجہ حسین...... منچن آباد۔ جناب عمران احمد صاحب السلام وعلیکم اس بار شمارہ 19 کو ملا خیر خدا کا شکر ہے مل گیا ورنہ یہ کہاں ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا بابائے خدمت دنیا سے چل بسے میں ان کے لیے دعا گو ہوں عمران صاحب میں ادارہ کو پہلے دو عدد کہانیاں ارسال کر چکا ہوں اور اب اپنے خط کے ساتھ اپنی تیسری کہانی بھی ارسال کر رہا ہوں اشاعت کا بہت انتظار رہے گا۔

ثنا اللہ سنگی...... رحیم یار خان۔ جناب عمران صاحب سلام عرض آپ کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ محفل میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔ عمران صاحب کچھ چیزیں تعریفی القابات سے بے نیاز ہیں ایک عرصے سے کوشش کر رہا ہوں کہ گفتگو میں دستک دوں لیکن یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں کہ آخر وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جن سے نئے افق کی تعریف ممکن ہو اور آپ کو بھی خراج پیش ہو سکے پرچہ سرورق سے لے کر اختتام تک اپنی مثال آپ ہوتا ہے اور جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کا جامع مفہوم والا گوشہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور دوست احباب میں علی اصغر انصاری، حسین جاوید، یاسر اعوان، احسان سحر، شجاع بخاری صاحب کے خط کمال کے ہوتے ہیں۔

حسین جاوید...... منچن آباد۔ بندہ ناچیز کی جانب سے وادی محبت وسخن کے شہزادے عمران کو آداب عرض۔ حلقہ ادب کی نظر اک طلسمی دنیا کا خواب اک روز میں خلاف معمول دیر تک سویا رہا اور دیر تک سونے کی وجہ سے ایک حسین خواب تھا جن حالات وواقعات کا حقیقت سے تعلق نہ ہو وہ خواب ہی ہوتے ہیں خیراب میں آتا ہوں اپنے اصل مدعا پر بات کچھ یوں ہے کہ جب بندہ اپنی اوقات بساط سے بڑھ کر کچھ حاصل کرتا ہے تو وہ احساس خواب ہی لگتا ہے جس چیز کا حقیقت کے ساتھ تعلق نہ ہو وہ بہت مشکل سے بیاں ہوتی ہے ہاں تو میں اپنے خواب کا ذکر کر رہا تھا کہ میں خواب میں اک طلسمی دنیا میں پھرتا تھا کہ دور افق پر ایک پاک پرچم کے پروں والا شاہین پرواز کر رہا تھا اس شاہین کے پروں سے خون ٹپک رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ شاہین اب تھک چکا ہے لیکن اس کا حوصلہ اب بھی بلند ہے خیر جیسے ہی دور افق سے نظریں ہٹا کر میں نے زمین پر دیکھا تو میرے حواس بے ساختہ ہو گئے اور میں حیرت کی ان وادیوں میں گم ہو گیا جہاں سے اگر بندہ بغیر جواب لیے واپس لوٹ آئے تو ساری زندگی ضمیر ملامت کرتا ہے عقل کے گھوڑے دوڑانے کے بعد صرف اور صرف اتنا پتا چل سکا کہ سبز پرچمی پروں والا شاہین اب اس لڑکی کی حفاظت کرنے سے قاصر ہے مجرم کو جرم کی سزا دینے سے جرائم ختم نہیں ہوں گے جب تک معاشرے سے وہ عناصر ختم نہیں ہوں گے جن کی وجہ سے جرائم رونما ہوتے ہیں تب تک مجرم پیدا ہوتے رہیں گے قندیل بلوچ قتل ہو گئی بقول قاتل کے اس نے قندیل کو اس کے جرم کی سزا دی ہے میرا خیال ہے اب ان لوگوں کو بھی سزا دی جائے جن کی وجہ سے فوزیہ قندیل بننے پر مجبور ہوئی۔ دل تھام کر میں اپنے حواس کو بحال کرتے ہوئے آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نابینا بزرگ اپنے ہاتھوں میں اپنی آنکھیں لیے پھرتا ہے مجھے بہت حیرت ہوتی ہے باباجی کو دیکھ کر ایک عمر رسیدہ بزرگ بغیر آنکھوں کے چلتے

پھرتے ہیں۔ جب میں باباجی کے قریب پہنچتا ہوں میرے کانوں میں آواز آتی ہے (میری آنکھیں ٹھیک ہیں کسی ضرورت مند کے لیے) بھلا کوئی اپنی آنکھیں بھی کسی کو دیتا ہے باباجی کے وجود میں سے سفید روشنی نکل رہی تھی جس سے ایک عالم روشن تھا باباجی کے وجود سے نظریں ہٹانا مشکل تھا باباجی تو پیکر استعارہ تھے ابھی میں باباجی کے کچھ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا باباجی کے ساتھ ایک دراز قد خندہ پیشانی گھنے بال منہ میں پان، خون سے لت پت نوجوان جا رہا ہے باباجی نے جس عالم کو اپنی روشنی سے روشن فرمایا اس عالم کو نوجوان نے اپنی آواز سے دلوں کو سکون بخشا (جب قبر اندھیری میں گھبراؤں گا میں تنہا) اتنے میں آسمان سے نور پھٹتا ہے اور ایک ہوا کا جھونکا مجھے کہیں دور پھینکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی شہزادے کا دربار لگا ہوا ہے معلوم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ سلطنت ادب ہے اور یہاں کا شہزادہ عمران ہے جب میں دربار میں داخل ہوتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شہزادہ عمران اپنی شاہی کرسی پر براجمان ہے دربار کا آغاز کرتے ہوئے ملکہ ملتان اپنے سلطان مجید کے ساتھ شہزادے عمران کی محفل کو رونق بخشتے ہوئے خوب صورت الفاظوں اور اپنی قیمتی آرا سے دربار کو سجاتی ہیں سلطان مجید کی باتیں سوئی ہوئی قوم کو جگانے کے لیے کافی تھی۔ راج کمار تابش جو کہ دولت چشتیاں کے راج گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں فرمانے لگے شہزادے عمران مجھے آپ کے دربان نے گمشدہ قرار دے دیا ہے وہ بھی بغیر انعام کے آفرین آفرین اس سے پہلے کے محفل کا رنگ کچھ پھیکا ہوتا حمد باری تعالیٰ پیش کی گئی اور اس خوب صورت کلام پر ملک صغریٰ کوثر کو خوب داد دی گئی پھر محفل کو مزید رونق بخشنے کے لیے شاہی وادی رحیم یار خان سے ہماری ملکہ بہن عائشہ اعوان نے انتہائی خوب صورت غزل پیش کی پھر یکے بعد دیگرے سب کو اپنے فن کے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ ریاض حسین قمر نے خوب داد پائی عمر فاروق ارشد بھی کم نہ تھے۔ ساجدہ زیدی کی غزل بہت جامع مفہوم کی تھی کامران خان کا انتخاب اچھا تھا زرین صدیقی امبر کی نظم خوب سے خوب تر تھی اور دربار کی محفل کا حصہ ذوق آگہی میں ملک یاسر اعوان نے دل سے دعا لی۔ جاوید احمد صدیقی صاحب بازی لے گئے۔ فلسفہ محبت بہن رضوانہ اسحاق نے حقیقت بیان کر دی شہزادہ عمران کا دربار خوب لگا ہوا تھا لیکن میں اداس تھا کیونکہ بہن نسیم سکینہ صدف غیر حاضر تھی ملکہ ڈسکہ حاضر ہو ملکہ ڈسکہ بہن نسیم شہزادے عمران کے دربار کو ہمیشہ سجاتی آئی ہیں خدا خیر کرے پتا نہیں کیا بن پائی میری ممتاز احمد سرگودھا والے آپ کی کمی کیسے پوری ہوگی کم از کم جاتے جاتے یہ تو بتا جاتے محترم ایم اے راحیل صاحب اگر آپ کا قلمی ساتھ رہا تو کبھی نہ کبھی میرا خط بھی طویل ہو جائے گا اور جہاں تک انعام کا سوال ہے تو آپ کی قیمتی رائے کسی انعام سے کم نہیں۔ جناب عمران صاحب میرے تبصرے کا قطعی یہ مقصد نہیں کہ کسی کی دل آزاری ہو میں نے تو بس یہ کوشش کی ہے کہ کچھ منفرد، بہن کو سونے کی چڑیا رحیم یار خان جہان میں اپنی باقی زندگی گزارنا چاہتا ہو وہاں کے راج دلارے سردار یاسر اعوان نے اپنی زیارت کے شرف سے محروم رکھا سردار صاحب جہاں رہو خوش رہو سردار صاحب اگر آپ تہار رہو گے تو زندہ رہو گے اور اگر ہمارے ساتھ رہو گے تو خوش رہو گے باقی جیسے آپ کی مرضی، بجلی کا شہر منگلا ڈیم کے راجہ ریاض حسین قمر آئی مس یو۔

عامر زمان عامر...... بورے والا۔ امید ہے آپ سب احباب خیریت وعافیت کے ساتھ خوش و خرم ہوں گے، چند پیشہ ورانہ مصروفیات اور گھریلو مسائل کی وجہ سے نہ صرف لکھنے پڑھنے کا سلسلہ ٹھپ ہو کر رہ گیا بلکہ نئے افق سے غیر حاضری بھی خاصی طویل ہو گئی۔ نئے افق کے صفحات پر یا بذریعہ ٹیلی فون جن چاہنے والے دوستوں نے میری کمی محسوس کرتے ہوئے کومل جذبات کا اظہار کیا اور شب و روز اپنی مخلص دعاؤں میں یاد رکھا

ان تمام خواتین وحضرات (رائٹرز وقارئین) کا تہہ دل سے سپاس گزار ہوں اور امید کو ہوں اپنائیت و مان کا یہ انمول جذبہ یونہی برقرار رہے گا۔ نئے افق میں شمولیت کے ساتھ ہی آپ تمام احباب کے لیے خوشخبری ہے کہ خداوند کریم نے چاند سا بیٹا عطا کر کے "فیضان عامر" کی صورت میرا اور میری پیاری شریک حیات ریحانہ عامر کا دامن کائنات کی تمام خوشیوں اور نعمتوں سے بھر دیا ہے اس نعمت عظمیٰ پہ رب کائنات کا جس قدر شکر ادا کروں ناکافی ہے، دلی دعا ہے ان تمام احباب کے لیے جن کو خداوند کریم نے ابھی تک اس انمول دولت سے محروم رکھا ہے ان سب کو الٰہی اس میٹھی مراد سے بہرہ مند فرمائے، آمین۔ ان تمام خواتین وحضرات کا بے حد مشکور ہوں جنھوں نے نئے افق میں میری شاعری اور افسانے کو پسندیدگی کی سند سے نوازا تمام احباب کی تنقید وتعریف کے لیے شکر گزار ہوں۔ اسٹاف نئے افق، رائٹرز اور قارئین کے لیے درجہ بدرجہ دعائیں۔

احسن ابرار رضوی......ساھیوال۔ السلام علیکم! میں خیریت سے ہوں اور آپ سب کی خیریت مطلوب چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہنستا مسکراتا اور امن سے زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ ماہ اگست 2016 کا نئے اُفق آزادی کا جشن مناتے موصول ہوا۔ ٹائٹل کی بات کی جائے تو دل جیت لیا۔ عقابی پرندہ جس کے پَر پاکستانی پرچم سے سجائے گے ہیں محو پرواز ہے۔ آزادی کا خوبصورت پیغام دے رہا ہے۔ اگر نیچے بیٹھی لڑکی کو پرندے کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھایا جاتا تو ٹائٹل اور خوبصورت ہو جاتا۔ کیونکہ ہم آزاد ملک میں تو رہتے ہی ہیں لیکن ہمیں آزادی کی بہت ضرورت ہے۔ مہنگائی سے آزادی، غربت سے آزادی، کرپشن سے آزادی، بدعنوانی سے آزادی، لوٹ مار سے آزادی چاہیے۔ اللہ کرے وہ دن جلد آجائے اور ہم غربت، مہنگائی، کرپشن، رشوت، لوٹ مار، سے آزاد ہو جائیں۔ ہر طرف خوشحالی ہو، ہریالی ہو، خوشیاں ہوں۔ مسکراہٹیں ہوں، محبتیں ہوں۔ آمین! دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب عبدالستار ایدھی کے بارے میں لکھ کر تعریفی لوگوں کی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ عبدالستار ایدھی نے واقعی عمدہ مثال قائم کردی ہے اور ایک ایسا ادارہ دے گئے ہیں، جو خوشیوں کا امین ہے۔ اُن کی خدمت میں ہر بڑے سے بڑا ایوارڈ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا، وہ تمام تر ایوارڈ سے بالاتر تھے۔ اب حکومت کوشش کر رہی ہے کہ انہیں نوبل انعام دیا جائے۔ میں تو ہزاروں نوبل انعام قربان کردوں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے لئے جیتے تھے، جیسے اُن کی اپنی زندگی نہیں تھی۔ وہ خوش رہتا تھا اور اُس کی خوشی کا راز بھی یہی تھا کہ وہ دوسروں کی خوشیوں کا سبب بنتا تھا۔ روتے ہوئے کو ہنساتا تھا۔ ننگے سروں کو آنچلوں سے ڈھانپتا تھا۔ وہ عظیم تھا۔ اُس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، وہ تو کسی تعریف کے محتاج نہیں تھے۔ ہمیں بھی عبدالستار ایدھی بننا چاہیے۔ اُس کے لگائے ہوئے پودے کو مرجھانے نہیں دینا کا عہد کرنا ہوگا۔ گفتگو میں کسی کا انعام نہ پا کر حیرت ہوئی شاید ادارہ نے انعامی سلسلہ بند کر دیا۔ ریحانہ سعیدہ کا تنقیدی خط عمدہ لگا، یہ تنقید برائے اصلاح تھی۔ تحریروں پہ تنقید ہمیشہ ہونی چاہیے اس سے لکھاری کو مزید تحریروں کو سنوارنے میں مدد ملتی ہے ہاں البتہ شخصیت پہ تنقید حسد اور کینہ پروری کے زمرے میں آتی ہے۔ صائمہ نور نے بھی عمدہ لکھا اور مجھے یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ جاوید احمد صدیقی بھی کھری کھری باتیں کر رہے تھے۔ علی حسنین تابش، ایم اے راحیل، ناظم بخاری، محمد رفاقت، عنبرین اختر، فلک شیر ملک، عبدالجبار رومی انصاری، حسین جاوید، علی اصغر انصاری، ناظم حسین شاہد، پرنس افضل شاہین، سید عبداللہ توفیق، شجاع بخاری، احسان سحر نے عمدہ خط لکھے اور پیارے محترم مجید احمد جائی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ باریک بینی سے نئے افق کا مطالعہ کرتے ہیں اور

سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں۔معاشرے کی ناانصافیوں پہ گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔میری طرف سے بہت بہت
مبارک باد۔اقراء میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کے بارے پڑھ کر دل کو منور کیا۔جعلی ناولز کے بارے پڑھ کر
حیرت ہوئی ،لوگ اس قدر گر جاتے ہیں۔دوسروں کی شہرت سے پیسا کمانا چاہتے ہیں۔کہانیوں میں شب
زاد، کانٹا، وحشت گرد، چندامندا، میں نہیں جانتی، کالا باغ، جنت کا خواب، قیامت، عقیدت کے پھول، عذاب
حرص، بہترین تھیں۔عورت زاد کا اختتام عمدہ رہا،فن پارے، ذوق آگہی، خوشبوئے سخن بھی عمدگی سے چل رہے
ہیں۔اب اجازت، رہی زندگی تو ملاقاتیں ہزاروں۔

ایم۔اے۔راحیل...... آداب! اُمید ہے خیر خیریت سے ہوں گے۔اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی خوشیاں
عطا کرے آمین۔ماہ اگست کا نئے اُفق ممتاز آباد مارکیٹ سے خریدا۔ٹائٹل خوبصورت تھا۔دستک میں محترم
جناب مشتاق احمد قریشی نے عبدالستار ایدھی کے بارے خوب لکھا۔وہ ایسی شخصیت تھے اُن پہ جتنا لکھا جائے کم
ہے۔اُس نے اپنا سب کچھ غریبوں، یتیموں، لاوارثوں پہ وار دیا۔جاتے جاتے آنکھوں کا عطیہ بھی دے
گئے۔وہ محسن پاکستان تھے۔اُن کے کارنامے مدتوں یاد رہیں گے۔اللہ تعالیٰ اُن کی بخشش فرمائے آمین۔گفتگو
میں انعام کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔مجھے تو ادارہ کی سمجھ نہیں آتی، ہر ماہ اِن کی پالیسی نئی ہوتی ہے۔پہلے انعام کا
اعلان کرتے ہیں اور پھر مدتوں انتظار کرواتے ہیں۔مجھے بھی انعام کے لئے نامزد گیا تھا لیکن آج تک انعامی رقم
نہیں ملی۔ادارہ میں محترم جناب طاہر احمد قریشی صاحب جیسی معتبر شخصیت سے بار بار رابطہ کیا لیکن کمال ہے کہ
توجہ سے کال سُن لیتے۔۔سات بار وقفے وقفے سے کال کی، اُس دوران نماز کا وقت بھی نہیں تھا۔گلے شکوے
بھی لکھاری سے کیے جاتے ہیں، جناب اگر نمبر دیا جاتا ہے تو کال بھی سن لیتے ہیں۔سات بار کال او کے ہوئی
، نام پوچھتے ہی کال ڈراپ، ہم انسان ہیں، حیوان نہیں۔۔مان لیا آپ اونچے طبقے کے لوگ ہیں۔۔۔اگر انعام
نہیں دینا تھا تو اعلان ہی نہ کرتے۔۔۔میں نے ممبر شپ کا کہا، ایڈریس بھی دیا مگر۔۔۔؟ جناب ایسے ادارہ
، پرچے میں لکھنا مناسب نہیں ہے، خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کر رہا ہوں۔۔انعام میرا حق ہے۔۔مجھے روانہ
کریں۔۔ورنہ معاف نہیں کروں گا۔۔۔اور ہاں میرا نئے اُفق میں یہ آخری خط ہے، میں ایسے ادارہ میں لکھنا ہی
چاہتا۔۔باقی اس بار گفتگو کی محفل خوب رہی، اقراء نے دل کے نہاں خانے روشن کیے، جعلی ناولز کے بارے
جان کر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ایسا ہر تیسری گلی میں ہو رہا ہے۔دولت کی سیاہ پٹی آنکھوں پہ بندھ جائے تو ناجائز
بھی جائز بن جاتا ہے۔۔کہانیوں میں چندا مندا، میں نہیں جانتی، وحشت گرد، کانٹا، قیامت، عقیدت کے پھول
،شب زاد، عذاب حرص، عمدہ تھیں۔۔فن پارے کی تحریریں اعلیٰ تھیں اور ہاں کمپوزنگ کی اغلاط نے پرچے کا ستیا
ناس کر دیا ہے۔۔۔جگہ جگہ غلطیاں دیکھی جاسکتی ہیں، تفصیل میں جاؤں تو طوالت ہو جائے گی۔۔۔ہو سکے تو
خود ایک بار پرچہ کا معائنہ کیجئے گا، والسلام۔

☆ایم اے راحیل ناراضگی نامے کا شکریہ، آپ کو کئی بار پرچے بلکہ فون پر بھی آگاہ کیا گیا تھا کہ انعامی رقم ہم
باقاعدگی سے روانہ کی جاتی ہے ایک بار واپسی پر آپ کو دوبارہ رقم کی گئی مگر آپ کی شکایت دور نہیں ہوئی، آپ
کے نہ لکھنے سے نئے افق پر فرق تو نہیں پڑے گا البتہ آپ کی ناراضگی سے ہمیں دکھ ہوگا، اللہ آپ کو خوش رکھے۔

مجید احمد جائی......ملتان شریف مزاج گرامی! اُمید واثق ہے بخیریت ہوں گے اور
خوشیوں کے جھرمٹ میں رہتے ہوئے خوشیاں بانٹتے ہوں گے۔اللہ تعالیٰ حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے

کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ صحت کی بادشاہی کے ساتھ ایمان کی سلامتی ہمیشہ رہے اور غموں سے دُور، خوشیوں بھری زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔! ماہ اگست 2016 کا نئے اُفق حسب روایت بروقت مل گیا۔ سرورق دل کش تھا، امن کا پیغام لئے شاہین پرواز کر رہا ہے، جیسے جشن آزادی کی خوشیاں منا رہا ہو اور اہل وطن کو جشن آزادی کی مبارک باد دے رہا ہو۔ دوشیزہ ایسے جیسے بھارت حسد اور کینہ پروری کی آگ میں جل بھن گیا ہو، لڑکی کے تیور بالکل بھارت جیسے ہیں، آنکھوں میں وحشت بھری ہے اور بکھرے کھلے بالوں سے اپنی غربت کا حال دے رہی ہے، بھارت بھی تو ایسے ہی ہے چنگھاڑتا ہے، دہاڑتا ہے مگر اپنی رعایا کی حالت زار کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔۔۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے بابائے خدمت کے بارے میں عمدہ لکھا۔ میں حیران ہوں عبدالستار ایدھی صاحب 88 سال ہمارے درمیان رہے، لیکن کسی کی نظریں اس درویش کی طرف نہیں گئیں لیکن جونہی دُنیا سے ناتہ توڑا پروٹول پروٹول کی گردان شروع ہوگئی۔۔۔ یہ اُس وقت کہاں تھے جب ایدھی جلی کٹی لاشیں اپنے کندھوں پہ اُٹھا رہا تھا، غسل دے رہا تھا۔ لاوارثوں کا باپ بن رہا تھا، بے سہاروں کا سہارا بن رہا تھا۔ بلقیس ایدھی کا بیان پڑھ کر محو حیرت ہوں کہ حکومت کو بھی علم ہے کہ ایدھی صاحب سے کس نے سونا اور رقم لوٹی ہے اور اس وقت کہاں ہیں۔ پھر بھی حکومت خاموش تماشائی۔۔۔ بھلا ہو پاک افواج کا ہر معاملے میں آگے آتی ہے۔ تعجب کی بات ہے عبدالستار ایدھی کے مرنے کے بعد کوئی محسن وطن کہہ رہا ہے تو کوئی بابائے خدمت، ہر کوئی پھول لئے کھڑا ہے، اُس کے جنازے کو توپوں کی سلامی دی جارہی ہے سیاسی، عسکری لوگ جنازے میں بھی شریک ہیں۔۔۔ لیکن کسی نے ایدھی صاحب جیسا کام کرنے کی ہامی نہیں بھری، کسی نے اتنا نہیں کہا کہ میں ایدھی بنوں گا۔۔۔ گفتگو میں ریحانہ سعیدہ نے سچی کھری باتیں کی اور اُن کا باریک بینی سے مطالعہ کا پتا چلتا ہے۔ خط عمدہ تھا۔ صائمہ نور نے بھی عمدگی سے حکومتی عہدیداروں کے لتے لیے ہیں۔ جاوید احمد صدیقی صاحب بھی محفل کو رونق بخش رہے تھے۔ جناب آپ کا حکم ہو تو ہم ننگے پاؤں چلیں آئیں گے۔ احسن ابرار رضوی نے مختصر خط میں خوب لکھا، علی حسنین تابش غیر حاضری کے بعد زبردست خط کے ساتھ حاضر تھے۔ اتنے پیارے الفاظ، واہ بھائی واہ۔۔۔ گلے شکوے اپنوں سے ہوتے ہیں اور اُمید ہے اب آپ کے شکوے ادارے نے دُور کر بھی دیئے ہوں گے۔ ناظم بخاری لودھراں کا خط بہت پسند آیا۔ محمد رفاقت، عنبرین اختر، فلک شیر ملک، ریاض بٹ، بہت نوازش آپ نے اس قابل سمجھا اور عزت بخشی۔ عبدالجبار رومی، حسنین جاوید، علی اصغر انصاری، ناظم حسین شاہد، پرنس افضل شاہین، اویس اویسی، سید عبداللہ توفیق، شجاع بخاری، اور پیارے احسان سحر نے کمال تبصرے لکھے۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو سلامت رکھے آمین۔ اقراء میں طاہر قریشی بھائی نے صفاتی ناموں پہ خوب لکھا۔ اللہ تعالیٰ احکامات بجالانے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ محمد عارف اقبال نے ابن صفی کے نام سے شائع ہونے والے دو جعلی ناول سے آگاہی دی۔ موصوف گہری نظر رکھے ہوئے ہیں اور لوگ سستی شہرت اور پیسے بٹورنے کے چکر میں اپنا آپ بھی بھول جاتے ہیں۔ ضمیر فروشوں کا کام بھی یہی ہوتا ہے۔ اب تو ادبی چور بہت پیدا ہو گئے ہیں جو تحریریں ادھر اُدھر سے کتر کر اپنے نام سے شائع کرواتے ہیں۔ ان کا کیا جائے،،،؟ کہانیوں میں چندا منداسنے خوب ہنسایا اور رلایا بھی۔ میں نہیں جانتی، آزادی کے حوالے سے بہترین تحریر تھی، یہ سلسلے، اس بار مہتاب خان ناکام رہی ہیں۔ ایسے لگتا ہے یہ تحریر اُن کے بچپن کی ہے۔ دہشت گرد بھی اچھی کہانی تھی۔ اس کے علاوہ قیامت، جنت کا خواب، عذاب حرص، جنت کا خواب۔ کانٹا، کالا باغ اچھی تحریریں

تھی، فن پارے میں پروفیسر شیخ محمد اقبال کی تحریر نے متاثر کیا، باقی بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ذوق آگہی، خوش بوئے سخن کے ساتھ ساتھ شب زادا چھوٹی تحریر تھی۔ شب زاد کے تعریفی کلمات میں ''مریخ'' کی جگہ بھی ''مریض'' لکھا گیا ہے۔۔ آزادی کے حوالے سے بہترین ناول تھا۔ اب اجازت۔ اللہ نگہبان۔

صائمہ نور...... ملتان آداب! اُمید کرتی ہوں صحت کی نعمت سے مالا مال ہنستے مسکراتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام بیماریوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے اور بے اولادوں کو اولاد جیسی نعمت سے نوازے۔ ملک پاکستان میں امن قائم ہو اور دہشت گرد نیست و نابود ہو جائے آمین! ماہ اگست 2016 کا نئے اُفق آزادی کی تحریریں لئے جلوہ گرہ ہوا۔ سرورق پہ شاہین قومی پرچم کے رنگوں سے مزین محو پرواز ہے۔ اِس سے مراد پاکستانی عوام کو لیا گیا ہے شاید۔۔۔ میری طرف سے اہل وطن کو جشن آزادی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ جسمانی، روحانی، ذہنی طور پر آزاد فرمائے۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں اور پاکستان ترقی کی طرف گامزن ہو جائے۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی نے محسن وطن عبدالستار ایدھی کے بارے میں لکھا۔۔۔ عبدالستار ایدھی نے تمام بہانے تمام دلیلیں غلط ثابت کر دیں۔ انسان کچھ کرنے کی ٹھان لے تو کتنی بھی مشکلات کا سامنا ہو سرخرو ہوتا ہے۔ کروڑوں کے اثاثے چھوڑنے والا خود کیسی زندگی گزار گیا۔ سیاستدانوں، جاگیرداروں کے منہ پہ طمانچہ ہی تو ہے۔ عبدالستار ایدھی نے کسی سیاست دان سے چندہ نہ لیا اور مودی سے کروڑوں کی امداد لینے سے انکار اُس کی دلیری اور وطن سے محبت ظاہر کرتی ہیں۔ اور یہ بھی اعزاز اُنہی کے سر جاتا ہے کہ اُنہوں نے کسی بھی بیرون ملک سے امداد نہیں لی۔ وہ پروٹوکول، واہ۔ واہ، یا ایوارڈ کے لئے نہیں جیتا تھا۔ بلکہ تمام ایوارڈ اُس کے آگے زیرو تھے۔ جاتے وقت بھی وہ اپنی آنکھیں دے گیا۔ کاش! یہ آنکھیں حکومت کو لگا دی جاتی۔۔۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں کروٹ کروٹ راحت وسکون عطا فرمائے۔۔۔ اللہ کرے۔۔۔ ایدھی فاونڈیشن تا قیامت یونہی کام کرتی رہے۔ گفتگو میں عمران قریشی کی باتیں سنتے ریحانہ سعیدہ سے ملے۔ جو تنقیدی خط کے ساتھ حاضر تھیں اور کھری کھری سنا رہی تھیں۔ میں اُن سے اتفاق کرتی ہوں۔ مجھے برابر شائع کرنا کا شکریہ۔۔۔ کیا کہانی بھی بھیج دو۔؟ جاوید احمد صدیقی، احسن ابرار رضوی، علی حسین تابش، ایم اے راحیل، مجید احمد جائی، ناظم بخاری، محمد رفاقت، عنبرین اختر، فلک شیر ملک، ریاض بٹ، عبدالجبار رومی انصاری، علی اصغر انصاری، ناظم حسین شاہد، پرنس افضل شاہین، سید عبداللہ توفیق، شجاع بخاری، اور محترم احسان سحر کے تبصرے خوبصورت اور اعلیٰ تھے۔ اقراء نے دل کے نہاں خانوں کو منور کر دیا۔ جعلی ناولز کے بارے پڑھ کر حیران رہ گئی۔ لوگ اس حد تک گر جاتے ہیں۔ دولت کا نشہ واقعی بے ضمیر بنا دیتا ہے۔ انسان دولت کمانے کے ہزاروں طریقے ایجاد کر چکا ہے۔ کہانیوں میں میں نہیں جانتی، شب زاد، آزادی کے حوالے سے بہترین تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ عقیدت کے پھول، عذاب حرص، قیامت، یہ سلسلے، جنت کا خواب، کالا باغ، کانٹا، چندا مندا، دہشت گرد، اچھی تحریریں تھیں۔ فن پارے، خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی خوب رہے۔ قسط وار کہانیاں ٹھیک رہیں۔ اس بار تمام پرچہ بہترین تھا۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور۔ رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ نئے افق کا خوب صورت شمارہ بیس تاریخ کو ہی مل گیا خوب صورت دوشیزہ کشمیر کی بیٹی لگی جو حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی اور منتظر ہے کہ کوئی صلاح الدین ایوبی یا محمد بن قاسم آئے اور ہمیں ہندوستان کے تسلط سے آزاد کرائے اگست کے حوالے سے قومی پرچم کے رنگ لیے شاہین کی پرواز بہت اچھی لگی۔ یقیناً اس پرچم کے سائے تلے ہم

ایک ہیں، ایدھی تو واقعی نعمت الٰہی تھے جنہوں نے ہر جگہ انسانیت کو فیض پہنچایا ان کا خلا کبھی پورا نہیں ہو سکتا مگر ان کا مشن ہمیشہ جاری رہے گا، ان کا جذبہ اور خدمت خلق قابل تقلید ہے جسے ہر پاکستانی کو اپنانا چاہیے۔ گفتگو میں محترمہ ریحانہ سعیدہ کی تعریف وتنقید متاثر کن رہی صائمہ نور کی کھری اور سچی باتیں بہت اچھی لگیں کاش کوئی جادو کی چھڑی ہو اور سب کرپٹ عناصر ایک دم سیدھے ہو جائیں پر کیا اس عوام میں اتنا جذبہ نہیں کہ کچھ بول سکے بس لکیر کے فقیر اندر ہی اندر آنسو پی کے رہ جاتے ہیں۔ جاوید احمد صدیقی کا بھرپور تبصرہ بہت عمدہ تھا، مجید احمد جائی بھی معاشرتی المیوں پر رنجیدہ دکھائی دیے، گزر ہی جائے گی یہ رت بھی حوصلہ رکھنا۔ ریاض بٹ نے بھی بہت اچھی تبصرہ نگاری کی زبردست۔ ناظم حسین شاہد اور پرنس افضل شاہین مسکرا کے ملتے ہوئے بہت اچھے لگے۔
احسان سحر بھائی آپ کیوں اداس تھے نرم گرم دن بھی زندگی کی دھوپ چھاؤں میں گزر ہی جاتے ہیں سو خوش رہیں جی لیجیے عورت زاد بھی مکمل ہوئی مٹھن خان بھی اپنے انجام کو پہنچا، شعیب کے مرنے کا افسوس ہوا ہمیں تو لگا تھا اینڈ پہ شاید نینا مر جائے گی شکر ہے کہانی کی ہیروئن زندہ رہی، تاجاں کے ساتھ کیا ہوا وہ تو سائیڈ پہ ہی رہ گئی اور بی بی صاحب کا کردار بھی چھپا رستم نکلا اینڈ اچھا ہی ہو گیا، قیامت حالت حاضرہ کے مطابق اچھی رہی، مزدوروں اور ماہوار تنخواہ پر مڈل کلاس طبقہ کے ساتھ ہر ماہ ایسا ہی ہوتا ہے اور کمپنی کے مالکوں پہ اسی طرح رہ رہ کے غصہ آتا ہے ہاں اچھی کمپنیاں بھی ہیں ٹائم پر پے منٹ کر دیتی ہیں اور پھر ترقی بھی وہیں ہوتی ہے جہاں کام کرنے والے بھی خوش ہوں، میں نہیں جانتی دلخراش واقعات لازوال قربانیوں سے پاکستان تو قائم ہوا مگر اس کو صحیح معنوں میں کوئی بھی پاکستان نہیں بنا سکا ورنہ موجودہ حالات میں کوئی بھی اداس نہ ہوتا سکینہ کی طرح، صفدر تو ڈھلان سے اتر گیا مگر کالا باغ کا اشارہ دے گیا سیاستدان ایک دوسرے سے تو لڑائی میں مصروف ہیں مگر کالا باغ ڈیم کی بند پوٹلی کوئی بھی کھولنے کو تیار نہیں کاش کوئی صفدر جیسا سمجھدار آ جائے تو کالا باغ کی بیل بھی منڈھے چڑھ جائے۔
خلیل جبار کی کاشا زبردست رہی کہانی تو عام ہی تھی مگر اس میں تجسس بہت تھا ٹرک ڈرائیور کی ہمدردی بھی کام آ گئی اور نازو پھر سے رمضان کی ہو گئی۔ واہ کمال کر دیا روبی نے اور راحیل نے قاتل کو پکڑنے کے لیے ماحول بھی پراسرار بنا ڈالا جس کے ساتھ رہتے ہوئے عطیہ کریم اور سرفراز کو بھی خبر نہ ہوئی البتہ سب کی تفتیش اپنی جگہ زبردست رہی۔ عقیدت کے پھول ایک ہی نشست میں پڑھنے کا مزہ آ گیا۔ پل صراط عشق ہر لفظ ہی محبت ہے فریال اور مہک بھی محبت سے جیون ساتھی بن گئے یہ نایاب کے ساتھ عمیر خان کو بٹھایا گیا ہے تو میز نظر نہیں آیا شاید اس میں بھی کوئی محبت کی پردہ داری ہو۔ عائشہ اور سندس کی داستان غم میں عورت ہی لاچار اور بے بس دکھائی ظفر تو اپنا مطلب پورا کر گیا لیکن عائشہ کو چیخ چیخ کر سب کو بتا دینا چاہیے تھا فاطمہ کی خواہش بس خواہش ہی رہ گئی نہ اپنی پوری ہوئی تھی نہ بیٹے کی پوری ہو سکی اور وہ بھی امن کے دشمنوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بس اللہ ہی حافظ ہے اللہ انہیں ہدایت دے۔ جنت کے خواب انسانیت کو جھنجوڑ دینے والی تحریر تھی باقی ذوق آگہی میں جاوید احمد صدیقی، عائشہ اعوان، رضوانہ اسحاق اور عاصم بٹ کے مراسلے زبردست رہے اور خوش بوئے سخن میں صفیہ سعدیہ، ظریف احسن اور عمر فاروق ارشد کا کلام اچھا رہا۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! ماہ اگست کا شمارا پڑھا بہت پسند آیا اس میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی گفتگو میں سب لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اس سے پرچے کے معیار کا پتا چل جاتا ہے جو لوگ پرچے کو غور سے پڑھتے ہیں وہ اپنے خیالات کا اظہار بھی اچھے انداز

سے کرتے ہیں اس دفعہ عقیدت کے پھول (راجہ بنارس) عذاب حرص (سلیم کرد) قیامت (نوشاد عادل) جنت کا خواب (محمد سفیان بٹ) یہ سلسلے (مہتاب خان) دہشت گرد (راحیلہ تاج) کانٹا (خلیل جبار) کی لکھی گئیں اچھی اور منفرد کہانیاں تھیں، اسی طرح چندا مندا کے ایم خالد کی کہانی بھی خوب تھی۔ عورت زاد، قسط وار ناول ختم ہوا، امجد جاوید نے خوب لکھا ہے۔ بہت ہی اچھا سلسلہ تھا میں نہیں جانتی صداقت حسین ساجد کی آزادی کے متعلق اچھی کہانی تھی۔ بھائی سب نے خوب محنت سے اپنی کاوشوں کو پیش کیا ہے سب کو میں مبارکباد دیتا ہوں، گفتگو میں صائمہ نور، جاوید احمد صدیقی، احسن ابرار رضوی، علی حسنین تابش، ایم اے راحیل، مجید احمد جائی، ناظم بخاری، عنبرین اختر، ایم حسن نظامی، فلک شیر ملک، ریاض بٹ، عبدالجبار رومی انصاری، حسین جاوید، علی اصغر انصاری، ناظم حسین شاہد، پرنس افضل شاہین، سید عبداللہ توفیق، شجاع بخاری اور احسان سحر کے تبصرے بہت خوب تھے اور ان حضرات کا بھی شکریہ جنہوں نے میرے خط کو پسند کیا۔ والسلام

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان۔ جناب عمران اور دیگر معزز مدیران گرامی، آداب عرض کرتا ہوں، اگست کا شمارہ مجموعی لحاظ سے بہتر رہا، عورت زاد اچھے انداز میں اختتام پزیر ہوئی اور امید ہے کہ پل صراط عشق بھی اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے گی آنے والے دونوں ناولوں کا انتظار ہے لگتا ہے کہ دونوں تحریریں شہرت پائیں گی محترمہ ریحانہ سعیدہ ساون کی گھٹا کی طرح آئیں اور گرج برس کر چلی گئیں اور جاتے جاتے اول نمبر بھی لے گئیں واہ کیا خوب تبصرہ تھا مگر کچھ باتوں سے مجھے اتفاق نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بائیس خطوں میں سے صرف پہلے پہلے خط کا جواب دیا گیا حالانکہ تمام قارئین نے کچھ نہ کچھ ضرور پوچھا تھا خالی خط یا تبصرہ شائع کر دینا کافی نہیں بلکہ جو چیز پوچھی جائے یا تجویز دی جائے اس کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔ پرنس افضل شاہین، عبدالجبار رومی اور مجید جائی کے تبصرے جاندار تھے، نسیم سکینہ صدف کا کلام خوب تھا۔ عذاب حرص، جنت کا خواب، قیامت، کانٹا اور کالا باغ خوب صورت انداز کی تحریریں تھیں، فن پاروں میں شہر خموشاں، عید اور کوئی عید ایسی ہو بہت زبردست تھیں۔ ذوق آگہی میں بڑی ہی اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں محمد یاسر گجرات کا انتخاب دعا بہترین دعا تھی یہ دعا ادارہ عبقری کے روح رواں جناب حکیم محمد طارق محمود مجذوبی چغتائی صاحب کی لکھی ہوئی ایک جامع دعا ہے ہمیں ایسی دعائیں ہی مانگنا چاہیے جو ہمہ گیر ہوں تو یہ مختصر انداز میں مہہ جبین کھروڑ پکا کا خوب صورت انتخاب تھا۔ انجم انصار کراچی کی نصیحت پر عمل کر کے زندگی کو خوب صورت بنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی اس راہ پر آ کر تو دیکھے صغریٰ کوثر کی حمد باری تعالیٰ شاندار تھی بس انداز واسو والا تھا (یعنی واسو اور شہزادرائے والا) زرین صدیقی امبر کی نظم نے دل موہ لیا۔ آخر میں چند گزارشات عرض کرتا ہوں امید واثق ہے کہ جواب دیا جائے گا۔ ناقابل اشاعت تحریروں کا سلسلہ شروع کریں تا کہ رائٹرز کو پریشانی نہ ہو۔ میں نے کچھ تحریریں بھیجی تھیں ان کے متعلق بتائیں اگر گنجائش نہیں تو کسی اور جریدے کو بھجوائی جا سکیں۔ ٹائٹل کے بارے میں کافی تنقید آرہی ہے اس بارے میں سنجیدگی سے غور کریں۔ آپ کے پاس روزانہ بے شمار تحریریں آتی ہوں گی مگر رسالہ چھوٹا ہے تحریریں شائع ہونے سے رہ جاتی ہیں پلیز ایک رسالہ نئی منزلیں نئے راستے کے نام سے نکالیں تا کہ سب رائٹرز کے دل کی آرزو پوری ہو سکے۔ فن پاروں کی بجائے سچے واقعات، آپ بیتیاں اور جگ بیتیوں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ شاعر اور رائٹرز کے انٹرویو والا سلسلہ بے شک بند کر دیں تا کہ زیادہ سے زیادہ کہانیاں چھپ سکیں۔ عبدالستار ایدھی مرحوم اور امجد صابری مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کے ساتھ یہی کہوں گا۔

یہ اک اشارہ ہے آفات ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

☆محترم آپ کا ناول الف لام میم اس شمارہ میں شامل ہے باقی تحریروں کے لیے انتظار کریں۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار اگست کا نئے افق آزادی نمبر پاکستانی پرچم اپنے پروں پر سجائے محو پرواز تھا نیچے مقبوضہ کشمیر کی کشمیری بچی آنکھوں میں آس امید لیے کہ ہم بھی کبھی پاکستان میں شامل ہوں گے ایسا لگتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلیں گے۔ ہم پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے رہنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ان شاء اللہ وہ دن بہت جلد آئے گا۔ جب آپ لوگ پاکستان میں شامل ہوں گے آپ کے چہروں پر خوشی آئے گی آگے بڑھے تو آپ کی دستک دنیا کی عظیم شخصیت یعنی عبدالستار ایدھی کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی واقعی عبدالستار ایدھی ایک ایسی شخصیت تھے جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی، دنیا میں ہے کوئی ایسا شخص جو دو جوڑے کپڑوں اور فوت شدگان کے پلاسٹک کے جوتے پہن کر اپنی ساری زندگی گزار دے، جو لاوارث لاشیں نکالنے کے لیے گندے نالوں میں کود جائے، بم دھماکوں اور برستی گولیوں کی بوچھاڑ سے زخمیوں کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال پہنچادے۔ گفتگو میں پہنچے تو آپ خوش خبری سنا رہے تھے کہ اس ماہ عورت زاد کی آخری قسط ہے آئندہ ماہ سے عشنا کوثر سردار کی کہانی ایک سو سولہ چاند کی راتیں شروع ہو رہی ہے۔ امید ہے یہ کہانی بھی سب کو پسند آئے گی۔ میرے خطوط پسند فرمانے پر ریاض بٹ، عبدالجبار رومی، علی اصغر انصاری، حسنین جاوید، شجاع بخاری کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے اور ریحانہ سعیدہ، صائمہ نور، جاوید احمد صدیقی، احسن ابرار رضوی کے خطوط بھی پسند آئے ناظم حسین شاہد اور اویس اویس کو گفتگو میں پہلی بار آمد پر خوش آمدید کہتے ہیں ریحانہ سعیدہ پرانے شعرا کا انتخاب ہی تو نئے افق کا حسن ہے بقول ناظم بخاری کے نئے شعرا کے اشعار میں وزن نہیں ہوتا امید ہے آپ کی اب تسلی ہو گئی ہوگی، صائمہ نور آپ بالکل درست لکھتی ہیں کہ سفارشی لوگ عہدوں پر بیٹھے ہوئے ہیں میرٹ والے سڑکوں کی خاک چھان رہے ہیں علی حسنین تابش آئندہ آپ کی طرف سے غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے۔ احسان سحر آپ کو اعتکاف کی مبارکباد ہے اللہ تعالیٰ آپ کا اور تمام اعتکاف کرنے والوں کے اعتکاف قبول فرمائے اور آپ سب کی جائز خواہشات پوری فرمائے۔ عبدالجبار رومی انصاری آپ کو شادی مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ دونوں کے دل ملائے اور آپ ہنسی خوشی ازدواجی زندگی گزاریں آمین۔ اقرا میں طاہر بھائی اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کا ذکر کر رہے تھے واقعی اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تسبیح کرنے والے دلی مرادیں پاتے ہیں۔ ابن صفی کے نام سے شائع ہونے والے دو جعلی ناول سائے کا قتل، روشنی کی آواز کے بارے میں پڑھا بہت دکھ ہوا لوگ ادبی حوالوں میں بھی جعلساز نکلتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ عقیدت کے پھول پڑھ کر اداکار ندیم کی فلم انہونی یاد آ گئی جس میں اداکار ندیم جو مقتول ہوتے ہیں قبر سے نکل کر اپنے قاتل کو قتل کرتے ہیں۔ اجازت دیں خدا حافظ۔

ممتاز احمد...... سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، طاہر قریشی صاحب عمران احمد صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ پاک پروردگار رب کریم کی بارگاہ میں اس دعا کے ساتھ اپنے نامہ محبت کا آغاز کرتا ہوں کہ میرا سوہنا رب ہم سب کو حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد پورے کرنے کی توفیق نصیب فرمائے ہم سچے کھرے مسلمان بن جائیں ہماری زبان، ہاتھ اور کسی عمل سے

دوسرے انسان کو کوئی دکھ، تکلیف، ایذا نہ پہنچے سب کی خیر ہو، ہر طرف محبتوں کے پھول کھلیں ہمارے دلوں سے نفرت، عداوت، بغض، حرص، لالچ، طمع، حسد اور دشمنی کے پلے ہوئے بت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاش پاش ہو جائیں آمین ثم آمین۔ ہم میں سے بیشتر لوگ حکمرانوں اور معاشرے کے حالات پر کڑھتے رہتے ہیں مگر کیا ہم نے کبھی اپنا احتساب بھی کیا ہے کیا ہم مفید شہری ہیں اپنے ملک کی تعمیر و ترقی اور معاشرے میں بہتری اور بھلائی میں ہمارا کوئی کردار ہے ہر انسان کے اندر ایک منصف بیٹھا ہے جو درست فیصلہ کرتا ہے کیا ہم نے اپنے بارے میں اس منصف سے کوئی فیصلہ لیا ہے، ہمارے اندر کا انداز اور ضمیر ان سب سوالوں کا جواب ایمانداری، دیانتداری اور سچائی سے دے گا جس کی روشنی میں ہم نے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اپنے آنے والے کل کو بہتر بنانا ہے، اگست کا شمارہ 20 تاریخ کو مارکیٹ میں آ گیا ٹائٹل میں شاہین کے پروں پر پاکستان کا خوب صورت جھنڈا بنا کر اسے فضاؤں میں اڑتے دکھایا گیا یقین کریں دل خوش ہو گیا، دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے نہایت خوب صورت الفاظ میں جناب عبدالستار ایدھی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا سچ پوچھیے تو ایدھی صاحب اپنی ذات کے اندر ایک بہت بڑا ادارہ، ایک مشن اور ایک عزم تھے جو کچھ انہوں نے انسانیت کے لیے کیا اپنی ساری زندگی انسانیت کے لیے وقف کر کے اپنا سکھ چین آرام قربان کر کے دوسروں کے لیے ایک زندہ مثال چھوڑ دی ہے کہ زندگی کا مقصد ہے اوروں کے کام آنا کاش ہم سب بھی ان کے مشن اور جذبے کی پیروی کر سکیں اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

بچھڑا کچھ ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

گفتگو میں ریحانہ سعیدہ، صائمہ نور، جاوید احمد صدیقی، احسن ابرار رضوی، علی حسنین تابش، ایم اے راحیل، مجید احمد جائی، ناظم بخاری، محمد رفاقت، عنبرین اختر، ایم حسن نظامی، فلک شیر ملک، ریاض بٹ، عبدالجبار رومی انصاری، حسین جاوید، علی اصغر انصاری، پرنس افضل شاہین، سید عبداللہ توفیق، شجاع بخاری اور احسان سحر کے خطوط جگمگا رہے تھے اور ان کے تبصروں نے گفتگو کو حسن اور رونق بخشی، محترمہ ریحانہ سعیدہ کا بے لاگ تبصرہ بہت پسند آیا حقائق پر مبنی تبصرہ تھا قارئین کی مثبت تنقید لکھاریوں کے لیے مشعل راہ ہوتی ہے علی حسنین تابش آپ نے سو فیصد درست کہا واقعی ہمارے دلوں میں جلن، بغض، منافقت اور حسد کے ڈیرے ڈال رکھے ہیں ہمارا ظاہر اور باطن ایک جیسا نہیں ہے آپ نے خوب صورت خیالات کو خوب صورت الفاظ میں ڈھال کر ایک بہترین پیغام دیا ہے ویلڈن۔ مجید احمد جائی صاحب آپ اپنے ہر خط میں تلخ و شیریں حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آپ ایک لکھاری ہونے کے ناتے اردگرد کے حالات و واقعات کا خوب جائزہ لے کر باریک بینی سے مطالعہ کے بعد جو الفاظ کی مالا پروتے ہیں ان کا اثر دل پر ہوتا ہے اللہ آپ کو اور زور قلم عطا فرمائے اور نظر بد سے بچائے آمین۔ جناب ناظم بخاری صاحب اب آپ نے واپس نہیں پلٹنا اب آئے ہیں تو آتے ہی رہیے گا۔ محترم فلک شیر ملک صاحب جی مجھ سے بھول گئی معافی کا خواستگار ہوں، آپ کی خدمت میں ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ عنبرین اختر کی آمد بہت اچھی لگی خوش بوئے سخن میں آپ کا کلام ''اجنبی'' بہت پسند آیا ریاض بٹ صاحب کا مفصل اور مدلل تبصرہ شاندار تھا پرنس افضل شاہین صاحب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس پاک ذات نے آپ کو بیماری سے نجات دلا کر صحت و تندرستی کی نعمت سے نوازا اسلامت

رہیں خوش رہیں آمین۔ احسان سحر صاحب اعتکاف کی بہت بہت مبارک ہو، اللہ پاک آپ کی ہر عبادت اور دعا اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، آمین۔ صائمہ نور، احسن ابرار رضوی، ایم اے راحیل، عبدالجبار رومی انصاری آپ صاحبان نے مجھے یاد فرمایا بہت شکریہ، عقیدت کے پھول بہت عمدہ تحریر تھی۔ ''عذاب حرص'' درس دیتی تحریر تھی حرص اور لالچ کرنے والے ہمیشہ انجام بد سے دوچار ہوتے ہیں۔ نوشاد عادل نے ''قیامت'' کے عنوان سے ایک المیہ لکھا یہ سچ ہے کہ سرمایہ دار کو اپنا سرمایہ بڑھانے کی تو دن رات فکر ہوتی ہے مگر کسی غریب کے گھر میں فاقے ہو رہے ہیں چولہے ٹھنڈے پڑے ہیں یہ سوچنے کی فرصت نہیں ہے۔ ''جنت کا خواب'' رلا دینے والی تحریر تھی مہتاب خان نے ''یہ سلسلے'' کے عنوان سے شاندار تحریر پڑھنے کو دی واقعی یہ سچ ہے عشق نہ پچھے ذات جب عشق ہو جاتا ہے تو پھر دولت کے ڈھیر خود ہی گر جاتے ہیں خلیل جبار کی ''کانٹا'' بہت مزیدار اور اچھوتی تحریر تھی اچھے برے لوگ ہر قبیل میں ہوتے ہیں دنیا میں اچھے انسان ابھی ہیں نازو کا گھر پھر سے آباد ہو گیا ٹرک ڈرائیور کے اچھے کردار کی وجہ سے ہی وہ دوبارہ آباد ہوئی۔ فن پارے میں شامل تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے قابل صد احترام استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال صاحب کی تحریر ''مس ہیلمٹ'' کو نئے افق کی زینت بنایا۔ مختلف اوراق پر محترمہ نسیم سکینہ صدف کا کلام جگمگا رہا تھا بہت پسند آیا۔ ذوق آگہی میں ملک یاسر صاحب، جاوید احمد صدیقی صاحب اور عائشہ اعوان کے انتخاب پسند آئے۔ خوش بوئے سخن میں صغریٰ کوثر، عائشہ اعوان، پرنس افضل شاہین، عمر فاروق ارشد، ریاض حسین قمر کے کلام بہت عمدہ اور شاندار تھے عبدالجبار رومی انصاری کا انتخاب بھی اچھا تھا باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ ان شاء اللہ اب اگلے ماہ حاضری ہو گی اگر زندگی نے وفا کی تو۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہو گی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

ترتیب: طاہر قریشی

(۷) اللہ تبارک وتعالیٰ کی تنزیہ صفات

ایسی صفاتِ الٰہی جو اللہ تعالیٰ کی بڑائی، کبریائی، پاکی، نیکی اور ہر عیب ونقصان سے اس کی برأت، کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایسی صفاتِ الٰہی جو اللہ تعالیٰ کو ایسی صفات سے پاک رکھتی ہیں جو اس کی شایانِ شان نہیں۔

(۱)۔ العلی۔ مرتبہ والا، بلند مرتبہ۔ بلند ترین درجے والا، جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا ہو جو سب سے برتر ہے۔ سب سے اعلیٰ، سب سے بزرگ وعظیم، بڑا ہی عظیم، برتر، قوی تر۔

(۲)۔ الکبیر۔ بڑا، سب سے بڑا، بزرگ ترین ہستی، زمان ومکان میں ارفع واعلیٰ، ایسی یکتا بڑائی اور جلالت والا جس کا کوئی شریک اور مدمقابل نہیں، سب رعب والوں سے بڑا رعب والا۔

(۳)۔ الجلیل۔ بزرگ۔ پرشکوہ، صاحب جلال، جمال وجلال کا سرچشمہ، جلیلِ مطلق، جلالت اس قدر کہ جتنی بھی صفات ہیں سب سے وہ موصوف ہے۔

(۴)۔ الغنی۔ بے نیاز، جسے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں، عزت، دولت، اولاد سے خاندان سے پاک ہستی، غیر محتاج، ساری کائنات اس کی محتاج، اس کی کسی سے کوئی غرض نہیں سب کو اس سے ہی غرض ہے۔

(۵)۔ الماجد۔ عزت والا، بزرگ، درجے میں بلند ترین بڑی شان والا، عظمت والا، وقار وتوقیر والا، جو معنی ماجد کے ہیں وہی قریب قریب "مجید" کے ہیں۔

(۶)۔ القدوس۔ پاک ومنزہ، ہر عیب سے پاک، سب سے الگ ذات، روح اور ملائکہ سے بھی ارفع اور پاک ہستی، ایسی پاک ومنزہ ہستی جو اپنی صفات کمال میں ہر سوچ سے ارفع ہو۔

(۷)۔ الجمیل۔ اچھا، حسین، خیر کثیر عطاء کرنے والا، احسنِ کثیر، خیر محض۔

(۸)۔ العدل۔ عادل، انصاف کرنے والا، سب سے بڑا منصف، اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کے باعث کائنات میں عدل وانصاف کا نظام قائم ہے۔

(۹)۔ الصمد۔ بے نیاز، بے پروا، بلند اور محکم، ہر آمیزش سے پاک، اس کی ذات سے کوئی چیز نہیں نکلی، جس کی سب کو احتیاج ہے اسے کسی کی کوئی ضرورت نہیں، جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جائے۔

(۱۰)۔ العظیم۔ عظمت والا، بزرگ برتر، سب سے بڑا، جس کی بڑائی کو انسانی فہم بھی نہ پہنچ سکے۔ ایسی عظمت والا جس کے سامنے ہر بڑائی، ہر بڑی سے بڑی شے ہیچ ہے۔ بلند وبالا مرتبے والا۔

(۱۱)۔ الرفیع۔ بلند، رفعت والا، بلندی عطا کرنے والا، بلندیوں والا۔

(۱۲)۔ الکریم۔ شریف، کرم کرنے والا، مہربان، بخشش وعطا کرنے والا، فیاض خطا معاف کرنے والا، صاحب کرامت، تکریم والا، بڑی عزت والا، بے حد سخی، صاحب کرم۔

(۱۳)۔ الصادق۔ سچا، راست باز، حق، وعدہ کا پکا۔

(۱۴)۔ الحمید۔ تعریف والا، شکر اور تعریف کے لائق، ثناء کا مستحق، اپنی ذات کی صفات کی تعریف والا، تمام تعریفیں اُسی ذات کے لئے ہیں۔

(۱۵)۔ الحق۔ سچا اور اصل، حقیقی، معبودیت کے لائق، واجب الوجود، سچائی کا مالک جس کے سوا ہر شے باطل اور معدوم ہے، ایسا ثابت کہ جس کے ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو۔

(۱۶)۔البر۔نیک۔خیر مطلق، نیکی کا منبع، نیکی کی ترغیب دینے والا، زندگی میں کشادگی کی راہیں پیدا کرنے والا، بے حد وحساب وسعتوں کا مالک، فراخی وکشادگی والا۔
(۱۷)۔سبوح۔ہر عیب سے پاک۔
(۱۸)۔الرشید۔سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا، راستے پر ڈالنے والا، راہ دکھانے والا، ہدایت دینے والا، سب سے بھلا سب سے اچھا، ہدایت یافتہ، نیک، پرہیز گار۔
ان اسمائے الحسنیٰ کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ پاک کو اور بھی کئی نام سے پکارا جاتا ہے۔
الناظر۔دیکھنے والا، نگران، نگہبان، محافظ، منتظم۔
الفاطر۔فطرت پیدا کرنے والا، خالق کائنات، پہلی بار پیدا کرنے والا۔
البرہان۔روشن اور واضح۔
القائم۔باقی رہنے والا، قائم رہنے والا، حفاظت کرنے والا۔
الواقی۔بچانے والا، ہر قسم کے شر سے ٹوٹ پھوٹ سے بچانے والا۔
المنیر۔روشن کرنے والا، نور دینے والا، روشنی کا خالق، نور کا منبع۔
السامع۔سننے والا، سمع، دعا، اور ہر فریاد کو سننے والا۔
التام۔مکمل، جس میں کوئی نقص کوئی عیب نہ ہو۔
الابد۔جس کی کوئی انتہا نہیں، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
الشاکر۔شکر والا، تمام شکر گزاریوں کو قبول کرنے والا، شکر ادا کرنے کی توفیق وطاقت دینے والا۔
الاکرم۔شرف وبزرگی والا، ہر چیز پر اپنا کرم کرنے والا۔
الخلاق۔بہت بڑا خالق، پیدا کرنے والا، تخلیق کرنے والا۔
المثیب۔ثواب دینے والا، ہر نیکی اور دعا کو قبول کرنے والا۔
العالم۔تمام علم رکھنے والا، ہر شے کو پوری طرح جاننے والا، عالم مطلق۔
المولیٰ۔مددگار، احتیاج پوری کرنے والا، آقا، مالک، وہ ہستی جو اعانت ونصرت عطا کرے۔
ذوالمعارج۔عروج والا، بلندیوں والا۔
المبین۔پاس آنے والا، ہر شے اسی سے پیدا اور ظاہر ہے، وہ ذاتِ عالی جس کے ساتھ پہنچتی ہے۔
الالہ۔معبود حقیقی، لائق عبادت۔
الفرد۔ذاتِ واحد، لاشریک، منفرد۔
السریع۔انتہائی سرعت کے ساتھ تیزی سے تیار۔
المفضل۔فضل کرنے والا، افضل ذات۔
الملیک۔مالک، بادشاہ، بلاشرکت غیرے قابض۔
المعین۔مددگار، اعانت کرنے والا۔
الحاکم۔حکمت والا، اصل حاکم۔
الغالب۔برتر، چھایا ہوا، قابض، غلبہ کا مالک۔
الاعلیٰ۔ہر ایک سے برتر واعلیٰ، نہایت ہی بلند اور اعلیٰ۔
الحفی۔بہت مہربان، ساری کائنات پر مہربان۔

رزاق شاہد کوہلر

محمد یاسین صدیق

ملک کے نامور ادیب، ڈرامہ نگار، شاعر، رزاق شاہد کوہلر ادبی حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ ان کی کہانیاں نئے افق سمیت ملک کے بڑے ڈائجسٹوں میں (سب میں ہی چند کے سوا) تواتر کے ساتھ شائع ہو کر لاکھوں قارئین تک پہنچتی رہتی ہیں۔ آپ ایک روشن خیال ناول نگار، معروف ڈرامہ نگار تو ہیں ہی لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ منفرد لہجے کے شاعر بھی ہیں لیکن ادب کے ساتھ ساتھ اتھلیٹک، سوئمنگ اور گائیکی پر بھی کمال کی دسترس رکھتے ہیں۔

انہوں نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور اپنی زندگی کا پہلا بھرپور انٹرویو نئے افق کو دینے پر رضا مند ہوئے۔ ہمارے انٹرویوز پینل میں (شہباز اکبر الفت، ظفر علی، سرفراز قمر، عاصم سعید، قاری ابوبکر، نعمان عظیمی، عدیل عادی، یاسین صدیق اور یاسین نوناری، صداقت ساجد وغیرہ شامل ہیں جنھوں نے ان سے ہر طرح کے، ہر موضوع پر سوال کیے جن کے جناب رزاق شاہد کوہلر نے تسلی بخش جواب دیئے۔

(س) آپ کا اصل نام کیا ہے؟ آپ کا نام کس نے رکھا تھا؟ قلمی نام کیا ہے؟ اور کب سے ہے؟ اپنی تاریخ پیدائش، جائے پیدائش بتائیں؟ کیا والدین حیات ہیں؟ آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟ ان میں آپ کا نمبر کون سا ہے؟

(ج) میرا اصل نام عبدالرزاق کوہلر ہے۔ قلمی نام رزاق شاہد کوہلر ہے جو کہ پہلی بار 1999 میں پرنٹ میڈیا میں آیا تھا۔ میری تاریخ پیدائش 10 جنوری 1969 ہے اور جائے پیدائش یارک ڈیرہ اسماعیل خان۔ میری ماں میرے ہوش سنبھالنے سے قبل اللہ کو پیاری ہوگئی تاہم والد بہت عظیم مہربان اور علم دوست انسان تھے۔ میرے تین بھائی تین بہنیں ہیں میرا نمبر پہلا ہے کیونکہ میری ماں کی وفات کے بعد والد صاحب نے دوسری شادی کی تھی۔

(س) اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟

(ج) میرے جد امجد کا نام بخش تھا۔ جس کی منقولہ اراضی لگ بھگ دس ہزار کنال تھی۔ ہمارے بڑے انگریز کے دور سے گاؤں کے ملک اور نمبردار چلے آرہے ہیں۔ بہت جنگ جو اور سرکش تھے درجنوں کے حساب سے ان کے مزارعے ہوا کرتے تھے۔ جن کے حقوق کا وہ بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مگر جان بوجھ کر کی گئی غلطی پر انھیں سزا بھی دیتے تھے۔ میرا نانا انگریز کے دور کا پڑھا ہوا تھا۔

(س) آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ بچپن کے پسندیدہ اساتذہ کے نام؟ آپ کی تعلیم کیا ہے؟ اپنے اساتذہ بارے میں بتائیں جن کی تربیت، تعلیم، محبت توجہ نے آپ کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا؟

(ج) میٹرک تک اپنے گاؤں یارک سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان شہر میں پڑھتا رہا۔ بچپن کے اساتذہ میں سعد اللہ جان، خان حمید اللہ خان اور عبداللہ جان خان بہت شفیق اور عظیم لوگ تھے۔ پرائمری اور پھر ہائی اسکول میں اس بات سے بہت چڑتا تھا کہ مجھے اسکول کا اسمبلی کمانڈر کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ اصل میں میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا مگر مقدر میں جرنلزم کرنا لکھا تھا سو کر لیا۔ سعد اللہ جان اور حمید اللہ خان میرے ان اساتذہ میں سے ہیں جنہوں نے اپنی محنت سے مجھ جیسے کنکر کو ہیرا بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ دعا ہے کہ خدا ان کی عمر دراز کرے۔

(س) بچپن کا کوئی ایک ایسا واقعہ جسے یاد کریں تو آج بھی چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے؟
(ج) بہت سے واقعات ہیں۔ جواب بھی یاد ہیں۔ تاہم بچپن میں جب میں اسکول جانے سے کنی کتراتا تھا تو مجھے بھیڑ بکریاں چرانے بھیج دیا جاتا تھا۔ دو کزن بھی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ بہت اچھے دن گزر رہے تھے کہ ایک دن ریوڑ پر اچانک بھیڑیوں کی جوڑی نے حملہ کر دیا۔ اس واقعہ سے میں اس قدر خوفزدہ ہوا کہ دوسرے روز باقاعدگی سے اسکول جانے لگا۔
(س) آپ کی شخصیت سازی میں زیادہ کردار کس کا ہے والدہ یا والد کا؟ آپ کی پٹائی کا فریضہ کون سر انجام دیتا رہا؟
(ج) والدہ کا زیادہ ہاتھ ہے اور پٹائی بھی وہی انجام دیتی رہیں۔
(س) ہر کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ یہ کریڈٹ کس کو دیں گے؟
(ج) اپنی دوسری ماں کو جس نے مجھے پالا پوسا اور پڑھنے پر مجبور کیا۔ میری ماں میرے ہوش سنبھالنے سے قبل اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔
(س) آپ نے کتنی عمر سے ادب کا مطالعہ شروع کیا؟ سب سے پہلے کس بڑے ادیب کو پڑھا۔ اپنے چند پسندیدہ ناول اور کہانیوں کے اور چند پسندیدہ لکھاریوں کے نام بتائیں؟
(ج) تیسری یا چوتھی جماعت سے سسپنس و جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے لگ گیا تھا۔ جو میرا ایک کلاس فیلو جلال اسکول بیگ پھلانے کے لیے بیگ میں بھر لاتا تھا۔ ادباء میں سب سے پہلے نسیم حجازی اور نواب صاحب کو پڑھا۔ رسائل میں جاسوسی سسپنس، نئے افق اور اردو ڈائجسٹ کثرت سے پڑھے ہیں۔ پسندیدہ رائٹرز میں نسیم حجازی، نواب صاحب، قدرت اللہ شہاب، طاہر جاوید مغل، کاشف زبیر، ناصر ملک، علیم الحق حقی اور احمد اقبال صاحب شامل ہیں۔ میرے پسندیدہ ناولز میں جج اکبر، شب احتساب، نواب صاحب کے بھی ناولز، نسیم حجازی کے بھی تمام ناولز، عمیرہ کا پیر کامل اور لا حاصل وغیرہ احمد اقبال کا بھورے ماموں کالے خاں وغیرہ شامل ہیں۔
(س) سب سے پہلے آپ نے مکمل کون سا ناول یا کہانی پڑھی تھی جس نے بے حد متاثر کیا ہو؟
(ج) ابتدائی ناول نسیم حجازی کا مجاہد تھا۔ بچپن میں اسے پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔
(س) دس کتابوں کے نام بتائیں جو آپ کو ترتیب سے پسند ہوں ان میں اسلامی بکس شامل نہیں ہیں؟ آپ نے کون سی کتاب یا کہانی دوبارہ پڑھی ہو؟
(ج) اجل نامہ، شہاب نامہ، جج اکبر، پیر کامل، عبداللہ، مصحف، طلسم زادی، قلمی محبت، منہ ول کعبے شریف، قیصر و کسریٰ۔ میں نے نسیم حجازی کے ناول کئی بار پڑھے ہیں۔
(س) آپ کون کون سے میگزین ریگولر پڑھ رہے ہیں؟
(ج) خریدتا تقریباً ہر ماہ ہوں جاسوسی، سسپنس، نئے افق اور حکایت وغیرہ مگر پڑھتا بہت کم ہوں۔ دراصل میں کتابیں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔
(س) کس موضوع پر کہانیاں آپ کو پسند ہیں؟ کس موضوع پر آپ کے خیال میں زیادہ لکھا جا رہا ہے؟ کس موضوع پر نہیں لکھا جا رہا اور کیسا ادب وقت کی ضرورت ہے؟
(ج) مجھے معاشرت سائنس فکشن اور ایڈونچر کہانیاں بہت پسند ہیں۔ اس وقت رشتوں ناتوں کی تنزلی اور اسلام سے دوری پر لکھنا بہت ضروری ہے۔ ایک رائٹر سے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں سو وہ ان موضوعات پر لکھ کر معاشرے کو سدھارنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ انسانیت پر بہت کم لکھا گیا لہٰذا اس موضوع پر لکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے

اس کے علاوہ نچلے طبقے کے مسائل انھیں بھی ہائی لائیٹ کرنے کی ضرورت ہے۔
(س) کیا چیز متاثر کرتی ہے۔ خوبصورتی یا ذہانت اور پہلی ملاقات میں کیا چیز نوٹ کرتے ہیں؟
(ج) خوب صورتی اور انداز گفتگو نوٹ کرتا ہوں۔
(س) آپ نے جس کو چاہا تھا کیا شادی بھی اسی کے ساتھ ہوئی؟
(ج) نہیں ہوئی تھی مگر مجھے اس کا کوئی غم نہیں ہے۔ کیونکہ میری جس سے شادی ہوئی وہ اچھی شریک سفر ثابت ہوئی۔
(س) صورت حال کچھ یوں ہے کہ ایک لڑکی آپ پر فدا ہو چکی ہے۔ وہ آپ سے آپ کا فوٹو مانگ رہی ہے اور آپ دے نہیں رہے۔ بلا آخر وہ اپنے والد کو فوٹو لینے کے لیے بھیجتی ہے۔ کیا اپ اس کے والد کو فوٹو دیں گے یا انکار کریں گے؟
(ج) میں نے فوٹو دے دیا تھا اور غالباً ان معلومات کے پس پردہ میرا بھائی ہے۔
(س) شادی اپنوں یا غیروں میں ہوئی ہے۔؟
(ج) فرسٹ کزن ہے خالہ زاد اور چچا زاد بھی۔
(س) آپ ایک ادیب ہیں گھر میں کتابیں ہی کتابیں ہوتی ہوں گئیں۔ بیگم تو پریشان ہوتی ہوگی۔ کرتی بھی ہوں گی؟
(ج) وہ کتابوں سے بالکل پریشان نہیں ہوتی البتہ لڑکیوں کی کالز وغیرہ کو ناپسند کرتی ہے۔ ایک بار میں نے اپنی کہانی میں ایک ایسی لڑکی کا ذکر کر دیا جو رئیل لائف میں میرے ساتھ رہ چکی تھی۔ بیگم کو یہ بات بہت بری لگی اور پھر پتا نہیں اس نے کیا پڑھ کر پھونکا کہ وہ کہانی تا حال غیر مطبوعہ ہے۔
(س) آپ کے کتنے بچے ہیں نام اور عمر و کلاس بتائیں۔؟
(ج) دو بچے ہیں اوصاف شاہد عمر سات سال اور حور العین شاہد عمر تین سال اوصاف اول اعلیٰ میں پڑھتا ہے۔
(س) آپ کے کامیاب ادیب بننے میں آپ کی شریک سفر کا کتنا ہاتھ ہے اپنی شریک زندگی کے بارے میں مختصر تعارف دیں۔ کیا آپ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔
(ج) میری شریک حیات ہی مجھے لکھنے پر اکساتی ہے ورنہ میں تو بہت تساہل پسند ہوں۔ ازدواجی زندگی قابل رشک ہے۔
(س) پہلی محبت کے بعد دوسری یا تیسری بھی ہو سکتی ہے کہ نہیں؟
(ج) ہو سکتی ہے جیسے پٹھان سگریٹ چھوڑنے کے لیے نسوار کا سہارا لیتے ہیں۔
(س) گھر میں نرم مزاج ہیں یا پھر غصے کے تیز ہیں؟
(ج) غصے کا تیز ہوں مگر جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ویسے میں عملی زندگی میں مزاح پسند بھی بہت ہوں۔
(س) عشق تو کیا ہوگا؟ عشق کی تعریف کس طرح کریں گے؟
(ج) چھے سات کیے ہیں سب ناکام ہوئے سو عشق سے اب نہیں بنتی۔
(س) عشق و محبت کی تعریف کیا یہ ایک ہی ہیں یا الگ الگ؟
(ج) محبت کی دوسری سیڑھی ہے عشق۔
(س) محبت کرنا آسان ہے۔ نبھانا مشکل۔ میں بھی ناکام ہوا تھا۔ ایک بار میں نے محبت کی ناکامی کے اسباب لکھے تھے۔ آپ بھی اس ناکامی کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ آپ سے ناکامی کے سات اسباب پوچھے جائیں تو کیا

بتائیں گے۔

(ج) ناکامی کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ جن میں رنگ، قبیلہ، معاشرتی حیثیت، انسان کا اپنا کردار، سماج کی رکاوٹیں، رقیبوں کا حسد اور انا پرستی یہ سب محبت میں ناکامی کے عوامل ہیں۔

(س) محبت کا انجام کیا ہونا چاہیے؟

(ج) ٹریجڈی ورنہ محبت محبت نہیں رہتی۔

(س) آپ کا پہلا شعر کون سا تھا آپ کا اپنا شعر۔ آپ کی اس وقت عمر کیا تھی؟

(ج) پہلا شعر آٹھویں کلاس میں کہا تھا لگ بھگ چودہ سال کی عمر میں اور شعر تھا۔

دور رہنے سے تو ہوتی نہیں الفت کم
فاصلے پیار کو اور بڑھا دیتے ہیں

(س) شاعری میں آپ کا استاد کون ہے اپنے استاد کے دو شعر سنائیں جو آپ کو پسند ہوں؟۔

(ج) کسی بھی صنف میں باقاعدہ استاد کوئی نہیں ہے بس خداداد صلاحیت ہے جسے جنون مطالعہ نے نکھار دیا۔ تاہم شاعری میں روحانی طور پر محسن نقوی اور ساحر لدھیانوی کو استاد مانتا ہوں۔

دل وہ بازار ہے جان محسن جہاں
کھوٹے سکے بھی اکثر چلائے گئے

اور ساحر کا

ڈھونڈتی رہتی ہیں تخیل کی باہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

(س) آپ کو سینکڑوں اشعار یاد ہوں گے کوئی ایسا شعر سنائیں جو ہر دور میں آپ کو پسند رہا ہو۔

(ج) تجھ سے ملتا ہوں تو اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں
وقت کے پاؤں میں زنجیر میں ڈالوں کیسے

(س) آپ نے اب تک کتنی طبع زاد کہانیاں لکھی ہیں؟

(ج) سو سے زائد ہوں گی صحیح تعداد یاد نہیں ہے۔

(س) ہر کہانی کا ہیرو کوہ قاف کا شہزادہ ہوتا ہے۔ عام سا مرد جو زیادہ خوبصورت نہ ہو بہت کم کہانیوں میں ملتا ہے۔ آپ کی کہانیوں کے بھی ہیرو بڑے ہنڈسم ہیں ایسا ہی کیوں؟

(ج) ہم پڑھنے والوں کی نفسیات کے مطابق لکھتے ہیں۔ کالا کلوٹا بھدی ناک والا ہیرو کون پسند کرے گا۔ ہم تجربہ کر بھی لیں تو ناشر اور میگزین ایڈیٹر کو کون راضی کرے گا۔

(س) ہر کہانی میں ہوتا ہے کہ ہیروئن پریوں کے حسن کو مات دے رہی ہوتی ہے اس کی چال قیامت ہوتی ہے حسن ایسا کی ایمان ڈول جائیں سر ایسی لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں؟ کیا یہ لکھاری کی مجبوری ہے کہ قاری ایسا پڑھنا چاہتا ہے یا سب لکھاری لکیر کے فقیر ہیں یا کچھ اور وجہ ہے؟

(ج) قدرتی طور پر چونکہ ہر انسان خوبصورتی کا دلدادہ ہوتا ہے اس لیے ہمیں ایسی ہیروئن کا نقشہ کھینچنا پڑتا ہے جو قاری کے ذہن میں مجسم صورت اختیار کرلے۔ (خوبصورت لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں؟ یسین بھائی میرے خیال میں آپ شاید لڑکیوں کو غور سے نہیں دیکھتے)

(س) سر ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں ولن ہی ہیرو ہوتا ہے۔ وہ جو ظلم وستم کرتا ہے۔ اس کا بدلہ نہیں ملتا۔ ہیرو یا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جس کے ساتھ ظلم ہوا ہو وہ ایسے ہی دنیا سے سدھار جاتا ہے یہ تو زمینی حقیقت ہے۔ لیکن ہر کہانی میں جتنی بھی مشہور ہوئیں ہیرو ولن کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔

(ج) قاری اور فلم بین حقائق سے فرار اختیار کر کے کتاب پڑھتے اور فلم دیکھتے ہیں اگر اس پلیٹ فارم پر بھی ان کی محرومیوں کا ازالہ نہ ہو تو وہ جیتے جی مر جائے گا۔ کہانی اور فلم کا ہیرو در اصل قاری اور فلم بین کی محرومیوں کی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے جس میں ہیرو کی شکست ان سے برداشت نہیں ہوتی۔

(س) انداز بیاں منفرد ہو تو ایک لکھاری اپنا مقام بناتا ہے۔ لیکن یہ انداز بیاں میں کسی کا رنگ تو جھلکتا ہوگا۔ آپ کے انداز بیاں میں کس کا رنگ جھلکتا ہے۔

(ج) ویسے تو یہ بات قارئین بتا سکتے ہیں تاہم مجھے لگتا ہے میں لاشعوری طور پر گاہے گاہے انکل نواب کے انداز میں جملے لکھ جاتا ہوں مگر وہ جملے ہوتے خالص میری تخلیق ہیں۔

(س) تحریر میں فحاشی کس لیے شامل کی جاتی ہے کیا یہ آج کی مانگ ہے یا پھر آپ اسے ایک طرح کا مسالہ سمجھتے ہیں؟ بحیثیت مسلمان کیا آپ کا اس بات پر ایمان ہے کہ ایک ادیب جو کچھ لکھتا ہے، اس کا جواب اسے اللہ تعالیٰ کے حضور دینا ہوگا؟

(ج) میری تحریر میں سرے سے فحاشی ہوتی ہی نہیں۔ حتیٰ کہ ایک کہانی میں کسی عورت کا وجود ہی نہیں ہے۔ بالکل ہر اچھے اور برے عمل کا حساب کتاب ہوگا۔

(س) ہر کہانی یا ناول کے ہیرو کے کردار میں رائٹر اصل میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہے، لیکن دیکھا گیا ہے کہ حقیقی زندگی میں وہ ایسا نہیں ہوتا ایسا کیوں؟

(ج) مگر میں نے یہ تصور غلط ثابت کر دیا ہے۔ مجھے سٹوڈنٹ لائف میں ساتھی کبھی وحید مراد تو کبھی ایتابھ سے مماثل قرار دیتے تھے۔

(س) اردو فکشن میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کیوں ضروری ہے؟

(ج) اس لیے کہ چراغ تبھی جلتا ہے جب اس میں تیل پڑتا رہے نئے لکھنے والے بھی ادب کے چراغ میں تیل کے مانند ہیں۔

(س) نئے لکھاریوں اور پرانے قاریوں کو ایک ایک مشورہ جس پر عمل کر کے وہ اچھے لکھاری بن سکیں؟۔

(ج) نئے لکھاری مطالعے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں کہ مطالعے کا رآمد کوئی چیز نہیں ہے اور قاری کے لیے یہ مشورہ ہے کہ وہ ہر تحریر سے زندگی کا کوئی نہ کوئی سبق لے۔

(س) اردو فکشن کا کیا مستقبل نظر آ رہا ہے آپ کو جبکہ اردو فکشن کے بڑے بڑے نام نواب صاب کاشف زبیر اقبال کاظمی وغیرہ ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں؟

(ج) فکشن ان شاء اللہ یوں ہی چلتا رہے۔ یہ دنیا ہے یہاں ہر کسی کو مخصوص وقت دیا گیا ہے بقول شیکسپئر یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار ہر شخص اپنے حصے کا کردار ادا کرنے کے بعد پس پردہ چلا جاتا ہے۔ نیا آ جاتا ہے۔

(س) اردو ادب میں سرقہ پرانی روایت ہے۔ لوگ پہلے غزل کی زمین چرا لیتے تھے۔ خیال چرا لیتے تھے۔ آج کل پوری کی پوری غزل اڑا لیتے ہیں۔ اسی طرح نثر میں بھی پہلے مرکزی خیال چرایا جاتا تھا۔ ماحول چرایا جاتا تھا۔ کچھ فقرے چرائے جاتے تھے۔ آج کل بہت کچھ چرا لیا جاتا ہے۔ عموماً ترجمہ کہانیوں کے حوالے سے یہ شکایات زیادہ ہیں کہ ہم معنی الفاظ بدل دئے جاتے ہیں۔ اس ادبی سرقہ کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟ نیز آپ پر بھی کبھی سرقہ کا الزام لگا؟

(ج) مجھ پر بھی سرقہ کا الزام نہیں لگا۔تاہم میں سرقہ کا سخت مخالف ہوں۔شاعری میں صرف توارد روا ہے۔ جہاں تک انگریزی ادب کی بات ہے تو وہاں کسی کا ترجمہ چرا لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔بس تحریر کا متن بدل ڈالو۔گو کہ یہ آسان ہے مگر بددیانتی ہے۔متن بدل لیں مگر انداز تحریر بدلنا بہت مشکل ہے۔ہوسکتا ہے کچھ اس کام میں ماہر بھی ہوں۔

انداز بیاں انسپائریشن کے زمرے میں آتا ہے مگر ہے یہ کسی رائٹر کے لیے معیوب اور فقرے چرانا سرقہ ہے بے شک ان کا متن بدل دیا جائے۔ماحول لکھنے میں البتہ ممانعت نہیں ہے جیسے جلیل سیریز میں کاشف مرحوم کرتے رہے ہیں جلیل سیریز دراصل احمد اقبال سرکی بھورے ماموں کالے خاں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔خود میں نے سر احمد اقبال سے متاثر ہو کر راجو اور علن سیریز لکھی تھی جو نئے افق میں شائع ہوتی رہی۔

(س) اردو ادب میں تنقید ایک اصطلاح ہے۔جس میں کسی بھی تحریر کے محاسن و نقائص پر بحث کی جاتی ہے۔بہت کم رائٹر دیکھے ہیں جو کھلے دل سے تنقید برداشت کرتے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے؟

(ج) تنقید کے لیے ضروری ہے کہ ناقد کا علم رائٹر سے زیادہ ہو اور ناقد کو الفاظ برتنے کا ہنر آتا ہو۔ناقد اگر لٹھ مارنے والے انداز میں تنقید کرے گا تو کوئی رائٹر بھی برداشت نہیں کرے گا۔

(س) زندگی کا مقصد کیا ہے؟

(ج) دنیا دراصل ایک امتحان گاہ ہے اور زندگی وہ پرچہ ہے جسے ہر انسان نے اپنے انداز میں حل کرنا ہے۔جس کے مارکس مناسب آئیں گے وہ پاس جب کہ دوسرا فیل۔میرے نزدیک زندگی دوسروں کے کام آنے کا نام ہے ورنہ عمر تو جانوروں کی بھی بسر ہو ہی جاتی ہے۔

(س) سودا کا مشہور زمانہ شعر ہے۔سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا محبت کسی بھی رنگ روپ اور انداز میں ہوسکتی ہے مگر ہمارے ہاں محبت پر لکھنے والے محبت کو پاکیزگی سے مشروط کر دیتے ہیں۔جسم کی ہوس سے پاک محبت ہی سچی محبت

(ج) بہت اہم سوال ہے اس پر لکھنا چاہیے مگر وہی ازلی خوف آڑے آجاتا ہے کہ جنسیات کا ٹھپا لگ جائے گا اور لوگ کیا کہیں گے۔منٹو کو بھی تو بہت کچھ کہا گیا ہے مگر اس سے منٹو کے قد میں کمی نہیں آئی

(س) کس سیاسی جماعت سے آپ کا تعلق ہے اور کیوں ہے؟

(ج) کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں، تعلق کیوں نہیں کا جواب بقول ڈاکٹر بشیر بدر

میرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

(س) مسلمان دنیا میں تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہیں (دوسرے نمبر پر ہیں تعداد کے لحاظ سے یہ پرانی بات ہے) لیکن زوال (یافتہ) ہیں سب سے اہم سبب زوال کا۔

(ج) نااہل حکمران اور سہل پسند عوام

(س) کس چیز کو پسند نہیں کرتے۔؟

(ج) درست کیفیت تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہوگی البتہ اس کی مخلوقات سے زیادتی ہوتے میں نہیں دیکھ سکتا۔

(س) رائٹر کیا آج واقعی اپنی ذمہ داریاں صحیح سے نبھا رہے ہیں؟

(ج) یہاں کوئی بھی اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نہیں نبھا رہا۔

(س) آپ کو اپنی نگارشات میں سے کون سی کہانی یا ناول سب سے زیادہ پسند ہے؟

(ج) مٹی کا کھیل اور پر یت کی ریت
ریڈیو سے کب سے لنک ہے؟
نومبر 2006 سے
(س) آپ کے لکھے ہوئے کتنے ڈرامے اب تک آن ایئر ہو چکے ہیں؟
(ج) لگ بھگ پچاس ڈرامے ان میں سے بہت سے قومی نشریاتی رابطے سے بھی آن ائیر ہوئے۔
(س) پہلی کہانی جو آپ نے لکھی اس کا نام۔ کہاں شائع ہوئی۔ کیا اعزازیہ ملا تھا اس کا۔
پہلی کہانی بڑوں کے لیے مسٹری میگزین میں نومبر 2001 میں لکھی تھی جس کا عنوان تھا "وہ کون تھا" اور اعزازیہ میں نے لگ بھگ چھ سال کسی پرچے سے نہیں لیا۔
(س) سب سے زیادہ کس کہانی پر کس ڈائجسٹ کی طرف سے اعزازیہ ملا
(ج) جاسوسی سسپنس اور اردو ڈائجسٹ کی طرف سے سب سے زیادہ معاوضہ ملا اور مٹی کا کھیل کا بھی 50000 روپیا ملا تھا
(س) کوئی ایسا حادثہ جسے زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے؟
(ج) میرا آرمی میں چند سال جاب کرنا۔
(س) آپ خود ایک جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، جاگیرداری نظام کے خلاف کیسے لکھ لیتے ہیں؟ کیا یہ جرات مندی آپ کی اعلیٰ تعلیم اور وسیع مطالعہ کی مرہون منت ہے؟
(ج) تعلیم نے شعور کو بہت اجاگر کیا ہے اب باپ دادا کا زمانہ گیا ورنہ میرے نانا اور دادا جو کہ آپس میں بھائی بھی تھے گاوں میں کسی مرد کو ننگے سر نہیں پھرنے دیتے تھے۔
(س) آپ کی کہانیوں کا کوئی ایسا کردار جس میں آپ کی شخصیت کا عکس جھلکتا ہو؟
(ج) ریت کی دیوار کا عدنان حیدر
(س) دنیا بھر میں بہت سے رائٹر اپنی فلموں اور ڈراموں میں اداکاری کر چکے، کیا ہم یہ توقع رکھیں کہ آپ کو بھی کسی ڈرامے میں اداکاری کرتے ہوئے دیکھ سکیں گے؟
(ج) شاید دیکھ لیں ویسے بچپن میں مجھے اداکار بننے کا بہت شوق تھا۔
(س) کیا پاکستان میں فکشن رائٹرز کو اس کا جائز مقام حاصل ہے؟ کیا پذیرائی اور معاوضہ سے مطمئن ہیں؟
(ج) غیر مطمئن ہوں یہاں فکشن رائٹرز کو ابھی تک جائز مقام نہیں ملا اور معاوضہ محدود ے چند اداروں کے کوئی دیتا ہی نہیں۔
(س) سر ایک اہم سوال، آپ بہت صاف گو طبیعت کے مالک ہیں، لگی پٹی رکھے بغیر دو ٹوک بات کہنے کے عادی، اس صاف گوئی کی وجہ سے کبھی کوئی نقصان بھی اٹھانا پڑا؟
(ج) بہت زیادہ نقصان اٹھایا ہے اب بھی اٹھا رہا ہوں مگر میں لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک اچھی عادت سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ یہاں میں ایک مثال دوں گا کہ ایک شخص جو اپنے تئیں ادیب یا شاعر ہے مگر اس کی تحریر اور شاعری میں ہر قسم کی فنی خامیاں ہیں تو یہاں آپ کی تعریف اس سے دشمنی کے زمرے میں آئے گی
(س) بچوں کے ادب سے کوئی دلچسپی رہی؟ اگر کوئی پروڈکشن ہاؤس آپ سے بچوں کیلئے فلم یا ڈرامہ لکھوانے کا خواہش مند ہو تو آپ کا فیصلہ کیا ہوگا؟
(ج) تعاون کروں گا کیونکہ میری پہلی چند تحریریں بچوں کے لیے ہی تھیں۔

(س) کیا ایک مصروف فلمی مصنف اور ڈرامہ نگار بن جانا ہی کسی ادیب کی سب سے بڑی کامیابی ہے؟ آپ کے خیال میں ناول نگار بننا زیادہ آسان ہے یا ڈرامہ نگار؟ کیا وجہ ہے کہ ڈرامہ نگار کے برعکس ناول نگار کو آج بھی زیادہ شہرت اور پذیرائی ملتی ہے؟

(ج) دراصل فلم اور ڈرامے میں لوگ سارا کریڈٹ اداکاروں کو دے دیتے ہیں جب اسکرین پر ٹائٹل دکھایا جاتا ہے تو ناظرین مصنف کے نام پر کبھی توجہ نہیں دیتے۔۔ سو فلم اور ڈرامہ رائٹر پس پردہ ہی رہتا ہے۔ جب کہ کہانی یا ناول کی تخلیق میں چونکہ صرف مصنف ہی ہوتا ہے اس لیے قاری اس کی واہ واہ کرتے رہتے ہیں۔ میرے نزدیک ناول نگار بننا زیادہ آسان ہے۔

(س) پہلا ڈرامہ آن ایئر جانے پر کیا؟

(ج) بہت خوشی ہوئی تھی۔

(س) ڈرامہ کیلئے کردار تخلیق کرتے وقت ان کے حوالے سے اداکار آپ کے ذہن میں ابھر رہے ہوتے ہیں یا اداکار آپ کے اسکرپٹ کو اپنے انداز میں آگے بڑھاتے ہیں۔

(ج) اکثر مرکزی کردار کے لیے آرٹسٹ کو مدنظر رکھا جاتا ہے

(س) آپ نے اب تک کل کتنے ڈرامے لکھے۔ پہلا ڈرامہ کون سا تھا۔ آج کل کون سا لکھ رہے ہیں سب سے زیادہ پذیرائی کس ڈرامے کو ملی۔

(ج) جیسا کہ پہلے بتایا پچاس کے لگ بھگ ڈرامے لکھے ہیں۔ پہلا ڈرامہ احتساب تھا۔ اور اب جو لکھ رہا ہوں اس کا نام جال ہے۔ پذیرائی ویسے تو سبھی کو ملی مگر ”تعبیر“ اور ”لہورنگ“ کو بہت زیادہ ملی۔ تعبیر کو تو لڑکیوں کے کچھ اسکولوں میں چلایا بھی گیا تھا۔

(س) ڈرامہ لکھتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ آپ اپنے تجربہ کی روشنی میں بتائیں؟

(ج) ڈرامہ میں مکالمہ کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کرداروں میں ڈھل کر ڈرامہ اسکرپٹ لکھا جاتا ہے اور دوسرا اس میں احتیاط کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے یعنی ملک وقوم کے خلاف نہ ہو۔ میرے خیال میں یہ کہانی سے مشکل صنف ہے۔

(س) گولی چلاتے وقت کیا احساسات ہوتے ہیں؟

(ج) گولی چلانا یہاں مشاغل میں شامل ہے لہذا احساسات کوئی خاص نہیں ہو

(س) کبھی قتل کیا؟ یا کرنے کا خیال آیا؟

(ج) شادی سے قبل ایسا سوچتا تھا مگر اب اپنے بچوں کا سوچتا ہوں۔

(س) جیل میں رہنے کے احساس کو کیسے بیان کرینگے؟

(ج) جیل ایک الگ دنیا کا نام ہے جہاں پر سودا نقد و نقدی ہوتا ہے اور پیسے کو خدا سمجھا جاتا ہے۔ دولت مندوں کے لیے جیل عیاشی کا اڈہ اور مفلس کے لیے عقوبت خانہ ہے۔

(س) رونے کو بزدلی خیال کرتے ہیں یا بہادری؟

(ج) رونا صورت حال پہ ڈیپنڈ کرتا ہے اپنے لیے رونا میرے نزدیک بزدلی ہے۔ تاہم کسی دوسرے کے دکھ پر رونا انسانیت کی معراج ہے۔

(س) کوئی شخص جس کے خلوص پر آپ شک نہیں کر سکتے؟

(ج) میری خالہ اماں جو کہ میری ساس بھی ہیں

(س) لڑکپن کی کوئی سہانی یاد؟
(ج) لڑکپن کی سہانی یادیں پربت کی ریت میں
(س) آپ کے خاندان میں اور کوئی ادیب ہے۔ اگر ہے تو ان کا تعارف ایک سطر میں؟
(ج) میرا چھوٹا بھائی ریاض عاقب کوہلر ایک اچھا شاعر اور ناول نگار ہے۔ چار جلدوں میں دو ناول لکھ چکا ہے۔
(س) آپ کے سب سے اچھے۔ جن پر آپ کو فخر ہو تین ناول بتائیں۔ کہاں سے مل سکتے ہیں اڈریس۔
(ج) مٹی کا کھیل۔ درزنداں اور اجالوں کے نقیب یہ سب القریش پبلی کیشنز لاہور سے مل جائیں گے۔
(س) آپ کے لکھنے کا کیا عالم ہے؟
(ج) جب موڈ ہو تو تب لکھتا ہوں۔ زود نویس نہیں ہوں۔ طبیعت مائل نہ ہو تو نہیں لکھ سکتا۔
(س) کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ تخلیقی عمل کو آپ کس طرح بیان کرینگے؟
(ج) میں قارئین کی محبت میں لکھتا ہوں۔ اس لیے لکھنے کو کبھی کمائی کا ذریعہ نہیں سمجھا۔
تخلیق عمل نہیں ہے بلکہ ایک خداداد صلاحیت ہے جو اوپر والا چند مخصوص لوگوں کو ودیعت کرتا ہے۔
(س) جرم اور گناہ میں کیا فرق ہے کیا یہ ایک ہی سکے کے دو رخ نہیں
(ج) جرم کبھی کبھار حالات سے مجبور ہو کر بھی کیا جاتا ہے مگر گناہ صرف لذت نفس کے لیے کیا جاتا ہے۔
(س) اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک نماز روزے کے پابند بزرگ ٹریفک سگنل کو توڑ کر نکل جاتے ہیں آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے
(ج) بحیثیت قوم ہم میں صبر کا بہت فقدان ہے سو جلدی پہنچنے کی دھن میں ہم یہ قانون شکنی کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔
(س) خرابی حالات میں کس ساتھی نے کبھی ساتھ نہیں چھوڑا؟
(ج) اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے کہ میں کبھی کرائسس کا شکار نہیں ہوا۔
(س) آپ کے نزدیک جمہوریت کیسا نظام ہے؟ یہ اسلام سے متصادم ہے یا مماثل؟
(ج) اصل جمہوریت عین اسلام ہے مگر مغرب کی عطا کردہ جمہوریت غلامی کی ایک صورت ہے۔
(س) تعلیم انسان کو سنوارتی ہے یا بگاڑ بھی دیتی ہے؟
(ج) زیادہ کو سنوارتی ہے اکا دکا بگڑ بھی جاتے ہیں۔
(س) اسلام، تاریخ، معاشرہ، اخلاقی اوج پستی، خفیہ اداروں کی کارروائیوں، جاسوسی وغیرہ میں کس موضوع پر لکھیں گے؟
(ج) یہ سب موضوعات وقت کی اہم ضرورت ہیں مگر میں معاشرت اور ہسٹری پر لکھنا پسند کروں گا۔
(س) ایسا لمحہ جو چاہتے ہیں واپس آجائے؟
(ج) میرا بچپن کہ میں بہت ماضی پرست انسان ہوں
(س) کوئی ایسا لمحہ جب آپ نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا ہو؟
(ج) اپنی بہن زیب النساء کی وفات کا لمحہ
(س) نواب محی الدین سے آپ مل چکے ہیں ان کی یادیں باتیں؟
(ج) انکل نواب واقعی گریٹ انسان تھے ان کے ساتھ میری ملاقات یادگار رہی میری ایک کہانی پڑھ کر فرمانے لگے واہ بہت خوب کیا انداز تحریر ہے وہ میرے ایکشن مناظر کی بہت تعریف کرتے رہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار

رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے۔
(س) کبھی ترجمہ کیا کسی ناول کا۔اگر کرنا پڑے تو کس کا کریں گے؟۔
(ج) ویسے تو تراجم کے خلاف ہوں کیونکہ قاری فورا" چوری کا الزام لگا دیتے ہیں پشتو ادب سے ضرور کوئی ترجمہ کروں گا۔
(س) ابن صفی کیسا مصنف تھا؟ کبھی عمران سیریز پر لکھنے کا سوچا
(ج) سچ پوچھیں تو میں کبھی ابن صفی یا مظہر کلیم سے متاثر نہیں ہوا اور نہ ہی اس کردار پر لکھنے کا ارادہ ہے۔ جب بھی لکھوں گا اپنے کردار تخلیق کروں گا۔
(س) گر آپ سے کوئی قرض مانگے تو اسے کیا جواب دیتے ھیں؟ اگر کوء قرض واپس نا کر سکے تو کیا کرتے ھیں؟
(ج) اپنے علاقے کا ہو تو بخوشی دے دیتا ہوں مگر انجان لوگوں کو ٹال دیتا ہوں۔ مزید مہلت دے دیتا ہوں۔
(س) درزنداں ناول میں ہیرو اور ہیروین کے درمیان جو رابطہ (خواب کے ذریعے) دکھایا گیا ہے کیا یہ غیر حقیقی نہیں ہے
(ج) خوابوں کے بارے میں میں نے بہت پڑھا ہے آپ علامہ ابن سیرین کی تعبیر الرویا پڑھیں
(س) درزنداں میں ہیرو کا دوست بلکہ ہر ناول میں جیسا ہیرو کا دوست ہوتا ہے ایسے دوست حقیقی زندگی میں کیوں نظر نہیں آتے۔
(ج) ہاں حقیقی زندگی میں ایسے دوست بہت کم ہوتے ہیں مگر اصلاح معاشرے کے پیش نظر ہمیں ایسے دوست تخلیق کرنا پڑتے ہیں کہ شاید کوئی پڑھ کر دوستی کے مفہوم سے آگاہ ہو جائے۔
(س) مٹی کا کھیل، کے موسیٰ خان جیسا ولن جو کئی مقامات پر ہیرو سے زیادہ اچھا لگا کیا حقیقی زندگی میں ایسا کوئی شخص آپ کو نظر آیا۔
(ج) حقیقی زندگی میں ہمارے ہاں ایسے ولن پائے جاتے ہیں دراصل پختون کلچر کچھ الگ سا ہے
(س) کیدو ہمارے نزدیک پوری برادری میں واحد غیرت مند شخص تھا آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں
(ج) بجا فرمایا ہے پختون کلچر میں تو ایسے لوگ ہیرو کہلاتے ہیں
(س) بعض لکھاری اپنے ناول میں رومانوی / پیار بھرے لمحات کے بیان میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ (جناب ناصر ملک کے ناول مسافر میں میڈم شکیلہ کے پیار بھرے لمحات) جبکہ امجد جاوید صاحب کے ناول قلندر ذات کے شروع میں ایک میلے میں ناچنے والی کا آنکھوں دیکھا حال اس قدر صاف ستھرے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ تمام لوازمات بھی پورے ہو گئے اور برا بھی نہ لگا۔
(س) ان دونوں صورت حال میں اپ کی رائے کیا ہے؟
(ج) اتفاق سے یہ دونوں ناول میں نے نہیں پڑھے اس لیے کچھ کہنے سے قاصر ہوں تاہم ناصر ملک کی کئی مکمل کہانیاں پڑھی ہیں جنھوں نے مجھے انسپائر کیا مثلا "تماشائے عشق" ان کا ایک خوب صورت ناول ہے۔
(س) ماشا اللہ ایک گھر میں دو دو لکھاری اور وہ بھی منجھے ہوئے۔ لکھنے کے معاملے میں آپس میں کتنا کوارڈینیشن ہے؟
(ج) بہت تعاون ہے ایک دوسرے کی تحریریں ڈسکس کرتے رہتے ہیں مشورے بھی دیتے ہیں ایک دوسرے کو۔

(س) آپ کا کوئی ایسا ناول یا ڈرامہ جو کسی نے چرایا ہو؟

(ج) جاسوسی کے رنگ سے میری ایک کہانی کا مکمل پلاٹ چوری کر کے ایک نجی چینل نے ڈرامہ چلایا۔ یہ بات مجھے ایک بہت بڑے ادیب نے بتائی تھی۔ ادیب اور چینل کا نام نہیں لوں گا

(س) جھوٹ کب بولتے ہیں؟

(ج) تب جب سچ بولنے میں فساد کا اندیشہ ہو۔

(س) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ادیب کو گروپنگ میں نہیں پڑنا چاہیے خصوصاً فیس بک پر تو بالکل بھی نہیں آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

(ج) ٹھیک کہتے ہیں لوگ رائٹرز اپنے فینز کا دل رکھنے کے لیے ان سے گھل مل جاتے ہیں مگر بعد میں یہی فینز اس کے لیے سر درد بن جاتے ہیں۔

(س) کچھ لوگوں سے فیس بک پر آپ کی تلخ کلامی ہوئی۔ کیا فیس بک پر کسی سے الجھنا کسی ادیب کو زیب دیتا ہے؟

(ج) زیب تو نہیں دیتا مگر لوگ جب حد کراس کرنے لگیں تو پھر مجبوری کے عالم میں کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

(س) ادب کے ساتھ ساتھ اتھلیٹک، سوئمنگ، ہینڈ رائٹنگ اور گائیکی پر بھی کمال کی دسترس رکھتے ہیں۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟

(ج) یہ سب اوپر والے کا خصوصی کرم ہے کہ میں بہت اچھا تیراک مصور گلوکار ایتھلیٹ اور خوب صورت ہینڈ رائٹنگ کے ساتھ ساتھ بنٹے کھیلنے کا بھی ماہر ہوں۔

(س) گندم کٹائی سے کتنا ڈر لگتا ہے؟

(ج) گندم کٹائی دنیا کا کٹھن ترین کام ہے۔

(س) فیس بک کے درجنوں گروپس میں آپ ایڈ ہیں سب سے زیادہ کون سا گروپ پسند ہے۔ کسی کے ایڈمن ہیں؟

(ج) کسی بھی گروپ کا ایڈمن نہیں ہوں۔ ہر وہ گروپ جہاں ممبرز ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوں مجھے پسند ہیں۔ ہر گروپ میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ہر اس گروپ کو پسند کرتا ہوں جس کے ممبرز باشعور اور بااخلاق ہوں۔

(س) فیس بک پر جے ڈی پی کے مختلف گروپ یا دھڑے بنے ہوئے ہیں۔ ہر دھڑا خود کو صحیح سمجھتا ہے۔ آپ کے خیال میں اس دھڑے بندی کی وجہ کیا ہے اور اس دھڑے بندی کا ذمہ دار کون ہے؟؟؟ یاد رہے سیاسی بیان نہیں دینا۔ اپنا مشاہدہ پوری ایمانداری اور بغیر لگی لپٹی بتانا ہے۔

(ج) جے ڈی پی کے ان گروپس کے بارے میں نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہوگا۔ یہ سب ادارے کی ساکھ کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ اگر ادارے کے وفادار ہوتے تو ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوتے۔ سب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ ادارہ ان کی تعریف و تنقید سے نہیں بلکہ رائٹرز کی اہلیت کی وجہ سے چل رہا ہے۔ یہ چند سو لوگ جن میں سے آدھے سے زیادہ لوگ ڈائجسٹ خریدتے ہی نہیں ادارہ کا کیا بھلا و برا کر سکتے ہیں؟ کاش یہ بات ادارے کی سمجھ میں آجائے تو ان گروپس کی چھٹی ہو جائے۔

(س) آپ مستقبل میں سوشل میڈیا کو کہاں دیکھ رہے ہیں

(ج) آئندہ سوشل میڈیا کھانے پینے سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لے گا۔ شاید رسائل اور کتابیں بھی آن لائن

شائع ہونے لگیں۔ یہ میڈیا کچھ بھی ہو کتاب کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ میرے نزدیک وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں جو کتابوں سے منہ موڑ لیتی ہیں۔

(س) ہم فیس بک پر کوئی پوسٹ کیوں لگاتے ہیں۔

(ج)۔ پذیرائی اور داد کے لالچ میں۔

(س) آپ کے حوالہ سے اس ناچیز کا کچھ مشاہدہ ہے ہوسکتا ہے کہ میں غلط بھی ہوں۔ آپ کو اپنے فینز کا اس طرح سے خیال نہیں ہے۔ جس طرح باقی ادیب کرتے ہیں۔

(ج) میں وہ واحد رائٹر ہوں جو نا صرف فینز کی ہر کال سنتا ہوں بلکہ انھیں خود فون بھی کرتا رہتا ہوں کئی فینز کی اصلاح بھی کی ہے۔ انھیں اپنی تصنیفات بھی بھیجی ہیں۔

(س) ڈائجسٹس کا وہ معیار جو آج سے دس سال پہلے ہوتا تھا آج کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ آپ کے مطابق اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

(ج) اوریجنل رائٹرز کا فقدان۔ دراصل اب گاڈ گفٹڈ رائٹر کم اور پیسے اور شہرت کے طالب نام نہاد رائٹرز زیادہ ہیں۔ سو معیاری تخلیق اب کم کم ہی نظر آتی ہے۔

حساس نہ ہوں تو رائٹرز کیوں ہوں۔ یہی حساسیت تو انھیں عام لوگوں سے الگ کرتی ہے۔ آپ کو پتا ہے شاعروں میں ایک حس زائد ہوتی ہے جسے ذوق جمالیات کہتے ہیں۔

(س) آپ ادب کی وضاحت کیسے کریں گے مطلب کیا ہے ادب آپ کی نظر میں؟

(ج) ہر اچھی تحریر چاہے نثری ہو نظم یا غزل ہو میرے نزدیک ادب ہے مگر ہماری بدقسمتی کہ یہاں ادب کی درجہ بندی کر دی گئی ہے۔ نسیم حجازی سے لے کر نواب صاحب تک اس ملک میں کتنے ہی مایہ ناز لکھاری پیدا ہوئے جن میں سے بعض کی تحریریں غیر ملکی زبانوں میں بھی ٹرانسلیٹ کی گئیں مگر یہاں انھیں ادیب نہیں مانا گیا اس کے برعکس جو ادیب بنے پھرتے ہیں ان میں سے اکثر کی کتابیں میں نے فٹ پاتھوں پر ردی کے مول بکتے ہوئے دیکھیں۔ یہاں ڈائجسٹ رائٹرز کو یہ نام نہاد ادیب تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر عوام میں ڈائجسٹ رائٹرز ان سے کہیں زیادہ مقبول ہیں اردو ناول آج اگر زندہ ہے تو محض ان ڈائجسٹوں کی وجہ سے۔

(س) رائٹر کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں

(ج) پراپرٹی ڈیلنگ کا کام کرتا ہوں۔

(س) سر اب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب کون سی شائع ہوئی تھی اور کب یعنی کس سال شائع ہوئی تھی۔ کیا آپ اپنی سبھی کتابوں کے نام اور سن اشاعت بتانا پسند فرمائیں گے۔

(ج) نومبر 2006 میں میری پہلی دو کتابیں ایک ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ اجل کا روپ۔ اپرادھی۔ پھر 2011 میں دو مٹی کا کھیل دو جلد۔ اجالوں کے نقیب اور 2016 میں ایک درزنداں اور شعری مجموعہ اسیر زلف۔ جب کہ تین زیر طبع ہیں

(س) آپ اپنی سب سے بہترین دس کہانیوں یا ناولز بارے بالترتیب بتائیں جو سب سے زیادہ پاپولر ہوئے

(ج) ناولز میں "مٹی کا کھیل" "درزنداں" اور "اجالوں کے نقیب" کو قارئین کی طرف سے پسندیدگی کی سند ملی تینوں ناول ماہنامہ حکایت میں قسط وار چلتے رہے۔ کہانیوں میں "بھرم۔ نجات۔ ریت کی دیوار کو سراہا گیا یہ جاسوسی سسپنس میں لگی تھیں۔ نئے افق میں سنجیدہ موضوع پر آخری فیصلہ، ادھورا خواب، پورا سچ، سلسلہ گردش کی ابتدائی تین اقساط اور کامیڈی سیریز کی آخری درویش، ڈبل کراس اور آخری جوا وغیرہ کو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔

(س) جے ڈی پی گروپ سے آپ کے اختلافات اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ان اختلافات کی وجہ؟ اور مستقبل قریب یا بعید میں جے ڈی پی میں دوبارہ لکھنے کا ارادہ ہے کہ نہیں؟

(ج) یہ اختلافات دراصل جان بوجھ کر پیدا کیے گئے ہیں۔ اور رہ گئی ان کے لیے لکھنے کی بات تو یہ ادارے کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ کو آپریٹ کریں گے تو ٹھیک ورنہ یہاں رسائل کی کمی تو نہیں ہے۔

(س) کہانی لکھتے وقت آپ کن چیزوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

(ج) تیز رفتاری، سنسنی اور جان دار مکالمہ کے ساتھ املا کی درستی اور جھول کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہوں۔ میں تو کہانی کو اصلاح معاشرہ کا ایک کارآمد ذریعہ قرار دیتا ہوں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ کبھی پڑھنے والے جنوں بھوتوں کی کہانیاں پڑھتے تھے مگر اب ایسا نہیں وقت کے ساتھ تغیر قانون فطرت ہے اسی لیے تو کسی نے کہا ہے ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں اور دوسری بات یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا اب اس سے آگے کیا کر سکتا ہے۔ کتاب اور رسائل تو بدستور چھپ رہے ہیں۔

(س) معمولی سی بات پر آپ ناراض ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے مان جاتے ہیں جذبات جہاں کہنے کی ہوتی ہے وہاں نہیں کہتے۔ اور جس جگہ کہنے کی نہیں ہوتی وہاں کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے آپ جذباتی انسان ہیں۔ کیا یہ تجزیہ آپ کے بارے درست ہے اگر درست نہیں ہے تو درست کیا ہے

(ج) احساسات وجذبات کے بغیر انسان مٹی کا مادھو ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے کہ میں ایک جذباتی انسان ہوں۔ دراصل میں سچ کہنے اور سننے کا عادی ہوں۔ دوستی اور دشمنی دونوں کھل کر کرتا ہوں۔ منافقت مجھے نہیں آتی۔

(س) آپ نے بہت سے رسائل میں لکھا۔ مدیران سے واسطہ رہا۔ ہر ایک مدیر کے بارے میں بتائیں آپ نے انہیں کیسا پایا۔ خیال رہے آپ نے ان سب ایڈیٹرز کے بارے میں بتانا ہے جن کے ساتھ آپ ملے، کال کی، یا کسی بھی طرح رابطہ ہوا۔ یا اس رسالہ میں آپ کی کہانی شائع ہوئی ہو۔

(ج) حکایت کے مدیر عارف محمود سے بہت بار ملاقات ہوئی ہے مہمان نواز اور یار باش آدمی ہیں بھیجی گئی کہانی میں قطع برید بھی پوچھ کر کرتے ہیں۔ جے ڈی پی گروپ کے اقلیم علیم صاحب اور پرویز بلگرامی صاحب مستند رائٹرز کی بہت قدر کرتے ہیں ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی مگر ٹیلی فونک رابطہ بہت رہا جو کہ اب بھی بحال ہے۔ اسی طرح نئے افق کے عمران قریشی صاحب اور طاہر قریشی صاحب سے ٹیلی فونک رابطہ رہا دونوں صاحبان رائٹرز کے قدردان ہیں۔ مسٹری میگزین وائیڈ وچر کے ابراہیم غوری سے بھی رابطہ رہا ہے مگر میں نے ان کے لیے پانچ چھ کہانیاں ہی لکھی تھیں۔

(س) کہانی کو لکھتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اچھی کہانی کے ارکان کیا ہیں۔ کہانی میں سب سے اہم کیا ہے۔ کیا کہانی اپنے کتھارسس کے لیے لکھی جانی چاہئے یا ریڈر کی پسند کو دیکھنا چاہیے۔ یا کسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھنا مناسب ہے۔؟

(ج) سب سے پہلے تو انداز تحریر کی اہمیت ہے اس کے بعد کہانی میں اصلاح معاشرہ کے لیے کوئی سبق ہونا چاہیے۔ قاری کی پسند کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ اچھی کہانی لکھنے کے لیے انداز تحریر عمدہ منظر نگاری اور کردار نگاری خوب صورت اور مکالمہ دل چسپ ہونا چاہیے۔

(س) نئے افق میں آپ نے کتنی کہانیاں لکھیں۔ سب سے پہلی کب لکھی اور اس کا نام کیا تھا۔ اور اب تک آخری کب لکھی اور اس کا نام کیا تھا۔ اب کب کہانی نئے افق کو بھیج رہے ہیں۔

(ج) نئے افق میں میری پہلی کہانی کامیڈی سیریز کی "آخری درویش" تھی جو غالباً 2004 کے کسی مہینے میں لگی تھی۔ اس کے بعد نئے افق میں متواتر تین برس تک لکھتا رہا۔ سچ پوچھیں تو مجھے چمکانے میں نئے افق کا زیادہ ہاتھ ہے۔ نئے افق کے لیے آخری تحریر گردش کی تیسری قسط تھی جو بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر میں جاری نہ رکھ سکا۔ اب نئی تحریروں میں پریت کی ریت اور پہچان ان کو بھجوانے کا ارادہ ہے۔

(س) ماہ نامہ نئے افق کو کب سے پڑھنا شروع کیا۔ نئے افق میں سے سب پسندیدہ لکھاری کون ہے۔ نئے افق میں حال میں ہی تبدیلیاں کی گئی ہیں کیسی لگی آپ کو آنے والے دور میں نئے افق کو کس مقام پر دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت آپ کے خیال میں نئے افق کا کیا معیار ہے۔ نئے افق۔ ادب کے افق پر چھا جائے مالکان و مدیر کو کیا کرنا چاہئے۔

(ج) نئے افق کو اس دور سے پڑھنا شروع کیا تھا جب نیا رخ بھی اس کا ساتھی ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں راحت صاحب اور بہت سے نامی گرامی رائٹرز ان رسائل میں لکھا کرتے تھے۔ بروقت پورے ملک میں سپلائی ہوتے تھے۔ پھر نیا رخ بند ہو گیا۔ آہستہ آہستہ نئے افق پہ بھی زوال آنے لگا اور یہ سب انٹرنیٹ کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا کچھ منتظمین نے بھی سستی کا مظاہرہ کیا۔ مگر اب وہ دوبارہ سے کمر کس کر میدان میں آ گئے ہیں اور پرچہ پھر سے ترقی کی طرف گامزن ہو چکا ہے۔ مالکان اس میں سچ بیانیوں کا چیپٹر بند کر دیں دو بڑی کہانیاں ہر ماہ ابتدائی و آخری صفحات پہ اور دو اچھے سلسلے رسالے کو دوبارہ عروج پر لے جائیں گے۔ ویسے تو اب بھی پہلے سے معیار بہتر ہو گیا ہے مگر ابھی مزید بہتری کی گنجائش ہے۔ ان نئے لکھاریوں کو جگہ دیں جن میں لکھنے کی خداداد صلاحیت ہو محض فیس بک کے دانش ور نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے اگر مالکان اس طرف متوجہ ہوئے تو بہت جلد پورے ملک میں نئے افق کا طوطی بولے گا۔

(س) آپ کا اس سے پہلے کوئی انٹرویو کہیں شائع ہوا ہو

(ج) بہت بار کہا گیا ریڈیو والے اب بھی مصر ہیں مگر میں ایسی باتوں کا قائل ہی نہیں ہوں۔ سو پہلی بار یاسین صدیق بھائی اور ان کے انٹرویو پینل کی چاہت دیکھ کر شائع ہونے کے لیے انٹرویو دیا ہے تاہم آن لائن متعدد بار ہو چکا ہے۔

(س) میرے لکھاری بن جانے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

(ج) آپ محنت کریں تو اچھا لکھ سکتے ہیں مگر شرط ہے کہ مطالعہ بہت زیادہ کریں۔

(س) جناب رزاق شاہد کوہلر صاحب آپ کا شکریہ۔

(ج) آپ سب کا بھی شکریہ۔ جو مجھ ناچیز کو اس قابل سمجھا۔ اور اتنے علمی و ادبی سوال کیے۔

فلک شیر ملک

چناروں کی سرزمین وادی جنت نظیر کمشیر 47ء سے آگ و بارود کی زد میں ہے کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب وہاں سے خواتین، بچوں، نوجوانوں اور بوڑھے افراد کی شہادت کی خبریں نہ آتی ہوں، بھارتی فوج کے تمام تر مظالم کے باوجود ہر گزرتے دن کے ساتھ آزادی کی تحریک توانا ہوتی جارہی آزادی کے خواب کی تعبیر قریب سے قریب آتی جارہی ہے کشمیریوں کو یقین ہے کہ آزادی کا سورج اب طلوع ہونے کو ہے۔

آزادی کشمیر کے پس منظر میں ملک شمشیر کا خوب صورت ناول

چھن، چھن......
چھن، چھن......
چھم، چھم......

گھنگھروؤں اور بارش کی آواز سے عجیب سا سماں بندھا ہوا تھا۔ بارش لحہ بہ لحہ تیز ہو رہی تھی۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی سے بارش کا گدلا پانی جھرنے کی طرح بہہ کر نشیب کی طرف آ رہا تھا۔ ہوا کی شاں شاں سے دل دہل رہے تھے۔ بارش کی تیزی کے ساتھ ساتھ ملنگوں کے دھمال میں بھی تیزی آ رہی تھی۔ طاقچوں میں رکھے دیے ہوا کی تیزی سے مقابلے کے لیے نبرد آزما تھے۔ ٹمٹماتے ہوئے شعلے لحہ بھر کے لیے بجھنے لگتے اور پھر اچانک تیزی سے جلنے لگتے۔ اگر بتیوں اور عطر کی بھینی بھینی خوشبو سارے ماحول میں رچی ہوئی تھی۔

وہ مزار کی بائیں طرف بنے برآمدے کے پائے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سنگ مرمر سے بنے اس برآمدے میں اسے اپنا آپ ایک سیاہ داغ کی مانند لگ رہا تھا۔ کالا سیاہ، بدنما داغ بارش کی بوندوں سے وہ کافی حد تک بھیگ چکا تھا۔ اس نے نظر گھما کر اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھا۔ لوگوں کا ایک ہجوم برآمدے اور دائیں طرف والی بارہ دری میں سمٹا ہوا تھا۔ سامنے مزار کی پرشکوہ عمارت تھی۔ برآمدے اور بارہ دری سے ایک طرف داخلی دروازہ تھا۔ جس کے ساتھ دونوں طرف غسل خانے اور وضو خانے بنے ہوئے تھے۔ ڈھول کی تھاپ پہ جھومتے ہوئے مرید، گناہ بخشوانے کے آسان طریقے سے فیض اٹھا رہے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت گزر چکا تھا۔ گہرے سیاہ بادلوں کی وجہ سے وقت کا تعین کرنا مشکل تھا۔ نذرانے، نیاز اور لنگر کے لیے دیگیں لا کر برآمدے کے ایک کونے میں رکھی جانے لگیں۔ مریدین کا یہ منظر دیکھ کر دھمال میں تیزی آ گئی۔ سردی، بارش، مسلسل دھمال اور لنگر کی اشتعال انگیز خوشبو سے بھوک چمک اٹھی۔ سارے کن آکھیوں سے اپنی نظروں کی بھوک مٹانے لگے۔ ڈھول پہ چوٹ پڑی اور لوگ دھمال سے ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگے۔ لنگر بانٹنے والوں نے جلدی جلدی پلیٹیں، پراتیں اور ڈشیں بھرنی شروع کر دیں۔ اسٹیل کے گلاسوں اور جگوں کے ٹکرانے کی آوازوں کے ساتھ ایک طرف سے جگہ خالی کروا کر دریاں بچھا دی گئیں۔ دھمال عروج پر پہنچ چکا تھا۔ یا، ہو کی آوازوں کے ساتھ دمادم مست قلندر کے نعرے لگے اور پھر اچانک ہر طرف سناٹا پھیل گیا۔

یہ خاموشی چند ثانیے کے لیے تھی۔ اب لوگوں کے دریوں پہ بیٹھنے اور برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر پائے کے ساتھ ٹکا دیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے اس کا کندھا ہلایا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"اٹھو بابو! کھانا کھالو، کب سے یہاں بیٹھے ہو اور کب تک بیٹھے رہو گے؟" اس نے یہ کہتے ہوئے بریانی کی پرات اس کے سامنے رکھ دی اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔ جب اس نے کافی دیر تک کھانے کے لیے ہاتھ آگے نہ بڑھایا تو کھانا لانے والے آدمی نے اس کی سرخ اور وحشت ناک آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بابو! میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ پیٹ کا دوزخ بھی تو ساتھ ہے نا اور سارا فساد اسی کی وجہ سے برپا ہے۔ تو جوان ہو، پڑھے لکھے لگتے ہو، کیوں اس طرح جوانی برباد کرنے پہ تلے ہو۔ تین راتوں سے یہاں پڑے ہو۔ کھانا کھاؤ اور گھر جاؤ۔ شاباش۔" اس نے پرات وہاں رکھی اور اٹھ کر بارہ دری کی طرف چلا گیا۔ وہ دور جاتے اس شخص کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک داخلی دروازے سے ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر اس کے جسم میں بجلی کوندی اور وہ پائے کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا، مگر اس وقت تک وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اس نے برآمدے میں لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے دوڑ لگا دی۔ بیرونی دروازے کے باہر دو، تین سیڑھیاں تھیں۔ بھاگتے ہوئے وہ دروازے سے اندر آنے والے ایک شخص سے ٹکرا کر گر گیا۔ اسی اثناء میں وہ لڑکا اس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اس لڑکے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"چل یار اٹھ گھر چلیں، تین دن سے ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔"

ابھی باتوں کے دوران کھانا لانے والا شخص بھی ان کی طرف آ گیا۔ شاید اس نے دونوں کو بھاگتے دوڑتے ہو

ئے دیکھ لیا تھا۔قریب آکر اس نے آنے والے لڑکے کی طرف دیکھا اور بولا۔

''باؤ جی! لگتا ہے یہ آپ کے کوئی عزیز ہیں، تین راتوں سے یہاں پڑے ہیں۔اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔''

نووارد نے سر اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''جی حضور! یہ میرا دوست ہے، میں اسے ہی لینے آیا ہوں۔''

''میں نہیں جاؤں گا، میں یہیں رہوں گا۔'' کرنے والا نوجوان اب تک کھڑا ہو چکا تھا اور اس نے ناراضگی سے دونوں کو دیکھ کر کہا۔

نووارد نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور پاس کھڑے شخص سے ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''آپ اسے کچھ سمجھا سکتے ہیں تو سمجھائیں کہ یہ پاگل پن چھوڑے کیوں سب کو پریشان کر رہا ہے۔کچھ تو خیال کرئے، اپنا نہ سہی ہمارا ہی کر لے۔''

ان صاحب نے زیرلب مسکراتے ہوئے نوجوان کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اور نرم لہجے میں بولے۔

''کیوں میاں! کیوں تنگ کر رہے ہو ان کو، جاؤ چلے جاؤ اس کے ساتھ۔نوجوان ہو، ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے، ماں باپ پریشان ہوں گے۔وہ دور اب نہیں رہا جب لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں اور ویرانوں میں جا بیٹھتے تھے۔''

''یہی تو میں اسے سمجھا رہا ہوں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔مجاور اور راہب بننے کا، کچھ انسان کی سوشل لائف بھی ہوتی ہے۔ایسے اگر ویرانوں یا درگاہوں پہ جا بیٹھیں تو پھر تو ہو گیا کام۔''

آنے والے نے موبائل کے بٹن دباتے ہوئے ایک نظر دونوں کی طرف دیکھ کر رائے دی۔اب وہ کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔بارش کی شدت میں کچھ کمی آگئی تھی۔اس نے جیسے ہی موبائل کان سے اتارا، ایک کار زناٹے سے آکر دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس میں سے ایک اور لڑکا نکل کر ان کی طرف آیا۔

''اچھا جی اب ہمیں اجازت دیں۔نووارد نے پاس کھڑے شخص کی طرف دیکھ کر اجازت لی اور کرنے والے لڑکے کو بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا گاڑی کی طرف لے چلا۔

''چھوڑو مجھے میں نہیں جاؤں گا۔میں کہتا ہوں چھوڑو مجھے۔'' آنے والے دونوں نوجوانوں نے اس کے شور کو خاطر میں لائے بغیر اسے کھینچ کھانچ کر گاڑی تک لے گئے اور دروازہ کھول کر اسے گاڑی کے اندر دھکیلا۔باہر کھڑے لوگ اس منظر سے خوب لطف اٹھا رہے تھے۔گاڑی ایک زناٹے سے پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

......☆☆☆......

حمزہ، کھانے کے برتن اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو رخسانہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولیں۔

''حمزہ!''

''جی ممی!''

''ادھر آؤ میرے پاس، میں نے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' رخسانہ نے ہاتھ میں اٹھایا ہوا میگزین سامنے ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کہا۔جدید تراش خراش کا سوٹ پہنے، چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ اور سنہرے فریم کا چشمہ، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے اور ڈائمنڈز کی انگوٹھیاں، وہ کوئی تیس سال کی جوان عورت معلوم ہوتی تھیں۔بوتیکس چین کی مالک، ایک این جی او کی چیئر پرسن ہونے کے ناتے طبیعت میں شان بے نیازی تھی۔

''اچھا۔میں یہ برتن کچن میں رکھ کر آتا ہوں۔''

''تم ادھر آؤ۔میں فوزیہ سے کہتی ہوں وہ لے جائے گی۔'' رخسانہ کے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات ابھر کر مٹے تھے۔انھوں نے ملازمہ کو آواز دے کر برتن اٹھانے کا کہا۔حمزہ اس وقت تک سامنے والے صوفے پہ بیٹھ چکا تھا۔رخسانہ نے اپنے عزیز از جان بیٹے کی طرف دیکھا جو ریموٹ اٹھا کر ٹی وی پہ چینل سرچ کرنے میں مصروف تھا۔

''حمزہ! وٹ از دز؟'' رخسانہ نے غصے سے کہا۔

''یس مام وٹ ہیپنڈ؟''

''آئی سرپرائزڈ حمزہ کہ رخسانہ دراب کا بیٹا مزاروں کے چکر لگانے لگا ہے۔کس چیز کی کمی ہے تمھیں جو تم منتیں مانگنے ادھر پہنچ جاتے ہو؟'' رخسانہ نے کبھی بھی اپنے اکلوتے بیٹے سے اس طرح پوچھ گچھ نہ کی تھی۔مگر یہ جان کر کہ ان کا بیٹا پچھلے دو مہینوں سے مزاروں اور درگاہوں کے چکر لگا رہا ہے، وہ حقیقت میں مرنے والی ہو رہی تھیں۔

''ممی آپ سے یہ کس نے کہا کہ میں مزاروں اور درگاہوں کے چکر لگاتا ہوں، جس نے بھی کہا ہے جھوٹ کہا ہے۔'' حمزہ نے سفید جھوٹ بولا اور دل ہی دل میں شکایت لگانے والے کو گالیوں سے نوازا۔

''شٹ اپ حمزہ! تم ماں کو جھوٹا کر رہے ہو۔ صوفیہ کے ساتھ پچھلے بیس سالوں سے جان پہچان ہے میری۔ اس کے جھوٹ بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے خود تمہیں کسی لعل شاہ کے مزار کے باہر دیکھا۔ اس سے کچھ دور تمہاری کار بھی کھڑی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پہ میمونہ کا بیٹا نعمان بیٹھا تھا۔ اس نے خود اس سے پوچھا اور تم کہہ رہے ہو کہ تم نہیں گئے وہاں۔ اس سے پہلے بھی میری ایک دو کلائنٹس نے مجھے اس متعلق بتایا تھا مگر میں نے اگنور کر دیا تھا۔'' رخسانہ کو شدید غصہ آیا تھا۔ اور اس سے کہیں زیادہ شرمندگی کا سامنا انہیں صوفیہ کی طنزیہ باتوں پہ ہوا تھا۔

''ممی آپ نے صوفیہ آنٹی سے نہیں پوچھا کہ وہ مزاروں پہ کیا کرنے جاتی ہیں اور ممی اس سے پہلے تو آپ نے کبھی اس طرح انوسٹی گیشن نہیں کی تھی میرے سے۔ ایک دوسرے بندے کے کہنے پر آپ مجھے اس طرح ڈانٹ دیں گی۔ آئی کانٹ بلیو۔'' حمزہ نے درشتگی سے ماں کی طرف دیکھا اور ریموٹ کو غصے سے صوفے پر پٹخا۔

''تو پھر تم خود مجھے بتا دو کہ یہ کیا تماشا ہے؟'' رخسانہ کے لہجے سے گہری ناراضگی جھلک رہی تھی۔

''کوئی تماشا نہیں ہے ممی، ہم گروپ فیلوز ایک اسائنمنٹ پر کام کر رہے ہیں۔ ٹاپک ہی ایسا ہے کہ جانا پڑتا ہے۔'' حمزہ نے بات بناتے ہوئے جواب دیا حالانکہ رخسانہ کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے بیٹے کی بات پر یقین نہیں آ رہا۔

''کیا ٹاپک ہے؟'' رخسانہ نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''spirtual life روحانیت۔ بس اور کچھ نہیں۔ آج کل اسٹڈیز بھی ذرا سخت ہو گئی ہیں نا۔'' حمزہ نے جواب دیا۔

''کب ملی تھی تمہیں یہ اسائنمنٹ؟''

''لاسٹ فرائی ڈے (جمعہ) کو۔''

''that is enough Hamza'' اس سے زیادہ اور جھوٹ مت بولنا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم لاسٹ ویک میں ایک دن بھی یونیورسٹی نہیں گئے۔ تمہارے سر فاروق کا تمہارے پاپا کو فون آیا تھا، تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے وہ اور انھوں نے ہی تمہارے پاپا کو انفارم کیا کہ تم تو پورا ہفتہ یونیورسٹی نہیں آئے۔'' رخسانہ کی باتوں سے اس کا سر جھک گیا۔ اب وہ ماں کو کیا بتاتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس کے یوں چپ رہنے پر رخسانہ کو مزید طیش آ گیا۔

''کیا ایکٹیویٹیز ہیں تمہاری حمزہ۔ کیوں پریشان کر رہے ہو، تمہارے پاپا کو پتا چلا تو بہت ناراض ہوں گے اور میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں اگر تمہاری یہی حرکتیں جاری رہیں تو میں تمہیں فارن بھیج دوں گی۔ حد ہو گئی، حمزہ تم رخسانہ دراب کے بیٹے، جس کا سوسائٹی میں ایک نام ہے، ایک مقام ہے۔ لوگ رشک کرتے ہیں ہم پر اور تم ہو کہ نہ جانے کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ اسٹڈیز پر تمہارا فوکس نہیں ہے۔ تمہیں چاہیے کہ پڑھائی پر دھیان دو، اپنا مقام بناؤ۔ کل کو تمہاری شادی ہونی ہے۔ اگر تم یوں مزاروں کے رکھوالے بن بیٹھے تو پھر تو ہو گیا بیڑہ پار۔''

وہ جو اب تک خاموش بیٹھا تھا ایک دم سے بھڑک اٹھا۔

''مما میں کوئی فیڈر پینے والا بچہ نہیں ہوں، جس کے آپ مجھے ایک ایک بات بتائیں۔ نہ ہی میں اتنا بے وقوف ہوں کہ مزاروں پہ ہاتھ پاؤں باندھ کر فقیروں کے بھیس میں مانگنے بیٹھ جاؤں گا۔''

رخسانہ نے ہکا بکا اپنے بیٹے کو دیکھا جو کہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔

''اس کے پاپا سے بات کرنا پڑے گی، میں اور لوگوں کو مینرز اور ایٹی کیٹس سکھاتی ہوں۔ یہاں میرے بیٹے کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔'' رخسانہ نے پریشانی سے سوچا۔

☆☆☆

کمرے میں پاؤں رکھا تو سامنے گلاب کے پھولوں کی سیج سجی تھی۔ جہیز کا سامان پہلے ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ اس لیے کمرے میں ہر چیز نئی تھی۔ عین وسط میں ڈبل بیڈ، بیڈ کے سامنے صوفہ، دائیں دیوار کی جانب سنگھار میز اور اس کے ساتھ دو چینوٹی کرسیاں، کونے میں بڑا سا گلدان اور اس میں لگے مصنوعی پھول، دائیں جانب دروازے کے ساتھ

کپڑوں کی الماری اور ساتھ دو موڑھے۔ کارنس کے اوپر اکلوتا ڈنر سیٹ اور اسٹیل کے برتن آویزاں تھے۔ چھوٹی سی جنت، جو ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے۔ اس نے پھونک پھونک کر کمرے میں پاؤں رکھے کہ کہیں خواب ٹوٹ ہی نہ جائے۔ لڑکیاں بالیاں کافی دیر تک اس کے آس پاس بیٹھی رہیں اور وہ ان لمحوں سے خوشیوں کا عطر کشید کرتی رہی۔ اس نے ابھی تک اپنے شوہر کو نہ دیکھا تھا۔ کچھ لمحوں بعد اس کی ساس اماں نے کھانے کے برتن اٹھائے اور دودھ کا گلاس اسے پکڑا کر باہر نکل گئیں۔ بھوک تو بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی، اس لیے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی اور کمرے میں بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے دوپٹا سر کا کر گھونگھٹ گرالیا۔

''اسلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟'' ایک گمبھیر مردانہ آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے دھیرے سے اپنا سر ہلا کر ٹھیک ہونے کا جواب دیا۔ دولہا میاں نے اس کا کانپتا ہوا ہاتھ تھاما اور سونے کی انگوٹھی اس کی شہادت کی انگلی میں پہنا دی اور آہستہ سے گھونگھٹ پلٹ دیا۔ شرم سے اس کی نظریں نہ اٹھ سکیں۔ جب کافی دیر تک کوئی اور بات نہ ہوئی تو اس نے ایک نظر اپنے شوہر کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے وقت تھم گیا تھا۔ بالکل اسی طرح اس کا شوہر بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے خواب واقعی ٹوٹ گیا ہو اور اس کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں کھب گئی ہوں۔ شاید ایک، دو آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔ لب ہلے۔

''عارب'' اس کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ جلدی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ کیا ہوا تھا۔ اس کا ماضی منہ پھاڑے قہقہے لگاتا ہوا اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ ذلت اور بدنامی اس پر ہنسنے لگی تھی۔ جس چیز سے بچنے کے لیے وہ یہاں تک آئی تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی استقبال کے لیے آپہنچی تھی۔ ماں کو مرے ہوئے چار مہینے ہونے والے تھے۔ جب وہ اس محلے میں آئے تھے تب وہ فالج کا شکار تھی۔ یہاں ان کے ماضی سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ قسمت نے ساتھ دیا اس لیے محلے والے بھی اچھے نکلے۔ تعلقات بنے تو لوگ اس کی فرمانبرداری کی مثالیں دینے لگے۔ پھر ایک دن جو رات کو سوئے تو صبح ماں نہ اٹھی۔ محلے کی بزرگ عورتوں نے اس حال میں اس کا بہت ساتھ دیا۔ اس کے کہنے پر ایک بیوہ خاتون اس کے پاس رہنے لگیں۔ شہناز بھی اسی محلے میں مقیم تھیں۔ بیٹا بینک میں جاب کر رہا تھا اور ہر ماں کی طرح یہ بھی اپنے بیٹے کے سر سہرہ سجانے کی خواہشمند تھیں۔ کوئی قریبی رشتہ دار تو تھا نہیں اس لیے جب محلے میں نظر دوڑائی تو وہ انھیں پسند آگئی۔ بیٹے سے بات کی اور چٹ پٹ سارے معاملات طے کر کے منگنی کر دی۔ محلے کے سارے بزرگ ان کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے اور فیصلہ کیا کہ وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح رخصت کریں گے۔ اس لیے مخیر حضرات نے جہیز کا سارا سامان تیار کیا۔ اس کے علاوہ بھی جس سے جو ہو سکا اس نے اس نیک کام میں حصہ لیا۔ پھر آخر مایوں کا دن آپہنچا۔ ان لوگوں کا اتنا پیار و محبت دیکھ کر اس کی آنکھیں چھلکیں تو پھر وہ ہر بزرگ عورت کے گلے لگ کے ایسے روئی جیسے واقعی وہ اس کی سگی مائیں ہوں۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اب دکھ کے دن ختم ہو گئے مگر یہ کیا ہوا تھا۔ سارا خواب ختم ہو چکا تھا۔ عرش سے فرش پر آنے میں دیر ہی کتنی لگی تھی۔ اسے اپنا وجود برف کی سل کی طرح سخت اور ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے ایک نظر کمرے کے دروازے کو دیکھا، جنت اتنی جلدی اجڑنے والی تھی کیا۔ اس نے اٹھ کر کپڑوں والی الماری سے اوڑھنے والی چادر نکالی، بھاری کام والا دوپٹہ اتار کر بیڈ پر رکھا اور چادر اوڑھ لی۔ ابھی وہ دروازے کی طرف بڑھنے والی تھی کہ دروازہ کھلا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''کیا آج یوم حساب ہے؟ یا اللہ آج مجھے ذلت سے بچالیں۔'' دل میں دعا کرتے ہوئے وہ ادھر ہی کھڑی تھی۔ اس کا شوہر، اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کرنے والا تھا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خاموشی کے چند لمحے اور گزرے، کمرے میں موت کا سا سکوت طاری تھا۔

''فائزہ'' اس کا خوف کے مارے کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

''ادھر آؤ میرے پاس، کہاں جا رہی ہو آپ؟'' عارب اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا کہ نہ جانے وہ کیا کہنے

والا ہے۔

''فائزہ! مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کہوں اور کیا رہنے دوں۔ کہاں نہیں ڈھونڈا آپ لوگوں کو۔ میرا ضمیر مجھے ایک پل چین نہیں لینے دیتا۔ میں روز جی رہا ہوں، روز مر رہا ہوں، یہ سزا تو مجھے یہاں مل رہی ہے۔ نہ جانے آگے میرا کیا ہوگا۔'' وہ جو خوف میں مبتلا تھی اب حیرت سے اس اونچے لمبے مرد کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہمت مجتمع کی اور دل کی بات زبان پر لے آئی۔

''ماہ جبیں کہاں ہے؟''

اس کی اس بات پر عارب نے ایک گہرا سانس لیا تھا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولا۔

''میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ شاید وہ واپس چلی گئی ہوگی۔ میں ڈر کی وجہ سے وہ شہر چھوڑ کر ادھر آگیا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں پکڑا گیا تو پولیس مجھے نہیں چھوڑے گی۔ میں اپنی جاب بھی چھوڑ آیا تھا۔ یہاں آ کر ایک اور بینک میں جاب شروع کر دی۔ امی خوش ہو گئیں کہ ان کا بیٹا ان کی نظروں کے سامنے آگیا ہے۔ شدید ڈپریشن سے طبیعت خراب رہنے لگی۔ امی کو کسی نے مشورہ دیا کہ میری شادی کر دیں۔ خاندان میں کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔ انہی دنوں میں پتا چلا کہ آپ لوگ یہاں آگئے ہیں۔ امی کو معلوم ہوا کہ صرف ایک ماں بیٹی ہیں اور ماں کو فالج ہے۔ پھر وہ بھی محلے کی عورتوں کے ساتھ آپ کے گھر گئیں۔ بہت تعریفیں کرتی تھیں، پھر ایک دن پتا چلا کہ لڑکی کی ماں وفات پا گئی۔ کچھ دنوں بعد امی نے مجھ سے رشتے کی بات کی۔ میں نے امی کی خوشی کے لیے ہاں کر دی۔ امی نے مجھے بتایا بھی تھا کہ لڑکی کا نام فائزہ رانی ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ امی آپ لوگوں سے متعلق بات کر رہی ہیں۔'' یہاں تک کہنے کے بعد عارب نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنا چہرہ نمی سے تر محسوس ہوا۔ ماضی اتنا تکلیف دہ کیوں ہوتا ہے۔ اس کا جواب آج مل رہا تھا۔ اس نے عارب کی آنکھوں میں دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے پھر وہی سوال کر بیٹھی۔

''ماہ جبیں ہماری طرف نہیں آئی تھی، آپ کے پاس سے بھی چلی گئی تو پھر کہاں گئی؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟'' جواب ملا تھا۔

''پھر؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

''پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں مل کر اسے ڈھونڈیں۔ کیا ہم ماضی کو بھلا کر نئی زندگی کی شروعات کر سکتے ہیں۔ بالفرض اگر میرے ساتھ نہیں رہنا ہے تو بے شک مت رہنا، مگر ابھی مت جاؤ۔ امی کے لیے رک جاؤ، میں اپنے سے بڑھ کر کوشش کروں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔'' اس نے پرامید نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ فائزہ نے ایک نظر عارب کو دیکھا اور فیصلہ کرنے میں چند ثانیے لگے تھے۔

''میں یہیں رہوں گی آپ کے پاس، آپ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے۔''

عارب نے اس کی اس بات سے سکون کا سانس لیا تھا اور جھانک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں بہت سارے ستارے چمک رہے تھے۔

......☆☆☆......

گاڑی جی ٹی روڈ پر فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر حمزہ بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر نعمان بیٹھا تھا۔ نعمان اس کا قریبی رشتہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ کلاس فیلو بھی تھا۔ پریشانی دونوں کے چہروں سے جھلک رہی تھی۔ حمزہ نے سامنے موجود ٹرک کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی، اچانک ٹرک کے سامنے سے ایک کرولا کار نکل کر سامنے آگئی۔ بڑی مشکل سے اس نے گاڑی کو بروقت سنبھالا ورنہ بہت برا ایکسیڈنٹ ہو جاتا۔

''حمزہ! آرام سے یار، کیا کر رہے ہو؟'' نعمان نے حمزہ کی طرف دیکھا جو کہ ہونٹ بھینچے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''آخر اس وجی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں کر رہا ہے ایسے۔ مجھے تو اچھا بھلا سمجھ دار لگتا ہے۔ پھر بھی اس طرح کی حرکتیں کر رہا ہے۔ میری مانو تو اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانے کی ضرورت ہے اور اگر وہ نہیں مانتا تو اسے اپنے گھر واپس بھیج دو۔ تم جانتے ہو اس کی ان حرکتوں سے ہمیں کتنا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ ہماری اسٹڈی کا کتنا حرج ہو رہا ہے اور تو اور اپنی تو سوشل لائف بھی ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ یونو وہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے اب یونیورسٹی میں بھی مشہور ہو رہا ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ لوگ ہمیں بھی عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔''
نعمان نے الجھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔اس نے حمزہ کی خاموشی کو نظر انداز کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔
''قسم خدا کی۔اگر وہ واقعی ہی وہاں ہوا تو میں اسے صاف صاف کہہ دوں کہ بھائی اب اور برداشت نہیں ہو سکتا۔حد ہے اگلے مہینے ہمارے ایگزامز ہیں اور قسم سے جو ایک لفظ بھی پڑھا ہو،کم از کم میں دو سمسٹرز میں اچھے گریڈز کے بعد اب اپنی ساکھ خراب نہیں کر سکتا۔ویسے بھی ڈیڈی کا ارادہ ہے کہ میں اچھے گریڈ کے ساتھ فارن جاؤں۔گریڈ ہی اچھے نہ آئے تو کوئی فارن یونیورسٹی ہمیں خاک سلیکیٹ کرے گی۔''
اس کے لہجے میں مستقبل کے حوالے سے کافی اندیشے تھے۔
''کیا کروں یار! کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کروں۔مجھے تو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وجی اس طرح بی ہیو کرنے لگے گا۔کیسے اسے سمجھاؤں کہ بھول جائے سب کچھ۔''
حمزہ نے پریشانی سے جواب دیا اور ایکسیلیٹر کو مزید دبایا۔نعمان نے کچھ حیرت کے ساتھ اسے دیکھا اور رخ پھیر کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
''کیا مطلب؟ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے وہ ایسے کر رہا ہے۔پہلے تو تم نے کبھی نہیں بتایا۔''نعمان نے پوچھا۔
''کیا بتاؤں اب تمہیں،تم جانتے ہو نا کہ فرسٹ سمسٹر میں وجی کی شادی ہو گئی تھی۔''
''ہاں! یہ تو جانتا ہوں میں کہ فرسٹ سمسٹر میں ہی اس کی منگنی ہو گئی تھی۔شاید اپنی فرسٹ کزن سے،پھر تم نے ہی بتایا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ان حرکتوں کی وجہ سے تو بھابی بہت پریشان ہوتی ہوں گی۔''
''پریشان کہاں ہوتی ہوں گی وہ ساری پریشانیوں سے آزاد ہو گئی ہیں۔''
''مطلب۔''
''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔''
''کیا؟''
حمزہ کی بات سن کر تو چند لمحوں تک نعمان سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔وہ شاکڈ سا حمزہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔اسے ایک دم ہی بہت سی شرمندانہ کیفیت نے آگھیرا۔
''انہیں کیا ہوا تھا؟تم نے پہلے کبھی بتایا ہی نہیں۔وجی کی مدران لاء تو بہت دکھ میں ہوں گی۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔شاید وہ اس کی خالہ کی بیٹی تھیں۔''
''ہاں! وجی کی منگنی اپنی کزن سے ہوئی تھی۔مگر اس کی شادی اس سے نہیں ہوئی تھی۔''
''کیا مطلب منگنی ہوئی،شادی نہیں ہوئی۔شادی ہوئی اور اب بھابی دنیا میں نہیں۔کیا پہلیاں بجھوا رہے ہو،مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''نعمان نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔
''وجی نے یہاں ایک شہری لڑکی سے شادی کر لی تھی اور اس سے شادی پر میں نے اسے مجبور کیا تھا۔اس بات پر اس کی اماں بہت ناراض تھیں۔اس کی منگیتر کا بھی مطالبہ تھا کہ وہ جب تک اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے گا تب تک اس سے شادی نہیں کرے گی۔وجی کا خیال تھا کہ بھابی نے شاید میرے کہنے پر اس سے شادی کی ہے۔جب اس کی اماں کی ناراضگی حد سے بڑھ گئی تو اس نے اپنے بابا سے مشورہ لیا کہ اگر وہ بھابی کو طلاق دے تو اماں اس سے راضی ہو جائیں۔وہ نہیں جان پایا کہ اس کی ساری گفتگو بھابی نے سن لی ہے۔ان کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔اس لیے اس بات کو برداشت نہیں کر سکیں۔ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی۔''حمزہ نے بہت سی باتوں کو حذف کر کے نعمان کو تفصیل بتائی۔نعمان نے تاسف سے سارا ماجرا سنا تھا۔گاڑی میں گھمبیر خاموشی چھا گئی۔باہر ٹریفک کا اژدھام رواں تھا۔یہ علاقہ اس کے لیے انجانا تھا۔گاڑی اب ایک یوٹرن پر کھڑی تھی۔سامنے شاید کوئی بس اسٹینڈ تھا۔رکشے،ہائی ایس گاڑیاں،کوسٹر اور پشاوری بسیں اسٹاپ پر رکی ہوئی تھیں۔اسٹاپ کے ایک طرف پھلوں اور سبزیوں کی ریڑھیاں بڑی تعداد میں موجود تھیں۔عورتیں،بچے اور مرد ہاتھوں میں بہت سارے شاپر اور تھیلے لے کر گاڑیوں میں سوار ہو رہے تھے۔شاید عقب

میں کوئی بہت بڑا بازار تھا۔ یوٹرن کے سامنے جی ٹی روڈ سے ایک سڑک اسٹاپ کے ساتھ اندر کی طرف جارہی تھی اور ان کی کار اسی سڑک پر دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہی تھی۔ روڈ کے دائیں طرف فرنیچر کی بہت ساری ورکشاپس تھیں جبکہ بائیں طرف عدالتیں اور اس سے ملحقہ کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنر کے آفس کی عمارتیں تھیں۔ نعمان نے گردن موڑ کر باہر لگے ایک بورڈ کو دیکھا تھا۔

''حسن ابدال!! ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' نعمان نے اردگرد کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ تب تک حمزہ گاڑی کو سڑک کی سائیڈ پر روک چکا تھا۔ اس نے ایک بچے کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ بچہ اب قریب آ کر گاڑی کے شیشے کے سامنے کھڑا تھا۔

''پیرتخی سائیں کا دربار کدھر ہے؟'' حمزہ نے گاڑی کے شیشے کو تھوڑا نیچے کرکے پوچھا۔

''او سامنے پہاڑی اوتے ہوئے ہے، تسی اگر منت دا گھڑا اوپر لے کے جانڑاں اے تے دوسو روپے دے۔'' (وہ سامنے پہاڑی کے اوپر ہے، تم نے اگر منت کا گھڑا اوپر لے کر جانا ہے تو دوسو روپے دو۔)

خانہ بدوش بچے نے سامنے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کو راستہ کس طرف سے جاتا ہے؟''

بچے نے دوبارہ ہاتھ کے اشارے سے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا جو فرنیچر مارکیٹ سے اندر کی طرف جارہی تھی۔

''ہمارے ساتھ آجاؤ، ہم تم سے گھڑا ابھی نہیں اٹھوائیں گے اور تمہیں ڈھائی سو روپے دیں گے۔'' حمزہ کی بات سن کر بچے کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور جھٹ سے دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب گاڑی اس ذیلی سڑک پر دس، پندرہ منٹ چلنے کے بعد ایک گلی کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں لوگوں کی کافی چہل پہل تھی۔ دو گھروں کے درمیان سے ایک راستہ اوپر جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں سے بہت سے لوگ پہاڑی کے اوپر جارہے تھے اور بہت سے نیچے اتر رہے تھے۔ عورتیں پانی سے بھرے گھڑے سروں پہ رکھے پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ہوا میں خنکی تھی۔ حمزہ نے ایک نظر اوپر جاتے راستے کو دیکھا اور سر پیچھے موڑ کر عقب میں بیٹھے خانہ بدوش بچے سے مخاطب ہوا۔

''یہاں تو گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔ ایسے تو کوئی چوری نہ کرلے۔''

''نہ صاحب، تسی فکر کرن دی کوئی جرورت نہ ہووے ہے۔ کسی دکان دے سامنے کھڑی کردے تے مالک نوں کہہ جا، کوئی نہ لے کے جاوے ہے پھر۔'' حمزہ نے بچے کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کو ایک سائیڈ پہ (مالک کی اجازت سے) کپڑے کی دکانوں کے سامنے کھڑا کردیا۔ اب تینوں گاڑی سے اتر کر پہاڑی کے اوپر جانے والے راستے پر چل رہے تھے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' نعمان نے بچے سے پوچھا۔

''ماڑا؟''

''ہاں، تمہارا۔''

''ماڑا نام سانول ہووے ہے۔'' (میرا نام سانول ہے)

''کہاں رہتے ہو؟''

''پہاڑی دے پچھے بازار نال ہماری جگی ہووے۔'' (پہاڑی کے پیچھے بازار کے ساتھ ہماری جگی ہے) سانول نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ اب وہ زمین سے کافی اونچائی پر تھے۔ پہاڑ کے پتھریلے راستے پر جابجا پتھر پڑے تھے۔ حسن ابدال کا شہر نیچے رہ گیا تھا۔ اونچائی سے پورا شہر اور گھروں کی چھتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ سردی کے باوجود ان کی پیشانیوں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اب تینوں خاموشی سے اس طرح چل رہے تھے کہ سانول سب سے آگے تھا، اس کے پیچھے حمزہ اور آخر میں نعمان۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کے بعد اب ڈھلوانی راستے کے بجائے سامنے سیڑھیاں اوپر جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اب سانول رک گیا تھا، اس نے مڑ کر دونوں کو دیکھا اور بولا۔

''ہن تساں کو ماڑی جرورت نہیں ہووے، سیڑھیاں چڑھ، سامنے پہاڑی دا درمیان ہووے۔'' (اب تم لوگوں کو میری ضرورت نہیں، سیڑھیاں چڑھ کے سامنے پہاڑی کا درمیان ہے)

حمزہ نے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر والٹ نکالا اور

اسے ڈھائی سو روپے نکال کر دیے۔ سانول نے انھیں سلام کیا اور واپس مڑ گیا۔ حمزہ نے نعمان کو دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہا۔ دونوں کے چہروں سے تھکاوٹ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں اب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ یہ کوئی ساٹھ یا ستر کے لگ بھگ تھیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر پہاڑی کو کاٹ کر تھوڑا سا میدان سا بنا دیا گیا تھا۔ یہاں پر اکا دکا دکانیں نظر آ رہی تھیں، ایک طرف درخت کے نیچے چبوترے کے ساتھ پانی کے مٹکے رکھے تھے۔ چبوترا شاید نماز کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ مٹکے سے پانی نکال کر وضو کرنے میں مصروف تھے۔ پہاڑی کے نیچے جانب سے اکا دکا لوگ، جن میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی، اوپر چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا میں خنکی کافی زیادہ تھی۔ نیچے حسن ابدال کا پورا شہر نظر آ رہا تھا۔ اتنی اونچائی سے لوگ ننھے منے سے دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے بھی مٹکے سے پانی پیا اور وضو کر کے نماز میں شریک ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کے وہیں چبوترے پر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ نمازیوں کی اسی جگہ پر مختلف چیزوں کی عارضی دکانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک، دو کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھابے تھے جو جھونپڑوں کی طرح، سر کنڈوں سے بنے ہوئے تھے۔ دھوپ کی تمازت بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ پہاڑی پر جا بجا جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جن پر جامنی رنگ کے پھول ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک بزرگ ہاتھ میں چینک اٹھائے ان کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ چہرے پر داڑھی، سر پر سفید ٹوپی، گلے میں رومال ڈالے وہ باوقار انداز سے ان کے پاس آ کر چبوترے پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے چائے پیالی میں انڈیلی اور ان کی طرف بڑھائی۔ حمزہ نے نعمان کو چائے کی پیالی پکڑائی اور دوسری خود لے کر جلدی جلدی پینے لگا۔

"آرام سے بیٹا! چائے گرم ہے۔ منہ جل جائے گا۔"

بزرگ نے اس کی عجلت پر اسے ٹوکا۔ حمزہ نے کچھ شرمندہ سے انداز میں ان کی جانب دیکھا اور انھیں اپنی طرف گہری نظروں سے متوجہ پا کر نظریں جھکا لیں۔ بزرگ نے دھیرے سے مسکرا کر اس کی شرمندگی کے انداز کو دیکھا اور پھر بولے۔

"ویسے پوچھنا مناسب تو نہیں لگ رہا، مگر پھر بھی پوچھوں گا کہ آپ دونوں اس طرف کہاں گھوم رہے ہو۔ پہلے آپ دونوں کو علاقے میں کبھی نہیں دیکھا۔ سیر سپاٹے پر آئے ہو یا پھر ویسے ہی۔"

حمزہ نے ان کی بات سن کر چائے کی پیالی نیچے چٹان پر بچھی چٹائی کے اوپر رکھی اور کہا۔

"سیر سپاٹے کی غرض سے تو نہیں آئے۔ کسی شخص کی تلاش میں آئے ہیں۔ ہمارا ایک دوست ہے اس کا ذہنی توازن خراب ہے۔" تفصیل بتانے کا وقت نہیں تھا، اس لیے اس نے جلدی جلدی بات کو کور کیا۔ بزرگ نے دھیرے سے سر ہلایا جیسے ساری بات سمجھ گئے ہوں۔ نعمان نے ان کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

"بہت لوگ آتے ہوں گے یہاں منت ماننے۔"

"ہاں! بہت آتے ہیں۔ مگر خدا تو ہر جگہ سنتا ہے۔ اس مشقت کے بغیر بھی۔" بزرگ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ان کی بات پر حمزہ اپنے آپ کو چپ نہ رکھ سکا اور فوراً بولا۔

"آپ کا اگر یہ موقف ہے تو پھر آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" بزرگ کے چہرے سے ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ غائب ہوئی۔ مگر فوراً اس سے گہری مسکراہٹ ان کے چہرے پر آ گئی۔

"بیٹا! ہم توحید کی دعوت کے لیے یہاں بیٹھے ہیں۔ لوگوں کو یہ سمجھانے کہ حقیقی حاجت روا تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو واحد و لاشریک ہے۔ سارے جہاں کا پالنے والا ہے۔ شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ اللہ والوں سے محبت اچھی بات ہے۔ مگر میرے بچو! افسوس کہ کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں نے دین میں نئی نئی باتیں نکال لی ہیں۔ ہم تو بیٹا! ان سنگلاخ چٹانوں پر اللہ کی اذان بلند کرنے اور نماز قائم کرنے بیٹھے ہیں۔" ان دونوں نے ان کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا۔

"تو ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم درست راستے پر ہیں یا غلط پر؟" نعمان نے دلچسپی سے سوال کیا۔

"آپ نے سورۃ البقرہ کی پہلی آیات کا ترجمہ پڑھا ہو گا۔" بزرگ چند ثانیے خاموش رہے اور پھر سلسلہ کلام

شروع کیا۔

"شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان، رحم کرنے والا ہے۔ الم (۱) یہ اللہ کی کتاب ہے، نہیں کوئی شک اس (کے کتاب الٰہی ہونے) میں، ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔ (۲) جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز اور اس میں سے جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔ (۳) اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو نازل کیا گیا تم پر اور اس پر جو نازل کیا گیا تم سے پہلے اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں۔ (۴) یہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے رب کی اور یہی ہیں فلاح پانے والے (۵)" سورۃ البقرہ کی پہلی پانچ آیات کے ترجمے میں نعمان کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ بزرگ اب پرسکون خاموشی سے ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ حمزہ نے ان سے اجازت چاہی تو دھیرے سے مسکرا کر بولے۔

"جس کی تلاش میں آئے ہو وہ تو یہاں سے جا چکا ہے۔ بڑا ہی ناسمجھ ہے عشق خدا کو چھوڑ کر عشق مجازی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا کی تمام محبتوں کو زوال ہے، سوائے خدا کی محبت کے۔ آیا تھا یہاں بھی، میں نے اپنی سی کوشش کی ہے اسے سمجھانے کی۔ اب ان شاء اللہ سمجھ جائے گا۔ اپنے بازو پر بھروسے کے ساتھ ساتھ خدا پر کامل یقین کا ہونا بھی لازمی ہے میرے بچو! ہوتا وہی ہے جو اس ذات کی مرضی ہوتی ہے۔ وہی انسان کے لیے بہتر ہوتا ہے، جو وہ چاہتا ہے۔"

دونوں حیرانگی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کس کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا اور چبوترے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں کے درمیان ایک گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ذہنوں میں سورۃ البقرہ کی آیات کا ترجمہ گونج رہا تھا۔

"الم (۱) یہ اللہ کی کتاب ہے، نہیں کوئی شک اس (کے کتاب الٰہی ہونے) میں، ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔ (۲) جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز اور اس میں سے جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔ (۳) اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو نازل کیا گیا تم پر اور اس پر جو نازل کیا گیا تم سے پہلے، اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں۔ (۴) یہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے رب کی اور یہی ہیں فلاح پانے والے (۵)"

......☆☆☆......

وہ اس وقت سرینگر اور بارہ مولا کے درمیان پہاڑی راستے پر سفر کر رہے تھے۔ رات کا سناٹا ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا اور کسی بھی لمحے بارش شروع ہو سکتی تھی۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ایک آگے اور باقی تین پیچھے سفر کر رہے تھے۔ ان کے منہ خاموش تھے، مگر وہ چاروں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو سن رہے تھے۔ زبانوں پر آیات کریمہ کا ورد جاری تھا۔ ذرا سی آہٹ پر وہ رک کر اپنے ماحول کا جائزہ لیتے اور پھر چلنے لگتے۔ دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، بھارتی چوکیوں پر سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ مگر قدرت ہمیشہ نیک نیت لوگوں کا ساتھ دیتی ہے۔ سردی کی شدت سے صبح سے ہر طرف دھند کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ اندھیرے اور دھند نے ملکر رات کو مزید گہرا کر دیا تھا اور نہ سرینگر کے علاقے میں کوئی حرکت بھارتی فوج سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

ان چاروں کا مقصد ایک ہی تھا۔ وہ یہ کہ بارہ مولا کے علاقے میں موجود اسلحہ ڈپو کو کسی طرح تباہ کر دیا جائے۔ وہ چاروں کشمیری نہیں تھے، مگر مسلمان ضرور تھے۔ ایک وقت تھا کہ جب چاروں اپنی اپنی زندگی میں مگن تھے۔ مگر چاروں کی زندگی میں آنے والے "ٹرننگ پوائنٹ" نے انہیں یکجا کر دیا تھا۔ چاروں کا موقف ایک تھا، یہی کہ آج نصف صدی سے اوپر ہو جانے کے بعد بھی کشمیر پر بھارت کا غیر قانونی تسلط قائم ہے۔ اگر پوری دنیا میں کوئی مظلوم ہے تو وہ مسلمان ہے، چاہے وہ فلسطین کا مسلمان ہے یا افغانستان کا، عراق کا مسلمان ہے یا شام اور مصر کا۔ صورت حال ہر طرف ایک جیسی ہے۔ یہ انہی افراد میں سے چار افراد تھے کہ جن میں سے تین نے اپنی آدھی زندگی انگلش میڈیم اور مشنری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے گزاری تھی اور جہاں انہیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ مسلمان انتہا درجے کا ظالم ہے۔ اسلام کی سزائیں ہیومن رائٹس کی منافی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ تھا کہ جس نے میٹرک میں، اپنی

اسلامیات کی نصابی کتاب میں سورۃ الانفال اور سورۃ الاحزاب کو ترجمہ کے ساتھ پڑھا تھا اور اس میں موجود جہاد سے متعلق آیات اس کے ضمیر کو ہمیشہ جھنجوڑتی تھیں۔ وہ ہمیشہ سوچتا تھا کہ جب اس کا رب یہ کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے تو پھر وہ سارے کیوں ان سے دوستی اور رشتے بڑھانے کے خواہاں ہیں۔ ان چاروں میں سے ایک وہ تھا، جس نے مشنری اسکولوں سے پڑھ کر سودی نظام کو بڑھانے میں اپنی صلاحیتیں لگائی تھیں اور اس کی ماں، جو سارا سارا دن لوگوں کے کپڑے سی کر اپنے بیٹے کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہی تھی وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ بڑے ہو کر اس کا بیٹا، خدا اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ بلند کرنے والا تھا۔ ان میں سے تیسرا وہ تھا جو پاکستان کی امیر ترین سوسائٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے فیصلے کو سن کر اس کے خاندان میں ایک بھونچال آ گیا تھا۔ اس کے والدین اور اس کے رشتہ دار مسلسل اسے سمجھاتے رہے تھے کہ وہ ساری دنیا میں امن قائم کرنے کا ٹھیکیدار نہیں ہے۔ اسے اپنے فیصلے سے پھیرنے پر ہر قسم کے لالچ اور سختی سے کام لیا گیا تھا۔ ان میں سے چوتھا وہ تھا کہ جو ان نام نہاد مسلمانوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا کہ جو ملک میں تخریب کاری میں ملوث تھے۔ ایک دن جب وہ جمعہ کے اجتماع میں خودکش دھماکا کرنے جا رہا تھا تو اس کی ملاقات اس گروپ کے امیر سے ہو گئی۔ کئی دن اور راتوں کی مسلسل مشقت سے وہ اسے سمجھانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ چاروں ایک خفیہ ایجنسی سے متعلق تھے، مگر جس مشن پر یہ اب نکلے تھے یہ ایک غیر سرکاری مشن تھا۔ ان ساروں کا مقصد اب ایک ہی تھا کہ اس جنت سے ان مشرکوں کو نکال باہر کیا جائے جو خدا نے زمین پر بنائی تھی اور جسے ایک نواب نے پیسے کے لالچ میں مشرکوں کے ہاتھوں بیچا تھا۔

......☆☆☆......

کمرے میں اس وقت کرنل شنکر اور کیپٹن دلیپ دونوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ میز کے اوپر جبرانڈی کی دو، تین بوتلیں دھری تھیں۔ کرنل شنکر کی آنکھوں میں شب خوابی کی وجہ سے سرخی اتری ہوئی تھی۔ وہ بار بار غصے سے مٹھیاں بھینچ کر سامنے ٹیبل کے اوپر مارتا۔ کیپٹن دلیپ البتہ خاموش بیٹھا ہوا تھا اور بار بار کن انکھیوں سے کرنل کی جانب دیکھ رہا تھا۔ چند ثانیے بعد کرنل کی آواز کمرے میں گونجی۔

''کرنل چوپڑا کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے خلاف بے ضابطگی کی رپورٹ کرے۔ ہم نے تو ہمیشہ اس کی خیر خواہی کی بات کی ہے۔ اب وقت آیا ہے کہ اس پاپی کا سر نیچا کیا جائے۔ اس کے کیریئر کا اب انت (ختم) ہو گا۔''

''مجھے تو یقین نہیں آتا کہ کرنل چوپڑا نے آپ کے خلاف رپورٹ پیش کی ہے۔ اب ہمیں بھی کوئی ایسا مشن پورا کرنے پڑے گا، جس سے ہمارا ساکھ میں اضافہ ہو۔'' کیپٹن دلیپ نے دھیرے سے جلتی پر تیل ڈالا۔

کرنل شنکر نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور پھر ٹیلی فون اٹھا کر ایک سپاہی کو ٹرانسمیٹر لانے کا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لانگ رینج کا ٹرانسمیٹر تھا۔ جب وہ کمرے سے نکل گیا تو کرنل نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور پھر ٹرانسمیٹر سے غلاف اتار کر فریکوئنسی سیٹ کی اور ٹوں ٹوں کی آواز کے بعد دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔

''ہیلو، ہیلو۔ اے۔ آر اسپیکنگ اوور۔''

کرنل شنکر نے آواز سن کر بٹن دبایا اور بولا۔

''ہیلو۔ سر کے۔ ایس سپیکنگ۔ اوور''

''یس سر!!''

''کیا رپورٹ ہے۔ کے۔ سی کے بارے میں۔ جلدی بتاؤ'' کرنل شنکر نے کرنل چوپڑا کے متعلق پوچھا۔

''سر! یہاں ایک مشن کی تیاری کی جا رہی ہے۔ رپورٹ ملی ہے کہ بارہ کے پاس ایک گودام میں غیر ملکی اجناس کی کھیپ آ رہی ہے۔ کے۔ سی رجمنٹ وہاں پر چھاپہ مارنے کی تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ اجناس کی برآمدگی سے کے۔ سی کی ترقی میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ اوور'' کرنل نے بات سن کر دھیرے سے سر ہلایا اور پھر بولا۔

''کھیپ کی لوکیشن بتاؤ۔ اوور''

''کھیپ میں چار اقسام کے پھل ہیں۔ یہ بارہ کے پاس موجود کسی گودام میں پہنچائی جا رہی ہے اور کے۔ سی کا ارادہ ہے کہ انہیں پرانے کنوئیں کے پاس کہیں جا لیں اور

ان کا مزہ لے سکیں۔کھیپ تقریباً صبح ہونے سے پہلے بارہ پہنچے گی۔اوور''

''ہم ٹھیک ہے۔ہم وہاں پہلے پہنچ جائیں گے۔اوور''
کیپٹن دلیپ چپ چاپ اس کوڈ ورڈنگ کو سنتا رہا۔پھر جب کرنل نے اوور کہہ کر جب ٹرانسمیٹر اٹھا کر الماری میں رکھا تو کیپٹن دلیپ نے پوچھا۔

''سر کیا کوئی آتنگ وادی آرہے ہیں کیا؟''

''ہاں !بارہ مولا کے پاس ان کا کوئی ٹھکانا ہے۔باوجود کوشش کے ہم اس کا پتا نہیں چلا سکے۔کرنل چوپڑا بھی ان کو پکڑنے کی کوشش کرے گا مگر ہمیں اس سے پہلے وہاں ریڈ کرنا ہوگا۔تاکہ گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کر سکیں۔تم کرنل گپتا کو کہو کہ ریڈ کی تیاری کرے،مگر تیاری ساری خفیہ انداز میں ہونی چاہیے۔''

''او۔کے سر جیسے آپ کا حکم۔''کرنل دلیپ نے سر ہلایا اور آفس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔کرنل شنکر نے جبرانڈی کی بوتل اٹھا کر منہ کے ساتھ لگالی۔

کیپٹن دلیپ نے دروازہ کھول کر ارد گرد دیکھا اور پھر ایک سائیڈ پر آگیا۔اس طرف سپاہی نہ ہونے کے برابر تھے۔کیپٹن دلیپ نے کلائی پر بندھی گھڑی کے ڈال پر لگے ایک ہک کو کھینچا اور گھڑی منہ کے قریب کرکے بولا۔

''ہیلو۔ہیلو۔سر ڈی ون اسپیکنگ۔''

''یس ڈی۔ون! کیا بات ہے؟اوور''دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

''سر ایک اہم بات بتانی ہے۔اوور''کیپٹن دلیپ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تمہید مت باندھا کرو ڈی۔ون۔اوور''دوسری طرف سے کہا گیا مگر لہجہ ہنوز نرم تھا۔

''سر!کے۔ایس بھی غیر ملکی پھلوں کی کھیپ میں دلچسپی لے رہا ہے،انھوں نے آپ سے پہلے وہاں پہنچنے کی تیاری کا حکم دیا ہے۔اوور''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ان کی موجودگی کی اسے کیسے خبر ہوگئی۔اوور''اس بار دوسری طرف سے کرنل چوپڑا کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔

''سر!آپ کے آس پاس ان کا کوئی مخبر کام کر رہا ہے۔جس نے انھیں یہ خبر دی۔خوش قسمتی سے میں بھی اس وقت ان کے پاس تھا۔اوور''

''چلو اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا۔اب میں اسے دیکھ لوں گا۔اوور''

''سر میرا انعام۔۔اوور!!''کیپٹن دلیپ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ہاں اوہ تمہیں مل جائے گا۔فکر مت کرو۔اوور''کرنل چوپڑا نے موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔کیپٹن دلیپ نے او۔کے کہہ کر ٹرانسمیٹر کی ناب گھما کر اسے گھڑی کے ڈائل کے اندر کردیا اور پھر اطراف کا جائزہ لیتا ہوا اپنے آفس کی جانب چل دیا۔

......☆☆☆......

بھارتی فوج کے نماز جمعہ کے بعد سے گھروں میں چھاپے جاری تھے۔وجہ صرف یہی تھی کہ ایک مسجد کے باہر نماز جمعہ کے دوران کسی کشمیری نوجوان نے پاکستان کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔نہ صرف لہرایا تھا بلکہ اس نے جھنڈے کو سر پر باندھ کر نماز ادا کی تھی۔جیسے ہی وہ نوجوان مسجد سے باہر نکلا تو ایک گولی اس کے سینے میں اتار دی گئی۔آن کی آن میں کشمیری نوجوان جام شہادت نوش کر گیا۔مگر اس کے بعد سے حالات کنٹرول میں کرنا بھارتی فوج کے لیے مشکل ہوگیا۔شہید نوجوان کا جنازہ رات عشاء کی نماز کے بعد ادا کیا جانا تھا۔سردیاں ہونے کی وجہ سے عشاء کی نماز آٹھ کے قریب ادا کی جاتی تھی۔نوجوان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر ابھی سے اکٹھا ہو رہا تھا۔بھارتی فوج کی جانب سے ساری وادی میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔مگر کرفیو کی پروا کیے بغیر کشمیری اپنے بھائی کے آخری دیدار کے لیے بے چین تھے۔ایک غم و غصے کی کیفیت سارے حریت رہنماؤں میں اور کشمیریوں میں پھیلی ہوئی تھی۔جگہ جگہ لوگ جلوسوں کی شکل میں نکل کر بھارتی جارحیت کے خلاف نعرے بازی میں مصروف تھے۔آسمان بھی سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ساری وادی میں خون و بارود کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔بھارتی فوج کے دستے ہی دستے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے تاکہ مشتعل افراد کا مقابلہ کیا جاسکے اور اس کے لیے وہ اسلحہ استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔شہید نوجوان محمد موسیٰ کا گھر بنگرام کے ایک نواحی قصبے میں تھا۔جیسے جیسے وقت گزر رہا

تھا۔ ماحول میں عجیب سی بے چینی چھارہی تھی۔ مغرب کے بعد تو ہر گلی میں بھارتی فوجی گشت کرنے لگے۔ بلاوجہ ہی تلاشی شروع ہوچکی تھی اور جس کو چاہتے، بھیڑ بکریوں کی طرح گھسیٹتے ہوئے اور مارتے ہوئے لے جاتے۔ ان انسانی حقوق کی پامالی پر جہاں ساری دنیا چپ ہے وہاں نام نہاد این جی اوز بھی، جو ہیومن رائٹس کی بڑی علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، وہ بھی منہ چھپائے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے فوجی ٹینکروں میں نوجوانوں کو بھر بھر کر نامعلوم جگہ پر منتقل کیے جارہے تھے۔ عشاء کی نماز تک فضا میں کشیدگی کی کثیف تہہ چھا چکی تھی۔ نماز کے بعد جنازہ گھر سے باہر بڑی سڑک پر نمودار ہوا۔ سارا دن تو فوجیوں کے لیے صورت حال سنبھالنا اگر آسان تھا تو اب ہزاروں افراد کے مجمعے کو دیکھ کر حواس ان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ تدفین کے بعد حالات اس وقت مزید کشیدہ ہو گئے جب ایک کشمیری نے بھارت کے مظالم کے متعلق پرسوز تقریر کی تو ہزاروں کا مجمع ایک دم بپھر گیا۔ فوجیوں پر پتھروں کی بارش کردی گئی۔ بہت سارے مسلمان جیالے ٹینکوں کے سامنے خودساختہ بم باندھ کر لیٹ گئے۔ فوجیوں نے بھی فائرنگ شروع کی تو سڑکیں خون سے بھر گئیں۔ صبح کے لیے سینکڑوں جنازے پھر سے تیار ہو گئے۔ یہی ہوتا آرہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ کشمیریوں کو ان کے جائز حقوق نہیں مل جاتے۔

☆☆☆

صبح کاذب کا وقت تھا۔ آسمان کیونکہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس لیے وقت کا تعین کرنا مشکل تھا۔ وہ چاروں اب ایک نالے سے گزر رہے تھے، جو بارش کی وجہ سے بن گیا تھا۔ خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کی چھڑیاں تھی جو وہ سامنے والی جھاڑیوں پر مار کر راستہ بنا رہے تھے۔ ایک جگہ جا کر پانی کا نالہ ایک چھوٹی سی آبشار کی شکل میں نیچے ڈھلوانی سطح پر گر رہا تھا۔ وہ چاروں آبشار سے پہلے ہی نالے سے باہر نکلے۔ جیسے ہی وہ اس نالہ سے باہر آئے تو انھیں سامنے اندھیرے میں ایک کمرہ بنا ہوا نظر آیا۔ اس کے اندر ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں سے امیر نے رک کر ساروں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود پیٹ کے بل رینگتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اندر سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔

"یار ارجن! یہاں تو ہر سے ایسا لگتا ہے جیسے موت سر پر منڈلا رہی ہو۔ میں وہاں آسام میں بڑے عیش میں تھا یارا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو کمار۔ ادھر تو نہ ٹی وی ہے، نہ وی سی آر۔ اگر کہیں ہے بھی تو کرنل سالے چلانے ہی نہیں دیتے۔ خود تو چھاؤنی میں میٹھی نیند سو جاتے ہیں اور ہمیں یہاں پہرے پر بٹھایا ہوا ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے رادھا سے ملے ہوئے۔ ماں نے خط لکھا تھا کہ رادھا کی ماں نے اس کا رشتہ اپنے رشتہ داروں میں کرنے کا اشارہ دیا ہے۔"

باتیں جاری تھیں۔ امیر نے ایک چھوٹا سا پتھر ہاتھ میں لیا اور رینگتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے سے تھوڑا فاصلے پر رک کر اس نے اپنے آپ کو اچھے طریقے سے ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپایا۔ یہ پتھر قدرتی طریقے سے تھوڑا ابھرا ہوا تھا اور شاید اسی لیے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے آدھے سے زیادہ کمرے کا حصہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ اس بڑی پہاڑی چٹان کے ساتھ جنگلی خودرو پودے اور جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ الغرض کے یہ حفاظتی لحاظ سے بہترین جگہ ثابت ہوتی تھی۔ ہاتھ میں اٹھایا پتھر اس نے دروازے کو دے مارا۔ کھنک کی آواز کے ساتھ پتھر دروازے کے ساتھ ٹکرایا اور ایک لمحے کے لیے اندر سے آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ امیر نے جلدی جلدی ارد گرد ہاتھ مارا اور ایک اور پتھر انگلیوں میں دبا لیا۔ چند ثانیے کی مکمل خاموشی رہی پھر ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک فوجی محتاط انداز سے سر باہر نکال کر دیکھنے لگا۔ یہی سر نکال کر باہر دیکھنا اسے مہنگا پڑ گیا کیونکہ اسی وقت امیر کے ہاتھ میں موجود پتھر آکر سیدھا اس کی کھوپڑی پر لگا۔ فوجی نے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنے کوشش کی مگر ضرب شدید ہونے کی وجہ سے لہرا کر گر پڑا۔ امیر نے فوراً الو کی طرح آواز نکالی۔ آواز سن کر اس کے باقی ساتھی فوراً اوٹ سے نکل آئے اور اس کے ہاتھ کے اشارہ سے کمرے کی جانب دوڑ پڑے۔ دروازے کے سامنے فوجی اوندھا پڑا تھا اور دوسرا اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور

سامنے دیکھا اچانک بوکھلا گیا۔ مگر اس کی بوکھلاہٹ چند لمحوں کے لیے تھی۔ اس نے فوراً ہاتھ میں پکڑے پسٹل کا رخ ان کی جانب کر کے گولی چلانے کی کوشش کی۔ مگر عین اسی لمحے بڑی چٹان کے پیچھے سے امیر نے ایک اور پتھر اٹھا کر اس کی جانب پھینکا جو اس کے ہاتھ پر لگا اور پسٹل اس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔ دوسرے ساتھی نے پیچھے سے اس کے سر پر ہاتھ میں پکڑا لوہے کا گولہ دے مارا۔ خون کی چھینٹے اڑ کر اس کے کپڑوں پر پڑے اور فوجی ادھر ہی ڈھیر ہو گیا۔ چاروں اوٹ سے باہر آچکے تھے۔ چند ثانیے انھوں نے مزید مزاحمت کا انتظار کیا اور جب خطرے کا امکان ٹل گیا تو کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ امیر نے انھیں دونوں فوجیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا حکم دیا اور خود کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کے بائیں جانب دیوار کے ساتھ ایک چارپائی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ ضرورت کا سامان بھی موجود تھا، جن میں کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت اسلحہ بھی یہاں رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دور رینج ٹرانسمیٹر اور واکی ٹاکی سیٹ بھی ٹیبل کے اوپر دھرے تھے۔ دونوں فوجی غفلت میں مار کھا گئے تھے ورنہ یہاں حفاظت کا بہترین نظام موجود تھا۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ ایک وقت میں ایک فوجی پہرا دیتا اور دوسرا آرام کرتا تھا۔ اس جگہ کمرے کی موجودگی کا اصل مقصد پہاڑی سے نیچے درے پر نظر رکھنا تھا کیونکہ اس درے کو بھارتی فوج اسلحے کی ترسیل کے لیے استعمال کرتی تھی۔ تلاشی کے بعد امیر نے نوجوانوں کو آرام کرنے کا کہا اور خود کمرے سے باہر آکر اسی پتھر کی اوٹ میں چھپ کر پہرہ دینے لگا۔ مصدقہ اطلاع یہ تھی کہ اگلی رات اس درے سے ایک فوجی کانوائے گزرنا تھا، اور اسے تباہ کرنا ان کے مقصد میں شامل تھا۔

......☆☆☆......

اسلام آباد میں رات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور اس وقت ملک کی مشہور و معروف یونیورسٹی کے اندر ایک کنسرٹ شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ کنسرٹ کے ٹکٹ آخری وقت میں بھی دھڑا دھڑ فروخت کیے جا رہے تھے۔ کنسرٹ یونیورسٹی بلاک کے اندر ہی کھلی جگہ پر منعقد کیا گیا تھا۔ مقررہ وقت سے تھوڑی ہی دیر بعد کنسرٹ شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک گانا شروع کیا گیا۔ نوجوان نسل کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بھنگڑے ڈالے جا رہے تھے۔ کچھ منچلے اسٹیج پر جا کر گلو کاروں کے ساتھ ڈانس کرنے میں مشغول تھے۔ آدھی رات تک یہ طوفان بدتمیزی جاری رہا۔ رات کے آخری پہر جب کنسرٹ ختم ہوا تو بہت سارے نوجوان گھروں کو ڈگمگاتے ہوئے جا رہے تھے۔ اسی وقت ایک سیاہ رنگ کی کار بھی یونیورسٹی گیٹ سے باہر آئی۔ اس کی عقبی نشست پر ایک نوجوان سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اس کے گھٹنوں پر ایک بریف کیس رکھا تھا۔ جس میں کنسرٹ کی آمدنی موجود تھی۔ اس نوجوان کا تعلق پاکستان کے اونچے گھرانے سے تھا۔ اس لیے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی دوسرے ملک کی خفیہ ایجنسی سے ہو سکتا ہے۔ اس کا مشن نوجوانوں کے اندر بے راہ روی اور ملک سے نفرت کے جذبات جیسے عناصر پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے پورا ایک نیٹ ورک بنایا ہوا تھا۔ وہ اور اس کا گروپ یونیورسٹیوں کے اندر کنسرٹ کرواتے اور وہاں پر اپنے مشن کو پورا کرنے میں لگے رہتے۔ ملک کی بڑی یونیورسٹیز کے اندر پڑھنے والے طلباء اس نیٹ ورک سے منسلک تھے اور اپنی اپنی یونیورسٹی کے اندر منشیات فروشی کا کام خفیہ طریقے سے جاری رکھے ہوئے تھے۔ گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایک بڑے بنگلے کے سامنے آکر رکی۔ گیٹ پر مخصوص انداز میں ہارن بجایا گیا۔ تیسرے ہارن پر دروازہ کھل گیا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوئی اور پیچھے دروازہ آٹو میٹک سسٹم کے تحت خود بخود بند ہو گیا۔ جیسے ہی گاڑی پورچ میں آکر رکی، نوجوان نے بریف کیس اٹھایا اور گاڑی سے باہر آ گیا۔ پورچ سے گزر کر اس نے سامنے موجود پودار کی لکڑی سے بنے بڑے دروازے کو دھکیلا جو بغیر کوئی آواز پیدا کیے کھلتا چلا گیا۔ اندر روشنی جل رہی تھی مگر ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی بھی انسان موجود نہ ہو۔ نوجوان ڈرائنگ روم میں رکھے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ چند لمحوں بعد ساتھ شیشے کے ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوجوان

نے کریڈل اٹھایا اور کان سے لگایا۔ اس نے دوسری جانب سے آواز سنے بغیر بولنا شروع کیا۔

"سر اصغر اسپیکنگ! مال اور رقم بریف کیس میں موجود ہے۔ ہمارا مطلوبہ ٹارگٹ ہم نے حاصل کرلیا ہے۔ میں اگلے ٹارگٹ کے لیے تیار ہوں۔"

"ویل ڈن اصغر! تم ابھی جا کر آرام کرو اور ہمارے اگلے حکم کا انتظار کرو۔ بہت جلد تم سے رابطہ ہو گا۔ بائے۔" دوسری طرف سے ایسے آواز سنائی دی جیسے کہ کوئی روبوٹ بات کررہا ہو۔ اصغر نے بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور کریڈل رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر پورچ میں آکر اس نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے سر سیٹ کی پشت گاہ پر ٹکا دیا۔ گاڑی کا انجن جاگا اور گاڑی دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

اس وقت میریٹ میں ایک ہائی کلاس ڈنر چل رہا تھا۔ رخسانہ، بھورے اور سنہرے رنگ کے امتزاج والی ساڑی پہنے، گلے میں ڈائمنڈ نیکلس پہنے سارے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ اس قسم کے بزنس ڈنر ان کی بزنس لائف کا حصہ تھے۔ کھانا لگنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ مہمانوں کو سوفٹ ڈرنک سرو کیے جا رہے تھے۔ رخسانہ کا موبائل دفعتاً بجا۔ رخسانہ ساتھ کھڑی مہمان خاتون سے معذرت کرتے ہوئے موبائل نکال کر کال سننے لگیں۔

"میم احتشام بات کر رہا ہوں۔ سوری ٹو ڈسٹرب میم۔ مگر ایک ضروری اطلاع دینی تھی۔" احتشام کا لہجہ احترام سے بھرپور تھا۔

"جی احتشام۔ کیا بات ہے؟" جواباً رخسانہ کا لہجہ بھی کافی نرم تھا۔

"تھینک یو میم! میم آپ نے حمزہ صاحب کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"ہاں تو کیا پتا لگا۔ کہاں گیا ہوا تھا وہ۔" رخسانہ نے لہجے کی بے قراری کو حتی الوسع چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"میم! حمزہ صاحب دو تین دن سے مسلسل حسن ابدال جا رہے ہیں۔ یہ ٹیکسلا سے تھوڑا آگے ہے میم۔ اور میم بات یہ ہے کہ......" احتشام نے بات کو درمیان میں چھوڑتے ہوئے، شاید ان کا رد عمل جاننے کی کوشش کی۔

"کیا بات ہے احتشام۔ تمہید مت باندھا کرو۔" لہجہ تھوڑا سخت ہوا۔

"سوری میم! میم وہ وہاں کوئی بزرگ ہیں، ان سے ملنے جاتے ہیں اور میم جیسے آپ نے پہلے ڈسکس کیا تھا اسی طرح وہاں پر ایک پہاڑی کے اوپر کسی بزرگ کا مزار بھی ہے۔ پھر بعد میں جب میں نے پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ میم وہ پرانے وقتوں میں کسی بزرگ کی بیٹھک تھی۔ مگر اب لوگ وہاں منتیں، مرادیں مانگنے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ میم، وہاں سکھوں کا بھی بہت بڑا گوردوارہ ہے۔ سکھ بھی ان بزرگ کو بہت مانتے ہیں۔" احتشام نے جلدی جلدی تفصیل بتائی۔

رخسانہ نے سب تحمل سے سنا اور پھر بولیں۔

"ٹھیک ہے احتشام! تم حمزہ کا خیال رکھو (انھوں نے جان بوجھ کر پیچھا کرنے کو اس مطلب سے کہا)۔ میں آج اس سے تفصیلی بات کروں گی۔ مگر تم ان بزرگ کے بارے میں پتہ چلاؤ کہ کون ہیں؟ اور کہاں رہتے ہیں؟ میں نے ان سے ملاقات کرنی ہے۔"

"او کے میم! جیسے آپ کا حکم۔"

رخسانہ نے ہلکا سا سر کو خم دیا اور پھر چہرے پر چھائے فکر مندی کے تاثرات کے زیر اثر واش روم کی طرف چل پڑیں۔ واش روم میں لگے آئینے میں ایک نظر خود کو دیکھا۔ میک اپ کو درست کیا اور جب انھیں لگا کہ ان کا چہرہ نارمل ہو رہا ہے تو واش روم سے باہر آگئیں۔ مہمانوں کے پاس آکر تھوڑے وقت کے لیے ان کے ذہن سے یہ بات محو ہو گئی، مگر جیسے ہی ڈنر ختم ہونے کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھیں۔ ان کا دھیان دوبارہ سے اس طرف بھٹکنے لگا۔ گھر واپس آکر انھوں نے لاؤنج میں کھڑے ہو کر جب بالائی منزل کو دیکھا تو حمزہ کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ چینج کرنے کے بعد سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے کمرے کی جانب بڑھیں۔ ابھی وہ آخری سیڑھی پر ہی تھیں کہ اندر سے سنائی دینے والی آواز نے ان کے قدم روک دیے۔ وہ کان لگا کر سننے لگیں۔

"یا۔ سین (۱) قسم ہے قرآن حکیم کی (۲) یقیناً تم رسولوں میں سے ہو (۳) سیدھے راستے پر ہو (۴) یہ (قرآن حکیم) نازل کردہ ہے غالب اور مہربان ہستی کا

(۵) تا کہ تم متنبہ کرو ایسی قوم کو کہ نہیں متنبہ کیے گئے ان کے باپ دادا اسی وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں (۶) یقیناً پوری ہو چکی اللہ کی بات ان میں سے اکثر پر لہذا وہ ایمان نہیں لائیں گے (۷)"

رخسانہ نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ سامنے بیڈ پر حمزہ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگا کر باادب بیٹھا تھا اور اس کی بند آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ رخسانہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور ٹیبل پر رکھے سی ڈی پلیئر کو، جس میں سورۃ یٰسین کی تلاوت کی آواز آ رہی تھی۔ رخسانہ چلتی ہوئی بیڈ کے پاس پہنچیں اور حمزہ کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا، حمزہ نے ہلکی سی آنکھیں کھولیں۔ پانی سے بھری آنکھوں کے ساتھ ماں کو دیکھا، ہاتھ بڑھا کر ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں اپنے سامنے بٹھایا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ماں کے کندھے پر پڑے دوپٹے کو پکڑ کر آنچل ماں کے سر پر ڈالا۔ رخسانہ جیسے کسی ٹرانس سے باہر نکلیں اور فوراً سر کو اچھے طریقے سے ڈھانپ لیا۔ آیت ختم ہونے پر حمزہ نے سی ڈی پلیئر ریموٹ سے بند کیا۔ قاری صاحب کی تلاوت کی آواز رکتے ہی ہر طرف وحشت ناک سی خاموشی چھا گئی۔ رخسانہ نے دوپٹے سے حمزہ کی آنکھیں صاف کیں۔ حمزہ نے مسکرا کر انھیں دیکھا اور بولا۔

"ممی! امی فائن۔ ڈونٹ وری۔"

"پھر یہ آنسو۔" رخسانہ نے اطمینان کی سانس خارج کی۔

"بس ممی! تلاوت سن رہا تھا تو بہنے لگے۔" حمزہ نے جواب دیا تو رخسانہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہیں۔ حمزہ نے انھیں اپنی طرف متوجہ پا کر پوچھا۔

"آپ ابھی تک سوئی نہیں۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"

"ہاں بس سونے لگی تھی۔ تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تو اس طرف آ گئی۔" کمرے میں چند ثانیوں کے لیے خاموشی پھیل گئی۔ صرف باہر ہوا سے درختوں کے ہلتے پتوں کی آواز آتی رہی۔ رخسانہ نے بات شروع کرنے کے لیے الفاظ جمع کیے اور بولیں۔

"کافی دنوں سے سوچ رہی تھی بیٹا! کہ تم سے بات کروں گی مگر ٹائم ہی نہیں مل رہا تھا۔ (خاموشی) حمزہ بیٹا! اگر تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری وجہ سے کافی پریشان ہوں بیٹے۔ کس چیز کی تلاش میں ہو تم۔ کیوں مارے مارے پھر رہے ہو بیٹا۔ مجھے بتاؤ میں تمہاری ماں ہوں۔ میں تمہیں وہ چیز لا دوں گی جو تمہیں چاہیے۔"

حمزہ نے نظریں سامنے بیٹھی اپنی ماں کے چہرے پر ڈالیں۔ باہر کافی تیز ہوا چل رہی تھیں۔ کھڑکی کا پٹ کھل کر اب ہوا کے ساتھ جھول رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ ہلکے سے دکھی سا مسکرایا اور بولا۔

"ممی!! مجھے اللہ چاہیے۔ یقین مانیں ممی۔ میں اللہ کو ڈھونڈتا ہوں مگر وہ مجھے نہیں ملتا۔ میرا رب مجھ سے ناراض ہے۔ میں اسے راضی کرنا چاہتا ہوں۔ پتہ ہے ممی! میں روز سوچتا ہوں کہ آج میں کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا کہ جس سے میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو۔ مگر میں پھر وہ حرکت کر بیٹھتا ہوں۔ ممی پتہ ہے مجھے ان لوگوں پر رشک آتا ہے (بھیگے لہجے کے ساتھ بولتے ہوئے) جو کہتے ہیں کہ انھیں اللہ اپنے اردگرد محسوس ہوتا ہے۔ ممی آخر کیوں مجھے میرا اللہ اپنے پاس محسوس نہیں ہوتا۔"

رخسانہ نے ہکا بکا انداز سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ بچپن کے بعد وہ آج اس چوبیس، پچیس سال کے نوجوان کو یوں روتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ کھڑکی کا پٹ ہوا کی تیزی سے بار بار کھل کر بند ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مسلسل اندر آ رہے تھے۔ انھوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"بیٹا! اللہ پاک آپ کے پاس ہے میرے بچے۔ وہ آپ سے ناراض نہیں ہے۔ وہ بڑا رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کی ہر بات سنتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہو۔"

"ممی میں کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ مجھے اس پاک ذات کا احساس اپنے چاروں طرف محسوس ہو۔ مگر مجھے نہیں ہوتا۔ ممی ہر کوئی کسی انسان کی محبت میں غرق ہے۔ وجیہہ ہے نا میرا دوست (ہوا کی شدت سے کھڑکی اتنے زور سے بجنے لگی کہ جیسے ٹوٹ کر اندر گرنے والی ہو۔) وہ بھی تو ایک انسان کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس کی محبت میں وہ پہاڑوں اور صحراؤں پر نہ جانے

کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے۔ میں اور نعمان اسے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ مگر دیکھیں نا ممی وہ جتنا بھی بھاگ لے، وہ اسے نہیں مل سکتی کیونکہ وہ اس دنیا میں اب ہے ہی نہیں۔ ممی اللہ مل جاتا ہے پر پتا ہے یہ انسان نہیں ملتا۔" اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ کمرے میں لگے ہیٹر کی گرمی ختم ہو چکی تھی۔ کمرہ ایک دم سے سرد ہو گیا تھا۔ برف کی مانند ٹھنڈا، اتنا ٹھنڈا کہ ہڈیوں کا گودا جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ رخسانہ نے اٹھ کر کھڑکی بند کی اور ہیٹر تیز کر کے اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے اس کا ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھ میں لیا اور سہلاتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! اللہ اس لیے مل جاتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس ہستی کو تو کبھی نیند یا اونگھ بھی نہیں آتی۔ اتنا مہربان ہے کہ اگر انسان اس کی جانب توجہ کر لیتا ہے تو پھر وہ اپنے بندے کو کبھی خالی ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ اپنی ذات سے محبت کرنے والوں کو تو وہ بہت پسند کرتا ہے۔"

"پھر ممی آپ اس سے کیوں محبت نہیں کرتیں؟" حمزہ نے سوال داغا۔ اس کا سوال سن کر ایک لمحے کے لیے تو رخسانہ بوکھلا گئی، پھر سنبھلتے ہوئے بولیں۔

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ ہر مسلمان کو اپنے خالق سے محبت ہے بیٹا! مجھے بھی اپنے اللہ سے محبت ہے۔" رخسانہ کا جواب سن کر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"نہیں ممی! آپ کو اللہ سے محبت نہیں ہے۔ ممی آپ کو میرے اللہ سے محبت کیوں نہیں۔ (سسکتے ہوئے) ممی اگر آپ کو اللہ سے محبت ہوتی تو آج اللہ آپ کے بیٹے سے بھی محبت کرتا۔ آپ بھی تو ایک انسان کی محبت کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ (کھڑکی کے شیشے پر بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں) ممی آپ کو پاپا سے محبت ہے۔ پچھلے دس سالوں سے آپ پاپا کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ آپ کو اس لیے چھوڑ گئے تھے نا کہ آپ کو دادا زبردستی ان کے ساتھ بیاہ کر لائی تھیں۔ (ہوا کے مسلسل جھٹکوں سے کھڑکی کی کنڈی ڈھیلی ہو کر گر گئی اور پٹ دوبارہ سے کھل گیا۔ ہوا کا تیز جھونکا بارش کی بوندوں اور ٹیرس پر لگی بیل کے پتوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔) مجھے پتہ ہے سب ممی کہ آپ دس سال سے صرف اس لیے محنت کر رہی ہیں تا کہ پاپا کو جب آپ کے مشہور ہونے کا پتا چلے تو دوڑے چلے آئیں۔ آج تک آپ نے اپنے بوتیکس کا نام بھی انھی کے نام پر رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے نا کہ آپ کو ان سے محبت ہے۔ کیا کچھ نہیں کر رہیں آپ......"

رخسانہ نے اذیت سے آنکھیں بھینچیں اور پھر کھول کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔

"بس کرو حمزہ! فار گاڈ سیک۔ بس کرو۔" حمزہ نے ان کی دکھتی رگ کو چھیڑا تھا۔

"نہیں ممی! آج مجھے کہنے دیں۔ آپ نے دس سال ایک انسان کی جدائی میں گزار دیے۔ مگر دیکھیں وہ نہیں آئے۔ آپ نے اتنے سال میری محبت میں، میرے اچھے مستقبل کے لیے ضائع کیے۔ ممی اگر میں آج ہی مر جاؤں تو پھر آپ کے ہاتھ تو کچھ نہ آیا نا۔ یہ سال اگر آپ نے اللہ کے لیے صرف کیے ہوتے تو وہ آپ کو اتنا اعلیٰ مقام دیتا۔ ہم انسان جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ ساری محبتوں کو زوال ہے سوائے خدا کی محبت کے۔ اسی کی محبت لازوال ہے۔ ہمیشہ رہنے والی ہے۔" وہ نڈھال سا ہو کر بیڈ پر رکھے سرہانے پر گر گیا۔ اب کمرے میں اس کی سسکیوں، ہوا سے ہلتے پتوں کی سرسراہٹ اور بارش کی بوندوں کی ٹپ ٹپ کی آواز آ رہی تھی۔ کھڑکی کا پٹ اب بہت آہستگی سے ہل رہا تھا۔ ہوا ٹھہر چکی تھی۔ رخسانہ ایک ہی انداز میں بیڈ پر خاموش بیٹھی تھیں۔ نہ جانے کب تک وہ وہاں بیٹھی رہیں۔ جب ہوش آیا تو حمزہ سو چکا تھا۔ انھوں نے ایک ٹرانس میں اٹھ کر کھڑکی بند کی اور اس پر کمبل ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے انھوں نے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا۔

"ممی!! مجھے اللہ چاہیے۔"

دوسری سیڑھی۔

"اللہ بڑا رحیم ہے۔"

تیسری سیڑھی۔

"ممی وجیہہ ہے نا میرا دوست، وہ بھی ایک انسان کی محبت میں گرفتار ہے۔"

چوتھی سیڑھی۔

"ممی! اللہ مل جاتا ہے پر پتا ہے یہ انسان نہیں ملتا۔"

پانچویں سیڑھی۔۔۔

"نہیں ممی! آپ کو اللہ سے محبت نہیں ہے۔ ممی آپ کو میرے اللہ سے محبت کیوں نہیں۔"

چھٹی سیڑھی۔

"آپ کو پاپا سے محبت ہے۔"

ساتویں سیڑھی۔

"دادو زبردستی ان کے ساتھ بیاہ کر لائی تھیں۔"

آٹھویں سیڑھی۔

"ممی اگر میں آج ہی مر جاؤں تو پھر آپ کے ہاتھ تو کچھ نہ آیا نا۔"

نویں سیڑھی۔۔۔

"ساری محبتوں کو زوال ہے، سوائے خدا کی محبت کے۔"

دسویں سیڑھی۔

"یاسین (۱) قسم ہے قرآن حکیم کی (۲) یقیناً تم رسولوں میں سے ہو (۳) سیدھے راستے پر ہو (۴) یہ (قرآن حکیم) نازل کردہ ہے غالب اور مہربان ہستی کا (۵) تاکہ تم متنبہ کرو ایسی قوم کو کہ نہیں متنبہ کیے گئے ان کے باپ دادا اسی وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں (۶) یقیناً پوری ہو چکی اللہ کی بات ان میں سے اکثر پر لہذا وہ ایمان نہیں لائیں گے (۷)۔"

وہ وہیں نڈھال سی بیٹھ گئیں۔ ان کے بیٹے نے نہ صرف پچھلے دس سالوں کا، بلکہ ان کی ساری زندگی کا خلاصہ ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ان نے اپنے ہاتھوں پر ایک نظر ڈالی۔ لمبے لمبے ناخن کیوٹکس سے سجے ہوئے تھے۔ انھوں نے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر کیوٹکس اتارنی شروع کر دی۔ اس کارروائی میں چند ناخن ٹوٹ گئے۔ سامنے لاؤنج میں لگے شیشے میں انھیں اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں پر میرون لپ اسٹک۔ انھوں نے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر اسے اتارا اور اپنے نئے شفون کے گولڈن دوپٹے سے لپ اسٹک صاف کرنی شروع کر دی۔

اگست کے آخری دن چل رہے تھے۔ فضا میں حبس پھیلا ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا، پھر بھی گرمی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ فائزہ اس گرمی میں بھی کچن میں چائے بنانے میں مصروف تھی۔ عارب ابھی بینک سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ شہناز بیگم محلے میں کسی کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اس نے باوجود اصرار کے بھی شہناز بیگم کو کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ وہ سارا دن اسے دعائیں دیتے نہ تھکتی تھیں۔ اڑوس پڑوس میں بھی بہو کی خوب تعریفیں کرتی تھیں۔ عورتیں بھی رشک اور کبھی حسد کی نگاہ سے اسے دیکھتی تھیں۔ مگر فائزہ کو ان سب کی پروا کب تھی۔ وہ تو اپنی اس چھوٹی سی جنت کے قائم و دائم رہنے کی دعائیں مانگتی تھی۔

فائزہ نے چائے کی پتی کا ڈبا سلیب کے اوپر رکھا اور چائے کے ابلتے پانی میں پتی ڈالی۔ گرم کھولتے پانی میں جیسے ہی پتی کے ذرے گرے، ابلتے پانی کا رنگ بدلنے لگا۔ بھورا رنگ ہر طرف پھیل گیا۔ ماضی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ بچپن، لڑکپن اور پھر جوانی۔ وقت کا پہیہ گھوم گھوم کر چرچرانے لگا، اور اس چرچراہٹ کی آواز میں ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"رانی! میرا جی چاہتا ہے کہ بھاگ جاؤں یہاں سے۔ کتنی گھٹن اور وحشت ہے نا یہاں۔ ان در و دیوار کو دیکھو۔ پرانی بوسیدہ سی حویلی، شاید کسی ہندو کی ملکیت تھی۔ میں ان تنگ تنگ کھڑکیوں، دروازوں کو دیکھتی ہوں تو میرا دل بند ہونے لگتا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ایک بہت بڑا گھر ہو جس میں جامن اور امرود کے درخت ہوں، اور ان کے ساتھ میں پینگ ڈال کر جھولا جھولتی رہوں۔" لاشعور میں جاگنے والی ماہ جبیں کی یاد نے آنکھوں کو پانیوں سے بھر دیا۔ اس نے پاس پڑی دیگچی میں سے دودھ کا کپ بھر کر کھولتے قہوہ میں ڈالا۔ سیاہی چھٹنے لگی اور سارا قہوہ یک لخت سفید ہو گیا۔ سفیدی اس کے اردگرد پھیلنے لگی۔ اس سفیدی میں ایک پرانی حویلی کے باورچی خانے کا منظر جھلکنے لگا۔ دیوار کے ایک طرف انگیٹھی، اس کے نیچے ایک چولہے پر چائے کی دیگچی میں ابلتا ہوا قہوہ، اس سے نکلتی ہوئی بھاپ۔۔۔ دودھ کا کپ اس نے اسمیں انڈیلا۔ پاس کھڑی ماہ جبیں نے قہوے کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر یاسیت سے کہا۔

"دیکھو اس دودھ نے اس سیاہ پانی کی ساری سیاہی کو ایک سیکنڈ میں ختم کر دیا۔ کاش ہماری زندگیوں میں بھی کوئی دودھ کی مانند صاف شفاف انسان آ جائے، جو ماضی کے

سارے داغ اسی طرح ختم کر دے۔ بالکل اسی طرح جیسے۔"

چائے کھول کھول کر چولہے پر گرنے لگی تو وہ ماضی سے حال میں آ گئی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں تو باہر سے شہناز بیگم کی آواز سنائی دی۔

"فائزہ! کہاں ہو؟ عارب آ گیا ہے کیا؟"

اس نے سرخ ہوتی ناک کو دوپٹے سے رگڑا اور اٹھ کر کچن کے دروازے کے پاس آ کر شہناز بیگم کو دیکھنے لگی، جو چادر اتار کر دوپٹا لے رہی تھیں۔

"نہیں امی! ابھی نہیں آئے۔ بس آنے والے ہوں گے۔ پانچ بجے تک کھلا رہتا ہے بینک۔" اس نے بیرونی دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا مجھے ایک گلاس پانی تو پلا دو۔ توبہ اتنی گرمی ہے، ایسے لگتا ہے دوزخ کا منہ کھلا ہوا ہے جیسے۔ اللہ معاف فرمائے۔" شہناز بیگم دوپٹے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بڑبڑانے لگیں۔ فائزہ نے کچن میں رکھی فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور سلیب پر رکھے ہوئے گلاسوں میں سے ایک گلاس اٹھا کر باہر صحن میں آ گئی۔ شہناز بیگم کو پانی پلانے کے بعد گلاس کو اوندھا کر کے بوتل کے اوپر رکھا اور وہیں چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔

"کیسی طبیعت تھی خالہ نسیم کی؟" اس نے ساس سے پوچھا۔

"بہتر ہی ہے، بڑھاپا ہے نا۔ ویسے بھی بڑھاپے میں سو سو بیماریاں انسان کے ساتھ چمٹ جاتی ہیں۔ (خاموشی) چند ثانیے بعد سونگھنے والے انداز میں) چولہے پر کیا رکھا ہوا ہے جلنے کی بو آ رہی ہے۔" فائزہ نے چونک کر کچن کی جانب دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر کچن کی جانب دوڑی۔

"چائے رکھی تھی اور یاد ہی نہیں رہا۔" اس نے بھاگتے بھاگتے ہی ساس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ شہناز بیگم نے ناگواری سے ناک سکوڑا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔

"آج کل کی نوجوان لڑکیوں کا تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ ہر کام بھول جاتی ہیں۔ ایک کام چھوڑ کر دوسرا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ارے کوئی ان سے پوچھے کہ یہ کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہیں کہ انھیں یاد ہی نہیں رہتا، ہاں بھئی سسرال ہے، کون سا اماں، باوا کا گھر ہے جو یوں خیال کریں۔"

دروازے پر دستک سنائی دی۔ ڈیلی دروازہ کھول کر عارب اندر داخل ہوا۔ شہناز بیگم نے بیٹے کو دیکھ کر دعا دی اور چارپائی کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئیں۔ عارب نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے ارد گرد نظر دوڑائی اور پھر ماں سے مخاطب ہوا۔

"اماں! رانی کہاں ہے؟" شہناز بیگم نے ناگواری سے بیٹے کی جانب دیکھا۔ مگر کمال ہوشیاری سے تاثرات چھپا گئیں۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"کچن میں ہے۔ چائے رکھ کر بھول گئی تھی۔ میں اس سے کہتی ہوں تمہارے لیے کھانا لگا دے۔ تم تب تک کپڑے بدل لو۔"

عارب سر ہلاتا ہوا کمرے کی جانب چل دیا۔ فریش ہو کر آیا تو برآمدے میں دری کے اوپر کھانا لگا ہوا تھا۔ وہ وہیں دری پر بیٹھ گیا۔ شہناز بیگم اٹھ کر بیٹے کے پاس آ بیٹھیں اور ڈونگے میں سے سالن نکال کر اس کی پلیٹ میں ڈالنے لگیں۔ اسی دوران بجلی بند ہو گئی۔ اب وہ ہاتھ والے پنکھے سے اسے ہوا دینے لگیں، تھوڑی دیر بعد انھوں نے فائزہ کو چائے لانے کا کہا۔ عارب نے ایک نظر ماں کی جانب اور دوسری نظر اس پر ڈال کر ماں کو مخاطب کیا۔

"ماں! میں یہ نوکری چھوڑ رہا ہوں۔"

شہناز بیگم کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"پر کیوں بیٹا؟ اتنی اچھی سرکاری بینک کی بندھی بندھائی نوکری ہے۔ تم کیوں اپنی روزی روٹی پر خود لات مار رہے ہو۔"

"ماں جی! یہ سودی کاروبار ہے۔ اس لیے میں اسے چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

"نوکری چھوڑ دو گے تو گھر کا نظام کیسے چلے گا بیٹا؟ آج کل ہر کوئی بینک کی نوکری کر رہا ہے۔ تو کیا سارے سود کھا رہے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اتنی اچھی نوکری پھر ہاتھ نہیں آئے گی اور اگر نوکری چھوڑ دو گے تو پھر خرچہ کیسے چلے گا۔" شہناز بیگم نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔ البتہ

فائزہ خاموشی سے دونوں ماں بیٹے کی باتیں سنتی رہی۔

"ماں جی! گھر کا نظام تب بھی تو چلتا تھا جب میری نوکری نہیں تھی۔ ابھی تو میں نہیں چھوڑ رہا، جب تک مجھے نئی نوکری نہیں ملتی تب تک یہاں ہی جاؤں گا۔" عارب نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"تب تو گزارہ اس لیے چلتا تھا کہ میں جان مارتی تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں دوبارہ سے سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دوں۔ مجھے تو پھر یہی حل نظر آتا ہے۔" شہناز بیگم نے بھڑکیلے لہجے میں جواب دیا۔ نرم دل والی شہناز بیگم آج کل بات بات پر غصہ کرنے لگی تھیں۔ عارب نے کچھ حیرانی سے ماں کو دیکھا۔ منہ کی طرف جانے والا ہاتھ وہیں رک گیا۔ ماحول میں ایک دم سے حبس بڑھنے لگا۔ فائزہ نے نامحسوس انداز میں ہاتھ والا پنکھا چارپائی پر رکھا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ عارب نے نوالہ ٹرے میں پڑے دسترخوان کے اوپر رکھا اور ماں کی جانب دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں نے یہ کب کہا ماں کہ آپ دوبارہ سے سلائی کرنا شروع کر دیں۔ جب تک مجھے نئی نوکری نہیں ملے گی تب تک میں ادھر ہی کام جاری رکھوں گا۔ اور اس بات کی اجازت تو مجھے دین بھی دے رہا ہے۔ بشرطیکہ میں نوکری تلاش کرتا رہوں اور جیسے ہی نوکری ملے، اسے چھوڑ دوں۔" بات ختم کر کے اس نے ہاتھ جھاڑے۔ شہناز بیگم نے بیٹے کو یوں کھانے سے ہاتھ کھینچتے دیکھا تو دل ہی دل میں نادم ہوئیں۔

"کھانا تو سہی طرح کھا لیتے بیٹا! میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔"

"بس ماں! جتنی بھوک تھی کھا لیا۔ اب تھوڑی دیر آرام کروں گا۔" اس نے ماں کی بات کا جواب دیا اور اٹھ کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ حبس مزید بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ وہ اس وقت اسی چوکی میں موجود تھے، جس میں تھوڑی دیر پہلے ارجن اور اس کا ساتھی (بھارتی فوجی) موجود تھے۔ سفر کی وجہ سے چاروں کے جسم تھکاوٹ سے چور چور تھے۔ مگر پھر بھی وہ چوکنا بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر نے ان کی جانب دیکھا اور سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

"میرا خیال ہے کہ میں باہر پہرا دیتا ہوں۔ تم لوگ آرام کر لو۔ اس وقت یہ آرام کرنے کا اچھا موقع ہے۔ شاید اگلے دنوں میں ہمیں سکون کا موقع نہ مل سکے۔"

ان میں سے ایک ساتھی نے امیر کی جانب دیکھا اور ادب سے بولا۔

"آپ بھی آرام کر لیں۔ میں پہرہ دیتا ہوں۔" وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ امیر نے اسے بازو سے پکڑا اور واپس بٹھاتے ہوئے بولا۔

"نہیں حسن! پہرہ میں دیتا ہوں۔ تم سارے آرام کرو۔ ہمیں صبح منہ اندھیرے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ کیونکہ ملٹری کی گاڑی جب ناشتہ دینے آئے گی تو ہمارے لیے مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ ہمیں ان کے آنے سے پہلے یہاں سے دور جانا ہوگا۔" امیر کی بات سن کر ساروں نے سر ہلایا۔ امیر نے اٹھ کر جدید ساخت کا پسٹل ہولسٹر کے ساتھ لگایا اور چوکی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تینوں مجاہدوں نے اپنے اوپر ایک کمبل ڈال لیا اور وہیں بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ رات کا آخری پہر تھا جب ان کی آنکھیں امیر کی الو جیسی آواز نکالنے پر کھل گئیں۔ الو کی آواز نکالنے کا مطلب تھا کہ خطرہ کہیں قریب منڈلا رہا ہے۔ تینوں مجاہد ایک جست لگا کر بستر سے اٹھے اور آناً فاناً، اسلحے کے بیگ پشت پر باندھ کر دروازے کی جانب بڑھے۔ تبھی دروازہ کھلا اور امیر اندر داخل ہوا۔

"جلدی سامان اٹھاؤ۔ میں نے درے میں سے دو ملٹری جیپوں کو چوکی کی طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔ آدھی رات کے وقت یہاں کوئی آ کر کیا کرے گا۔ لگتا ہے کہ ہماری مخبری ہوئی ہے۔ جلدی جلدی سامان اٹھاؤ۔ یہ کانوائے نہیں ہو سکتا۔" امیر نے اپنے حصے کا سامان اٹھاتے ہوئے ساتھیوں کو تفصیل بتائی۔ چاروں نے ایک نظر چوکی کے اندر ڈالی اور پھر باہر آ کر اس بڑے پتھر کی اوٹ میں چھپتے ہوئے پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔

"ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا سر۔ ان دونوں فوجیوں کی لاشیں انکے ہاتھ لگ گئیں تو سارے علاقے کی ناکہ بندی کر دیں گے۔ پھر ہمارا یہاں سے نکلنا دشوار ہو

جائے گا۔'' حسن نے امیر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ البتہ اس کانوائے کا مجھے افسوس رہے گا۔ یہ سارا اسلحہ ان نہتے کشمیریوں پر استعمال ہوگا۔ ہم اس کانوائے کو تباہ کردیتے تو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوجاتی۔ پر خیر اسمیں بھی اس ذات کی مصلحت ہی ہوگی۔'' امیر نے پہاڑی ڈھلوان اترتے ہوئے کہا۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ ان شاء اللہ یہ حساب بھی ان سے برابر کرلیں گے۔'' حسن نے بات کا جواب دیا۔ اسی کے ساتھ اوپر فوجیوں کے دوڑنے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چاروں نے نا سمجھنے والے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا، اسی وقت فضا میں فائر ہوا اور سارا علاقہ چند لمحوں کے لیے روشنی میں نہا گیا۔

''اس طرف آؤ، میں نے ادھر ایک غار دیکھا ہے۔ جلدی......فوراً......'' امیر کی بات سن کر سارے اس جانب دوڑ پڑے۔ یہ ایک متوازی غار تھا جو بارش اور لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے خود بخود بن گیا تھا۔ یہاں لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے کچھ پتھر ایسے گر گئے تھے کہ ایک چھوٹی سی غار بن گئی تھی۔ چاروں دوڑتے ہوئے اس چھوٹے سے غار میں سمٹ کر بیٹھ گئے۔ غار کے دھانے کے آگے انھوں نے اوپر لٹکنے والی بیلوں کو نیچے سرکا کر دھانہ چھپادیا۔ اسی اثناء میں سارا علاقہ سرچ لائٹوں کی روشنی سے نہا گیا۔ فائرنگ کا تبادلہ بھی بند ہوگیا۔

''یہ دوسرا گروپ کون سا ہے؟ اب فائرنگ بھی رک گئی ہے۔ ہمیں صبح تک یہیں بیٹھنا پڑے گا۔'' امیر کی بات سن کر تینوں نے سر ہلایا اور چوکنے ہوکر باہر دیکھنے لگے۔

☆☆

راہداری میں کرنل چوپڑا پاگلوں کی طرح ٹہل رہا تھا۔ غصے سے اس کا برا حال ہورہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کرنل شنکر کو نوچ کر کچا کھا جائے۔ راہداری میں دھوپ چھن چھن کر آرہی تھی۔ اسی وقت سامنے سے ملٹری کی چار پانچ گاڑیاں راہداری کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ کرنل چوپڑا سیدھا ہوکر کھڑا ہوگیا۔ گاڑیاں جیسے ہی راہداری کے سامنے آکر رکیں۔ ایک فوجی نے آگے بڑھ کر درمیان میں موجود کار کا دروازہ کھولا اور سیلوٹ مارا۔ کرنل چوپڑا بھی راہداری سے نکل کر گاڑی کے سامنے آیا اور سیلوٹ مارتے ہوئے بولا۔

''گڈ مارننگ سر۔''

''گڈ مارننگ کرنل چوپڑا'' گاڑی سے نکلتے ہوئے جنرل ملہوترا نے کرنل چوپڑا کی بات کا جواب دیا۔ اب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے راہداری میں داخل ہوئے اور راہداری کے آخر میں بنے آفس میں آگئے۔ جنرل ملہوترا آفس ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئے اور کرنل چوپڑا کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا، مگر کرنل چوپڑا ہنوز کھڑا رہا۔ جنرل نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا اور سر کرسی کی پشت گاہ پر ٹکاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے کرنل! کیوں اتنے غصے میں ہوں؟'' جنرل ملہوترا نے نرمی سے پوچھا، ویسے بھی دونوں کے آپس میں خاندانی تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے چھاؤنی میں بھی کرنل چوپڑا کو ذرا چھوٹ حاصل تھی۔ ورنہ تو جنرل ملہوترا سے بات کرنا، خود کو بھوکے بھیڑیے کے آگے ڈالنے والی بات تھی۔

''سر میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔ کرنل شنکر نے مجھے حد سے زیادہ زچ کردیا ہے۔'' کرنل چوپڑا نے ٹہلتے ہوئے کہا۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ یہ بھی تو پتا چلے اور تم دونوں آپس میں لڑنا چھوڑو اور دیش (ملک) کے بارے میں سوچو۔'' جنرل نے تھوڑا سختی سے کہا۔

''سر! میرے اس سے تعلقات کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتے۔ اس واقعہ کے بعد تو کبھی نہیں۔ سر! اس کا کورٹ مارشل ہونا چاہئے۔ وہ غدار ہے۔ پاپی ہے وہ۔''

''شٹ اپ کرنل چوپڑا! تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ تم ایک کرنل کو غدار کہہ رہے ہو۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ غدار ہے۔'' جنرل ملہوترا نے غصے سے کرنل چوپڑا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سر! وہ دوشی ہے۔ اس نے آتنک وادیوں کی مدد کی ہے۔ سر اس نے رات کو بارہ مولا کے مقام پر میری رجمنٹ کے جوانوں پر گولیاں چلائی ہیں۔ اس نے میرے ایک جوان کو ہلاک اور پانچ کو زخمی کیا ہے سر! حالانکہ ہمیں مکمل خبر ملی تھی کہ اس پہاڑی درے کے پاس آتنک وادی

چھپے ہوئے ہیں اور تو اور سر! اس نے چوکی نمبر ۶۱ کے دو جوانوں کا بھی خون کیا ہے۔ کیونکہ ان کی لاشیں بھی چوکی کے پاس سے ملی ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچے کہ ان سپاہیوں کی مدد لے سکیں اور آپریشن میں اس چوکی کو استعمال کر سکیں تو ہم نے دیکھا کہ وہاں ان کا خون ہوا تھا۔ ابھی وہ میرے سے رابطہ کر ہی رہے تھے کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ سر! کرنل شنکر کی رجمنٹ نے ان پر حملہ کر دیا۔ بڑی مشکل سے کچھ جوانوں نے جان بچائی۔ سر! اس کرنل شنکر کو اگر یہ نہیں پتہ کہ آتنک وادی کون ہیں اور اپنے فوجی کون ہیں تو اسے ابھی برطرف کیا جانا چاہیے۔"

غصے سے کرنل چوپڑا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ جنرل ملہوترا نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور سنجیدگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم بے فکر رہو کرنل۔ اگر اس نے یہ پاپ کیا ہے تو اسے اس کی سزا ضرور ملے گی۔ تم ابھی جاؤ میں اس کی تحقیقات کرواتا ہوں۔" کرنل چوپڑا نے اثبات میں سر ہلایا اور سلیوٹ مار کر آفس سے نکل گیا۔ جنرل ملہوترا نے ٹیلی فون کا کریڈل اٹھایا اور احکامات دینے لگا۔

☆☆☆

گاڑی ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے رکی۔ دروازے کے سامنے پردے کے لیے چادر لٹکی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی بچی باہر آئی۔ ڈرائیور تھوڑی دیر تک اس سے کچھ باتیں کرتا رہا۔ پھر ایک باریش داڑھی والے بزرگ دروازے سے نمودار ہوئے۔ ڈرائیور کی بات سن کر انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈرائیور چلتا ہوا گاڑی کے پاس آیا۔

"آئیے میڈم! یہی گھر ہے مولوی عبدل کا۔" رخسانہ نے سر ہلایا اور گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ آج خلاف توقع انھوں نے ایک سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ بالوں کو ایک سادہ سے جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ کپڑے بھی سادہ تھے۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹ کر چھوٹے کیے ہوئے تھے اور کیوٹکس سے خالی تھے۔ البتہ انگلیوں میں انگوٹھیاں موجود تھیں۔ رخسانہ نے سفید دوپٹے سے سر ڈھانپا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھیں۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا، ایک درمیانی عمر کی عورت نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے ایک نظر اس عورت کے چہرے پر ڈالی، جہاں سکون کی ایک دبیز تہہ تھی۔ رخسانہ نے ایک نظر گھر پر دوڑائی۔ دو، تین کمروں کا چھوٹا سا گھر لیکن صاف ستھرا۔ صحن میں مختلف پودوں اور پھولوں کے گملے پڑے ہوئے تھے۔ صحن میں چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

عورت نے انھیں ایک صاف ستھری چادر والی چارپائی پر بٹھایا۔ چند ثانیے خاموشی کا راج رہا۔ پھر اسی عورت نے بات کا آغاز کیا۔

"بہن، میں مولوی صاحب کی بیوی ہوں۔ کیا بات کرنی ہے آپ کو ان سے، مجھے بتائیں۔" رخسانہ نے خالی خالی نظروں سے سامنے بیٹھی اس عورت کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا سکون انھیں رشک میں مبتلا کر رہا تھا۔ گلی میں کوئی فقیر گزر رہا تھا۔ اس کی صدا سنائی دی۔

"چھیتی مڑ وے طبیبا نہیں تے میں مر گئی آں
تیرے عشق نے ڈیرا، میرے اندر کیتا
بھر کے زہر پیالہ میں تے آپے پیتا۔"

"مجھے مولوی صاحب سے خود بات کرنی ہے۔" رخسانہ نے فقیر کے چپ کرنے پر جواب دیا۔

"معاف کیجیے گا، مولوی صاحب نامحرم عورتوں سے نہیں ملتے۔" مولوی صاحب کی بیوی نے جواب دیا۔ فقیر نے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔

"تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔"

"لیکن مجھے ان سے ملنا ہے۔ میری زندگی کا سوال ہے۔ خدا کے لیے مجھے ان سے ملنے دو بہن۔" رخسانہ نے لجاجت سے التجا کی۔

"سلطانہ" مولوی صاحب کی بیوی نے اپنا نام بتایا۔

"سلطانہ بہن! خدا کا واسطہ ہے، میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی، مجھے ان سے ملوا دو بہن۔" رخسانہ نے سلطانہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی، فقیر کی صدا بلند ہوئی۔

"چھپ گیا وے سورج، باہر رہ گئی آ لالی
وے میں صدقے تے ہوواں، دیویں مڑ جے دکھالی

پیر ایں بھل گئی آں، تیرے نال نہ گئی آں۔"

"اچھا ......اچھا ......میں ان سے پوچھتی ہوں۔"

سلطانہ اس کی منتوں سے ہڑ بڑا کر اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔ رخسانہ نے آنسو پونچھے۔ فقیر نے پھر صدا لگائی۔

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

چند لمحوں بعد سلطانہ کمرے سے باہر آئی اور رخسانہ کے پاس آ کر بولی۔

"آپ پردہ کرلیں۔ مولوی صاحب آ رہے ہیں۔"

رخسانہ نے چادر کا پہلو سر کا کر چہرہ چھپالیا۔ گھونگھٹ کی وجہ سے ان کا چہرہ مکمل طور پر چھپ گیا۔ فقیر نے زور سے لاٹھی دروازے پر ماری اور صدا لگائی۔

ایس عشق دے کولوں مینوں ہٹک نہ مائے

لاہو جاندڑے بیڑے کیہڑا موڑ لیائے

میری عقل جو بھلی نال مہانیاں دے گئی آں

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

"اسلام علیکم بہن!" مولوی عبدل چارپائی کے ایک سائیڈ پر لا کر رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ سلطانہ نے باورچی خانہ سے ایک کٹوری آٹے سے بھر کر چھوٹی بچی کو دی۔ بچی نے دروازہ کھول کر آٹا فقیر کے تھیلے میں ڈالا۔ رخسانہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر بات شروع کی۔

"مولوی صاحب! بہت آس لے کر آئی ہوں آپ کے پاس۔ بہت پریشان ہوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے حمزہ۔ آتا رہتا ہے آپ کے پاس، جانتے ہوں گے اسے۔"

"جی بہت سعادت مند بچہ ہے۔ مہینے میں ایک بار چکر لگا لیتا ہے۔ ظہر کی نماز اکثر میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ یہ جو گھر کے پیچھے پہاڑی نظر آ رہی ہے۔ میں ادھر جماعت کرواتا ہوں۔ جہاں تک بات رہی آس کی تو میری بہن وہ تو ایک ہی ذات پوری کر سکتی ہے۔ میری کیا اوقات۔ وہی سب کا مالک ہے۔ وہی اللہ، ساروں کی آس، مرادیں پوری کرتا ہے۔" مولوی عبدل نے سر جھکائے دھیرے سے جواب دیا۔ فقیر شاید دروازے کے باہر ہی بیٹھ گیا تھا۔ دوبارہ اس کی صدا سنائی دی۔

ایس عشق دی جھنگی وچ مور بولیندا

رخسانہ نے اس کی صدا کو نظرانداز کر کے بات کو جاری رکھا۔

"مولوی صاحب میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اسے مجھ سے مت چھینیں۔ میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھنا چاہتی۔ آپ اسے منع کر دیں کہ وہ آپ کے پاس نہ آیا کرے۔ یہ جگہ اس کے لیے نہیں ہے۔ جتنے پیسے وہ آپ کو دیتا ہے میں آپ کو دے دیا کروں گی۔ مگر اسے منع کر دیں۔ میری کل کائنات وہی ہے۔" باہر فقیر اب ایک ایک صدا کو بار بار لگا رہا تھا۔

سانوں قبلہ تے کعبہ سوہناں یار دسیندا

چھتی مڑیں وے طبیبا نہیں تے میں مر گئی اں

تیرے محل مینارے نوں میں ٹھوکر ماراں

مرارا الجھن ٹل جائے......

مولوی عبدل کا چہرہ غیرت اور غصے سے سرخ ہو گیا۔ حتیٰ الوسع لہجہ دھیمار کھتے ہوئے بولے۔

"بہن! میں آپ کے بیٹے سے کچھ نہیں لیتا، نہ ہی میں نے کبھی اسے بلایا ہے۔ ہاں البتہ وہ جب بھی آتا ہے ہمارا بھی دل بہل جاتا ہے۔ پھر بھی اگر آپ چاہتی ہیں تو میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔ باقی میں کون ہوتا ہوں کہ آپ سے آپ کا بیٹا چھین لوں۔ سب کچھ اللہ کا ہے۔ وہی دیتا ہے اور وہی لیتا ہے۔ سب نے اسی کی جانب لوٹ کر جانا ہے۔ میں نے تو ویسے بھی اس ہفتے یہ شہر چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اللہ آپ کے بیٹے کو آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کا سبب بنائے۔ آمین۔ چائے پی کر جایئے گا۔ میں زینب کی ماں سے کہہ دیتا ہوں۔ اللہ حافظ۔" مولوی عبدل بات مکمل کر کے کمرے کے اندر چلے گئے۔ سلطانہ تب تک چائے لے کر آ گئی۔ رخسانہ نے سہولت سے اسے ٹالا۔ دل میں تنگی ایک دم سے زیادہ ہو گئی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلیں تو دروازے کے سامنے ایک تھڑے پر فقیر بیٹھا تھیلے میں سے آٹا نکال نکال کر سر پر ڈال رہا تھا۔ رخسانہ نے اس کی جانب دیکھا تو اس نے مٹھی بھر آٹا اس کی جانب اچھالا اور صدا لگانے لگا۔

بلھا شوہ نے آندہ مینوں عنایت دے بوہے

جس نے مینوں پوائے چولے ساوے تے سوہے

جاں میں ماری اے اڈی مل پیا ہے دھیا

جھب دے بوہڑیں وے طبیبا نہیں تے میں مر گیا

رخسانہ کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ رخسانہ نے سر مڑ کر پیچھے دیکھا۔ فقیر گلی میں جھوم جھوم

کرصدا لگا رہا تھا اور تھیلے میں سے مٹھیاں بھر بھر کر ہوا میں آٹا پھینک رہا تھا۔

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

☆☆☆

علی حمزہ کی مولوی عبدل سے ملاقات کے تین دن پہلے

رات بارش کے بعد اب مطلع صاف تھا۔ البتہ فضا میں خنکی بدستور پھیلی ہوئی تھی۔ مولوی عبدل آہستہ آہستہ پہاڑی کے اوپر جانے والے راستے پر چل رہے تھے۔ وہ پچھلے تین سال سے حسن ابدال شہر میں ایک کرایے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ نماز قائم کرنے کی مثال قائم کرنے کے لیے پہاڑی کے درمیان میں ایک قطعہ پر نماز پڑھاتے تھے۔ نماز وہ مسجد میں بھی پڑھا سکتے تھے مگر اس چبوترے پر وہ نماز پڑھانا اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ بہت سے ناعاقبت اندیش لوگ، اولیا کرام کی درگاہوں اور مزاروں پر بدعات میں مصروف تھے تو انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ لوگوں کو سمجھایا جائے۔ اس لیے یہاں آ بیٹھے۔ بہت سارے لوگ ان کے سمجھانے پر سیدھے راستے پر لوٹ آئے تھے۔ ابھی نماز میں کچھ وقت باقی تھا کہ انھوں نے ایک نوجوان کو سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے ہوئے دیکھا۔ شیو بڑھی ہوئی، میلے سے کپڑے زیب تن کیے وہ نیچے آکر چبوترے کے پاس اگے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ مولوی عبدل نماز سے فارغ ہوئے تو اسے وہیں بیٹھے پایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر طبیعت میں اضطراب تھا۔ مولوی عبدل نے مٹکے کا ڈھکن اٹھا کر مٹی کے پیالے میں پانی ڈالا اور اس کے پاس آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''لو بیٹا! پانی پی لو۔'' نوجوان نے آنکھیں کھول کر ان کی جانب دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر پیالہ لے لیا اور پانی پینے لگا۔

''بیٹا! جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اللہ کی رضا میں خوش رہنا چاہیے۔'' نوجوان نے ایک نظر ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔

مولوی صاحب نے بات جاری رکھی۔

''بعض اوقات غم بانٹ لینے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتاؤ کون ہو تم؟ اور کیا ہوا تمہارے ساتھ؟'' نوجوان نے سر جھکائے رکھا۔ چند ثانیے بعد اس کی آواز سنائی دی۔

''میرا نام وجیہی مجتبیٰ ہے۔ ماسٹرز کر رہا ہوں سوشیالوجی میں، پچھلے سال اسلام آباد میں ہی ایک لڑکی سے میری شادی نامساعد حالات میں ہوئی تھی۔ اس شادی میں میری رضامندی شامل نہیں تھی۔ میری ماں بھی اس شادی سے خوش نہیں ہوئیں، مگر میں پھر بھی اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔'' ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ بہت سارے پتے درخت سے ٹوٹ کر گرے۔

''میری ماں نے شرط رکھی کہ ان کی ناراضگی تب دور ہو گی جب میں اسے طلاق دوں گا۔ میں اس سے متعلق بابا سے بات کر ہی رہا تھا کہ اس نے سن لیا۔ اس بات کو اس نے ایسا دل پر لیا کہ اس کی موت واقع ہوئی۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ میں اس سے کتنی محبت کرنے لگا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پھر ایک دن یونیورسٹی میں ایک سیمینار کے دوران ایک پروفیسر نے بتایا کہ کچھ لوگ مرے ہوئے لوگوں سے ملاقات کروا سکتے ہیں۔ تب سے میں کوئی ایسا بندہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ جو میری اس سے ملاقات کروا دے تو میں اس سے معافی مانگ لوں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں مگر میں اسے بتا نہیں سکا۔''

مولوی عبدل اس کی باتیں حیرت زدہ انداز میں سنتے رہے۔ یہ ان کی زندگی میں سب سے عجیب واقعہ تھا کہ کوئی کسی مرے ہوئے سے ملنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ یہ جانتا تھا کہ جو لوگ مر جاتے ہیں ان سے دوبارہ ملاقات ممکن نہیں۔ انھوں نے پیار سے اس کے بالوں کو سہلایا اور بولے۔

''بیٹا! موت تو اللہ کے اذن سے آتی ہے۔ جو ایک دفعہ اس دنیا میں آیا ہے اسے موت کا مزا تو چکھنا ہے۔ کوئی جلدی چلا جاتا ہے تو کوئی دیر سے۔ مگر یہ بات تو غلط ہے کہ مرے ہوئے انسان سے ملاقات کی جا سکتی ہے۔'' ان کی بات سن کر وجیہی نے ان کی جانب دیکھا اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے بولا۔

''میرے لیے دعا کریں۔ میری جھولی بھر دیں۔ میں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

"بیٹا! اللہ سے مانگو۔ اللہ پاک قرآن مجید میں فرماتے ہیں "جو مانگنا ہے مجھ سے مانگو، صرف میں ہی تمہاری دعاؤں کو قبول کرتا ہوں۔ (سورۃ مومن، آیت ٦٠)" پھر ایک انسان دوسرے انسان کی جھولی کیسے بھر سکتا ہے؟ اللہ سے مانگو جو مانگنا ہے۔ وہ تمہاری جائز حاجات کو پورا کرے گا۔ باقی کوئی تمہاری دعا نہیں قبول کر سکتا۔"

وجہی نے ان کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

"میں آپ کے در کا فقیر بن جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹا! اللہ پاک فرماتے ہیں۔ "اے لوگو! تم صرف میرے در کے فقیر ہو۔ (سورۃ فاطر، آیت ١٥)" تو کوئی کسی انسان کے در کا فقیر کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ کے در کے فقیر بنو، وہ تمہارے سارے درد دور کر دے گا۔" مولوی عبدل کا لہجہ سخت تنبیہ لیے ہوئے تھا۔ نوجوان نے اپنی دھن میں بات جاری رکھی۔

"آپ میری کشتی پار لگا دیں، ورنہ میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔" اس کی بات سن کر مولوی عبدل نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور زور سے بولے۔

"بیٹے! اللہ پاک قرآن میں فرماتے ہیں۔ "جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں۔ (سورۃ العنکبوت، آیت ٦٥)" اور اللہ پاک فرماتے ہیں "اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے انسانوں سے کہ تمہارے نفع اور نقصان کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ (سورۃ جن، آیت ٢١)" تو صرف اللہ سے مانگو، صرف اللہ سے...... بس وہی کشتی پار لگاتا ہے کوئی انسان نہیں۔"

وجہی نے حیرت سے ان کی جانب ایسے دیکھا، جیسے ابھی نیند سے جاگا ہو۔ حقیقت تو یہی تھی کہ وہ ابھی غفلت کی نیند سے اٹھا تھا۔ مولوی عبدل کے الفاظ میں کچھ ایسا تھا کہ وہ ٹھٹک کر انھیں دیکھنے لگا۔ مولوی عبدل نے پیار سے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

"کہو بیٹا اللہ ایک ہے۔ محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور وہ بھی آخری رسول، ان کے بعد اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ وہی اللہ ہے جو سب کے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ ہم سارے اسی کے در کے فقیر ہیں۔ وہی ہماری مرادوں کو پورا کرتا ہے۔ ہماری کشتیوں کو پار لگانے والا، جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ جو نہ کسی کا بیٹا ہے، نہ اس کا کوئی بیٹا ہے، نہ ہی اس کی کوئی بیوی ہے۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ ہی نیند۔ وہی نعمت دیتا ہے وہی نعمت لے لیتا ہے۔ کبھی انسان کو دولت سے آزماتا ہے، کبھی اولاد سے، کبھی کسی اور طریقے سے۔ تو پھر کیوں ناشکری کرتے ہو۔ اچھے بھلے سمجھدار ہو کر بھی ناسمجھی والی باتیں کر رہے ہو۔ جو اس دنیا سے چلا جاتا ہے وہ دوبارہ کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ جاؤ اس کی مغفرت کی دعا مانگو۔ جعلی لوگوں کے چنگل میں کیوں پھنسے ہو۔ ماں زندہ ہے تمہاری؟" مولوی عبدل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سختی سے دباتے ہوئے پوچھا۔

"جی ماں زندہ ہیں۔" اس نے دھیمے سے جواب دیا۔

"جاؤ ماں کی خدمت کرو۔ اس کو ناراض مت کرو۔ مائیں ویسے بھی بچوں سے کبھی خفا نہیں ہوتیں۔ البتہ کبھی کبھی وقتی طور پر غصہ کر جاتی ہیں۔ خود سوچو اب اس کا کیا حال ہوگا۔ جاؤ اپنے ماں، باپ کی خدمت کرو۔ اللہ سے لو لگاؤ۔ تمہارے دل کو سکون ملے گا۔" وجہی نے ان کی باتیں سن کر ایسے سر ہلایا جیسے ساری باتیں سمجھ گیا ہو۔ آہستہ آہستہ اٹھا اور مولوی عبدل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ نے میرے دل پر پڑی ہوئی دھول کو صاف کر دیا ہے۔ جس آگ میں، میں پچھلے چھ مہینے سے جل رہا ہوں۔ وہ آپ نے ایک لمحے میں بجھا دی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ چلتا ہوں۔ ماں انتظار کر رہی ہو گی۔" مولوی صاحب نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کا کندھا سہلاتے ہوئے بولے۔

"سب اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ انسان کا کوئی کمال نہیں۔ صرف اس بات کو ذہن نشین کر لو۔" وجہی نے ان کی بات سن کر سر ہلایا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"جو مانگنا ہے مجھ سے مانگو، صرف میں ہی تمہاری دعاؤں کو قبول کرتا ہوں۔"

"اے لوگو! تم صرف میرے در کے فقیر ہو۔"

"اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے انسانوں سے کہ تمہارے نفع اور نقصان کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔"

☆☆☆

وجی اور علی حمزہ کی مولوی عبدل سے ملاقات کے دو ماہ بعد

یونیورسٹی ہال طلباء و طالبات سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ سالانہ ڈرامہ فنکشن شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ حمزہ نے موبائل پر میسج لکھتے ہوئے وجی سے پوچھا۔

''نومی نہیں پہنچا ابھی تک؟''

''نہیں ابھی تک تو نہیں آیا۔ پتہ نہیں کہاں رہ گیا ہے۔'' وجی نے ہال کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آنٹی سے مل آئے ہو؟ ذیشان بھائی کا اور انکل کا کیا حال ہے؟'' حمزہ نے اس سے گھر والوں کی خیریت دریافت کی۔

''ماشاءاللہ، سارے ٹھیک ہیں۔ اماں، بابا سارے۔ ذیشان بھائی کی شادی ہونے والی ہے۔ دعوت نامہ تمہیں مل گئے نہیں۔'' حمزہ نے ہلکا سا سر کو خم دیا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''یار وجی میں تو کہتا ہوں ذیشان بھائی کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی ہو جاتی تو اچھا ہے۔ ویسے بھی ہمارا ماسٹرز مکمل ہونے والا ہے۔ پہلے جو ہوا وہ تو اب نہیں لوٹ سکتا مگر تمہیں اب نئے سرے سے زندگی شروع کرنی چاہیے۔'' حمزہ کی بات سے اس کے چہرے پر پتھروں جیسی سنجیدگی پھیل گئی۔ اس نے حمزہ کو دیکھا تو وہ تھوڑا گڑبڑا گیا۔

''ابھی نہیں حمزہ! ابھی میں دوبارہ وہ تجربہ نہیں دہرانا چاہتا۔ میں بڑی مشکل سے نارمل لائف کی طرف لوٹا ہوں۔ ابھی مجھے کچھ وقت چاہیے۔ ویسے بھی ماسٹرز کے بعد میں جاب کرنا چاہتا ہوں کچھ عرصہ۔''

حمزہ نے اس کی بات مکمل ہونے پر اثبات میں سر ہلایا اور پھر موبائل کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ تمہاری خالہ انتظار کر رہی ہوں گی۔ تمہاری منگیتر بھی۔''

''وہ کسی کا انتظار نہیں کر رہے۔ خالہ نے گل کی شادی دو مہینے پہلے کر دی ہے۔ آخر وہ کیوں اپنی بیٹی کی شادی کسی پاگل سے کرتیں۔ انھوں نے تو انتظار ہی نہیں کیا۔'' وجی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ! چلو کوئی بات نہیں خیر ہے اس کام میں بھی کوئی مصلحت ہی ہو گی۔''

حمزہ نے حتیٰ الوسع ماحول میں چھائی کشیدگی دور کرنے کی کوشش کی اور اسی وقت ڈرامہ شروع ہونے کا اعلان ہونے لگا تو دونوں سر جھٹک کر اس طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

رخسانہ لان میں بیٹھی تھیں۔ شام کی چائے کا وقت ہو رہا تھا۔ تبھی گیٹ کھلا اور حمزہ کی کار اندر داخل ہوئی۔ حمزہ نے ماں کو لان میں بیٹھے دیکھا تو چابی گھماتا ہوا اسی طرف آ گیا۔

''اسلام علیکم ممی!'' حمزہ نے رخسانہ کو سلام کیا اور جھک کر اپنا چہرہ ماں کے قریب کیا۔ رخسانہ نے اس کے گال پر بوسہ دیا اور پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''وعلیکم اسلام! کیسے ہو بیٹا؟''

''ٹھیک ہوں جی۔'' حمزہ ٹیبل کے گرد دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تمہارا دوست کیسا ہے؟ کافی دنوں سے تم نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔'' رخسانہ نے چائے کپ میں ڈال کر اس کے سامنے رکھی۔ ''ٹھیک ہے وہ بھی۔ گھر گیا ہوا ہے۔ اس کے بھائی کی شادی ہے۔ مجھے بھی انویٹیشن کارڈ دیا ہے۔ ولیمہ پر جاؤں گا۔'' حمزہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''جاتے ہوئے بوتیک سے دو، تین سوٹ لے جانا۔ میری طرف سے تحفتاً دینا۔ یا میں شام کو جاؤں گی تو لے آؤں گی۔'' رخسانہ نے بیٹے کے پرسکون چہرے کو دیکھا۔ دور ذہن کے پردوں پر سلطانہ کا چہرہ ابھر کر معدوم ہو گیا۔

''جی بہت بہتر۔'' حمزہ نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا اور لان میں لگے کنگی پام کو دیکھنے لگا۔

''حمزہ! تم نے جاب کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' رخسانہ نے سوال داغا۔

''ممی! انسداد منشیات ڈیپارٹمنٹ میں اسامیاں آئی

ہوئی ہیں۔" حمزہ کا جواب سن کر رخسانہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"نہیں حمزہ! میں تمہیں پولیس وغیرہ کی نوکری نہیں کرنے دوں گی۔ تم کوئی اور جاب کرلو۔ پر اس طرف مت جانا۔" رخشانہ نے سختی سے کہا۔

"کیوں ممی؟"

"بیٹا! میرے پاس ایک تم ہی ہو۔ میری کل کائنات ہو۔ خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ تم ہمیشہ مجھے پریشان کرتے ہو۔ میرے ساتھ بزنس کو سنبھالو۔ یہ کیا نوکری ہوئی کہ ہر وقت زندگی داؤ پر لگی رہے۔" رخسانہ نے اپنے خدشات بتائے۔ حمزہ ان کی باتیں سن کر ہلکا سا مسکرایا۔ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا اور ماں کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پوچھنے لگا۔

"ممی! موت تو بہرحال آنی ہے۔ تو پھر موت اس حالت میں کیوں نہ آئے کہ جب میں خدا کے راستے میں لگا ہوا ہوں۔ اپنے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے اگر میں جان دیتا ہوں تو یہی میری کامیابی ہے۔" بیٹے کی باتیں سن کر رخسانہ نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر رخسانہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

"حمزہ پلیز! فار گاڈ سیک۔ تم ہمیشہ مجھے ٹارچر کرتے رہتے ہو۔ میری بھی خواہش ہے کہ میں بھی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجاؤں، میں بھی تمہاری خوشی دیکھوں بیٹا۔" حمزہ مسکراتا ہوا اٹھ کر ان کے پاس آیا اور ان کی پشت سے ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے پیار سے بولا۔

"میں نے کب منع کیا ہے آپ کو ممی۔ آپ ضرور میری خوشی دیکھیں۔ میں تو صرف بتا رہا تھا کہ اسامیاں آئی ہوئی ہیں۔ شاید اپلائی کروں اور اگر آپ مجھے خوشی سے اجازت دیں گی تو مجھے خوشی ہو گی۔" رخسانہ نے ہاتھ اس کے بالوں میں پھیرا اور کسی احساس کے تحت خود بخود ان کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔ دور سے فقیر کی صدا سنائی دی۔

سانوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار وسیندا

"یہ صدا سن رہے ہو بیٹا؟" رخسانہ نے سر موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی....." حمزہ نے ماں کی بات کا جواب دیا۔

"میں نے اس فقیر کی صدا کے بارے میں بہت سوچا بیٹا! تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے بھی اپنا قبلہ بدلا ہوا ہے۔ میں پندرہ سال سے دراب کا انتظار کرتی رہی۔ تب میرا قبلہ وہ تھے۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ ایسے بات نہیں بن رہی تو میں نے بزنس میں قدم رکھ دیا۔ پھر میرا قبلہ میرا بزنس بن گیا۔ پھر تم بڑے ہوئے تو میرا قبلہ پھر بدل گیا کہ میرے بیٹے کا ایک اپنا مقام ہو۔ مگر اس دن تمہاری باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ میرا قبلہ غلط ہے۔ اگر میں اصل قبلہ کی طرف رجوع کرتی تو مجھے یہ سب کچھ بغیر محنت کے مل جاتا۔ پتہ ہے بیٹا! میں نے اللہ پر توکل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میرا اصل مقصد کیا ہے۔ جاؤ بیٹا! تمہیں اجازت ہے۔ میں تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی، اس ملک کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم ضرور اپلائی کرو۔ ان شاء اللہ تم سلیکیٹ ہو جاؤ گے۔ جاؤ اب وقت ہے کہ تم اس ملک کی خدمت کرو۔" حمزہ نے بھیگی آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

☆☆☆

پہاڑیاں دھند اور بادلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ فضا میں نامانوس سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت چاروں مجاہد آبادی سے دور ایک حویلی کے تہہ خانے میں موجود تھے۔ کرنل شنکر اور کرنل چوپڑا کی آپس کی مڈبھیڑ کے بعد ساری وادی میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ گھر گھر تلاشی لینے کا سلسلہ جاری تھا۔ پوری وادی میں ایک بھی مسلمان گھر ایسا نہ تھا کہ جس کی تلاشی نہ لی گئی ہو۔ یہ حویلی، جس میں وہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ رام داس نامی ایک سکھ کی تھی۔ رام داس عرصہ دراز پہلے وفات پا گیا تھا۔ اب اس کی ماں اس حویلی کی مالکن تھی۔ چندن بائی سیدھی سادھی سی عورت تھی۔ وہ رام داس کے ساتھ کشمیر میں چائے کی پتی کے کاروبار کے سلسلے میں آئی تھی۔ یہاں کافی عرصے تک دونوں آسودگی سے رہتے رہے۔ ہر ماں کی طرح چندن بائی بھی اپنے بیٹے کے سر، سہرا سجانے کی خواہش رکھتی تھی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک شام رام داس گھر واپسی پر پاؤں پھسلنے سے ایک گہری کھائی میں گر کر جان کی بازی ہار بیٹھا۔ رام داس کے چونکہ بھارتی فوج

کے ساتھ دیرینہ مراسم تھے، اس لیے فوجیوں نے اس کی لاش کو اس کے گھر پہنچایا۔ چندن مائی تو اس غم سے نڈھال ہوگئی۔ چندن مائی کو بہتیرا سمجھایا گیا کہ وہ واپس اپنے ملک چلی جائے مگر وہ اس جگہ کو چھوڑنے کو تیار نہ تھی، جہاں اس کا بیٹا فوت ہوگیا تھا۔ اسی دوران اس حویلی کے عقب میں بنی ایک جھونپڑی میں سے پندرہ، سولہ سال کی لڑکی ایک دن اتفاقاً اس طرف آنکلی۔ حویلی کو اندر سے دیکھنے کی خواہش تو اس کے من میں کب سے جاگ رہی تھی۔ اسی وقت چندن مائی کچھ جنگلی پھول جمع کر کے ٹوکری اٹھائے حویلی کے سامنے سے آرہی تھی۔ وہاں ہی اس کی ملاقات اس لڑکی، گل شبانہ سے ہوئی۔ گل شبانہ کا باپ ایک کشمیری مجاہد تھا اور اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا۔ کچھ دن تو گل شبانہ کو چندن مائی کے سکھ ہونے کا پتا ہی نہ چلا۔ اس نے اپنے سینے میں چھپی ہوئی بھارتی فوج کی نفرت کو اور ان کے مظالم کو چندن مائی کے سامنے خوب بیان کیا۔ اس نے اسے اپنے دادا اور اس کے بھائیوں کی شہادت کے دل دوز واقعات سنائے تو چندن مائی کا بھی دل بھر آیا۔ چندن مائی وقت کے ساتھ ساتھ، گل شبانہ کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں کشمیریوں کے لیے نرم گوشہ بن گیا۔ اس لیے وہ وقتاً فوقتاً مسلمان مجاہدوں کی مدد کرتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی ان چاروں مجاہدوں کی یہاں آنے کی وجہ یہی تھی۔ رام داس کی فوج سے مراسم داری کی وجہ سے اس حویلی کی تلاشی بھی نہیں لی جاتی تھی۔ اس ساری صورت کے پیش نظر، شبانہ کے والد نے ایک خفیہ سرنگ اپنی جھونپڑی سے اس حویلی کے تہہ خانے تک بنائی ہوئی تھی، جس کا علم چندن مائی کو بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا۔ کرنل چوپڑا ساری رات، کرنل شنکر کے کورٹ مارشل کی خوشی میں مے نوشی میں مصروف رہا تھا۔ کرنل شنکر پر اس کے فوجیوں کو قتل کرنے کے علاوہ، چوکی پر موجود دو مزید فوجیوں کے قتل کا الزام تھا۔ اب اس کے بھی سارے فوجیوں کو کرنل چوپڑا کی ماتحتی میں کام کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر کا آدھا حصہ کرنل چوپڑا کے زیر انتظام آگیا تھا اور یہ بلاشبہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ کرنل چوپڑا خواب میں میڈل لے رہا تھا کہ اسی وقت پاس پڑے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی کریڈل اٹھایا اور غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔

"ہیلو۔" (کس گدھے کا فون ہے۔ یہ بات اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہی۔)

"سر! ستیش بول رہا ہوں۔ ایک اہم اطلاع دینی ہے۔" دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سنائی دی۔

"ہاں! سن رہا ہوں۔ بولو کیا بات ہے۔ جس کے لیے تم سے صبر نہیں ہوا۔ جلدی بکو۔" کرنل چوپڑا نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"سر رام داس کے گھر کے باہر مشکوک حرکات سامنے آئی ہیں۔" ستیش نے سہمے ہوئے لہجے میں بتایا۔ اس کی بات سن کر کرنل چوپڑا چونک پڑا۔ اس کے ذہن پہ چھائی ہوئی خماری ایک دم اڑنچھو ہوگئی۔ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کیسی مشکوک حرکات؟ جلدی بتاؤ۔ وہاں تو اس کی ماں اکیلی رہتی ہے۔ جلدی بولو۔" کرنل چوپڑا نے چیختے ہوئے کہا۔

"سر! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم وادی کے ہر گھر کی نگرانی کرتے ہیں۔ رام داس کی حویلی کے ساتھ ایک جھونپڑی میں ایک مسلمان رہتا ہے۔ بظاہر تو شفاف آدمی ہے پر پچھلے دنوں اطلاع ملی کہ اس کی بیٹی آج کل رام داس کی ماں چندن مائی سے بہت ملتی ہے۔ اس بات پر میں نے اس حویلی کی نگرانی شروع کروا دی۔ کچھ عرصہ تو سب کچھ ایک دم ٹھیک رہا۔ وہ لڑکی اس کے گھر جاتی اور پھر دونوں جنگل سے لکڑیاں اور جنگلی پھل چن لاتیں۔ لیکن پچھلے دو دن رات کے وقت اس حویلی کے عقب میں کچھ سائے دیکھے گئے ہیں۔ ایک فوجی پٹرولنگ گاڑی میں رات کو گشت کی جا رہی تھی تو رات کے پچھلے پہر اس لڑکی کے باپ کو حویلی سے نکل کر جھونپڑی میں جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ فوراً اس جھونپڑی کی تلاشی لی گئی۔ مگر جھونپڑی خالی تھی۔ چیک پوسٹ سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ اس لڑکی کی دادی کی ڈیتھ ہوئی ہے اور وہ لوگ سرینگر کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ لیکن سر اس سائے کا حویلی سے نکل کر جھونپڑی میں جانا بہت معنی رکھتا ہے کیونکہ جیسے ہی فوجی

اندر گئے وہاں کچھ نہیں تھا۔ حالانکہ وہ آدمی جھونپڑی سے باہر نہیں نکلا۔" ستیش نے تفصیل بتائی۔ اس کی بات ختم ہونے پر کرنل چوپڑا نے ہنکارا بھرا اور بولا۔

"ستیش! فوراً اس حویلی کی تفصیلی تلاشی لو اور مجھے اطلاع دو۔ یہ ضرور آتنک وادی ہوں گے۔ اور ہاں اگر بڑھیا بہت تنگ کرے تو اسے اٹھا کر ہیڈ کوارٹر بھجوا دو۔ لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تم لوگ اس کے علم میں لائے بغیر ساری حویلی کو چیک کرو، کیونکہ اگر اس کے ان لوگوں سے مراسم ہوئے تو تلاشی کی اطلاع انہیں مل جائے گی اور وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔" ستیش نے اس کی بات سن کر اسے ایک گھنٹے کے اندر اطلاع دینے کا کہا۔ کرنل چوپڑا کچھ دیر تک کریڈل کو دیکھتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ اس نے کریڈل رکھا اور چپل پہنے بغیر اٹھ کر وارڈ روب میں سے اپنا یونیفارم نکال کر غسل خانے میں گھس گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو فوجی یونیفارم میں تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر سے اس نے کیپ اٹھائی اور وہیں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی نے کمرے کا سکوت توڑا۔ اس نے فوراً کریڈل اٹھا کر کان کے ساتھ لگایا۔

"سر ستیش اسپیکنگ!"

"ہاں ستیش کیا رپورٹ ہے؟" کرنل چوپڑا نے بیقراری سے پوچھا۔

"سر خدشہ ٹھیک نکلا۔ ہم نے ساری حویلی کی تفصیلی تلاشی لی۔ وہاں تہہ خانے میں ایسے آثار موجود ہیں جیسے یہاں پر چار آدمی رہتے رہے ہیں۔ ہم نے بڑھیا کو جگا کر پوچھا۔ مگر وہ مسلسل انکاری ہے کہ وہاں کوئی تھا۔ اسی وقت تہہ خانے سے ملحقہ ایک خفیہ سرنگ کی موجودگی کی اطلاع ملی۔ اس کے علاوہ تہہ خانے کے عقب میں سیڑھیوں کے ساتھ ایک اور دروازہ بھی ملا۔ جس سے لگتا ہے کہ بڑھیا کو واقعی کچھ پتا نہیں۔"

ستیش نے جلدی جلدی تفصیل بتائی۔ ساری بات سننے کے بعد کرنل چوپڑا نے سر ہلایا اور بولا۔

"گڈ ستیش! تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ فوراً سرینگر چیک پوسٹ پر حکم دو کہ ان لوگوں کو ڈھونڈیں کہ کہاں گئے ہیں۔ اس بڑھیا کو یہاں سے فوراً واپس دیش بھیج دو۔ تشدد سے تو یہ مر جائے گی، میں اس کے لیے کوئی اور طریقہ سوچتا ہوں۔ حویلی میں خفیہ طریقے سے پہرا لگوا دو۔ میں خود بھی آ رہا ہوں۔" بات ختم کر کے کرنل چوپڑا نے کریڈل رکھا اور کمرے سے باہر آ کر ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد ان کی گاڑی چھاؤنی سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

چاروں مجاہد اس وقت ایک جھونپڑی کے نیچے بنے تہہ خانے میں بیٹھے تھے۔ یہاں بھی شبانہ کے والد کی وجہ سے وہ پہنچے تھے۔ انھوں نے جس دن چندن مائی کی حویلی سے کوچ کیا تھا اس دن ہی گل شبانہ اور اس کے اہل خانہ کو گھر چھوڑنے کا کہہ دیا تھا۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی دن گل شبانہ کی دادی فوت ہو گئیں۔ یہ جگہ ایک کشمیری مجاہد حامد نصیر کی تھی۔ دوپہر آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ اطلاع ملی تھی کہ رات کو گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے سے ایک چھوٹا کانوائے گزرنے والا تھا۔ آج وہ لوگ اس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے تاکہ بھارتی فوجی اس طرف متوجہ ہو جائیں تو وہ چھاؤنی کے اندر والا اسلحہ ڈپو تباہ کر سکیں۔ باری باری چاروں باہر پہرہ دے رہے تھے۔ امیر اندر داخل ہوا تو دوسرے ساتھی نے ایک کاغذ تہہ کر کے جیب میں ڈالا اور امیر کے لیے جگہ بنائی۔

"بیٹھے رہو حسن! میں اس طرف بیٹھ جاؤں گا۔" امیر نے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔

"ظفر کہاں ہے؟" حسن نے امیر کی جانب دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"وہ باہر پہرہ دے رہا ہے؟ کیا پڑھ رہے تھے؟" امیر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس اثناء میں دروازہ کھلا اور ایک اور نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی، جس کے اوپر تین پیالے رکھے تھے تینوں پیالوں میں قہوہ تھا۔ ساتھ ایک چھوٹی سی طشتری میں میٹھی ٹافیاں اور گڑ تھا۔ اس نے ایک، ایک پیالہ اٹھا کر دونوں کو پکڑایا اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

"کوئی نہیں آپ کی بھابی کا خط پڑھ رہا تھا۔ جب ہم یہاں آئے تھے اسی دن مجھے ملا تھا۔ آپ کو تو پتہ ہے نا کہ جہاں ہماری پہلے پوسٹنگ تھی وہاں موبائل سگنلز نہیں آتے تھے تو وہ خط لکھ کر حالات سے آگاہ کر دیتی تھی۔ اس میں لکھا

ہے کہ اس نے احمد کی بسم اللہ کروا دی ہے۔"

"احمد تمہارا بیٹا ہے حسن؟" آنے والے نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں! بیٹا ہے میرا۔ چھ سال کا ہونے والا ہے ماشاء اللہ۔" حسن نے جواب دیا۔

"بہت محبت کرتے ہوئے بیوی بچے سے۔" امیر نے پوچھا۔

"محبت کیا ہوتی ہے؟ یہ تو اس کی ماں نے مجھے سمجھایا ہے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں اس سے نہیں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے تو محبت اس لیے ہوگئی ہے کہ وہ میرے بیٹے کی ماں ہے۔" حسن نے تنکے سے فرش پہ لکیریں ڈالتے ہوئے کہا۔

دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اس بات کا کیا مطلب ہوا؟" امیر نے پوچھا۔

"بس! اب کیا بتاؤں آپ کو۔ بڑی عجیب سی کہانی ہے میری، میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی۔ جس کے بوجھ تلے میں آج تک دبا ہوا ہوں۔" بات کے اختتام پر اس کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔ امیر نے اٹھ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اسی لمحے باہر بادل گرجنے کی آواز سنائی دی۔

"بعض اوقات اپنا دکھ کسی سے بانٹ لینے سے انسان کو سکون مل جاتا ہے۔ انسان تو خطا کا پتلا ہے۔ غلطی کرنا تو اس کی فطرت میں لکھا ہے۔ اگر تم برا نہ مناؤ تو ہم سے اپنا دکھ بانٹ سکتے ہو۔" امیر نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے بی کام کر کے بینک میں نوکری شروع کی تھی۔ ہمارے ڈائریکٹر صاحب کے بنگلے میں ایک ڈنر تھا۔ وہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا، وہ اتنی اداس نظر آ رہی تھی کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ مصیبت میں ہے۔ خیر بات چیت ہوئی اور اس نے اپنے ماضی کے متعلق بتایا۔ وہ اپنے ماضی سے فرار چاہتی تھی۔ اس کی ماں اسے زبردستی محفل کی جان بنانا چاہتی تھی، مگر وہ اس کام سے انکاری تھی۔ ڈانس پارٹی کے بعد میں نے اس کی گاڑی کا نمبر دیکھ لیا اور کچھ دن بعد ہی اس کے گھر جا پہنچا۔ مجھے جب بھی بینک سے تنخواہ ملتی میں اس کے گھر پہنچ جاتا۔ وقت گزرتا گیا اور وہ مجھ پر مکمل اعتبار کرنے لگی۔ ایک دن اس نے مجھے کہا کہ میں اسے بھگا کر لے جاؤں، ورنہ وہاں نہ آیا کروں۔ میں نے سوچا کہ وہ میرے لیے سونے کی چڑیا ثابت ہوسکتی ہے، اگر میں اسے اغوا کرلوں تو میں اس کی ماں سے ڈھیر ساری رقم نکلوا سکتا ہوں۔ اب جبکہ وہ خود کہہ رہی تھی تو میں نے اس کی بات مان لی۔ میں اسے لے کر ایک رہائشی کالونی کے زیر تعمیر فلیٹس میں لے گیا جو کہ میرے دوست کی ملکیت تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس کی ماں سے پیسے لے کر اسے واپس پہنچا دوں گا۔ مگر یہاں مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا تھا، نہ جانے کس احساس کے تحت میں نے اسے ڈرایا کہ میں اس سے دھوکا کر رہا ہوں اور وہاں سے نکل آیا۔ مگر جب میں واپس گیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا رہا۔ میں حیران تھا کہ وہ اتنی اونچی عمارت سے نیچے کیسے اتری۔ مگر میں نہ سمجھ سکا۔ مجھ پر خوف طاری ہوگیا اور میں نے سارا سامان اکٹھا کیا اور فلیٹس کو تالا لگا کر نکل گیا۔ مگر وہ دن اور آج کا دن میں ایک خوف میں مبتلا رہا۔ ہر وقت ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کہ اس کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں نفسیاتی مریض بنتا گیا۔ میں نے بینک کی نوکری چھوڑ دی اور واپس اپنی ماں کے پاس دوسرے شہر چلا گیا۔ وہاں میں نے دوبارہ نوکری تو شروع تو کر دی، مگر ایک انجانا خوف ہر وقت میرے ساتھ چمٹا رہا۔ ماں کو کسی نے مشورہ دیا کہ میری شادی کر دیں۔ انھوں نے رشتہ دیکھنا شروع کیا مگر کوئی بھی مجھے رشتہ دینے پر تیار نہ تھا، پھر انھی دنوں محلے میں ایک ماں، بیٹی نے کرایے کا مکان لیا۔ لڑکی کی ماں کو فالج تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی ماں مر گئی تو ماں نے میری شادی اس کے ساتھ طے کر دی۔ پہلی رات جب میں نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو میرے دل کی دھڑکن جیسے بند ہوگئی۔ کیونکہ وہ اسی کی بہن تھی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں سگی بہنیں نہیں ہیں۔ ان دونوں کو ان کی ماں نے کہیں سے اغوا کیا تھا اور اس کی بہن واپس ان کے پاس نہیں گئی تھی۔ جب اس کی ماں کو فالج ہوا تو اسے پتا چلا کہ اس کی بہن کسی چوہدری کی بیٹی ہے، اور وہ خود شہر کے مشہور سرجن کی بیٹی ہے۔ جسے اس عورت نے اغوا کر لیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن ہم دونوں اسے

ڈھونڈتے رہے، مگر وہ ہمیں نہیں ملی۔"

"نام کیا تھا؟" امیر نے حسن کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماہ جبیں، اس کا نام ماہ جبیں تھا۔" حسن نے جھکے سر کے ساتھ جواب دیا۔ اسی لمحے باہر بہت زور سے بادل گرجے اور بارش شروع ہوگئی۔ امیر کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا نوجوان بھی جیسے کسی ٹرانس سے باہر نکل آیا اور حیرت سے عارب حسن کی جانب دیکھنے لگا۔ وجہی مجتبیٰ (امیر) چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

عارب نے حیرت سے اسے باہر جاتے دیکھا اور پھر سامنے بیٹھے حمزہ کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"انھیں کیا ہوا؟"

"ماہ جبیں، وجہی کی بیوی تھی۔ جب وہ وہاں سے نکلی تھی تو ہم سے ٹکرا گئی۔ بعد میں وجہی کی شادی اس سے ہوئی تھی۔" حمزہ نے دھیرے سے جواب دیا۔ اب زلزلے کی زد میں آنے کی باری اس کی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ آٹھ سال پہلے فوت ہوچکی ہے۔" حمزہ نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بادل زور سے گرجے اور بارش تیز ہوگئی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہلتے دروازے کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

بارش اور سخت سردی میں وہ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ دماغ پراگندہ خیالات کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ تبھی عارب نے آکر دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر سر جھکا کر زمین پر پڑی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو دیکھنے لگا۔ عارب وہیں اس کے سامنے پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ چند ثانیے اس کی جانب دیکھنے کے بعد بولا۔

"سر! ناراض ہوگئے ہیں مجھ سے۔ آج اتنے سال بعد مجھے سکون ملا ہے یہ جان کر کہ وہ آپ کے پاس تھی۔ اب میں فائزہ کو بتا سکوں گا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں تھی اور اس نے انھیں ہاتھوں میں دم توڑا ہے۔ وہ خود نہ سہی ہم از کم اس کی قبر پر ہی حاضری دے لیا کریں گے۔"

وجہی نے اس کی بات سن کر سر اٹھایا اور سرخ آنکھوں سے ان کی جانب دیکھا۔

"نہیں حسن! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں تو اپنے آپ سے ناراض ہوں۔ دیکھو میرے اللہ نے کیسے مجھے بتا دیا کہ وہ مجھ سے کتنے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ میں تو آج تک اس کی ناقدری کے گناہ کی وجہ سے بھٹک رہا ہوں۔ بس تم دعا کیا کرو کہ مجھے منزل مل جائے۔ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔ اس کا تمہارے ساتھ نکلنا۔ پھر ہمارے ساتھ ٹکرا جانا، ہماری شادی اور پھر اس کی موت تو صرف ایک بہانہ تھی ہماری زندگیوں کو بدلنے کے لیے۔ ہم خدا سے غافل بیٹھے تھے۔ اس کی موت سے آج ہم یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں اور شاید جس مشن پر ہم ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے سارے گناہ دھل جائیں۔" وجہی نے بات ختم کی تو عارب نے سر ہلایا۔ دونوں کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھری اور دونوں آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

"اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ رات کو ہم نے اپنا پہلا مشن بھی پورا کرنا ہے۔" عارب نے وجہی کو یاد دہانی کروائی اور دونوں ٹھکانے کی جانب چل دیئے۔

☆☆☆

رات کافی گہری تھی۔ بارش مغرب کے بعد سے رکی ہوئی تھی۔ وہ چاروں دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے اس وقت پہاڑی درے کے ساتھ ایک قدرتی غار کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ اس غار کی نشاندہی حامد نصیر نے کی تھی۔ اس نے پچھلا پورا دن لگا کر اس غار میں اسلحہ وغیرہ رکھ دیا تھا۔ ان چاروں کی پشتوں پر بڑے بڑے بیگ بھی موجود تھے اور منہ نقاب سے ڈھکے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں ظاہر تھیں۔ انھوں نے اس وقت بھارتی فوجیوں کی یونیفارم زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چاروں غار میں دم سادھے بیٹھے تھے۔ تبھی وجہی نے ان کی جانب دیکھا اور دھیمی آواز میں انھیں منصوبہ بتانے لگا۔

"میں نے پلان میں تھوڑی سی تبدیل کر دی ہے۔ جیسے ہی کانوائے پہاڑی درے سے گزرے گا۔ ایک ساتھی درے کے ساتھ چوٹی سے ایک بڑا پتھر لڑھکا دے

گا۔ جس سے لامحالہ کانوائے تھوڑی دیر کے لیے رک
جائے گا۔ اس پر انھیں شک اس لیے بھی نہ ہوگا کیونکہ بارش
کی وجہ سے یہاں پہاڑوں پر لینڈ سلائیڈنگ معمول کی
بات ہے۔ جس دوران کانوائے رکے گا۔ میں ان میں
سے کسی گاڑی پر سوار ہو جاؤں گا، کیونکہ چھاؤنی میں داخل
ہونے کا اس سے بہترین کوئی حل نہیں۔ یہاں اگر ہم
کانوائے کو تباہ کرنے کا سوچیں گے تو ہم ایک، دو گاڑیوں یا
ٹرکوں کو تباہ کر سکیں گے۔ جبکہ ہمارا اصل ٹارگٹ چھاؤنی
کے اندر موجود اسلحہ ڈپو ہے۔ چھاؤنی میں داخل ہونے کے
ساتھ ہی میں آپ کو ریڈ کاشن دوں گا۔ آپ نے مجھے بیک
اپ دیتے ہوئے یہاں سے واپس نکلنا ہوگا۔ کیونکہ ہماری
چھٹیاں بھی ختم ہونے والی ہیں۔ ہم نے دوبارہ حاضر سروس
بھی ہونا ہے۔ اگر حکومت کو ہمارے اس مشن کے متعلق پتا
چلتا ہے تو ہمارا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔" اس کی بات سن
کر سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سر! آپ مجھے اجازت دیں، میں پہاڑی پر سے پتھر
گراؤں گا۔ جب مجھے مجاہدین ساتھ لے گئے تھے تو انھوں
نے وہاں ہمیں نہتا ہونے کی صورت میں پتھروں کو استعمال
کرنے کی ٹریننگ بھی دی تھی۔" بات سن کر وجی نے
اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر دھیان رہے کہ سامنے والی چوٹی
پر فوجی چوکی موجود ہے۔ ان کی نظروں میں آئے بغیر یہ کام
کرنا ہے۔ میں نیچے درے میں جا کر بیٹھتا ہوں۔ ہمارے
پاس وقت بہت کم ہے۔ واکی ٹاکی سیٹ اور ٹرانسمیٹر بھی
اپنے ساتھ رکھ لو۔ ہمیں فل کوآرڈینیشن کے ساتھ کام کرنا
ہے۔ اسلحہ وغیرہ جو ضرورت ہے وہ اٹھا لو۔"

ساروں نے ہولسٹر کے ساتھ اسلحہ بھرنا شروع کر
دیا۔ وجی نے چھوٹے چھوٹے پینسل کے سائز کے بم اٹھا
کر جیب میں ڈالے اور غار سے نکل کر درے کی جانب
بڑھنے لگا۔ درے کے درمیان میں کچا راستہ تھا۔ یہ راستہ عموماً
فوجیوں کے استعمال میں ہی رہتا تھا، اس لیے جگہ کافی سخت
ہو گئی تھی۔ البتہ ایک طرف جہاں درہ تھوڑا تنگ
تھا۔ وہاں بہت ساری جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہ
رینگتا ہوا ان جھاڑیوں کے پاس پہنچا اور دبک کر ان میں
بیٹھ گیا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا کہ چوکی والی پہاڑی کے بالکل
نیچے تھا۔ اس لیے سرچ لائٹ کی روشنی اس سے مخالف سمت
میں ہی جا رہی تھی۔ کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد
اس کی سماعتوں سے گاڑیوں کے انجنوں کی آواز ٹکرائی۔ وہ
فوراً چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ گاڑیوں کی لائٹیں اب دور سے نظر آ
رہی تھیں۔ یہ تعداد میں آٹھ یا نو تھیں جو آہستہ آہستہ چلتی
ہوئی اسی جانب آ رہی تھیں جہاں وہ چھپا ہوا تھا۔ جیسے ہی دو
جیپیں درے کے چوڑے دہانے سے ذرا آگے ہوئیں ایک
بڑا پتھر لڑھکتا ہوا آیا اور آن کی آن میں درے کا دہانہ آدھا
بند ہو گیا۔ گرد و غبار کے بادل چھا گئے۔ فوجی اتر اتر کر درے
کے دہانے کی جانب بھاگے۔ اسی لمحے پہاڑ کی چوٹی پر
موجود چوکی کی سرچ لائٹ بند ہو گئی۔ یہ کام حمزہ کے سپرد تھا
اس نے چوکی پر چلنے والا جنریٹر بند کر دیا تھا۔ وجی نے اس
صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگ کر گاڑیوں
کے درمیان پہنچ کر ٹائروں سے تھوڑا اوپر بم لگانے شروع کر
دیئے۔ یہ ٹائم بم تھے اور ان کے ساتھ مقناطیس لگے
تھے، اسی وجہ سے فوراً لوہے کے ساتھ مضبوطی سے چمٹ
گئے تھے۔ ٹائم اتنا سیٹ کیا گیا تھا کہ چھاؤنی میں پہنچنے کے
پندرہ منٹ بعد دھماکے ہونے تھے۔ تھوڑی دیر میں گاڑیوں
کے انجن دوبارہ سے جاگ اٹھے۔ وجی بھاگتا ہوا آیا اور
ایک خالی ٹرک کی باڈی کے اندر سامان رکھنے والی جگہ پر
گھس گیا۔ اس نے فوراً ٹرانسمیٹر کے ذریعے ساروں کو اپنی
کامیابی کا کاشن دیا۔ گاڑیاں گھنٹہ بھر چلتی رہیں اور پھر ایک
ایسے علاقے میں داخل ہوئیں جو سرچ لائٹوں کی روشنی میں
نہایا ہوا تھا۔ روشنی چھن چھن کر ٹرک کی باڈی کی درزوں میں
سے اندر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ٹرک جامد ہو
گیا۔ اب باہر سے فوجیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں
سنائی دے رہی تھیں۔ اگر وہ اسی وقت سامان نکالنا شروع کر
دیتے تو وہ لامحالہ پکڑا جاتا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں
مانگنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی، اس نے
ڈھکنا اوپر اٹھا کر جھانک کر باہر دیکھا۔ یہ کسی عمارت کی عقبی
جانب تھی۔ جہاں لکڑی کی خالی پیٹیوں کے ڈھیر لگے ہوئے
تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک اونچی چوکی بنی ہوئی
تھی۔ دائیں طرف برآمدہ اور کمرے، جبکہ بائیں جانب
آفس تھے۔ وہ ڈھیر سے باہر آیا اور دبے قدموں پیٹیوں
کی جانب سے ہوتا ہوا برآمدے کی جانب آ گیا۔ برآمدے

کے ساتھ ہی بہت سارے کمرے قطار در قطار بنے ہوئے تھے۔وہ دوڑ کر ایک کمرے میں داخل ہوا۔صد شکر کہ کمرہ خالی تھا۔ابھی وہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا کہ عقبی دروازہ کھلا اور ایک فوجی گنگناتا ہوا اندر داخل ہوا۔اس نے کمرے میں اسے دیکھا تو فوراً چونک کر بولا۔

"کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" وجیہ چیتے کی طرح اس پر جھپٹا اور ایک لمحے میں اس کی گردن توڑ دی۔اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب دیکھا۔سات منٹ رہتے تھے بم پھٹنے میں، وہ جلدی جلدی اس فوجی کی لاش کو دھکیل کر چارپائی کے نیچے کرنے لگا۔اسی لمحے باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور ساری چھاؤنی سائرنوں کی آوازوں سے گونج اٹھی۔اسی لمحے اس کے ٹرانسمیٹر پر کاشن آنے لگا۔اس نے ایک ناب گھمائی تو اسمیں سے عارب کی آواز سنائی دی۔

"سر! ظفر کو گولی لگ گئی ہے سر، وہ شہید ہو چکا ہے۔وہ نظروں میں آ گیا تھا۔"

"ان للہ وانا الیہ راجعون، تم لوگ کہاں ہو اس وقت؟" وجیہ نے جلدی جلدی پوچھا۔

"سر! ہم سامنے پہاڑی پر موجود ہیں سر۔چھاؤنی میں تو ایک ہڑبونگ مچی ہوئی ہے۔" عارب کی آواز سنائی دی۔اسی کے ساتھ حمزہ کی آواز ابھری۔

"وجیہ! بم بلاسٹ ہونے میں تین منٹ رہ گئے ہیں۔تم وہاں سے نکلنے کی کرو۔اسلحہ ڈپو کو ہم پھر کسی وقت تباہ کر دیں گے۔" بات سن کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے ٹرانسمیٹر ہونٹوں کے پاس کر کے بولا۔

"تین منٹ بھی کافی ہیں حمزہ! تم دونوں ایسا کرو فوراً یہاں سے نکل کر نصیر کے گھر پہنچو۔اگر زندگی ہوئی تو دوبارہ ضرور ملاقات ہوگی، اور ہاں عارب سے کہنا کہ واپس جائے تو میری طرف سے احمد کو بہت پیار کرے اور اسے اس پاک سرزمین کے لیے سرمایہ بنائے۔میرے پاس وقت کم ہے اس لیے میں ٹرانسمیٹر یہیں پھینک کر جا رہا ہوں۔" اس نے دوسری جانب سے حمزہ کی بات سنے بغیر ٹرانسمیٹر بند کیا اور فرش پر رکھ کر اس پر بوٹ کی ایڑی رکھ کر توڑ دیا۔اسی لمحے باہر سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔اس نے ارد گرد دیکھا۔سامنے کھڑکی کے پٹ کھولے اور اس پر پاؤں رکھ کر روشن دان تک آیا۔خوش قسمتی سے روشن دان میں لوہے کے سریے نہیں لگے تھے۔اس نے خود کو اسمیں سے باہر نکالا۔چھاؤنی میں ایک قیامت آئی ہوئی تھی۔اس نے ایک نظر ارد گرد دیکھا تو ایک جگہ زمین میں ابھار نظر آیا۔یقیناً یہی اسلحہ ڈپو تھا۔اس نے جیب سے بم نکالے اور ان پر ایک منٹ کا ٹائم سیٹ کیا اور ڈپو کی جانب دوڑ لگا دی۔بہت سارے فوجی اس کی جانب دوڑے۔گولیوں کی تڑتڑاہٹ اسے کانوں کے پاس سنائی دیں۔مگر وہ زگ زیگ انداز میں دوڑتا چلا گیا۔پہاڑی کی چوٹی سے فائرنگ ہونے لگی، اس نے ایک نظر مسکرا کر اس پہاڑی چوٹی کی جانب دیکھا اور مزید تیز دوڑنے لگا۔اس کی گھڑی پر ایک منٹ باقی تھا۔اچانک ایک گولی اس کی ٹانگ کو چیر کر دوسری طرف سے نکل گئی۔وہ لڑکھڑا کر گرا، شکر ہے کہ گولی صرف گوشت کو پھاڑ کر نکلی تھی۔اس نے ہمت مجتمع کی اور دوبارہ اٹھ کر دوڑنا شروع کر دیا۔فوجی اور گولیاں چاروں طرف سے اس کی جانب آ رہی تھیں۔دو گولیاں اسے کندھے میں لگیں، مگر وہ پھر بھی دوڑتا رہا۔ایک غیبی طاقت تھی جو اسے دوڑا رہی تھی۔اس نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا آخری بیس سیکنڈ تھے۔اسی لمحے ایک اور گرم سلاخ اسے ٹانگ اور پیٹ میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔اس نے سامنے ڈپو کے روشن دان کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا بم اس روشن دان کے اندر گرا دیا۔گولیاں اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔اس نے گھڑی کو بند ہوتی نظروں سے دیکھا۔آخری سیکنڈ گزر چکا تھا۔اس نے سامنے دیکھا، ایک حسین وادی اور اسمیں لگے سنہرے پھولوں کی خوشبو کے جھونکے اس کی جانب آ رہے تھے۔اس نے مسکرا کر ان خوشبوؤں کا استقبال کیا۔اسی لمحے ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے تین مزید دھماکے ہوئے۔چھاؤنی میں ایک بھونچال آ گیا۔اسی لمحے اسلحہ ڈپو کے اندر پھینکے جانے والے بم کا ایسا دھماکا ہوا کہ وادی گونج اٹھی۔اسی کے ساتھ اس کا جسم دھماکے کے ساتھ نور کے کہیں ہالوں میں بٹ گیا۔

جویریہ سلیم

آزادی ایک نعمت ہے عطیہ خداوندی ہے، آزادی کے معنی کیا ہیں یہ ان سے پوچھیں جنہوں نے آگ وخون کا دریا پار ہو، جنہوں نے ہر ہر پل موت کا منہ دیکھو ہو۔

آزادی کے حوالے سے ایسی تحریر جسے پڑھ کر آپ کی آنکھیں بے ساختہ بھیگ جائیں گی

میری عمر پندرہ سولہ سال ہوگی جب میں نے ہندوستان کے کے گلی کوچوں میں یہ نعرے سنے۔ ''لے کے رہیں گے پاکستان۔'' یہ مسلمانوں کا نعرہ تھا۔

''پاکستان کو بنادیں گے قبرستان۔'' یہ سکھوں اور ہندوؤں کا نعرہ تھا۔

میں جب ''پاکستان زندہ باد'' اور لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نعرے سنتی تو میرے من میں بھی جذبہ آزادی بیدار ہوجاتا اور میں گھر کی چار دیواری کے اندر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگتی۔ میں دن رات جاگتے ہوئے بھی سوتے ہوئے بھی پاکستان زندہ باد کے الفاظ سنتی اور ساتھ ہی آزادی کے خواب بھی دیکھتی۔

وہی زمانہ تھا وہی لوگ تھے۔ گلیاں بازار مرغزار سب وہی تھے' وہی اللہ دین حلوائی کی دکان' برابر میں تائی اللہ رکھی کا مکان' سامنے بڑا سا کھیل کا میدان' میدان کے اس طرف مسجد' مسجد کے اندر اور باہر ہزاروں پروانوں کا اجتماع۔ نعرے پر نعرہ۔ ''بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ بن کے رہے گا پاکستان۔''

نعروں کی گونج سے دھرتی کانپ رہی تھی۔ شاید فلک بھی تھرتھرا رہا ہو۔

جانے میرے دل کو کیا ہوا...... میں بھی جھٹ سے ہجوم میں داخل ہوگئی۔ اس ہجوم کے درمیان ایک بڑی سی تصویر تھی۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا۔

''یہ تصویر کس کی ہے بھائی؟''

''قائداعظم محمد علی جناح۔'' کی اس نے مکا تان کر کہا۔

میں ڈر کر پیچھے بھاگی لیکن مکا تو وہ ہندو بنئے اور ولایتی حاکموں کو دکھا رہا تھا۔ میں نے بھی دونوں مکے تان لیے اور ایڑیاں اٹھا کر زور سے نعرہ لگایا۔

''پاکستان زندہ باد'' ساری فضا گونج اٹھی۔ ''پاکستان زندہ باد...... زندہ و پائندہ باد۔'' پھر مسلمان کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے۔ مسلمانوں کی دہاڑ سے تقدیر بھی تو خوف کھاتی ہے۔ بنیا اور انگریز کیوں نہ جھکتے وہ جھک گئے اور غلامی کی سیاہ شب کٹ گئی۔ 14 اگست 1947ء کو سورج نکلا تو آزادی کا پیام لے کر۔

اس دن میں بہت خوش تھی۔ میرا دل سرشار تھا۔ میری روح خوش تھی اور سب سے بڑھ کر میرا ایمان سرشار تھا۔ اپنے گھر کی کسے خوشی نہیں ہوتی۔ سب اہل وطن خدائے بزرگ و برتر کے حضور سربسجود تھے۔ ''بغل میں چھری...... منہ میں رام رام'' بننے کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہے۔ آہنسا کے پجاری جنگل کے درندوں سے بھی بڑھ گئے۔ آگ اور خون کی اس ہولی میں کیا کچھ نہیں لٹا۔ میرے باپ کو ہزاروں نمازیوں کے ساتھ حالت نماز میں ذبح کردیا گیا۔ میں نے آنسو نہیں بہائے تھے۔ یہی تو رسم شبیری تھی۔

ان ہی دنوں میرا ایک بھائی دنیا میں آیا تھا۔ بلوائیوں نے میری ماں کی چھاتیاں کاٹ ڈالیں۔ دودھ اور خون ملا تو شفق کی سرخی شرما گئی۔ پندرہ دن کے معصوم بچے نے نیزے پر چڑھ کر زبان خاموش سے صبح آزادی کا شکریہ ادا کیا۔ پھولوں کی پنکھڑی سے بھی نرم ونازک ہاتھ اوپر اٹھا۔ سر تھوڑا سا نیچے ہوا اور گل رنگ سویرے نے آگے بڑھ کر سلامی لے لی۔

میرا جذبہ عشق شاید کچھ زیادہ تھا جبھی تو سزا بھی بڑی ملی۔ ان کے نہ جانے کیا کیا نام تھے لیکن تھے تو سب سکھ اور ہندو۔ انہوں نے مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے جا کر زنجیروں سے باندھ دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دائیں طرف دیکھا...... ایک لمبی قطار تھی جوان شہزادیوں کی۔ بائیں طرف بھی یہی حال تھا۔ زیادہ نہیں تو کم از کم سو سے اوپر میری بہنیں، میری قوم کی بیٹیاں طارق، خالد، قاسم غزنوی کی بیٹیاں...... بے حال زخموں سے نڈھال چہروں پر خوف لیکن آنکھوں میں آس کی چمک...... میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ پتہ نہیں کیوں؟

سامنے میرے اللہ کا گھر...... میرے نبی ﷺ کا شہر تھا۔ میرے دل کا دیا جل اٹھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور لگی انتظار کرنے آنے والے وقت کا۔

وہ آئے سب کو دیکھا بھالا' ان کے آگے جو تھا شاید ان کا سردار تھا۔ اس نے کرپان دوبارہ اوپر نیچے لہرائی پھر بھوکے بھیڑیے کی طرح چلایا۔

''بولو...... پاکستان۔'' وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے پوری قوت سے زندہ باد کا نعرہ لگا دیا۔ یہ سن کر پہلے تو وہ بوکھلا گیا پھر بدمست ہاتھی کی طرح میری طرف لپکا۔ اس کے آگے کیا ہوا؟

میں نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی بربادی پر روؤں لیکن آنکھوں کے سامنے ایک سبز ہلالی پرچم لہرانے لگا۔ میں نے شرم وحیا کی چادر سے ایسا ہی ایک پرچم تخلیق کیا۔ آرزوؤں کے خون سے اس کے بیچ چاند تارا بنایا اور سوہنی دھرتی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے!''

اس جہنم سے مسجدوں کے شہر اور سنہرے ریشے کے دیس کے دل ڈھاکہ...... میں جس طرح پہنچی پہنچ ہی گئی۔ یہاں ایک بوڑھے نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ پھر میں ماں بن گئی۔ ایک ننھے منے گول مٹول خوبصورت بچے کی۔ بچے کے باپ کا نام مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مجھ سے جس نے بھی بچے اور اس کے باپ کا نام پوچھا میں نے بتایا۔ ''پاکستان۔''

اور میں کہہ بھی کیا سکتی تھی؟

شروع شروع میں مجھے بہت نیند آیا کرتی تھی۔ چین کی نیند...... شاید اس لیے کہ چمن پھل پھول رہا تھا' ہر سو بہار تھی خزاں کا نام ونشان تک نہ تھا اور

آنے والا دور بہت پرامید تھا لیکن یہ مسرت پیا آسودگی غم خزاں سے یہ بے نیازی بہت جلد دم توڑنے لگی۔ راتوں کو ڈراؤنے خواب ستانے لگے اور دن کو ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات جی جلانے لگے۔ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں نے اپنے بچے کا گوشت کھالیا ہے۔ نمک مرچ لگا کر۔

صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ شہر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ دوپٹہ سنبھالتی میں باہر کو بھاگی۔ وہاں بہت سے لوگوں نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ کوئی لاٹھی سے اسے پیٹ رہا تھا اور کوئی لاتوں اور گھونسوں سے۔ مجھے اس بے چارے پر بہت رحم آیا۔ آخر وہ میرے دیس کا باشندہ تھا۔ میرے نبی ﷺ کا امتی تھا۔ وہ بھی میرے بھائی تھے۔ ”بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے لیکن کیوں؟“

مجھے بتایا گیا۔ ”یہ پنجابی ہے۔“ وہ بہت کچھ کہتے رہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک گھر کے مختلف افراد ایک دوجے کے دشمن کیسے ہوسکتے ہیں؟ گھر تو نام ہے محبت خلوص اور ہمدردی کا۔ ایک دوسرے کے دکھوں میں کام آنے کا۔ ایک دوسرے کی خوشی پر مسکرانے کا۔ یہی تو اچھے گھروں کے اصول ہوتے ہیں۔ خدا جانے اپنی قوم کو عقل کب آئے گی؟ کہیں پانی سر سے گزر ہی نہ جائے۔ ایک وہم سا دل کو چھیدتا ہوا آنکھوں تک جا پہنچا اور میرے آنسو نکل آئے۔

بعد میں جو کچھ ہوا کاش میں وہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی مرجاتی۔ میرا وطن میرا دیس اور چمن میری جنت میری آنکھوں کا نور...... میرے دل کا سرور...... میرا مشرقی پاکستان...... میرا بنگال میرا ڈھاکہ میرا سلہٹ...... غرض پاکستان کے انگ انگ میں آگ بھڑک اٹھی اور بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگا۔

اس دن تو غضب ہوگیا جب میرے مسلمان پاکستانی بھائیوں نے اپنے سبز ہلالی پرچم کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ قائداعظم کی تصویر کو آگ لگائی، پاکستان زندہ باد کے بجائے ”جے بنگلہ“ کا نعرہ لگایا۔

مجھے بڑا ہی تاؤ آیا۔ جواب میں چھت پر چڑھ کر میں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا تو وہ دوڑے دوڑے آئے...... مار پیٹ تو خیر ہونی ہی تھی اور مجھے اس کا غم بھی نہیں...... رونے کی بات تو یہ تھی کہ چوبیس سال پہلے ایک ہندو نے میری عزت لوٹی تھی اور آج چوبیس سال بعد ایک مسلم بھائی کے ہاتھوں میں پھر لٹ گئی۔ کچھ کم قیامت ہے یہ؟

اس صورت حال سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ حواس جواب دینے لگے اور زندگی موت سے بدتر ہوگئی۔ ایسے میں...... میں نے صدق دل سے مرجانے کی دعا کی لیکن موت نہ آئی۔ سوچتی ہوں اس وقت مرجاتی تو بعد کے یہ طوفان کون دیکھتا؟ میرا مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیا بنا کہ گلیوں اور بازاروں میں ”جے ہند...... جے اندرا...... جے مہاتما گاندھی۔“ کے نعرے گونجنے لگے۔ نعرے لگانے والے مسلمان تھے۔ اپنے سینوں پر اندرا اور گاندھی کی تصاویر سجانے والے کلمہ طیبہ پر ایمان لانے والے تھے ان کے نام عمر، ناصر، قاسم، طارق اور خالد ہی تھے۔

اس شہر آرزو میں اپنوں کے طفیل اس اللہ کی بندی نے جیل بھی دیکھی۔ جیل کے نام پر ہر شریف آدمی کو خوف آتا ہے لیکن یہاں تو بات ہی الٹی تھی۔ کوئی چور اچکا اور بدمعاش پابند سلاسل نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ لاکھوں انسان جنہیں پاکستان کے نام سے محبت تھی یہاں مشق ستم بنے ہوئے تھے۔ تنگ و تاریک بستی ظلم و ستم کے سائے کئی بار جی چاہا کہ کہیں سے سبز ہلالی پرچم نظر آئے لیکن جب چمن ہی لٹ گیا تو بہار کیسے آئے۔ سو دل کی تمنا دل ہی میں رہی۔

اسیری کے دن بیت رہے تھے۔ ایک دن ایک آدمی جیل میں آیا۔ اس کا آنا قیامت سے کم نہ تھا۔ ہر طرف شور مچ گیا...... بھاگو...... جان بچاؤ بھاگ تو میں بھی پڑی لیکن بھاگتے بھاگتے یہ بھی پوچھ ڈالا۔

”کون آیا ہے؟“

”مکتی باہنی کا نمبر دو لیڈر...... جو آدمیوں کو کچا کھا جاتا ہے...... ماں بہن کسی کو نہیں سمجھتا۔ سنا ہے اب

تک ہزاروں آدمی مار چکا ہے۔ اپنے گھر میں انسانی کھوپڑیوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے اس نے۔"

دھیان پتہ نہیں کدھر تھا۔ پاؤں نے ٹھوکر کھائی اور میں زمین پر ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ سر سے خون بہہ نکلا۔ قمیض سے تھوڑا سا کپڑا اپھاڑ کر پٹی باندھنا چاہی تو کسی کے قہقہے فضا میں بکھر گئے۔ زندگی میں یوں ہنستے کسی کو نہ دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان ہنس رہا ہو' زمین ہنس رہی ہو' فضا ہنس رہی ہو لیکن کس کے لیے اور کیوں ہنس رہے ہیں یہ سب......؟

ابھی میں خیالات کا تانا بانا ملا ہی رہی تھی کہ ایک زوردار ٹھوکر میرے پیٹ میں لگی۔ درد کے مارے میری تو جان ہی نکل گئی۔ سر چکرا گیا اور میں اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔ بعد میں کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو شاندار کمرے میں پایا اور وہی کچھ نظر کے سامنے تھا جو میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کارنس پر سجی ہوئی گاندھی کی تصویر' بڑے سے گلدان میں پھولوں کے درمیان لہراتا ہوا چھوٹا سا ترنگا......گلدان کے اوپر لکھا ہوا۔ "گاندھی باپو زندہ باد۔" قائداعظم کی مورتی......ان کے پیٹ میں دھنسا ہوا خنجر......میرا خون پھر کھول اٹھا۔

مجھ میں اٹھنے اور چلنے کی ہمت تو نہیں تھی لیکن گرتی پڑتی اپنے قائد کی مورتی کے پاس پہنچ گئی۔ نہ جانے میرے دل کو کیا ہوا......میں بے اختیار مورتی سے لپٹ گئی۔ بے جان مورتی تھی لیکن میرے دل کو ایک سکون سا مل گیا۔ "میرے قائد! میرے باپ مجھے بتا میں کہاں جاؤں؟" میں نے چیخ چیخ کر پوچھا۔

پاکستان کی محبت کو اپنی روح میں بسا لے لڑکی جب تک زندگی ہے۔ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگائے جا۔

میرے احساس نے قائد کی جانب سے جواب دیا۔ اب میں نے ایک پل بھی ضائع نہ کیا اور پوری قوت سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا دیا۔ خدا کی قسم بڑا مزہ آیا۔ اور پھر میں نے نعرے پر نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ ایک بھونچال سا آ گیا۔ در و دیوار کانپنے لگے۔ ترنگا نیچے جلتی ہوئی آگ میں جا گرا۔ مہاتما کی

مورتی فرش پر ایسے گری کہ دو حصوں میں بٹ گئی۔
لیکن اتنی دیر میں وہ بھی پہنچ گیا...... وہی جو مجھے جیل سے لایا تھا۔ آتے ہی اس نے انگیٹھی سے انگاروں کی مانند چمکتی ایک لمبی سی سلاخ نکالی۔ اتنی گرم کہ مجھے دو قدم دور کھڑے بھی پسینہ آ گیا۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹی لیکن وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے سلاخ ہوا میں لہرائی اور مجھے اپنا دایاں گال جلتا ہوا محسوس ہوا لیکن اب گال کی فکر کسے تھی۔ انگ انگ جل رہا تھا۔ میں فرش پر گر پڑی۔ اس نے سلاخ پھینک دی اور لگا میرے کپڑے نوچنے۔ میں مادر زاد برہنہ ہوگئی۔ اسی کشمکش میں وہ کپڑا جس سے اس نے اپنا منہ کافی حد تک چھپایا ہوا تھا ایک طرف کو سرک گیا۔ اب جو صورت میرے سامنے تھی میری جانی پہچانی تھی۔ میرا پڑوسی عبدل جسے میں عبدل بھیا کہہ کر پکارتی۔ میری عزت کے درپے تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔
''او رے عبدل اپنی بہن کو نہیں پہچانتا؟''
''پہچان کے ہی یہاں لایا ہوں...... آج عیش کروں گا کیا سمجھی؟''
''آگے میں کیا جواب دیتی...... سفید خون مردہ دل۔ میں ان دنوں پھر ماں بننے والی تھی۔ میں نے عبدل کو بتایا کہ شاید اسے میری حالت پر رحم آ جائے لیکن اسے رحم نہ آیا۔ میں تڑپتی رہی، سسکتی رہی نیم بسمل پنچھی کی طرح۔ وہ ہوس کی پیاس بجھاتا رہا۔ اپنی منہ بولی بہن کے ساتھ اس نے منہ کالا کیا۔ ایک ماں کے ساتھ۔ ایک مجبور و بے کس عورت کے ساتھ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ بے شمار بت ہونٹوں پر مکروہ تبسم لیے مسکرا رہے تھے۔ عبدل بھی مجھے بڑا سا بت نظر آیا۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے جواب میں اپنے مکروہ لمبے لمبے دانتوں سے میرا چہرہ نوچ لیا۔
اب مجھ میں مزید سکت نہیں تھی۔ میں بے ہوش ہوگئی اور جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو خون میں لت پت اسی جیل میں پایا جہاں سے وہ ظالم مجھے لے کر گیا تھا۔

جیل میں پانی کئی دن سے بند تھا۔ نیم جاں تو میں پہلے ہی تھی اوپر سے بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا۔ پانی پانی کرتے میرا حلق سوکھ گیا۔ جان لبوں پر آ گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور زبان گنگ ہوگئی۔ کان البتہ کچھ سن سکتے تھے۔ اناؤنسر ہم وطنوں کو آزادی کی سالگرہ کی مبارک باد دے رہی تھی آج پھر اگست کی 14 تاریخ تھی۔
اف میرے خدا...... ستم پر ستم۔ سارا بدن کانپ اٹھا۔ کچھ یاد نہیں اس کے بعد کیا ہوا؟ اوسان بحال ہوئے تو رات کا دیوتا فلک کی گود میں مسکرا رہا تھا لیکن میرے ارد گرد بہت سے لوگ رو رہے تھے۔ مرد بھی بچے اور بوڑھے بھی۔ اس رونے کی وجہ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آئی پھر جو دائیں کروٹ لی تو سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔
غور سے دیکھا تو گوشت پوست کی ایک معصوم صورت دکھائی دی۔ مجھے اپنا دل پہلو سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ بچہ میرے جیسا چہرہ تھا۔ ہونٹ اور ناک تو ہو بہو میری طرح تھی آنکھیں بھی اپنی ہی نظر آئیں۔ شدت غم سے میں تو پاگل ہوگئی۔ اس چاند سے چہرے کے اتنے بوسے لیے کہ اس کی نرم نرم کھال ادھڑنے لگی۔ پھر انہوں نے میرا لال مجھ سے چھین لیا البتہ میرے کہنے پر اسے جیل کی سب سے اونچی جگہ لے گئے تاکہ کہیں سبز ہلالی پرچم نظر آئے تو اس کی ایک جھلک معصوم کو دکھا دیں۔ وائے افسوس سبز ہلالی پرچم کہیں نظر نہیں آیا۔
عمر بڑھتی گئی زندگی گھٹتی گئی۔ ہم میں سے اکثر کو اب اس زندگی کی ضرورت نہیں تھی البتہ موت کا انتظار تھا۔ صبح و شام اس کی راہ دیکھتے تھے لیکن انسان کے چاہنے سے موت کب آتی ہے۔ وہ تو من مانی کرتی ہے اور پھر ایک دن ہمیں پتہ چلا کہ پرسوں ہم میں سے ڈیڑھ سو کو پاکستان جانا ہے۔''
میرا نام پہلے گروپ میں تھا۔ میرا سر خود بخود بارگاہ رب العزت میں جھک گیا۔ جھکی ہوئی کمر سیدھی ہوگئی۔

آنکھوں میں آرزوؤں کے دیپ جلنے لگے۔ دل کے چمن میں بہار آتی نظر آئی تو سیروں خون بڑھ گیا۔ ایک نئے جذبے کے ساتھ۔ ڈھیروں ارمانوں کے ساتھ میں بحری جہاز میں سوار ہوئی۔

پاکستان ...... پاک لوگوں کا گھر...... پاک دل ...... پاک روح ...... امن کی چھاؤں ...... انصاف کا سمندر...... باہمی محبت کا شجر...... پر بہار...... انسان کا مسکن۔'' میرا دل یہی کہتا اور سوچتا تھا۔

جب میں عروس البلاد کراچی میں اتری تو ایک اور ہی سماں نظر آیا۔ میں نے ہر چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ ہر آنکھ میں جھانک کر دیکھا۔ احساس کی لہر دل تک اتر گئی لیکن وہ محبت پیار خلوص اپنائیت جس کی میں متمنی تھی نظر نہ آئی۔ ہر روپ کے پیچھے بہروپ' ہر چہرہ نقلی ہر ادا دلفریب بظاہر پھول اندر سے کانٹے۔ صورت رہبر اندر سے رہزن' خدا خوفی سے بے نیاز' دولت کے بندے۔ جو سنا تھا جو سوچا تھا اک سراب تھا۔ آس کی شمع بجھ گئی۔ تمناؤں کا خون کیا ہوا دل بھی خون ہوگیا۔

یہاں ایک آدمی نے مجھے بہن کہا۔ ایک بزرگ تھے جنہوں نے مجھے بیٹی بنالیا۔ ایک عورت میری ماں بن گئی۔ رہنے کو اک گھر مل گیا لیکن رات کو اس مہربانی کی قیمت یوں وصول کی کہ ایک آدمی کے ہاتھ مجھے بیچ دیا گیا۔ وہ آدمی خریدار کم سوداگر زیادہ تھا۔ اس نے بھی منافع کما کر میرا سودا کردیا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ کتنے آدمیوں نے مجھے بیچا۔ کتنے آدمی میرے خریدار بنے۔ ایک دو بار نہیں بلکہ کچھ اتنی بار مجھے لوٹا گیا کہ لٹنے کا احساس ہی نہ رہا۔ آخر کار ایک بہت بڑے آدمی نے مجھے خرید لیا اور ایک بڑی حویلی میں لے گیا۔ اس حویلی میں ہر کوئی ننگا نظر آیا۔ ہر دامن چاک۔ ہر صورت مکروہ۔ گھنگھروؤں کی جھنکار۔ ہوس کے خریدار۔ اب میری مثال اس لاش کی سی تھی جسے بے دردی سے کتوں' کوؤں اور چیلوں نے نوچ ڈالا ہو۔

اس دن اگست کی چودہ تاریخ تھی۔ پوری قوم یوم آزادی منا رہی تھی اور میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ منہ سے خون جاری ہوگیا۔ چہرے پر موت کے سائے سے خون جاری ہوگیا۔ چہرے پر موت کے سائے منڈلانے لگے تو وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر کے کلینک میں ہی میں نے ایک بچی کو جنم دیا۔ کاش میں مرجاتی لیکن میری رات کی سحر شاید ابھی دور تھی کہ میں زندہ رہی۔

میرا مالک اب میری اچھی طرح دیکھ بھال کرنے لگا۔ ادویات لانے لگا۔ ہر دوسرے تیسرے دن مجھے ڈاکٹر کو دکھانے لاتا مگر مجھے اب زندہ رہنے کی آرزو نہ تھی۔ جس روز میری بیٹی بانو پیدا ہوئی تھی میں نے اپنے قائداعظم سے پوچھا تھا۔ ''اے بانی پاکستان مجھے اور کتنی بار بغیر شادی کے ماں بننا پڑے گا؟''

یہی سوال میں ہر پاکستانی سے پوچھتی ہوں۔ ہے کوئی جو مجھے بتا سکے۔ اے چودہ اگست تو ہی بتا دے...... اس افسانے کا انجام مجھے۔''

میری ماں بانو نے مجھے اپنی ماں کی لہو رنگ داستان 1990 میں سنائی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ زندگی سے ناتہ توڑ گئی تھی۔ اس کا مالک اور مالک کا باپ بھی اس دنیا میں نہ رہا مگر ان کی جگہ ان کی اولاد نے لے لی۔ اس کے دو بیٹے بھی اس جیسے ہی نکلے۔ میں نے اس حویلی سے نکلنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ میں اب بھی ان وڈیروں جاگیرداروں اور بدمعاشوں کی اس حویلی میں رہتی ہوں۔ ماں اور نانی کی طرح ان کی بے دام غلام ہوں۔ میں اب بھی غلامی کی ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ جب بھی چودہ اگست کی تاریخ آتی ہے تو مجھے اپنی نانی بہت یاد آتی ہے اور میں بھی یہ آس لگالیتی ہوں کہ شاید مجھے بھی آزادی نصیب ہوجائے۔ مگر نہ جانے میرے لیے چودہ اگست کب آئے گی؟ نہ جانے کب؟

وقت آزادی

دستگیر شہزاد

مسئلہ کشمیر اس وقت اقوام عالم کے سینے پر ایک پھوڑے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ انتہا پسند ہندوؤں کے توسیع پسندانہ عزائم اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی دونوں ہی اس زخم کو تازہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت یہ پھوڑا زخم کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اب وہ دن دور نہیں جب یہ پھوڑا ابھر جائے گا اور کشمیری آزادی کی خوشگوار فضاؤں میں سانس لے سکیں گے۔

قارئین کے ذوق کے عین مطابق

صبح شیو کرتے وقت میں نے جب آئینے میں چہرہ دیکھا تو مجھے پھر سے ڈاکٹر کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کئی روز سے ٹل رہا ہے مگر آج آفس سے واپس ہوتے وقت ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤں گا۔ اس میں مزید بے پروائی ٹھیک نہیں۔ آج ہر چیز قیمت پر ڈاکٹر سے ملتا ہے۔ پچھلے ایک ہفتہ میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا معاملہ اگرچہ دفتر کا تھا مگر گھر میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

بیوی نے ایک آدھ بار اظہار ہمدردی کرتے ہوئے سن گن لینے کی کوشش کی لیکن میں نے ان کو خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ آج جب انٹرنل رپورٹ آ گئی اور اس کے متعلق کسی گڑبڑ کا ذکر نہیں پایا بلکہ کچھ Counter سے پذیرائی ہوئی تھی صاحب کی باتوں پر مجھے قطعی یقین نہ ہوا۔ جب تک میں نے خود نہیں پڑھ لی اور اس کے بعد ہی راحت کی سانس لی۔ چہرے پر کئی روز کے بعد اطمینان نظر آیا۔ ہفتہ بھر سے بگڑے ہوش وحواس درست ہوئے تھے اس خوشی میں میں نے پورے اسٹاف کو چائے پلائی سگریٹ اور پان کے ساتھ۔

میرا خیال تھا کہ اعلیٰ افسران کی جانچ پڑتال یا Audit سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے جو کسی بھی سطح پر ہیرا پھیری کرتے ہیں حالانکہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا وہ حوصلہ وجسارت مجھ میں تھی ہی نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دفتر میں میں خاصا ایماندار واقع ہوا تھا کیونکہ آمدنی والی سیٹ پر ہونے کے باوجود پیسے کے لیے کبھی کسی سے تھوڑا بہت بھی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ جس نے جو دے دیا آنکھ بند کر کے میں نے رکھ لیا۔ ساتھیوں کو یہ بات بہت کھٹکی شکایت ضرور تھی ان کا کہنا تھا کہ میں ریٹ خراب کر رہا ہوں۔ کاہے کا ریٹ۔ میری تاویل ہوتی۔ اپنی خوشی سے جو دے دے وہی بہت ہے۔ لینا تو حالانکہ یہ بھی نہیں چاہئے پر اب تنخواہ سے پورا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ باہر کے لوگوں کی رائے میرے بارے میں خراب نہیں تھی۔ اور یہ بھی مجھے معلوم تھا یہ خیال بھی اس درجہ تقویت دیتا کہ مجھے یقین کرنا پڑتا کہ مرنے کے بعد اللہ بھی کم سے کم اس کمائی کے بارے میں باز پرس نہیں کرے گا۔

مجھے دفتر کا ماحول حیرت انگیز طور پر بدلا ہوا نظر آیا۔ میری عادت تھی کہ کام کے اوقات میں بنا ضرورت میں سیٹ سے نہیں اٹھتا۔ کچھ کا خیال تھا کہ جب سامنے خوبصورت لڑکی بیٹھی ہو تو کرسی سے اٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میں ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ غصہ تو بہت کم ہی آتا ہے زیادہ تر باتوں کا جواب مجسم ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے کوفت بھی ہوتی کہ پندرہ سال کی ملازمت کے بعد بھی بابو والا مزاج کیوں نہیں اپنایا۔ اس وقت جو کانا پھوسی ہو رہی تھی وہ روز والی نہیں تھی اور میری ذات سے بھی وابستہ نہیں تھی اس بات کا پختہ یقین تھا۔ ساتھ کام کرنے والوں کے چہرے صرف پراسرار ہی نہیں ہوئے تھے اجنبیت

کا احساس بھی کرا رہے تھے۔ وہ لوگ جو عورتوں کی طرح لگائی بجھائی کے عادی تھے ان کی نظر بچاتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لینے کی غرض سے میں باہر نکلا۔

یہاں بھی رازداریاں برتی جارہی تھیں اب ذہن میں اندیشے مزید گہرے ہونے لگے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہندو انتہاپسند مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر شہر کے حالات بگاڑ رہے ہیں میری الجھنیں بڑھ گئیں۔ بیوی بچوں کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ گلاس کی آدھی چائے بینچ پر رکھ کر تیزی سے اندر آیا صاحب سمیت پورا عملہ غائب تھا صرف دو چپراسی بیٹھے ہوئے تھے میں نے جلدی سے الماری بند کی اور اسکوٹر نکال کر گھر کا رخ کیا۔ گھر آتے آتے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے بہت تیز اسکوٹر چلائی تھی۔ کئی بار خود کو ٹکرانے سے بچایا تھا عام طور سے میں گاڑی اتنی تیز نہیں چلاتا۔ مگر اس وقت معاملہ بہت مختلف تھا میرا بس چلتا تو اڑ کر گھر پہنچ جاتا۔

لوگ گھروں کے باہر کھسر پھسر کر رہے تھے۔ گیٹ کے سامنے اسکوٹر روکی تو پڑوسیوں کی مشکوک نگاہیں میری طرف اٹھ گئیں۔ رسماً بھی کسی نے حال احوال نہیں پوچھا۔ فی الحال میرے پاس بھی وقت نہیں تھا سب سے پہلا کام تو بیوی بچوں کی خیریت معلوم کرنا تھا۔ پڑوسیوں کی نظروں کے عتاب سے بچنے کے لیے بڑبڑاتے ہوئے اسکوٹر سمیت اندر گھس آیا۔ آہنی دروازہ دیوار سے ٹکرا کر تیزی سے واپس آیا تھا۔ اگر میں ہاتھ بڑھا کر اسے روک نہ لیتا تو یقیناً چوٹ لگتی۔ پھرتی سے پھاٹک بند کیا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ بیوی بچوں کو سامنے پاکر اطمینان کی گہری سانس لی۔ بیوی کے چہرے پر ہراس کی لکیریں نمایاں تھیں۔ بچے تمام باتوں سے بے خبر کھیلنے میں مصروف تھے ریموٹ اٹھا کر میں نے ٹی وی آن کیا۔

ثوبیہ سے پانی لانے کو کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ خبریں شروع ہونے والی تھیں بچے اب شور بھی کر رہے تھے۔ میں نے بری طرح ڈانٹا۔ وہ تینوں معاملے کی نزاکت سے انجان حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ اس سے پہلے توڑ پھوڑ کے بغیر انہیں سخت ڈانٹ نہیں پڑی تھی۔ یہ شور تو روز کے معمولات تھے چار سالہ ابوذر سہم کر ماں کی گود میں دبک گیا۔ ثوبیہ نے گلاس میز پر رکھ کر اسے اٹھالیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً مجھ سے الجھ پڑتی مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔ دوپہر تک سب کچھ نارمل تھا ثوبیہ روز کی طرح برابر والے رام اوتار جی کے گھر آدھا گھنٹہ بیٹھ کر آئی تھی اور ان کی لڑکی کو قورمہ بنانے کی ترکیب سکھائی تھی۔

اسی وقت خبر ملی کہ شہر میں جھگڑا ہوگیا ہے چار پانچ مر بھی گئے ہیں۔ دونوں فریقوں کے لوگ یہ ثابت کرنے پر تلے تھے کہ مرنے والے انہی کے فرقے کے تھے اس میں کتنی صداقت ہے یہ کسی کا مسئلہ نہیں تھا۔ بات کو نمک مرچ لگا کر آگے بڑھا دیتے اور خیال کرتے کہ فی الحال ان کی ذمہ داری ختم اور یہ سب کچھ نوجوان طبقے تک ہی محدود نہ تھا۔ معمر اور سنجیدہ اشخاص بھی یہی کر رہے تھے ٹی وی سے

کرفیو کی تصدیق ہونے کے بعد میری مشکلیں اور بڑھ گئیں۔ میرا معاملہ دوسروں سے بہت مختلف تھا۔

"کتنا منع کیا تھا میں نے کہ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

ٹی وی بند کیا تو بیوی شروع ہو گئی۔ جیسے اسی انتظار میں تھی۔

"چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی ہے اور گھر کے عین سامنے بڑا سا مندر ہے صبح آنکھ کھلتی ہے تو گھنٹے اور سنکھ کی آوازیں...... مگر میری تو ہر بات آپ کو بری لگتی ہے۔"

میں اس وقت کسی طرح کی بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔

بہرحال مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا میں سوچ رہا تھا کہ دو چار گھر بھی مسلمانوں کے اور ہوتے تو کتنی ہمت بندھتی لیکن گھر خریدتے وقت اور ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ پر یہ چوک ہو گئی۔ اس وقت اس طرح سوچنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ حالات تو ادھر دس بارہ سالوں سے بگڑے ہیں اگرچہ اس علاقے میں کسی ایک فرقے کی اکثریت نہیں ہوتی تھی۔ مگر جس جگہ میرا گھر تھا وہاں آس پاس کسی مسلمان کا دوسرا گھر نہیں تھا۔ مشکلیں اس باعث بڑھ رہی تھیں حالانکہ سڑک کے اس پار والی لین میں مسلمانوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی مگر چند قدم کا فاصلہ بھی اتنا بڑھ جائے گا اس کا احساس کبھی پہلے نہیں ہوا۔

میرے تمام عزیز واقارب اور دوست شہر کے اس حصے میں مقیم تھے جہاں کرفیو لگا تھا۔ وہاں تو جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لے دے کر یہی محلہ بچتا ہے حالات زیادہ بگڑنے کی صورت میں اسی طرف نکل جاؤں گا۔ تازہ صورت حال کا جائزہ لینے کی غرض سے ثوبیہ کو کچھ تسلی بخش جملے ادا کیے۔ قبل اس کے کہ میں باہر نکلتا ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے شیشے میں خود کو دیکھ کر غیر ارادی طور پر ٹھہر گیا۔ کچھ سوچتا ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ پیشانی کی دائیں طرف کئی روز سے نکلا ہوا دانہ کچھ اور بڑا نظر آیا۔

ابھرے ہوئے حصے کو دیکھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اور کچھ بھی ہو سکتا ہے پھنسی یا دانہ ہرگز نہیں۔ دانے وغیرہ کی ہیت سے میں بہرحال واقف تھا بیوی سے شبہ کا اظہار کیا تو اس نے بھی تائید کی اور کہا کہ پہلی فرصت میں ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ چھوٹی موٹی چیزوں میں بھی بے پروائی نہیں برتنی چاہیے۔ آگے کچھ اور کہتی تبھی گیٹ کے باہر سے کچھ لوگوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی ہم پر لرزش سی طاری ہو گئی۔

لپک کر بیوی بچوں کو اندر والے کمرے میں بند کیا گو کہ ثوبیہ مجھے بھی روکتی رہی مگر میں تجسس اور خوف کے سائے تلے باہر آ ہی گیا۔ دبے قدموں سے گیٹ تک آیا پھر آہستہ سے ایک آنکھ احتیاط سے دروازے کی جھری سے لگائی کہ حملے کی صورت میں بہت زیادہ نقصان نہ ہو۔ گلی کا منظر خیالوں کے قطعی برعکس نظر آیا۔ سامنے والے رام نریش جی چبوترے پر دو تین لوگوں کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کان لگا کر میں نے سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آگے کچھ فاصلے پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے مجھے لگا کہ میں بھی اگر اس وقت اپنوں کے بیچ ہوتا تو بچے ماں کی گود میں یوں ڈرے سہمے نہ ہوتے۔ عدم تحفظ کا احساس کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ آج مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا احتیاط سے چٹخنی کھولی تاکہ وہ لوگ نہ سن پائیں۔ باہر نکل کر پھر سے دروازہ بند کیا۔ ہراس کو چھپاتے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔ رسمی سی ہائے ہیلو کے بعد اپنے مقصد پر آ گیا۔

"یہاں سے کون لوگ دوڑتے ہوئے گزرے ہیں؟"

میں نے استفسار کیا۔ جواب میں پاٹھک جی نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"ہم لوگ ابھی آپ کی ہی بات کر رہے تھے۔ رام نریش جی کا خیال تھا کہ آپ نہیں نکلیں گے۔ پر میں کہہ رہا تھا ضرور نکلیں گے۔"

میں نے بہت کوشش کی مگر خجالت چہرے پر آ ہی گئی۔ میں سوچ رہا تھا میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے ہر بار بنا کسی قصور کے مجھے مضحکہ بنا دیا جاتا ہے۔ اب میں ایک ساعت بھی وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا مگر انہوں نے ایسی اخلاقی زنجیریں ڈال دی تھیں کہ ان سے رہائی اتنی آسان نہ تھی بظاہر جتنی نظر آ رہی تھی۔

میں فکرمند تھا کہ اندر جا کر بیوی کو معاملے کی اطلاع دوں۔ وہ پریشان ہو گی اور تبھی ایک پولیس کی جیپ آ کر رکی۔ لڑکے گیند بلا سنبھال کر ادھر ادھر ہو گئے تھے میں بھی سڑک کراس کر کے اپنے پھاٹک تک آ گیا تھا۔ تھانیدار نے سب کو اندر جانے کا حکم دیا اور یہ ہدایت بھی کہ کوئی باہر نہ دکھائی دے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا بلکہ میرے جی میں آیا

کہ میں ان سے کہوں کہ حضور تھوڑے تھوڑے وقفے سے چکر لگالیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ آگے کچھ اور سوچ پاتا کہ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں بھی جلدی سے اندر داخل ہوگیا۔

سورج دن بھر کا سفر سمیٹ رہا تھا۔ فضا میں تاریکی کے ساتھ اداسی بھی پھیلتی جارہی تھی۔ رات کسی تقریب کی ہو تو اس کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے مگر جب خوف کے سائے میں گزارنی ہو تو یہ ذہن و دل تک ہی نہیں اوپر نیچے ہوتی سانسوں میں بھی ہیبت پیدا کردیتی ہے۔ بیوی بچوں کو سمیٹے میں کونے میں دبکا ہوا تھا۔ ایک ایک پل جیسے صدیوں پر محیط ہو۔ پہلے بھی مسائل اور دشواریاں آئیں مگر وقت کی سفاکیت نے ایسے کرب و اذیت سے کبھی دوچار نہیں کیا۔ جیسا کہ آج چند گھنٹوں میں گزر گیا تھا ہر چند کہ اس وادی کشمیر میں امن وامان تھا مگر یہ قائم ہی رہے۔ اس کی ذمہ داری پاکستان ہی نبھا سکتا ہے۔ بچے بھی سہمے ماں کے پہلو میں سمٹے ہوئے تھے۔ دور دراز سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ ہر آہٹ پر ہماری سانسیں تھم سی جاتیں۔ خوف قطروں کی شکل میں مساموں خلیوں سے نکل پڑتا۔

رات کیسے گزرے گی؟ گزر بھی پائے گی یا نہیں؟ ایسے بہت سارے سوال ذہن کو جھنجوڑ رہے تھے۔ ذرا ذرا دیر میں فون کی گھنٹی بج اٹھتی۔ حالانکہ میں نے گھنٹی کی آواز کو کم کردیا تھا مگر اس کے باوجود اسپورٹڈ فون کی وہ آواز جس کی بہت لوگ تعریف کرچکے تھے۔ پُر اشتعال انگیز نعروں کا شائبہ کیوں ابھر رہا تھا۔ میں وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ دماغ میں یہ بھی آیا کہ ریسور اٹھا کر الگ رکھ دوں مگر خیریت کے لیے اماں کے فون بھی آرہے تھے۔ بھوک نے بھی اپنے رنگ دکھانے شروع کردیئے بلکہ اب شدت تک پہنچ گئی تھی۔ بچے بنا کھائے سونے لگے تھے دل میں ہوک سی اٹھی۔ فوراً ثوبیہ سے چاول پکانے کو کہا۔ شاید وہ اسی انتظار میں تھی۔ ابوذر کا سر آہستہ سے اٹھا کر تکیہ پر رکھا اور باورچی خانے میں چلی گئی تکیہ کے پاس مجھے ایک پوٹلی سی نظر آئی ہاتھ بڑھا کر میں نے اٹھایا اور کھولے بغیر مجھے معلوم ہوگیا کہ اس میں زیور اور نقدی تھی۔

اپنے معاملات میں عورت نازک وقت میں بھی ہوش نہیں کھوتی۔ اس احساس کے ساتھ ثوبیہ کا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔ تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کہ یہ بات میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی؟ کمرے کی ہر چیز کو نئے زاویے کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ اچانک میرا دھیان گیٹ پر لگی اپنے نام کی پلیٹ کی طرف گیا اور ایک دم سے اچھل گیا۔ جلدی سے اٹھ کر ابوذر کا بستہ تلاش کیا اس میں سے سیاہ رنگ کا مارکر نکالا اور لپک کر گیٹ تک آیا۔ جلدی سے پلیٹ اتاری۔ دونوں طرف جھانک کر دیکھا۔ دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا اور تو اور ساری رات بھونکنے اور آوارہ گردی کرنے والے کتے تک غائب تھے۔ بالکل ہو کا سا عالم طاری تھا۔

ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میں نے دیوار پر بڑے حرفوں میں اوم لکھا۔ اس پر کئی بار مارکر پھیرنے کی وجہ سے بہت واضح نظر آنے لگا تھا اور یہی میں چاہتا تھا میں نے اطمینان کی سانس لی اور اندر بھاگ آیا۔ اس کے بعد ثوبیہ بچوں سمیت کمرے میں داخل ہوئی۔ بچوں کو جگایا کچی نیند سے اٹھنا انہیں تھوڑا ناگوار ضرور لگا مگر جس طرح وہ کھانے پر ٹوٹے تھے ہم میاں بیوی کے لیے وہ منظر عجیب سا تاثر دینے والا تھا۔ خوشی بھی تھی اور غم بھی۔ کیا زیادہ تھا اور کیا کم یہ ہم طے ہی نہیں کرپائے کرسی پر رکھی ہوئی نیم پلیٹ کو دیکھ کر ثوبیہ بولی۔

"آپ نے یہ صحیح کیا میں بھی سوچ رہی تھی۔"

"اوم......" میری زبان پر آتے آتے رک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ثوبیہ اس بات کو کسی بھی قیمت پر تسلیم نہیں کرپائے گی۔ وہ بہت مذہبی قسم کی واقع ہوئی ہے اور فی الحال اسے سمجھایا بھی نہیں جاسکتا کہ میرے لیے اس وقت زندگی پہلے ہے۔ رات سبک خرامی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جتنی بار ہماری نظر کلاک پر جاتی اتنی بار گھڑی کے خراب ہونے کا دھوکا ہوتا۔

پچھلی گلی کی طرف سے بلی کتے کی آہٹ سے بھی اندر باہر کے سب تناسب بگڑ جاتے۔ ثوبیہ مسلسل آیت کریمہ اور قرآنی آیات کا ورد کررہی تھی۔ اللہ اللہ کرکے شب آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ بچے اب گہری نیند میں تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ثوبیہ اور شہروز کچھ بول دیتے تو موجودگی کا احساس ہوتا۔ نیند کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ہمیں لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے اسی طرح کمرے میں قید ہیں۔ بس کچھ گھنٹوں کا خوف وہراس نصف زندگی کی

رعنائیوں کو کس طرح غارت کرتا ہے اس کا خوب اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا۔ دس بجے تک پٹرول کار نے کئی چکر لگائے تھے۔ جس سے ہمیں بڑی تقویت مل رہی تھی ورنہ باہر کہاں کیا ہورہا ہے۔ ہم بالکل بے خبر تھے۔ بے خبری اطمینان کے ساتھ ساتھ تشویش بھی بڑھا رہی تھی۔

"پولیس نہ چاہے تو کہیں کچھ نہیں ہوسکتا۔" ثوبیہ نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ ادھر دو گھنٹے سے گاڑی نہیں آئی ہے۔ لہجے میں تھوڑا خدشہ بھی پوشیدہ تھا۔ ہوسکتا ہے کسی اور طرف راؤنڈ پر گئے ہوں۔ اسی وقت اچانک پچھواڑے کی گلی میں کچھ لوگوں کے ہونے کی آہٹ ملی اور یہ قطعی وہم نہیں تھا۔

ثوبیہ تو بس چیخنے والی تھی مگر تب تک شہروز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دبے پاؤں چل کر میں صحن میں آیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ اتنی سی دیر میں میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ آنگن کا دروازہ بہت مضبوط نہیں تھا۔ ایک جھٹکے میں الگ ہوسکتا تھا اس خیال کے ساتھ رہی سہی ہمت بھی پارہ پارہ ہوگئی۔ گپ چپ کے ساتھ زنجیر اور لوہے کی راڈ کی کھنک بھی سنائی دی۔ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ یہ جاننے سے زیادہ ضروری تھا اپنا دفاع۔ انتہا پسند ہندو ہوں یا غیر ملکی۔ غرض غایت تو ایک ہی ہوتی ہے۔ وقت بہت کم تھا موت دروازے تک آچکی تھی۔ کسی بھی لمحہ دھڑ دھڑا کر اندر گھسنے والے تھے شہروز نے فوراً پولیس کو فون کیا۔ شاید آہی جائے۔ اس کے بعد ایک ڈنڈا تلاش کیا جو ایک ضرب سے زیادہ کا متحمل نہیں تھا۔

باورچی خانے سے ترکاری کاٹنے والا چاقو نکالا اور یہ طے کرلیا کہ جتنے زیادہ سے زیادہ وار ہوسکتے ہوں وہ کرے گا ضرور۔ تھانہ کچھ فرلانگ کی دوری پر تھا۔ ثوبیہ نے مشورہ دیا کہ آنگن کی بتی جلا دو تاکہ انہیں ہمارے جاگنے کا احساس تو ہو۔ روشنی کا فوری کچھ اثر ہوا۔ رکے ہوئے قدموں میں کچھ حرکت ہوئی اور تبھی خاموشی کو چیرتی ہوئی پولیس کی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ دھم دھم قدموں میں کچھ حرکت ہوئی اور چند لمحوں میں ہی یہ شور کمزور پڑ کر خاموش ہوگیا۔

میں سرعت سے تالا کھول کر سڑک پر آیا۔ پٹرول جیپ دروازہ پر کھڑی تھی۔ میں نے داروغہ کو اپنا حوالہ دیا کہ باقی باتیں بتائیں اب تک کئی ہندو گھروں کے لوگ باہر آچکے تھے پولیس کا پورا عملہ بھاگ کر گلی تک آیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں سگریٹ کے تازہ ٹکڑے پڑے تھے جس میں اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ داروغہ نے اٹھا کر باریکی سے دیکھا اور پھینک دیا۔ اس نے شہروز کی ہمت افزائی کی۔ شہروز کو اس کی سخت ضرورت بھی تھی مگر اس کے ساتھ پولیس کے خوشگوار رویے سے حیرت بھی تھی۔

ہر چند کہ پولیس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا مگر پولیس کے بارے میں معلوم تو اچھی طرح سے تھا۔ داروغہ نے دو سپاہی آگے سڑک پر بٹھا دیے اور انہیں سخت ہدایات دیں کہ اس پورے خطے پر اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ ہی ذمہ دار ہوں گے جانے سے قبل شہروز نے داروغہ کے سینے پر لگی نام کی پٹی دیکھ کر برجستہ اس کے منہ سے نکلا۔

"اوہ تو یہ معاملہ ہے جبھی تو میں کہوں کہ یہ انہونی کیسے۔" گاڑی کے چلے جانے کے بعد پھر سے خاموشی طاری ہوگئی مگر اس بار فرق تھا جیسے جنگل کا راستہ ختم ہوگیا اور اچانک مضافاتی علاقے کی حدود دکھائی دینے لگی ہو۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ بہت سکون سے گزرا۔ میں نے چائے پی ٹی وی پر خبریں سنیں۔ پاکستان کے چینلز کشمیر ہمارا ہے۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ بھارت کے چینلز کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے کہہ رہے تھے۔ اسی اثناء میں کئی بار غنودگی طاری ہوئی۔

ثوبیہ نے ایک نیند مار بھی لی۔ کسمساتے ہوئے میں نے گھڑی دیکھی۔ دو بج گئے تھے۔ اسی وقت نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو جے شری رام کے فلک شگاف نعرے سنائی دیئے۔ اللہ خیر کرے۔ شاید یہاں بھی کچھ ہوگیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ثوبیہ کی آنکھ بھی کھل گئی۔ صدائیں حالانکہ دور سے آرہی تھیں مگر مشکلات تو بڑھ گئی تھیں سڑک پر تعینات دونوں سپاہی غائب تھے۔ محلے کے تمام لوگ باہر نکل آئے۔ اس بار ہجوم میں عورتیں بھی شامل تھیں۔

ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اس بار ان کے چہروں پر بھی بے چینی کی جھلک تھی۔ آگے بڑھ کر شہروز جب غول میں شامل ہوا تو لوگوں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اخوت اور بھائی چارہ کی ذہنیت کا ادراک

کردیا۔

ہمارا خیال تھا کہ کہیں بھی کچھ ہو پر کشمیر میں امن قائم رہنا چاہئے کشمیر میں سب کشمیری ایک ہیں۔ لیکن بھارت سے انتہا پسند آتے ہیں تو آپ بالکل بے فکر رہیں۔ شہروز نے کہہ تو دیا مگر معاملے کی نزاکت میں خوب سمجھ رہا تھا لیکن خطرناک آوازیں کبھی سپر کا کام بھی کرتی ہیں۔

اس کا احساس آج ہی ہوا۔ تحفظ کا خیال چیزوں کے مفاہیم کیسے بدلتا ہے۔ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہی چار جملے اگر یہ شام کو بول دیتے تو اس کے معنی کتنے مختلف ہوتے۔ اضطرابی کیفیت پر قابو رکھتے ہوئے میں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ National Integration پر چھوٹی سی تقریر بھی کر ڈالی۔ اندر آتے وقت میں بالکل بے بھرم نہیں تھا۔ لاکھ تسلیاں دی گئی ہوں کی مگر خطرے سے پہلے خطرے کا سدباب خطرہ کم کردیتا ہے۔ اس بات پر فی الحال تو یقین نہیں کیا جاسکتا پورے منظر پر اب نئی طرح سے روشنی ڈالنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ انتہا پسند بھارت سے ہی آتے ہیں۔

کہیں نہ کہیں مقامی لوگوں کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے۔ تھوڑے توقف کے بعد شور دھیما پڑ گیا میں نے اطمینان کی سانس لی۔ امن کسی بھی صورت قائم رہنا چاہئے۔ دنگے فساد مجھے قطعی پسند نہیں تھے۔ بہرحال! امن کے لئے کچھ نہیں ہوا۔ صبح ہوئی۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے آنکھیں جل رہی تھیں۔ بیسن پر جا کر میں نے پانی کے چھینٹے مارے۔ آئینہ اس بار کچھ اور بڑا نظر آیا۔ انگلی پھیرتے ہوئے آہستہ سے دبانے کی کوشش کی۔ وہ بہت سخت تھا مگر درد نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے تو مجھے لگا تھا کہ شاید کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ کیڑے کے کاٹنے کا اثر بھی اتنا دیرپا نہیں ہوتا۔ اب تو کافی روز ہو گئے تھے پھر یہ بلا کیا ہے؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دانہ اٹھنی کی برابر ہو گیا تھا اور ورم بھی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اب تو دور سے نظر آنے لگا تھا۔ اس مسئلے کا حل ڈاکٹر کو دکھائے بغیر نہیں نکلے گا۔

حالات نہ بگڑے ہوتے تو کل میں نے ڈاکٹر سے رجوع کرلیا ہوتا۔ میں نے طے کیا کہ آج کسی بھی قیمت پر ڈاکٹر کے پاس ضرور جاؤں گا۔ کل والے دنگے فساد اور

انتہا پسندی کی وجہ اور دیگر تفصیلات اخبار سے معلوم ہوگئیں۔ پانچ لوگ مارے گئے تھے پہلے صفحہ پر پانچوں لاشوں کی تصویریں چھپی تھیں۔

''ابو یہ جو پانچ لوگ مرے ہیں یہ ہندو ہیں یا مسلمان؟'' آٹھ سالہ اقبال نے مجھ سے پوچھا میں حیرت سے اقبال کا منہ تکتا رہ گیا۔ میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ ہاں یہ ضرور لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی کانٹا پھنس کر ٹوٹ گیا ہو۔ ان کا ماحول رات سے کتنا مختلف ہوتا ہے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ رات اسی شہر آشوب میں گزری ہے۔ سری نگر شہر میں روز سے زیادہ چہل پہل تھی۔ اخبارات پڑھنے کے بعد تبادلہ خیال شروع ہوگیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور شاید اس سے بھی زیادہ ضروری تھا اپنی برادری کے لوگوں سے ملنا۔

ڈاکٹر کشف کا مطب کھلا ہوا تھا۔ میں نے انہیں دکھایا۔ ان کے سوالوں کا جواب دیا۔ اس کے باوجود مجھے لگا ڈاکٹر صاحب مسئلہ کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے۔ بس روایتی سے جملے پریشان نہ ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ کبھی کبھی کسی چیز سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ دوا لکھ رہا ہوں انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا اور نہیں بھی ہوا تو ایک چیرا لگا دوں گا۔ جن لوگوں کے پاس فون کی سہولت تھی میں نے یاد کر کے سب کی خیریت معلوم کی۔ سب جگہ سے یہی اطلاع ملی کہ کشمیر کے حالات سدھر رہے ہیں۔

گھر میں بیٹھے بیٹھے میرا من ڈوبنے لگا تھا۔ بچے تو پھر سے کھیل کود میں مصروف ہوگئے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اسکول سے چھٹی مل گئی تھی۔ ثوبیہ سے بھی کہاں تک باتیں کرتا اور ایسے حالات میں جب ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔ کسی کے اندر کیا چھپا ہے۔ کوئی بھید نہیں دینا چاہئے۔ مجھے انتظار تھا کہ کرفیو میں کچھ ڈھیل ہو تو بیوی بچوں کو لے کر اماں کے پاس باغ چلا جاؤں اور جب تک حالات پوری طرح نارمل نہ ہوں وہیں رہوں۔ لاکھ وہاں کرفیو لگتا ہو مگر رات خوف کے سائے میں جاگ کر تو نہیں گزارنی ہوگی۔ وہاں کسی کی آواز پر سانسوں کا زیر و بم منتشر نہیں ہوتا اور نہ ہی منہ کھولنے سے پہلے دماغ پر زور دینا ہوتا ہے کہ کیا بولنا ہے اور کیا نہیں۔

آخر یہ انتظار بھی ختم ہوا۔ تین روز بعد دو گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔ میں پوری تیاری پہلے ہی کیے بیٹھا تھا۔ فوراً ثوبیہ کو بلایا جھٹ پٹ سب تیار ہوئے۔ میں نے پڑوسیوں کو اپنے جانے کی اطلاع دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ذرا گھر کا خیال رکھنا۔ یہ جان بوجھ کر کہا تھا تاکہ بعد میں کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

واپسی پر گھر صحیح سلامت ملے گا۔ اس کا یقین نہ مجھ کو تھا نہ ثوبیہ کو۔ اس وقت جان کی حفاظت زیادہ ضروری تھی۔ مگر ثوبیہ کا دم اب بھی کئی چیزوں میں اٹکا ہوا تھا۔ پر صبر کے علاوہ کوئی چارہ اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اماں کے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ اماں نے ایک ایک کو چھاتی سے لگا کر شکرانے کے جملے ادا کیے۔ ہماری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ اس کے بعد اماں نے فوراً پیشانی کے وافر حصے کے بارے میں استفسار کیا۔

''یہ تو اور بڑھ گیا۔ دکھایا نہیں کیا؟'' میں نے اماں کو پوری تفصیل بتائی۔ انہوں نے حکیم سیف اللہ کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ ان کی نظر میں حکیم سیف اللہ سے بہتر کوئی معالج ہی نہیں۔ کیسے کیسے امراض ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھیک ہوئے تھے۔ ہر بار ذکر نکلنے پر پوری روداد مشتاقوں سے ساتھ بیان کردیتیں۔ گھنٹوں کشمیر اور سری نگر کے حالات کا ذکر چلتا رہتا۔ ثوبیہ جو تین دنوں سے بولنے کو ترس گئی تھی۔ اسے بھی موقع مل گیا تھا۔ دیورانیوں کو لاگ لپٹ کر بتانے میں مصروف تھی کہ زیورات کس ہوشیاری سے بچا کر لائی تھی اور پولیس کو فون کرنے کا خیال بھی اسی کا تھا۔

جب کہ شہروز ثوبیہ کے حوالے سے ساری باتیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ رات ڈھلنے کے ساتھ یہاں بھی شورش برپا رہی۔ نعرے بازیاں بھی ہوئیں اور فائر بھی۔ بم کے دھماکے بھی توقف سے سنائی دیتے رہے۔ غنڈے بدمعاشوں کے لیے یہ وقت تہوار جیسا ہوتا ہے مگر مجھے ان سب باتوں سے کیا؟ یہاں زندگی کو کم سے کم کسی کا خطرہ تو نہیں۔ دس کلومیٹر کے فاصلے پر نہ زمین کا رنگ بدلا نہ آسمان کا رنگ بدلا۔ وہی آب و ہوا لیکن کتنا فرق تھا۔ دونوں جگہوں پر۔

اگلے کرفیو میں چار گھنٹے کی چھوٹ دی گئی۔ ماحول تیزی سے سازگار ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد کرفیو ختم ہو اور سب کچھ معمول پر آ جائے۔ تیسرے دن چھوٹ کی مدت کچھ اور بڑھ گئی۔ لوگ عجلت میں ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے۔ دکانداروں نے قیمتیں بڑھا دی تھیں مگر احتجاج کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ ڈھیل ختم ہونے سے ذرا پہلے ماحول ایک بار پھر بگڑ گیا۔ خبر اڑی کہ ہندو انتہا پسندوں نے دو مسلمان لڑکوں کو ٹائر کے ساتھ زندہ جلا دیا ہے۔ اس کا فوری ردعمل ہونا ہی تھا۔

فائرنگ اور دھماکوں میں بھی تیزی آ گئی۔ پیچھے والی گلی کے کچھ اوباش لڑکے ایک ادھیڑ عمر شخص کو گھسیٹ رہے تھے۔ اس کی کلائی پر بندھا ہوا کلاوہ مصیبت بن گیا تھا۔ میں دوستوں کے ساتھ نکڑ پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ چیخوں سے میرا دھیان اس طرف گیا۔ اس کی قمیص پھاڑ دی گئی تھی۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ دوستوں کو لے کر میں اس طرف دوڑا۔ چھری اور ڈنڈے ہاتھوں میں لہرا رہے تھے۔ اتنی دیر میں دو چار اور سنجیدہ لوگ آ گئے تھے۔ سب نے مشکل سے اسے بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑایا مجھے معلوم تھا یہ کام میرے اکیلے کا نہیں تھا۔ وہ شخص خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے پتلون میں پیشاب بھی کر دیا تھا۔ میں نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ یقیناً گر گیا ہوتا میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ غسل خانے میں اسے چھوڑ کر بھائی کا کرتہ پاجامہ لا کر دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ نہا کر باہر آیا۔ گھبراہٹ اور خوف اب بھی اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ گھر کے لوگ اس کی اعانت کر رہے تھے۔ اس لیے کوئی نئی دشواری سامنے نہ آئی۔ میں نے چائے کا کپ اسے دیتے ہوئے پوچھا۔

"ایسے حالات میں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"پانچ دن سے میں اپنے کارخانے میں بند تھا۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہاں آگے میری بیٹی رہتی ہے۔ اسی کے گھر جا رہا تھا۔ مالک نے بہت روکا تھا مگر......" اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اس کی ہمت بندھائی اور یقین دلایا کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ کل جب کرفیو کھلے گا تو میں تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔ رونا تو اس نے بند کر دیا مگر چہرے سے لگ رہا تھا کہ میری باتوں کا اسے ذرا بھی یقین نہیں آیا۔ رات دیر تک چاروں طرف سے ہو ہلا سنائی دیتا رہا۔ کافی تعداد میں لوگ گھر کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے۔ جو کہتے تھے گلہ پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے جو اسلحہ رکھتے تھے وہ منہ سے کم بول رہے تھے۔

نعرہ تکبیر اللہ اکبر! جے شری رام۔ جے بجرنگ بلی کی آوازیں فضا کو ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر چلا۔ دھڑام دھڑام کی آوازیں رک رک کر آ رہی تھیں۔ جن لوگوں کو بھڑاس نکالنے کا اطمینان ہو گیا وہ نیچے اترنے لگے۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد شور پوری طرح تھم گیا۔ کمرے میں تمام لوگ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ تبھی میرا چھوٹا بھائی گھبرایا ہوا آیا۔

"بھائی جان! شاید وہ آدمی بھاگ گیا۔"

"بنا بتائے۔ اتنی رات میں؟" میں بڑبڑا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ تو بند تھا۔ اس کا مطلب چھت سے کود کر بھاگا ہے۔ چھت تو کافی اونچی ہے۔ میں خیالوں سے الجھ رہا تھا۔ ٹانگیں بھی ٹوٹ گئی ہوں گی کمبخت کی۔ میں تیزی سے زینے کی طرف گیا۔ گہری اندھیری رات میں وہ شخص اکیلا کھڑا حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

"یہ وقت کے قیدی ضرور آزاد ہوں گے کشمیر بنے گا پاکستان کشمیر بنے گا پاکستان۔"

میں اور میرے بھائی دم بخود اسے دیکھے جا رہے تھے۔ میرے ماتھے پر پسینہ چھلک آیا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر پونچھنا چاہا تو مجھے لگا ہاتھ چپچپا رہا ہے۔ شاید پھوڑا پھوٹ گیا تھا۔ اس کی آواز میں میری آواز شامل ہو گئی تھی۔ آزادی کی یہ آواز ایک آواز نہیں پوری وادی کی آواز ہے۔

عمر سیف فضل

زرین قمر

تحریک آزادی خواہ کشمیر کی ہو یا فلسطین کی مظلموں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے سامراجی قوتیں آزادی کی خواہش کو کچلنے کے لیے انسانیت سے گرا ہوا ہر حربہ استعمال کر رہی ہیں۔ فلسطین اور کشمیر میں روزانہ جو انسانیت سوز واقعات جنم لے رہے ہیں، اسے دیکھ اور سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے امت مسلمہ کا ضمیر ہنود اور یہود کے پروپیگنڈے کا شکار ہو چکا ہے کہ وہ جاگ کر ہی نہیں دے رہا۔ اس کی زندہ مثال حال ہی میں پاکستان میں نظر آئی جب بھارتی انتہا پسند حکمرانوں نے فوج کے ذریعے مقبوضہ وادی کشمیر میں مسلمان ماں، بہنوں کو اسپتالوں سے باہر گھسیٹ کر تشدد کا نشانہ بنا کر شہید کیا۔ ہمارے ہاں صرف چند مذہبی مظاہرے کیے گئے اور پھر عید کے روز بھارتی فلم کی آمد پر کروڑوں روپے کا بزنس اس کے حوالے کر دیا کہ وہ اس رقم سے مزید ہتھیار خرید کر کشمیری مسلمانوں کو شہید کریں۔

نئے افق کی دیرینہ لکھاری زرین قمر کے قلم سے قارئین کیلئے منفرد ناول

ہلکے سرمئی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر براؤن ٹی شرٹ جس کی پشت پر VICTORY کے لفظ کے ساتھ ساتھ V کا سائن بھی بنا ہوا تھا اس کے جسم پر بہت جچ رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال کسی قدر گھنگھریالے اور لمبے تھے جنہیں اس نے ایک بینڈ کی مدد سے پونی ٹیل کی شکل دی ہوئی تھی وہ بیس بائیس سال کا گلابی رنگت والا خوبرو جوان تھا اس کی آنکھوں میں چیتے جیسی چمک تھی اور ہر ہر انداز سے پھرتیلا پن نمایاں تھا وہ ایک مکان کی دوسری منزل پر موجود تھا اور بڑی احتیاط سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک کسی ہیوی ڈیوٹی وہیکل کی آواز سنائی دی اور کہیں قریب ہی اس کا انجن بند ہونے کی آواز بھی سنائی دی تھی اسی لمحے نیچے گلی میں سے کسی آسٹریلوی طوطے کے چہچہانے کی سریلی سی آواز محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عمر سیف نے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے کھڑکی سے نیچے جھانکا جہاں اس کا دوست خالد قصام موجود تھا اس کا سر نیچے جھکا ہوا تھا اور وہ ایک دکان کے سامنے کھڑا تھا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اپنا سر سہلا رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اسرائیلی فوجی وہاں پہنچ چکے تھے وہ گلی میں بائیں جانب موجود تھے اور تعداد میں دو تھے اس کا اندازہ عمر سیف نے اس طرح لگایا تھا کہ اس کے دوست خالد نے اپنا سر دو بار سہلایا تھا جو اسرائیلی فوجیوں کی تعداد کو ظاہر کر رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے سہلایا تھا جس کا مطلب تھا کہ فوجی بائیں جانب موجود ہیں۔

یہ عمر اور اس کے ساتھیوں کے خفیہ اشارے تھے جن سے وہ خود کو دشمن سے مقابلے کے لیے تیار رکھتے تھے عمر سیف کا تعلق غزہ کی ایک جہادی تنظیم سے تھا جو اپنی

جدوجہد آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ چند روز پہلے مقابلے میں اس تنظیم کے ہاتھوں دو اسرائیلی فوجی مارے گئے تھے جن میں سے ایک کے قتل کا الزام عمر سیف پر تھا اور اب اسرائیلی فوجی بھوکے بھیڑیوں کی طرح اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے لیکن کئی روز کی آنکھ مچولی کے کھیل کے باوجود وہ اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہے تھے اس کے ساتھی اسے کسی نہ کسی طرح اسرائیلی فوجیوں کی آمد کی اطلاع دے دیتے تھے اور وہ ٹھکانہ بدل لیتا تھا۔

اب بھی یہی ہوا تھا خطرے کا سگنل پاتے ہی عمر تیزی سے کمرے سے نکل کر عمارت کے برآمدے میں آیا تھا اس نے برآمدے کی چھت پر لگا لوہے کا جنگلہ پکڑ کر الٹی قلا بازی کھاتے ہوئے اوپر کی طرف چھلانگ لگائی تھی اور ایک ہی کوشش میں چھت پر پہنچ گیا تھا۔ اسی وقت اسرائیلی فوجی گیٹ سے عمارت میں داخل ہوئے تھے اور اتنی دیر میں عمر چھلانگیں مارتا کئی عمارتیں پار کرتا چلا گیا تھا جب اسرائیلی فوجی چھت پر پہنچے تو وہ ان کی گرفت سے کافی دور تقریباً پانچویں عمارت کی چھت پر موجود تھا اور وہاں سے بھی اگلی عمارت کی چھت پر چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”وہ ......وہ ہے ......وہ دیکھو۔“ ایک اسرائیلی فوجی چیخا دوسرا اس سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔

”یہ جاؤ نیچے جاؤ...... اس کا پیچھا کرو...... بھاگنے نہ پائے۔ اسے زندہ پکڑنا ہے۔“ پہلے فوجی نے کہا اور خود بھی نیچے کی طرف بھاگا۔ عمر سیف اب اس عمارت سے بھی غائب ہو چکا تھا شاید اس نے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد غزہ کی گلیوں میں وہی آنکھ مچولی کا کھیل ہو رہا تھا جو عمر اور اسرائیلی فوجیوں کے درمیان کئی روز سے جاری تھا عمر آگے آگے چھلانگیں لگاتا بھاگ رہا تھا اور اسرائیلی فوجی اس کے پیچھے پیچھے تعاقب کر رہے تھے وہ بار بار انہیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا اور فوجی مزید طیش میں آ کر زیادہ مستعدی سے اس کا پیچھا کرنے لگتے تھے وہ اس پر فائر بھی کرتے جا رہے تھے لیکن ابھی تک اسے کوئی گولی نہیں لگی تھی شاید وہ جان کر اس طرح فائر کر رہے تھے کیونکہ وہ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔

”کم بخت چھلاوہ ہے۔“ ایک مقام پر ایک فوجی نے دیوار کا سہارا لے کر سانسیں درست کرتے ہوئے کہا اس کا سانس پھول گیا تھا اور چہرے سے تھکن نمایاں تھیں جبکہ عمر اسی طرح لنگوروں کے سے انداز میں چھلانگیں مارتا بھاگا جا رہا تھا۔

”ہیلو۔“ دوسرے فوجی نے اپنی کمر کے گرد لگی بیلٹ سے وائرلیس سیٹ نکال کر دوسری طرف کسی کو مخاطب کیا۔

”وہ اگلی گلی کے موڑ سے گاڑی کی طرف آ رہا ہے اسے وہیں پکڑ لو ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔“ فوجی نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

”گاڑی کے پاس کوئی ہے؟“ پہلے فوجی نے پوچھا۔

”ہمارے دو ساتھی ہیں وہ اس کے ہی منتظر ہیں۔“ دوسرے فوجی نے جواب دیا اس نے وائرلیس سیٹ واپس بیلٹ میں لگا لیا تھا اور پھر اپنے ساتھی کے ساتھ اس سمت روانہ ہو گیا تھا جدھر عمر گیا تھا۔ خالد قصام کچھ فاصلے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا یہ اس کی ذمہ داری میں شامل تھا کہ وہ عمر سیف کی حفاظت کرے اس کا ساتھ دے اور اس کی صورت حال سے باخبر رہے تاکہ موقع ملنے پر اس کی حفاظت کی جا سکے۔

عمر سیف چھلانگیں مارتا گلیوں کے موڑ مڑتا چھپتا چھپاتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک گلی کے سرے پر اسے اسرائیلی بکتر بند نظر آئی اس نے خود کو چھپانے کی کوشش میں چند قدم پیچھے کھسکائے کہ اس کی پشت سے ایک گن کی نال آ لگی۔

”جہاں ہو وہیں رک جاؤ ورنہ گولی چلا دیں گے۔“ ایک اسرائیلی فوجی کی کرخت آواز سنائی دی اور عمر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

”چلو! آگے بڑھو۔“ پیچھے سے اس کی کمر میں لگی بندوق کی نال پر دباؤ ڈالا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور اسرائیلی فوجی اس کے عقب سے نکل کر سامنے آ گیا پھر وہ اسے گلی سے باہر کھلے علاقے میں لے آئے تھے جہاں اسرائیلی بکتر بند موجود تھی۔ دور جگہ جگہ مقامی لوگ کھڑے تھے اور ان کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کر رہے تھے ساتھ ہی باتیں بھی کرتے جا رہے تھے عمر نے دیکھا انہی لوگوں کے درمیان خالد قصام بھی موجود تھا جو بار بار سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے V کا نشان بنا رہا تھا جس کا مطلب ایک تو یہ تھا

کہ فتح ہماری ہوگی اور دوسرا خفیہ مطلب یہ تھا کہ اس کی گرفتاری کی اطلاع جہادی تنظیم کو دے دی جائے گی۔

اسرائیلی فوجیوں نے دھکے دیتے ہوئے عمر سیف کو گاڑی میں سوار کرادیا تھا اور اسے لے کر گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی تھی۔ عمر سیف زید کی گرفتاری کے بعد کارروائی بہت مختصر سی تھی اسے ایک اسرائیلی کورٹ میں پیش کیا گیا تھا جہاں اس پر لگایا جانے والا الزام پڑھ کر سنایا گیا تھا جو ایک اسرائیلی فوجی کا قتل تھا لیکن اسے عمر سیف نے نہیں مارا تھا مگر اسرائیلی کورٹ نے اسے کسی صفائی کا موقع نہیں دیا تھا اور الزام سنانے کے بعد سزا سنادی گئی تھی جو چودہ سال قید تھی۔

اسے 1986ء میں گرفتار کیا گیا تھا اس کی گرفتاری کے ایک ماہ بعد اس کی بیوی رانیہ کی رسائی اس تک ہوسکی تھی اسرائیلی انتظامیہ تو اس کے شوہر سے ملوانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی اسے یہ تک بتایا نہیں جارہا تھا کہ عمر سیف کس جیل میں ہے جب رانیہ عمر سیف سے ملی تو اس کے جسم پر زخموں کے بے شمار نشانات تھے جو اسے جیل میں ہی لگے تھے۔

"اوہ عمر! یہ کیا؟ یہ کیا ہوا؟" رانیہ نے اس کے زخم دیکھ کر پوچھا۔

"اسے چھوڑو...... تم میری بات غور سے سنو۔" عمر نے کہا۔

"نہیں عمر، میں نے ایک بہت اچھے وکیل سے بات کی ہے اس نے کہا ہے......"

"میری بات سنو رانیہ۔" عمر نے اسے سختی سے ٹوکا تو وہ چپ ہوکر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"جتنی جلدی ہوسکے تم بچوں کو لے کر بلغاریہ چلی جاؤ وہاں تمہارا میکہ ہے تم وہاں محفوظ رہوگی۔"

"میں یہاں ہی ٹھیک ہوں...... تمہارے پاس...... جب تم رہا ہوکر آؤ گے تب ہم سب ساتھ ہی بلغاریہ جائیں گے۔" رانیہ نے کہا۔

"میری بات دھیان سے سنو۔ رانیہ یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے...... زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے تمہیں اپنی اور بچوں کی حفاظت خود کرنا ہے۔ اگر حمزہ تیار ہوجائے تو تم اسے اپنے ساتھ بلغاریہ لے جاسکتی ہو۔" عمر نے اپنے

چھوٹے بھائی حمزہ زید کا ذکر کیا اس کے علاوہ ان کی فیملی کا کوئی شخص غزہ میں نہیں تھا۔

''لیکن تمہیں اس حال میں؟''

''میری فکر مت کرو میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔ مجھے بس تم لوگوں کی فکر ہے۔'' عمر سیف نے کہا اور اسی وقت اسرائیلی فوجی جیلر نے وقت ملاقات ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

''جاؤ جتنی جلدی ہو سکے یہ کام کر لو...... خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔'' عمر سیف نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اسے ایک اسرائیلی فوجی نے کھینچ کر جیل کی سلاخوں سے پیچھے ہٹا لیا۔ رانیہ حسرت سے کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔ فوجی عمر کو کھینچتا ہوا اندر جیل کی تاریک کوٹھڑیوں کی طرف لے گیا تھا اور رانیہ کچھ دیر وہاں اداس کھڑی رہنے کے بعد بوجھل قدموں سے واپس آ گئی تھی گھر پہنچنے کے بعد اس نے عمر سیف کے چھوٹے بھائی حمزہ کو ساری بات بتائی تھی تو حمزہ پریشان ہو گیا تھا۔

''اگر بھائی نے یہ کہا ہے تو یہ کرنا ضروری ہے۔ اس نے یقیناً کسی وجہ سے کہا ہوگا۔'' حمزہ نے کہا۔

''ہاں اس نے دوسری کوئی بات ہی نہیں کی۔ بس بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ تم بچوں کو اور حمزہ کو لے کر بلغاریہ چلی جاؤ...... اس کے جسم پر زخموں کے بہت نشان تھے...... خدا جانے جیل میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے اور اب کیا ہونے والا ہے۔'' رانیہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم بچوں کو کچھ مت بتانا ہم یہاں کسی پر ظاہر نہیں کریں گے کہ ہم بلغاریہ جا رہے ہیں۔ اگر اسرائیلیوں کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو وہ ہمارے پیچھے وہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ ہم خاموشی سے یہاں جائیں گے پہلے میں خفیہ طور پر یہاں سے جانے کے انتظامات کر لوں اور بلغاریہ میں تمہارے گھر والوں سے بھی بات کر لوں۔'' حمزہ زید نے کہا تو رانیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

چند روز بعد موقع نکال کر حمزہ نے عمر کے دوست خالد قصام سے بات کی تو خالد نے اس کی ہمت بندھائی۔

''تم فکر مت کرو حمزہ...... ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے عمر سیف پر جو قتل کا الزام لگا ہے وہ جھوٹ ہے ہم اس کی حالت سے باخبر ہیں اور کوشش میں ہیں کہ موقع ملتے ہی اسے کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال لیں لیکن اسرائیلی جیل کا پہرہ بہت سخت ہے اور یہ کام آسان نہیں اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے اور عمر سے ہمارا رابطہ نہیں ہو رہا لیکن اتنا جانتے ہیں کہ جیل میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا اس پر اسرائیلی قیدی ایجنٹوں کے ذریعے حملے کروائے جاتے ہیں اور بھی مختلف طریقوں سے اسے ٹارچر کیا جاتا ہے تاکہ وہ ہر کسی کو اپنی بے گناہی کی داستانیں نہ سنائے اور خود پر لگے ہوئے الزام کو قبول کر لے۔'' خالد اسے تفصیل سے بتا رہا تھا اور حمزہ حیرت سے سن رہا تھا۔

''تم سے عمر نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو اس سلسلے میں اگر کوئی مدد چاہئے تو مجھے بتا دینا تم لوگوں کے بلغاریہ جانے کا انتظام ہو جائے گا۔'' خالد نے اسے تسلی دلائی۔

پھر خالد قصام سے ملاقات کے پندرہ دن بعد حمزہ اپنی بھابھی رانیہ اور تین بچوں طلحہ زید، سعد زید اور ہانیہ زید کے ساتھ غزہ سے نکل گیا اور اس کے لیے ایک مشکل سفر کا آغاز ہوا تھا۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀

1986ء میں گرفتاری کے بعد عمر سیف زید نے اسرائیلی جیل میں 1990 تک کا عرصہ بہت تکلیف و پریشانی میں گزارا۔ اسے اکثر مختلف سازشوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اسے قیدیوں سے پٹوایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مسلمان قیدی بھی اسی صورت حال سے دوچار تھے۔ عمر سیف نے بہت بار درخواستیں دیں، احتجاج کیا کہ اسے ایک جھوٹے الزام میں سزا دی گئی ہے اسے رہا کیا جائے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی آخرکار اس نے 1990 میں احتجاجی طور پر بھوک ہڑتال کر دی۔

''عمر تم نے بھوک ہڑتال کر کے اچھا نہیں کیا تم کیا سمجھتے ہو یہ لوگ تمہاری خوشامد کر کے تمہیں کھانا کھلائیں گے؟'' اس کے ایک ساتھی مسلمان قیدی نے کہا جس کی عمر تقریباً پچپن سال تھی۔

''نہیں طارق کریمی میں جانتا ہوں میری بھوک ہڑتال سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا لیکن میں اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں۔'' عمر نے بوڑھے کریمی سے کہا۔

''تم جو بھی ملتا ہے وہ کھاؤ یہ بہت ضروری ہے کہ تم

جسمانی طور پر مضبوط رہو تاکہ ان کے ظلم کا مقابلہ کر سکو اگر تم کمزور ہو گئے تو ان کا مقابلہ کیسے کرو گے؟" طارق کریمی نے اسے سمجھایا۔

"اللہ بہت بڑا ہے وہ مجھے ان کے مقابلے کی طاقت دے گا وہ مظلوم کا ساتھ دے گا ہمیں صرف اللہ ہی کا تو آسرا ہے۔" عمر نے کہا۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی احتیاط ضروری ہے اور اپنے مقصد پر ثابت قدمی سے قائم رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم جسمانی اور ذہنی طور پر ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔" کریمی نے سمجھایا وہ دونوں جیل میں کام کے وقفے کے دوران باتیں کر رہے تھے اچانک نگران فوجی کی نظر ان پر پڑی اور وہ تیزی سے ان کی طرف آیا پھر اس نے چمڑے کی بیلٹ سے طارق کریمی کی پشت پر دو تین ضربیں لگائی تھیں اور وہ تڑپ کر رہ گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ اسے کیوں مار رہے ہو؟" عمر نے چیخ کر کہا اور وہ فوجی اس پر پل پڑا وہ تیزی سے چمڑے کی بیلٹ سے اس کی پٹائی کر رہا تھا اور عمر سیف درد سے کراہ رہا تھا۔

"اوہ...... ظالم بس کرو...... میرا کیا قصور ہے؟" عمر نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ہمارے اسرائیلی فوجی کو مارتے ہو اور ہم سے رحم کی امید رکھتے ہو۔ ہم بھی تمہیں مار مار کر اس کے پاس بھیج دیں گے۔ اسرائیلی فوجی نے حقارت سے کہا۔

"وہ جہنم میں گیا ہے ہمارا ٹھکانہ بے شک جہنم نہیں ہے...... خدا مظلوموں کے ساتھ ہے۔" عمر سیف نے کہا۔

اس نے سسکتے ہوئے طارق کریمی کو سہارا دے کر اٹھایا تھا اور اسرائیلی فوجی پیٹ کر ایک طرف چلا گیا تھا اسی وقت عمر سیف کی نظر جیل کے احاطے میں دوسری منزل پر بنے کمروں کی طرف اٹھ گئی جہاں اسرائیلی جیل کا جیلر کھڑا تھا وہ حقارت سے گراؤنڈ میں کھڑے فوجیوں کو دیکھ رہا تھا اس کی نظر میں ایک تندرست و توانا اسرائیلی قیدی پر گئی تھی جسے اس نے ایک مخصوص اشارہ کیا تھا اور وہ قیدی عمر سیف کی طرف بڑھنے لگا تھا اس کے ہاتھ میں چھپے تیز دھار خنجر پر عمر سیف کی نظر پڑی تھی اور وہ اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ اس نے بھی طارق کریمی کو چھوڑ دیا تھا اور خود اس قیدی کے حملے

اقوال زریں

بے وقوف بول کر سوچتا ہے۔ عقل مند سوچ کر بولتا ہے۔

تکبر، ظلم اور غصہ عدل کا دشمن ہے۔

خوش رہیں اور دوسروں کو خوش رکھنے کی سعی کریں۔

کسی کی مدد کر کے اسے بھول جاؤ۔

بڑی چھلانگ لگانے کے لیے تھوڑا پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔

جھوٹ سے بہت دور تک جا سکتے ہیں لیکن واپس نہیں آ سکتے۔

دعائیں اس وقت کارگر ہوتی ہیں جب ان کے ساتھ جدوجہد بھی کی جائے۔

جو بلاوجہ ناراض ہوتا ہے بلاوجہ ہی دوست بن جاتا ہے۔

پھٹی ہوئی بوری بے جا خواہشوں کی طرح ہوتی ہے جو کبھی بھی نہیں بھرتی۔

چھوٹے بچے سونے نہیں دیتے جبکہ بڑے بچے آرام نہیں کرنے دیتے۔

ریاض بٹ...... احسن ابدال

دلچسپ و حیران کن معلومات

☆ کار سازی دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے۔

☆ نیلی وہیل کی سیٹی کسی بھی جانور کی پیدا کردہ سب سے بلند آواز ہے۔

☆ مچھلیاں آپس میں باتیں کر سکتی ہیں۔

☆ کبھی بھی کھلی آنکھوں کے ساتھ چھینک نہیں آ سکتی۔

☆ چوہا، اونٹ کی نسبت زیادہ لمبے عرصے تک پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔

☆ خواتین مردوں کی نسبت دوگنا تعداد اور رفتار سے اپنی پلکیں جھپکتی ہیں۔

☆ ایک عام پنسل سے پینتیس میل لمبی لائن کھینچی جا سکتی ہے یا ہم اس سے انگریزی کے پچاس ہزار الفاظ لکھ سکتے ہیں۔

انتخاب: کامران شاہد...... گجرات

سے بچنے کے لیے مستعد ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کئی دن کا بھوکا تھا اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ قیدی نے اس پر چھلانگ لگائی تھی اور وہ تیزی سے ایک سمت ہٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ گراؤنڈ میں موجود قیدی آہستہ آہستہ ایک دائرے کی شکل میں جمع ہو گئے تھے اور بہت دلچسپی سے اس لڑائی کو دیکھنے لگے تھے۔

قیدی نے دوبارہ اس پر چھلانگ لگائی تھی اس بار اس نے خنجر سے وار کیا تھا جس کی نوک عمر کے ایک بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی اور اس کی آستین کو کاٹ دیا تھا جس میں سے اس کا بازو نظر آ رہا تھا جس پر لگے زخم کے نشان سے خون رس رہا تھا اس بار عمر سیف نے بھی اس کی کمر پر اپنی کہنی سے وار کیا تھا اور قیدی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا وہ گر گیا تھا اس کے ساتھ ہی عمر نے اس پر چھلانگ لگائی تھی اور اس کو دبوچ لیا تھا پھر اس نے قیدی پر مکوں کی بارش کر دی تھی اس کے ساتھ ہی دو اسرائیلی پہرہ دار آگے بڑھے اور انہوں نے عمر کو پکڑ کر اس قیدی سے دور کر دیا تھا۔ جیل کے احاطے میں سائرن بجنے لگا تھا اور سارے قیدی لائنیں بنا کر اپنی بیرک میں چلے گئے تھے عمر اور اسرائیلی قیدی کو جیلر کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔

''تمہارے اندر بہت طاقت ہے کتے۔'' اسرائیلی فوجی نے عمر کو مخاطب کر کے حقارت سے کہا۔

''اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔'' عمر نے غصے سے جواب دیا اور اسی وقت پہرہ دار نے بندوق کا بٹ اس کے کاندھے پر زور سے مارا۔

''آرام سے بات کرو تم ہمارے افسر سے بات کر رہے ہو۔''

''اس نے اشارہ کر کے قیدی کو مجھ پر حملہ کرنے کے لیے کہا تھا۔'' عمر سیف نے سچ بول دیا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' پہرہ دار نے کہا اور جیلر مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسنے لگا پھر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا اور پہرہ دار عمر اور قیدی کو لے کر اس کے کمرے سے باہر آ گیا تھا قیدی اپنی بیرک میں چلا گیا تھا لیکن عمر کو وہ پہرہ دار ایک اور کمرے میں لے گیا تھا جہاں اس کے ہاتھ اوپر کر کے زنجیروں سے باندھ دیئے گئے تھے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور اسے مارا جانے لگا تھا عمر کو یاد نہیں

کہ اس کے ساتھ یہ سب کتنی دیر ہوتا رہا تھا اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ تکلیف کی شدت سے چیختا رہا تھا اور چیختے چیختے بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ اپنی کوٹھڑی میں پڑا تھا اس میں حرکت کرنے کی ہمت نہیں تھی وہ کئی گھنٹے اسی طرح پڑا رہا تھا اس کے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا اور دوسری بیرکوں کے قیدی جھانک جھانک کر اسے دیکھ رہے تھے پھر شاید وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی آنکھ ایک اسپتال میں کھلی تھی جہاں اسے اسرائیلی جیل سے دو فوجیوں کی نگرانی میں علاج کے لیے لایا گیا تھا۔ یہ بیت اللحم کے علاقے کا ایک اسپتال تھا وہ ہوش اور بے ہوشی کی کیفیت میں کئی روز اپنے بیڈ پر پڑا رہا تھا اس کے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں وہ اپنا ہاتھ بھی بمشکل اٹھا سکتا تھا سسٹر سہارا دے کر اسے بٹھاتی تھی اور سوپ وغیرہ دیتی تھی۔

تقریباً پندرہ دن بعد اس کی کئی پٹیاں ہٹا دی گئی تھیں اس کے جسم پر جگہ جگہ گہرے زخموں کے نشان تھے وہ حیران تھا کہ اسرائیلی فوجیوں نے اسے کس چیز سے مارا تھا کہ اتنے گہرے زخم آئے تھے۔

پھر اچانک ایک رات شاید قدرت اس پر مہربان ہو گئی یا یہ محض کوئی اتفاق تھا وہ اسرائیل کی طرف سے ہونے والی ایک معمول کی کارروائی تھی۔ انہوں نے اسرائیلی سرحدی علاقے سے بیت اللحم کے علاقے کی طرف راکٹ فائر کیے تھے جن میں سے دو راکٹ اس اسپتال کی بلڈنگ پر بھی لگے تھے جہاں عمر سیف زیر علاج تھا۔ وہ رات دو بجے کا وقت تھا زیادہ تر مریض اور اسپتال کا عملہ سو رہا تھا۔ اچانک ہی دھماکوں کی آوازوں سے سارا علاقہ گونج اٹھا تھا فضا میں مٹی ریت اور بارود کی بو پھیل گئی تھی اور انسانوں کی چیخیں دور دور تک سنی جا سکتی تھیں۔

''اوہ خدایا اللہ رحم اللہ اکبر۔'' مختلف لوگوں کی آوازیں تھیں لوگ تیزی سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے بموں کے حملے اور عمارت کی تباہی کے بعد بجلی فیل ہو گئی تھی ہر طرف اندھیرا تھا اور افراتفری کا عالم تھا کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ اسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر عمر سیف نے اطراف کا جائزہ لیا وہ اپنے بیڈ سے نیچے پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں

ڈرپ لگی تھی جسے اس نے نوچ کر پھینک دیا تھا اسے اپنے قریب کوئی اسرائیلی پہرہ دار نظر نہیں آ رہے تھے۔ خدا معلوم انہیں زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا اس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ جس کا جواب اسے دور سے کئی آوازوں نے دیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اسپتال کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے باہر نکل گیا باہر بھی ہر طرف لوگ ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے وہ تیزی سے لڑکھڑاتا ہوا ایک گلی میں روپوش ہوگیا تھا۔

اس کی جدوجہد آزادی کی تنظیم کے لوگ اس سے بے خبر نہیں تھے تیسرے دن اس کی ملاقات خالد قصام سے ہوگئی تھی اور خالد اسے بیت الحم میں واقع تنظیم کے دفتر لے گیا تھا جہاں اس کی ملاقات تنظیم کے علاقائی سربراہ اسامہ خلیل سے کروائی گئی تھی۔

''عمر سیف! تم نے بھی بچوں والا کام کیا ہے۔'' اسامہ نے قدرے ناراضگی سے کہا عمر اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم اتنی آسانی سے پکڑ لیے جاؤ گے۔'' اسامہ نے پھر کہا عمر کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ اس کا جواب دے سکے۔

''تم ہمارے بہترین مجاہدوں میں سے ایک ہو اب تک کتنے ہی کارنامے کر چکے ہو مجھے حیرت ہوئی جب مجھے پتہ چلا کہ دو اسرائیلی فوجی تمہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں؟''

''انہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔'' عمر نے آہستہ سے کہا۔

''قید میں ظاہر ہے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا ہوگا۔'' اسامہ نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے شاید تمہیں اسپتال لایا گیا ہم موقع کی تلاش میں تھے تمہیں کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکال لیتے لیکن خود اسرائیلیوں نے ہماری مشکل آسان کردی۔ اس حملے میں معصوم مریض اور اسپتال کا عملہ بھی مارا گیا ہے۔ اسرائیل بالکل اندھا ہوگیا ہے وہ مسلمانوں پر اندھا دھند حملے کررہا ہے وہ نہیں جانتا اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔''

''بے شک وہ بہت بڑا ہے...... وہ نامساعد حالات میں بھی مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی مدد کا سبب پیدا

کر دیتا ہے ہمارا ایمان ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کو شکست دے دیں گے۔'' عمر سیف نے پرجوش انداز میں کہا۔

''میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ تم کوئی بے وقوفی نہیں کرو گے اور اگلے احکامات کا انتظار کرو گے۔ اسامہ خلیل نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تمہاری ذرا سی بھی عجلت تمہارے لیے اور دوسروں کے لیے بھی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

''جی میں سمجھ گیا۔'' عمر نے مختصراً جواب دیا اسامہ نے ہاتھ کی جنبش سے اسے چلے جانے کو کہا اور وہ خالد قصام کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

''ابھی کچھ دن تک تمہارے باہر جانے پر پابندی ہے۔'' خالد قصام نے اسے بتایا۔

''تمہارے اسپتال سے غائب ہو جانے پر وہ پاگل کتوں کی طرح تمہاری تلاش شروع کر دیں گے ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی ڈیڈ باڈی پر تمہارا شک ہو اور وہ سمجھ لیں کہ تم اس حملے میں مارے گئے ہو لیکن اس کا امکان بہت کم ہے تمہیں پتہ ہے یہ اسرائیلی اپنے دشمن کو قبر سے بھی نکال لاتے ہیں۔'' خالد نے کہا۔

''ہاں میں جانتا ہوں یہ بتاؤ میرے بیوی بچے؟''

''وہ خیریت سے ہیں انہیں بلغاریہ پہنچا دیا گیا تھا تمہارا بھائی حمزہ بھی وہاں بچوں کے ساتھ موجود ہے۔'' خالد نے اسے بتایا تو اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔

''اب میں زیادہ سکون سے کام کر سکوں گا۔'' عمر نے کہا۔

''ہاں اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے اور ہمیں اپنے ملک کو دشمنوں سے آزاد کروانے کی توفیق عطا فرمائے۔'' خالد نے کہا۔

''بے شک وہ ہماری مدد کرے گا...... اتنے مسلمانوں کا خون ہرگز رائیگاں نہیں جائے گا۔''

''لیکن ہم کیا کریں ہمارے سربراہ ہی ہمارا ساتھ نہیں دے رہے ہیں انہیں عوام سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔'' خالد نے کہا۔

''اللہ بہت بڑا ہے...... وہ ناممکن سے ممکن اور نامعلوم سے معلوم پیدا کر دیتا ہے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے مایوسی کفر ہے۔'' عمر سیف نے کہا۔

''کیا رانیہ کی کوئی خیر خبر آئی ہے۔'' اس نے خالد سے پوچھا۔

''ہاں اس نے بلغاریہ کے ایک اسکول میں ملازمت کر لی ہے بچوں کو اسی اسکول میں داخلہ دلوا دیا ہے اور حمزہ نے بھی ایک بک اسٹال پر سیلز مین کی ملازمت کر لی ہے۔''

''شکر ہے میرے مالک اور رانیہ کے والدین؟''

''وہ بھی خیریت سے ہیں انہوں نے ہی ان سب کاموں میں رانیہ کی مدد کی ہے۔'' خالد نے بتایا۔

''میں اگر باہر نہیں نکلوں گا تو پاگل ہو جاؤں گا میں چوروں کی طرح چھپ کر نہیں رہ سکتا۔'' عمر سیف نے خالد سے کہا۔

''ابھی فی الحال تو تم باہر جانے کا ارادہ ترک کر دو کیونکہ اسامہ خلیل اس کی اجازت نہیں دے گا ایک دو روز حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔''

پھر عمر سیف کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا دوسرے ہی دن خالد دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔ ابھی عمر صبح کے ناشتے کے بعد چائے ہی پی رہا تھا اور تنظیم کے دفتر میں تھا۔

''عمر...... عمر دیکھو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔'' خالد نے اسے بتایا اس کا سانس پھولا ہوا تھا شاید وہ کافی دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''اسرائیلی فوجی دیواروں پر جگہ جگہ پوسٹر لگا رہے ہیں۔ جس میں تمہاری تصویر بنی ہے اور تمہارے سر کی قیمت دو لاکھ پونڈ لگائی گئی ہے اس پوسٹر میں لکھا ہے کہ تم قتل کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہو اور تمہیں زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں پیش کرنے پر دو لاکھ پونڈ دیئے جائیں گے۔''

''سب جھوٹ ہے تم جانتے ہو۔'' عمر نے خالد سے کہا۔

''ہاں میں جانتا ہوں لیکن یہ معاملہ ہمارے جاننے یا نہ جاننے کا نہیں وہ تو اسی طرح کے الزامات لگائیں گے تاکہ کسی بھی بہانے تمہیں پکڑ سکیں وہ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں انہیں کس نے روکا ہے؟'' خالد نے عمر کو سمجھانے

والے انداز میں بتایا۔

''اب اس کا کیا حل ہوگا؟''

''میرا خیال ہے اسامہ خلیل اس پر کوئی ایکشن ضرور لے گا وہ جو فیصلہ کرے گا وہی مانا جائے گا۔''

''اس نے تو مجھے روپوش رہنے کے لیے کہا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''ہاں دیکھتے ہیں اس کا اگلا فیصلہ کیا ہوگا۔ یقیناً جو تمہارے حق میں بہتر ہوگا وہی فیصلہ کیا جائے گا۔''

''میں کسی طرح بھی جدوجہد آزادی سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا۔'' عمر سیف نے کہا۔

''ہم میں سے کوئی بھی اس جہاد سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں لیکن جوش سے کچھ حاصل نہیں ہوگا ہم جوش میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھے تو ہماری جدوجہد آزادی پر اثر پڑ سکتا ہے ہمیں بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' عمر نے کہا۔

پھر اسی شام اسامہ خلیل نے عمر سیف کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا کمرے میں اس کے اور اسامہ کے علاوہ خالد قصام تھا یہ بات ابھی تنظیم کے لوگوں سے بھی چھپائی جا رہی تھی کہ عمر سیف اسامہ کے پاس موجود ہے۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم بھی بلغاریہ چلے جاؤ اپنے بچوں کے پاس۔'' اسامہ نے کہا۔

''لیکن اس طرح تو میں جہاد میں حصہ نہیں لے سکوں گا۔''

''یہاں ہم موجود ہیں لیکن تمہاری موجودگی ہمیں بھی مشکوک بنا دے گی اور اگر ایک بار ہم لوگوں پر شک ہو گیا تو ہمارے لیے یہ جدوجہد جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔'' اسامہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''لیکن میرا بلغاریہ جانا میرے بچوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔''

''نہیں ہم تمہیں ڈائریکٹ بلغاریہ نہیں بھیجیں گے تم مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک کا سفر کرتے ہوئے کافی عرصے میں وہاں پہنچو گے اور خود کو خفیہ رکھو گے بلکہ اپنا حلیہ بدل کر رہو گے تمہارے لیے بہتر ہوگا۔''

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔'' عمر سیف نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں سوچنے کا کام تمہارا نہیں...... ہمارا ہے اور ہم نے سوچ لیا ہے کہ تمہیں یہاں سے جانا ہی ہوگا چاہیں تو تمہیں دنیا کے کسی اور حصے میں بھی بھیج سکتے ہیں لیکن ہائی کمان نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے اس طرح تم اپنے بیوی بچوں کے قریب رہ سکو گے۔''

''جی بہتر۔'' عمر سیف نے مجبوراً حامی بھری اس کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

''تمہیں کل ہی روانہ کر دیا جائے گا۔'' اسامہ نے کہا اور عمر اسے حیرت سے دیکھنے لگا پھر خالد کے ساتھ وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

''خالد! ان لوگوں نے اتنی جلدی...... یہ فیصلہ کر لیا...... مجھ سے پوچھا بھی نہیں؟''

''تم سے کیا پوچھیں گے جو حالات کے مطابق بہتر فیصلہ ہے وہی کیا گیا ہے اور اس میں تمہارے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھلائی بھی مدنظر رکھی جا رہی ہے۔'' خالد نے سمجھایا۔

''دیکھیں کہ اب قسمت میں کیا لکھا ہے؟'' عمر سیف نے مایوسی سے کہا۔

دوسرے ہی روز عمر کا حلیہ تبدیل کر دیا گیا تھا اور اسے ایک ماڈرن سیاح بنانے کے لیے خالد قصام نے خاصی محنت کی تھی پھر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد خالد نے اسے غزہ کی پٹی پار کروا دی تھی اور آگے احتیاط سے سفر کرنے کی ہدایت کر دی تھی۔

عمر سیف مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں سفر کرتا ہوا اور جگہ جگہ اپنے حلیے بدلتا ہوا بالآخر بلغاریہ پہنچ گیا تھا اس عمل میں اسے کئی ماہ کا عرصہ لگا تھا جب وہ بلغاریہ میں رانیہ کے گھر پہنچا تھا تو اسے کوئی بھی پہچان نہیں سکا تھا۔

''مجھے حمزہ زید سے ملنا ہے۔'' اس نے دروازہ کھولنے والی اپنی بچی سے کہا جو اسے بالکل پہچان نہیں سکی تھی اور حمزہ کا کوئی مقامی دوست سمجھ رہی تھی۔

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔'' بچی نے معصومیت سے کہا اور عمر کا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر گلے سے لگا لے۔ وہ کافی عرصے بعد رانیہ کو دیکھ رہا تھا اور اس سے بے پناہ محبت بھی

کرتا تھا۔
"گھر میں کوئی اور ہے؟" اس نے پوچھا۔
"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" بچی نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کر دیا۔
"کوئی بڑا ہے؟"
"سعد بھائی ہے۔" حانیہ نے معصومیت سے کہا سعد کی عمر بامشکل بارہ سال تھی لیکن بہر حال وہ حانیہ سے تو بڑا تھا۔
"میرا مطلب ہے تمہاری...... امی وغیرہ۔"
"نہیں وہ اسکول گئی ہیں۔" حانیہ نے سادگی سے کہا۔
"اچھا...... میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔" اس نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ ٹھیک اسی لمحے گلی کے کونے سے رانیہ عبایہ میں ملبوس آتی نظر آگئی اسے وہ سیکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔
"رانیہ!" اس نے قریب آنے پر رانیہ سے سرگوشی میں کہا اور وہ ایک دم ٹھٹک گئی وہ اسے حلیے سے تو نہیں پہچانی تھی لیکن اس کے مخصوص انداز میں "رانیہ" کہنے پر وہ ہزاروں آوازوں میں بھی یہ آواز پہچان سکتی تھی وہ مسکرا کر اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
"میں گھر گیا تھا بچے نہیں پہچانے۔" عمر سیف نے رانیہ سے کہا اور رانیہ نے احتیاط سے اطراف کا جائزہ لیا اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی۔
پھر عمر سیف رانیہ کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہوا تھا۔ بچے اپنی ماں کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ رانیہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی تھی۔
"اوہ! عمر کیسے ہو...... تم نے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی؟" رانیہ نے والہانہ انداز میں اس کے سینے سے لگتے ہوئے کہا۔
"میں ٹھیک ہوں رانیہ...... تمہیں اطلاع دینے کا موقع ہی نہیں ملا...... میں بہت احتیاط سے سفر کرتا ہوا تم تک پہنچا ہوں۔ تم سے کوئی contact نہیں کر سکتا تھا کیونکہ شک ہے کہ میری نگرانی کی گئی ہو گی لیکن ابھی تک تو مجھے یقین ہے کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں ہے۔" عمر نے کہا۔
"بیٹھو! میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں پھر باتیں کریں گے۔" رانیہ نے کہا۔
"پہلے مجھے بچوں سے ملوا دو۔" عمر نے بے چینی سے کہا۔
"اچھا...... تم بیٹھو میں انہیں لاتی ہوں۔" رانیہ نے کہا تو عمر صوفے پر بیٹھ گیا کچھ ہی دیر بعد رانیہ اپنے تینوں بچوں کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی اور تینوں بچے اسے دیکھ کر اس سے چمٹ گئے تھے۔
"آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ آپ ابو ہیں میں آپ کو گھر میں بلا لیتی؟" حانیہ نے قدرے ناراضگی سے کہا جس کی عمر چار سال تھی۔
"میں آپ کا امتحان لے رہا تھا کہ آپ اپنے ابو کو پہچانتی ہیں یا نہیں؟" عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ابو میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔" طلحہ نے آگے بڑھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"بس اب میں تم لوگوں کے پاس ہی رہوں گا۔" عمر نے بچوں کو تسلی دی اور سعد جو صرف دس سال کا تھا اس سے چمٹ گیا۔
"ہاں ابو! اب ہم آپ کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔" اس نے پیار سے کہا۔
رانیہ بچوں کو عمر کے پاس چھوڑ کر کچن میں چلی گئی تھی اور جلدی جلدی عمر کی پسند کا کھانا تیار کرنے لگی تھی وہ چاہتی تھی کہ اتنے عرصے بعد اس کے آنے پر وہ کوئی کمی نہ ہونے دے اور عمر کی پسند کے مطابق اسے کھانا بنا کر جب کھانا میز پر لگ گیا تو حمزہ بھی آگیا تھا اور ایک عرصے بعد پوری فیملی کھانے کی میز پر جمع ہوئی تھی۔ بچے بہت خوش تھے۔ حمزہ بھی عمر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔
"حمزہ! میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے اتنے عرصے ان لوگوں کی دیکھ بھال کی۔" عمر نے کہا تو حمزہ ناراضگی سے اسے دیکھنے لگا۔
"بھائی یوں نہ کہیں آپ کی اس بات سے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی غیر ہوں اور میں نے آپ پر کوئی احسان کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے مجھے تو بہت خوشی ہوتی ہے کہ میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ یہ میری ہی فیملی ہے میں آپ کا بھائی ہوں۔" حمزہ نے کہا تو عمر نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔
"ہاں! مجھے احساس ہے...... لیکن اتنی کم عمری میں تم

نے بڑوں کی طرح ذمہ داری نبھائی ہے۔" عمر نے تعریفی انداز میں کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں بھائی جان آپ بھی تو اپنے ملک کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں اس میں تو یہ میرا بہت ہی تھوڑا سا حصہ ہے۔" حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دعا کرو اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے مقصد میں کامیاب کرے۔" عمر نے کہا۔

"آمین۔" حمزہ اور رانیہ نے ایک ساتھ کہا۔

"حمزہ! تم کافی عرصے سے یہاں ہو اب میرے لیے بھی کوئی کام ڈھونڈنا میں فارغ رہ کر کیا کروں گا۔ پتہ نہیں کتنے عرصے یہاں رہنا پڑے۔" عمر سیف نے کھانے کے دوران کہا۔

"ابھی تو آپ آئے ہیں جلد ہی کچھ کرلیں گے۔ فی الحال آپ آرام کریں اور میرا خیال ہے کہ زیادہ باہر نکلنے سے احتیاط برتیں۔" حمزہ نے کہا۔

"لیکن یہاں مجھے کوئی نہیں پہچانتا میں آزادی سے رہ سکتا ہوں۔"

"پھر بھی احتیاط ضروری ہے عمر۔" رانیہ نے درمیان میں مداخلت کی۔

"ابھی میں اور حمزہ ملازمت کر تو رہے ہیں ابھی تمہاری ملازمت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں پتا ہے میری فارغ بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں کچھ دن کی بات ہے پھر کوئی مناسب موقع دیکھ کر کہیں ملازمت بھی کرلینا۔" رانیہ نے اسے تسلی دی۔

دو چار دن تو عمر سیف کے ایسے مصروفیت میں گزرے کہ اسے احساس ہی نہ ہوا۔ اس کے سسرال والوں نے ایک کے بعد ایک کئی دعوتیں کردیں۔ وہ روز کسی سسرالی رشتہ دار کے گھر دعوت میں جاتا اس کے ساس سسر بہت خوش تھے کہ وہ زندہ سلامت غزہ سے نکل آیا ہے۔

پھر ایک روز جب رانیہ کے اسکول کی چھٹی تھی وہ عمر کو اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے سپر مارکیٹ لے گئی جہاں انہوں نے ڈھیر ساری خریداری کی۔ اس روز عمر نے محسوس کیا جیسے کوئی ان کے اردگرد موجود ہو اور ان پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ لیکن اس نے جب بھی اطراف کا جائزہ لیا تو اسے کوئی ایسا مشکوک شخص نظر نہیں آیا جو اس کی نگرانی کررہا ہو۔ اس نے اپنے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور شاپنگ کرکے رانیہ کے ساتھ واپس گھر آگیا۔

پھر کئی روز تک وہ مختلف کاموں سے گھر سے باہر جاتا رہا وہ ہر بار کافی احتیاط برتتا تھا۔ اس کا حلیہ کافی حد تک تبدیل ہوچکا تھا۔ اس کے نوجوان کلین شیو چہرے پر اب سیاہ رنگ کی گھنی داڑھی تھی۔ بال چھوٹے تھے اور پیٹ کسی حد تک باہر آگیا تھا۔ اسے غزہ سے بلغاریہ آئے ہوئے پانچ سال بیت گئے تھے اور خاصا مطمئن ہوچکا تھا کہ اب اسرائیلی اسے بھول چکے ہیں۔ وہ آزادی سے گھر سے باہر جانے لگا تھا پھر ایک دن جب وہ اکیلا ہی شاپنگ کے لیے مارکیٹ گیا ہوا تھا وہ بہت گھبرایا ہوا واپس آیا تھا۔ اس نے سودے کے شاپرز میز پر ڈال دیئے تھے اور اندر آنے پر باہر کا دروازہ بھی لاک کردیا تھا اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

"بچے کہاں ہیں؟" عمر نے پریشانی سے پوچھا۔

"وہ باہر کھیلنے گئے ہیں۔"

"نہیں باہر مت جانے دیا کرو...... وہ نا سمجھ ہیں اگر ان سے کوئی میرے بارے میں پوچھے گا تو وہ جھوٹ نہیں بول سکیں گے۔" عمر نے کہا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟ کیا بات ہے؟" رانیہ نے پھر پوچھا۔

"مجھے کافی دن سے محسوس ہورہا ہے کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

"نہیں عمر...... یہ تمہارا وہم ہوگا۔ تمہیں یہاں آئے پانچ سال ہوگئے ہیں۔"

"کچھ بھی سہی لیکن یہ اسرائیلی یہودی...... یہ ہمارا پیچھا ہماری قبر تک کرتے ہیں۔" عمر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"آخر ہوا کیا ہے تم مجھے تفصیل سے بتاؤ...... ٹھہرو میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔" رانیہ نے کہا اور کچن کی طرف دوڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک گلاس میں پانی لے آئی تھی اور عمر کو تھما دیا تھا جس سے عمر نے چند گھونٹ لیے تھے۔

''میں مارکیٹ میں شاپنگ کر رہا تھا میں نے نوٹ کیا ایک ادھیڑ عمر شخص بار بار میرے قریب سے گزر رہا تھا وہ کبھی کبھی مارکیٹ کے کسی کونے میں کھڑا ہو کر مجھے گھور بھی رہا تھا۔ پھر جب میں اس کی طرف دیکھتا تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے پیچھے ہی تھا۔'' عمر نے خالی گلاس رانیہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں عمر یہ تمہارا وہم ہوگا...... بھلا وہ تمہیں کیوں گھورے گا؟ ہوسکتا ہے کہ اسے تم میں کسی کی جھلک نظر آرہی ہو اور وہ تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔''

''نہیں......اس نے مارکیٹ سے نکلنے کے بعد بھی میرا پیچھا کیا تھا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ کیا تم نے اسے پیچھے آتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''ہاں......وہ کافی دور تک میری ٹیکسی کا تعاقب کرتا رہا تھا آخر میں نے ڈرائیور کو مختلف گلیوں میں گھمانا شروع کر دیا تھا اور ایک موقع پر اس کی گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ پھر جب کئی گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد مجھے اس کی سیاہ گاڑی نظر نہیں آئی تو میں گھر کی طرف آیا ہوں۔'' عمر نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

''بچوں کو اس بارے میں کچھ مت بتانا وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔'' عمر نے کہا۔

''ہاں! ہاں میں سمجھتی ہوں تم فکر مت کرو......میں حمزہ سے کہوں گی وہ اطراف پر نظر رکھے گا پھر بھی میرا خیال ہے کہ وہ تمہارا وہم ہے پانچ سال بعد......کون یاد رکھتا ہے؟''

''کاش ایسا ہی ہو......'' عمر سیف نے کہا لیکن پھر یہ سلسلہ رکا نہیں تھا اب اکثر ایسا ہوتا کہ عمر سیف باہر جاتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔ اسے کبھی کبھی کوئی اجنبی گلی کے کونے میں بازار، مارکیٹ میں چلتے ہوئے، کہیں چوراہوں تک پر بھی لوگ کھڑے محسوس ہوتے جو اسے گھور رہے ہوتے تھے لیکن کبھی کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک دو بار گھر کے دروازے پر دستک بھی ہوئی۔ جب جا کر دیکھا تو کوئی اجنبی ہوتا اور وہ کسی کا پتہ ڈھونڈ رہا ہوتا تھا۔ رانیہ کا یہی خیال تھا کہ یہ سب عمر کا واہمہ ہے کیونکہ وہ غزہ سے چھپ کر یہاں آگیا ہے۔

اس لیے اسے یہ شک رہتا ہے جیسے کوئی اس کے پیچھے ہے اس نے کئی بار عمر سیف کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔

''عمر یہ تمہارا وہم ہے......تم بچوں کے سامنے ایسی باتیں مت کیا کرو۔ وہ بھی ڈرنے لگیں گے۔'' ایک روز رانیہ نے اسے سمجھایا۔

''میں جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کرتا یہ سب میرے ساتھ ہو رہا ہے تو میں کہتا ہوں۔'' عمر سیف نے وضاحت کی۔

''میں جانتی ہوں لیکن بچوں کے سامنے ذرا احتیاط کیا کرو......کچھ ہی دنوں کی بات ہے جلد ہی تمہارا وہم ختم ہو جائے گا۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رانیہ نے سمجھایا۔

''ہاں! شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔''

کچھ دن اسی طرح گزر گئے پھر اچانک بلغاریہ میں موجود فلسطین کے اٹارنی کی طرف سے ایک خط رانیہ کو موصول ہوا اور خط نے رانیہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ عمر سیف کا شک درست ہے اس نے وہ خط عمر سیف کو دکھایا۔

''تم ٹھیک کہتے تھے انہیں پتہ چل گیا ہے کہ تم بلغاریہ میں موجود ہو۔ دیکھو یہ خط ایمبیسی کی طرف سے آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ اسرائیلی حکومت نے ان سے درخواست کی ہے کہ تمہیں ان کے حوالے کیا جائے۔ آخر انہیں یہاں تمہاری موجودگی کا علم کیسے ہوا؟'' رانیہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''یہی تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' عمر سیف نے کہا۔

''اب کیا کرنا چاہیے۔'' رانیہ نے پوچھا۔

''اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ میں ایمبیسی جاؤں اور ان لوگوں سے خود بات کروں۔'' عمر سیف نے کہا۔

''لیکن ایسا کرنے میں تمہارے لیے خطرہ ہے وہ تمہیں پکڑ کر اسرائیلیوں کے حوالے کر دیں گے۔''

''ایسا بھی ہوسکتا ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ میرا ساتھ دیں۔ ویسے بھی یہاں ہمیں بلغاریہ کی ایمبیسی کے علاوہ اور کسی کا بھی سہارا نہیں ہے۔'' عمر سیف نے کہا۔

''پھر؟'' رانیہ کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

''پھر کیا میں کل جاؤں گا ایمبیسی۔ وہاں میرا ایک دوست ہے اس سے ملوں گا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کیا مشورہ دیتا ہے۔'' عمر سیف نے کہا۔

"اور اگر راستے میں انہوں نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو؟"

"نہیں ...... ایسا نہیں ہوگا...... یہ اسرائیل نہیں ہے یہاں بلغاریہ کے قوانین ہیں اگر انہوں نے اپنے طور پر کوئی کارروائی کی تو انہیں بھی اس کے لیے جواب دہ ہونا ہوگا۔ اگر وہ خود کارروائی کرسکتے تو ایمبیسی والوں سے درخواست نہ کرتے۔"

"ہوں...... ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن اسرائیلیوں سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔"

"اللہ مالک ہے...... میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میرے اوپر لگائے جانے والے الزامات جھوٹے ہیں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔" عمر سیف نے کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔" رانیہ نے کہا۔

دوسرے روز ناشتے سے فارغ ہو کر عمر سیف حمزہ کے ساتھ بلغاریہ ایمبیسی پہنچ گیا تھا۔ جہاں اس نے فلسطین اتھارٹی ایمبیسیڈر احمد المعروف سے ملاقات کی جس نے اسے اسرائیل سفارت خانے کی طرف سے موصول ہونے والا خط بھی دکھایا اور اسے بتایا کہ اسرائیلی سفارت خانے نے بلغاریہ کے سفارت خانے سے درخواست کی ہے کہ وہ اس کے مجرم عمر سیف کو جو اس کے ملک میں موجود ہیں گرفتار کرکے اسرائیلی سفارت خانے کے حوالے کردے۔ اس کام کے لیے انہیں تقریباً بہتر گھنٹے دیئے گئے ہیں۔

"لیکن یہ ناممکن ہے...... میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہیں کرسکتا میں آپ کا مجرم نہیں ہوں اور اسرائیل نے بھی مجھ پر جھوٹے الزامات لگائے ہیں۔" عمر سیف نے کہا۔

"میں جانتا ہوں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت دنیا بھر میں فلسطینیوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ یہ جنگ اب فلسطین کی سرحدوں سے نکل گئی ہے اب دنیا میں جہاں جہاں فلسطینی موجود ہیں ان میں سے مختلف لوگوں کو اغوا کیا جارہا ہے اور انہیں قتل کردیا جاتا ہے۔"

"تو پھر دنیا کی عدالتیں؟ وہ کیا کر رہی ہیں؟ اقوام متحدہ؟ جسے مظلوموں کی حمایت اور انصاف کے لیے قائم کیا گیا تھا وہ کیا کر رہی ہے...... انسانی تحفظ کی دوسری تنظیمیں، ہم کہاں جائیں، ہمیں کہاں انصاف ملے گا؟" عمر سیف نے کہا۔ حمزہ اس کے برابر خاموشی سے بیٹھا تھا اور احمد المعروف بغور اس کی بات سن رہا تھا۔

نماز کی معافی نہیں

اللہ تعالیٰ جل شانہ کی تمام تخلیقات زمین، آسمان، سیارے، پہاڑ، سمندر، دریا، فرشتے اس کی حمد وثنا میں مصروف ہے۔ اللہ پاک رحیم بھی ہے جبار بھی ہے اللہ پاک اعلیٰ ہے اور عظیم ہے پھر اپنے لطف وکرم کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ میرا عذاب بھی عظیم ہے۔ اب ہمیں خود اندازہ کرلینا چاہیے کہ جو خود عظیم ہے۔ اس کا عذاب بھی عظیم ہے اللہ پاک کے ساتھ کسی کو شریک کرنا گناہ کبیرہ ہے کبیرہ سے مراد بڑا گناہ ہے۔ صغیرہ سے مراد چھوٹا گناہ۔ قیامت صغریٰ کا مطلب چھوٹی قیامت قیامت کبریٰ سے مراد بڑی قیامت۔ چھوٹی قیامت سے مراد کسی گھر میں حادثہ کی صورت میں کہرام برپا ہونا۔ یعنی اس گھرانے پر قیامت برپا ہوگئی۔ بڑی قیامت وہ ہوگی جب صور پھونکا جائے گا۔ انسانوں اور تمام نگلی گئی چیزوں کو زمین اللہ کے حکم سے اگل دے گی۔ سب سے پہلے انسانوں سے نماز کے بارے پوچھا جائے گا بے نمازی کو قبر میں عذاب بھگتنے کے علاوہ جہنم واصل کردیا جائے گا۔ ایک تو اللہ پاک کو شرک پسند نہیں دوسرا جو لوگ اس کے احکامات اور عبادت سے غافل ہوتے ہیں وہ پسند نہیں۔ کچھ ساگ، بھات اور حلوے کھانے والے دیہاتی ملاؤں نے مشہور کر رکھا ہے کہ پیر اپنے مریدوں کو بخشوائیں گے۔ پیروں کے آسرے پر لوگ نماز سے غافل ہوتے جارہے ہیں۔ یہ غفلت ان کو لے ڈوبے گی۔ پھر پچھتاوے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ جعلی پیر خود جہنم واصل ہوں گے۔ نماز کی معافی نہیں ہے۔ کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بھی تجاہل عارفانہ سے کام نہیں لیا۔ تو مسلمان بھائیوں نماز کی غفلت سے اجتناب کرو، نماز قائم کرو اسی میں ہماری بہتری ہے۔

بشیر بھٹی...... بہاولپور

"تمہارا کہنا درست ہے لیکن تم نے سنا تو ہوگا ۱۹۷۲ء میں لبنان میں فلسطینی لیڈر غصام کو بھی کار بم بلاسٹ میں مار دیا گیا تھا۔ وہ جن فلسطینیوں کو مار رہا ہے ان میں اسکالرز، کارکن، ناول نگار، استاد، ڈاکٹر، انجینئر ہر شعبے سے متعلق لوگ شامل ہیں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں غزہ کے واحد پاور پلانٹ کے ڈپٹی انجینئر درار ابوسیسی کو بھی مدسانہ سے اغوا کروایا تھا جو ٹرین میں سفر کررہے تھے۔ یہ ۲۰۱۱ء کی بات ہے انہیں رات کے وقت ٹرین میں ہی ہتھکڑیاں لگا کر پکڑا گیا۔ وہ کوئی مجرم نہیں تھے ایک انجینئر تھے اور اپنی ڈیوٹی کر کے واپس جا رہے تھے۔ ان پر تشدد کیا گیا اور انہیں زبردستی زندہ ایک تابوت میں ڈالا گیا اور جہاز کے ذریعے اسرائیل بھیج دیا گیا جہاں وہ اب تک قید ہیں۔" عمر سیف نے کہا۔

"تو پھر؟ تم تو سب کچھ جانتے ہو۔"

"میں سب کچھ جانتا ہوں...... میں کئی سال ان کی قید میں بھی رہ چکا ہوں۔ وہاں فلسطینیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ دیکھ اور سہہ چکا ہوں اس لیے میں گرفتاری دینا نہیں چاہتا جب کہ میں بے قصور ہوں۔"

"کیا تم میرے پاس صرف یہ بتانے آئے ہو کہ تم گرفتاری دینا نہیں چاہتے؟" احمد المعروف نے کہا۔

"ہاں! کیا بلغاریہ کی حکومت ایک بے قصور مظلوم کا ساتھ نہیں دے گی؟" عمر نے پوچھا۔

"بلغاریہ کی حکومت کیا کرسکتی ہے؟ وہ تمہاری خاطر اسرائیل سے تعلقات خراب نہیں کرسکتی۔" احمد المعروف نے کہا۔

"پھر کم از کم مجھے تحفظ فراہم کیا جائے میری جان کو خطرہ ہے۔ جیسا کے آپ بتا رہے ہیں کہ اسرائیلی کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔ وہ اغوا بھی کرسکتے ہیں، قتل بھی کرسکتے ہیں اور زبردستی گرفتار کر کے اسرائیل بھی لے جاسکتے ہیں تو میرے لیے بلغاریہ کی حکومت سے پناہ مانگیں۔ یہاں کی حکومت سے درخواست کریں کہ وہ سکیورٹی فراہم کرے جب تک کہ میرا کوئی مناسب فیصلہ نہیں ہو جاتا۔" عمر سیف نے کہا۔

"حکومت سے تو بات کرلیں گے لیکن تمہیں پتہ ہے کہ حکومتی کام میں وقت لگتا ہے فی الحال تم مجھ سے کیا چاہتے ہو وہ بتاؤ؟" احمد المعروف نے کہا۔

"اگر ممکن ہو تو مجھے یہاں سفارت خانے کی عمارت ہی میں کہیں چھپالو...... میں واپس جا کر اپنے بیوی بچوں کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یہاں محفوظ رہ سکو گے؟"

"ہاں یہ بلغاریہ کا سفارت خانہ ہے یہاں اسرائیلی درخواست بھیج سکتے ہیں لیکن یہاں آ کر مداخلت نہیں کر سکتے۔" عمر سیف نے کہا۔

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید تم یہاں بھی محفوظ نہ رہو۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے میرا دل کہتا ہے کہ میں اپنے گھر سے زیادہ یہاں محفوظ رہ سکتا ہوں۔"

"سوچ لو عمر...... بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوگا۔" عمر نے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن پہلے ہمیں رانیہ بھابھی سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔" حمزہ نے پہلی بار منہ کھولا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس نے انکار بھی کیا تو میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔ میں نے اب فیصلہ کرلیا ہے میں یہاں ہی پناہ حاصل کروں گا۔ جب تک اسرائیل کے ساتھ کوئی معقول سمجھوتہ نہیں ہو جاتا یہی رہوں گا۔" عمر سیف نے اٹل لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں میں کیا کرسکتا ہوں تم کل آ کر مل لینا میں بتادوں گا کہ کیا فیصلہ ہوا۔" احمد المعروف نے کہا۔

اس روز عمر اور حمزہ واپس گھر آ گئے تھے جب رانیہ کو اس معاملے کی اطلاع ملی تو اس نے شدید مخالفت کی۔

"نہیں عمر میں تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تم وہاں محفوظ نہیں رہو گے۔" رانیہ نے اسے سمجھایا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ وہ بلغاریہ کا سفارت خانہ ہے وہاں اسرائیل مداخلت نہیں کرسکتا۔"

"جو کسی قانون کو نہ مانے جو خدا سے نہ ڈرے جو اس کے بندوں پر ناحق ظلم کرے وہ بھلا کسی اور سے کیا ڈرے گا۔" رانیہ نے حقارت سے کہا۔

"اب اتنا بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ رانیہ میری سمجھ میں اس مصیبت سے نکلنے کی ایک

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ترکیب آئی ہے تو مجھے اسے آزمانے دو۔" عمر نے غصے سے کہا اور رانیہ خاموش ہوگئی۔

اس رات اس نے عمر کو سمجھانے کی بار بار کوشش کی لیکن عمر اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ پھر دوسرے دن وہ اپنے بیگ میں چند جوڑے کپڑے ڈال کر حمزہ کے ساتھ پھر بلغاریہ کے سفارت خانے پہنچ گیا تھا۔

"تو تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ تم یہاں پناہ حاصل کر کے رہو گے؟" احمد المعروف نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"ہاں! میں ایک فیصلہ کرنے سے پہلے اسے ہر پہلو سے دیکھتا ہوں اس پر سوچتا ہوں اس پر وقت لگاتا ہوں۔ لیکن جب ایک بار فیصلہ کر لیتا ہوں تو پھر اس پر قائم رہتا ہوں۔" عمر نے جواب دیا اور احمد المعروف کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اس نے اپنا بیگ بھی ایک طرف رکھ دیا تھا۔

"ہم لوگوں نے بھی کافی سمجھایا لیکن بھائی اپنی ضد پر قائم ہے۔" حمزہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں نے اتھارٹی سے بات کی ہے وہ کچھ روز تک پناہ دینے پر راضی ہوگئے ہیں۔ میں نے خاص طور سے عمر کے لیے سیکیورٹی دینے کی بات کی ہے۔" احمد المعروف نے بتایا۔

"ٹھیک ہے میں دو تین روز بعد آ کر بھائی کی خیریت لے جایا کروں گا۔" حمزہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... آؤ میں تمہیں عمر کی رہائش جگہ دکھا دیتا ہوں۔" احمد المعروف نے کہا۔ پھر وہ عمر اور حمزہ کے ساتھ سفارت خانے کے پچھلے حصے میں چلا گیا تھا جہاں ایک گراؤنڈ تھا۔ جس کے دوسرے سرے پر چند بلاک بنے ہوئے تھے جو تین اور چار منزلہ تھے ان کے ایک طرف ایک اونچی دیوار تھی اور دو طرف خوب صورت لان بنے تھے اور سامنے سفارت خانے کے دفاتر تھے۔ جگہ جگہ سیکیورٹی گارڈ موجود تھے۔ گیٹ پر بھی سیکیورٹی سخت تھی۔ سی سی کیمرے لگے تھے اور بڑے بڑے آہنی دروازے نصب تھے۔

حمزہ' عمر کو چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا اور عمر نے اپنے کمرے میں بیگ رکھ دیا تھا پھر وہ کمرے میں پڑے بیڈ پر لیٹ گیا تھا اس کمرے میں ایک فرد کے رہنے کے انتظامات تھے ایک الماری تھی' رائٹنگ ٹیبل اور دو کرسیاں تھیں۔ ساتھ ہی باتھ روم تھا اس نے اندازہ لگایا کہ وہ وہاں کئی ماہ تک رہ سکتا تھا۔ عمارت میں جگہ جگہ سیکیورٹی کا بہترین انتظام موجود تھا۔

دوسری شام کو احمد المعروف عمر سے ملنے اس کے کمرے میں آیا تھا۔ اس وقت عمر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

"کیسے ہو عمر؟" احمد نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں...... آئیں بیٹھیں۔"

"کیا یہاں تم خوش ہو؟"

"ہاں میں سمجھتا ہوں کہ یہاں میں محفوظ ہوں۔" عمر نے جواب دیا۔

"کھانا وغیرہ پسند آیا؟"

"آپ کا بہت شکریہ آپ نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔"

"نہیں کوئی بات نہیں عمر لیکن میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کرنا چاہتا تھا لیکن میرے بس سے باہر ہے۔"

"کوئی بات نہیں احمد بھائی آپ نے جتنا کر دیا وہ بہت ہے۔" عمر سیف نے کہا۔

"لیکن عمر میں تم کو تنبیہ کر رہا ہوں ہوشیار رہنا۔ یہ اپنا وطن نہیں ہے اور کسی کے چہرے پر اس کے دل کا حال نہیں لکھا ہوتا۔ کسی پر بھروسہ نہ کرنا اگر وقتی طور پر اسرائیلی ناکام ہو بھی گئے تب بھی وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اب دیکھ لو کہ کتنے سال بعد انہوں نے تمہیں بلغاریہ میں ڈھونڈ لیا ہے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔"

"ایک بات اور بتا دوں کھانا وغیرہ ہوشیاری سے کھانا۔ کسی طرح چیک کر لیا کرو۔ مجھے شک ہے کہ خفیہ طور پر زہر بھی دیا جا سکتا ہے۔" احمد المعروف نے کہا۔

"ارے احمد بھائی اب آپ مجھے ڈرا رہے ہو۔" عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں عمر آنکھیں اور کان ہر وقت کھلے رکھنا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" عمر نے کہا۔

"انہیں علم ہے کہ تمہیں یہاں پناہ دے دی گئی ہے۔ اس کا مطلب جانتے ہو؟" احمد المعروف نے کہا۔

"کیا مطلب ہے؟"

''مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسرائیل کا ساتھ دینے کے بجائے تمہارا ساتھ دیا ہے اور ہم تمہارے دوست ہیں۔ چنانچہ اب ہمیں بھی اسرائیل کی مخالفت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ وہ ہمیں بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''اوہ احمد بھائی میرا ایسا کوئی مقصد نہیں میں تو صرف......''

''میں جانتا ہوں لیکن تمہارے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ جتنی جلدی ہو اس قصے کو نمٹا دو اپنے ساتھ دوسروں کو مصیبت میں نہ ڈالو۔'' احمد المعروف نے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے...... میں دیکھتا ہوں کہ کیا کر سکتا ہوں۔'' عمر سیف نے آہستگی سے کہا۔

اسی شام حمزہ اس سے ملنے سفارت خانے آیا تو اس نے حمزہ کو بھی احمد المعروف کی بات بتائی اور کہا کہ ''اس نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ مجھے کھانے میں زہر دیا جا سکتا ہے اور یہاں بھی میرے خلاف سازش ہو سکتی ہے۔''

''میں تو آپ کے یہاں رہنے ہی کے حق میں نہیں ہوں۔'' حمزہ نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اسرائیلیوں نے ہم پر زمین تنگ کر دی ہے۔ ہمیں ہمارے وطن میں بھی سکون سے نہیں رہنے دیتے اور کہیں اور بھی سر چھپانے نہیں دیتے۔ اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرو تو ہمیں دہشت گرد کہا جاتا ہے۔''

''ہماری پہچان ہمارے وطن ہی سے ہے اور وطن چھوڑ کر کہیں اور پناہ لے کر ہم بچ نہیں سکتے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں وہی کرنا چاہئے جو اب تک غزہ میں دوسرے مسلمان کر رہے ہیں۔ یا تو لڑتے ہوئے شہید ہو جائیں یا اپنے وطن کو آزاد کروالیں۔'' حمزہ نے کہا۔

''میں بھی تو یہی کر رہا ہوں۔ میرے لیے تو حالات اتنے برے کر دیئے گئے ہیں کہ میں وہاں بھی محفوظ نہیں تھا اور میں ہی کیا اسرائیل کی جیلوں میں مجھ جیسے بہت سے لوگ ہیں جو بغیر قصور کے سزائیں بھگت رہے ہیں۔''

''میں ایک دو روز میں فیصلہ کروں گا۔ بظاہر تو کوئی بہتر صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ تم رانیہ کا خیال رکھنا اور بچوں کو بھی سمجھاتے رہنا۔'' عمر سیف نے حمزہ کو ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے۔'' حمزہ نے کہا۔

حمزہ کے جانے کے بعد عمر سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ پھر رات کے شاید بارہ بجے ہوں گے کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اس کے سامنے دو افراد سیاہ لباس میں ملبوس کھڑے تھے ان کے چہروں پر سیاہ نقاب تھے اور ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

''کون؟...... کون ہو تم؟'' عمر نے بوکھلا کر پوچھا وہ سوتے سے اٹھا تھا اچانک اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا جب تک وہ صورت حال کو سمجھتا وہ دونوں اسے دھکا دے کر اندر داخل ہو گئے تھے اور ان کے پیچھے مزید اور لوگ بھی تھے۔ وہ بھی اسی حلیے میں تھے انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔

''ہوں...... یوں چھپنے سے تم بچ نہیں سکتے۔'' ان میں سے ایک نقاب پوش نے کہا۔

''تم کون ہو؟...... میں نے کیا کیا ہے؟''

''یہ تو پتہ چل ہی جائے گا جب تم اسرائیل پہنچو گے۔'' ایک اور نقاب پوش نے جواب دیا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' عمر سیف نے غصے سے کہا۔

''تم جانتے ہو ہم جو چاہیں وہ تمہیں کرنا پڑے گا۔''

''ہرگز نہیں...... یہ اسرائیل نہیں...... یہاں کا بھی ایک قانون ہے۔''

''ہمارا قانون ہر جگہ چلتا ہے ہم کسی اور قانون کو نہیں مانتے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

اتنی دیر میں آنے والوں میں سے ایک نے عمر سیف کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے تھے اور اسے دروازے کی جانب دھکا دیا تھا۔ عمر لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکلا تھا۔ اور اس نے بغیر سوچے سمجھے سامنے بنے زینے سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ دو سیاہ پوش اس کے پیچھے تھے جنھوں نے اسے راستے میں دبوچ لیا تھا۔

''یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھت پر ہمارا ہیلی کاپٹر موجود ہے۔'' ایک نے کہا۔

''مجھے چھوڑ دو...... میں نے کچھ نہیں کیا...... میں بے قصور ہوں۔'' عمر سیف نے کہا وہ حیران تھا کہ یہ آنے

والے لوگ کون تھے؟ انہیں اندر تک کیسے رسائی مل گئی؟ راستے میں کسی نے ان کے خلاف کوئی مزاحمت کیوں نہیں کی اور اتنے شور شرابے کے باوجود کوئی اس کی مدد کو کیوں نہیں آیا؟ عمارت کے اس حصے سے سیکیورٹی گارڈز بھی غائب تھے وہ اس نئی صورت حال کو سمجھ نہیں سکا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے سر پر گن کا بٹ مارا اور وہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس کے بعد عمر سیف کے ساتھ کیا ہوا یہ کہانی سنانے والا کوئی نہیں تھا۔ دوسرے دن یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے علاقے میں پھیل گئی تھی کہ بلغاریہ کے سفارت خانے کے لان میں عمر سیف کی لاش ملی ہے جو خون میں نہائی ہوئی ہے اور اس کی موت کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سننے میں آرہی تھیں۔

حمزہ بڑی عجلت میں بلغاریہ کے سفارت خانے پہنچا تھا اور احمد المعروف سے ملا تھا۔

''کیا ہوا؟...... سب کیسے ہوا؟'' اس نے پوچھا۔ احمد بھی پریشان نظر آرہا تھا۔

''کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا ہوا ہے مجھے یہاں کے سیکیورٹی گارڈ نے صبح خبر دی۔ میں اسی وقت یہاں آگیا تھا۔ عمر سیف کی لاش میرے سامنے ہی ایک ایمبولینس میں مقامی اسپتال بھیجی گئی ہے۔'' احمد نے حمزہ کو بتایا۔

''اس کے ساتھ کیا ہوا؟ میں شام کو تو اس سے مل کر گیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا اس نے بتایا تھا کہ آپ نے اسے کہا تھا کہ اس کی جان یہاں محفوظ نہیں ہے اور اسے کھانے میں زہر بھی دیا جاسکتا ہے۔''

''ہاں میں نے کہا تھا لیکن یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہم سب ہی جانتے ہیں اسرائیلی ایسے ہی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔''

''لیکن اس کی موت زہر دینے سے تو نہیں ہوئی۔ سب کا کہنا ہے کہ وہ خون میں لت پت تھا اس پر تشدد کیا گیا ہے اور پھر چوتھی منزل سے دھکا دے دیا گیا تو وہ لان میں آکر گرا ہوگا۔'' حمزہ نے کہا۔

''ضابطے کی کارروائی ہورہی ہے تحقیقات کے بعد سب صورت حال واضح ہوگی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' احمد نے کہا۔

''لیکن کسی پر تو شک کیا جارہا ہوگا...... کوئی تو نشانات ملے ہوں گے...... کسی نے تو کچھ دیکھا ہوگا۔''

''ہاں! فی الحال میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ فلسطینی قیدیوں کے معاملات کے چیف عیسیٰ قراقی کا کہنا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ یہ اسرائیلی ایجنسی کی کارروائی ہے۔''

''اب جو بھی ہو لیکن میرا بھائی تو اپنی جان سے گیا اسے تو کوئی بچا نہیں سکا۔'' حمزہ نے کہا اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''تم جانتے ہو مجھ سے جو ہوسکا میں نے کیا۔''

''ہاں! میں تمہارا شکر گزار ہوں...... تم نے واقعی جو ممکن تھا کیا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میرا بھائی بے قصور تھا۔ ان بہت سے مسلمانوں کی طرح جواب بھی اسرائیل کی جیلوں میں قید ہیں اور وہاں روزانہ نت نئے مظالم کا شکار ہورہے ہیں۔ پھر چاہے کسی کو بھی قصوروار کہیں۔ چاہے سفارت خانے کے عملے کی بے پروائی کہیں۔ چاہے بلغاریہ کی حکومت کی کمزوری کہیں کہ اس کے ملک میں اس کے سفارت خانے میں اس کو اختیار نہیں اور وہ میرے بھائی کو سیکیورٹی فراہم نہیں کرسکی لیکن دنیا میں ہر جگہ یہی ہورہا ہے۔ ظالم کے ہاتھ مضبوط اور لمبے ہیں ان کی پہنچ مسلمانوں پر ہر جگہ ہے اور پھر برسوں کی جدوجہد کے بعد بھی آزادی حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ ہماری جدوجہد کتنی طویل ہے ہم نہیں جانتے اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ ابھی اس راہ میں عمر سیف جیسے کتنے غریب الوطن ہے۔ ہم نہیں جانتے اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ ابھی اس راہ میں عمر سیف جیسے کتنے غریب الوطن کو اپنی زندگیوں کی قربانی دینا پڑے گی۔'' حمزہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے گالوں تک آگئے تھے۔

''میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں میرے دوست اور دعا گو ہوں کہ عمر جیسے غریب شہر مکان کو اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور مسلمانوں پر رحم فرمائے۔

عشنا کوثر سردار

یہ ناول 1947ء کی ایک کہانی پر مبنی ہے اس ناول کا پلاٹ، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے یہ محبت کی ایک کہانی ہے جس نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس محبت کی کہانی دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو پہلی بار ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

عین النور پٹوڈی کی آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔ پیاس کی شدت سے اس کے ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی اور حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے مگر اس افراتفری میں جب سب کو اپنی جان بچانے کی پڑی تھی پانی کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ تیمور بہادر یار جنگ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جیسے فوری طور پر اس کی مدد کرنے سے قاصر دکھائی دیا تھا۔ اسے افسوس تھا مگر اس دوران وہ اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ نہ اسے تنہا چھوڑ کر کہیں جا سکتا تھا۔ عین النور بہت نیم جاں سی لگ رہی تھی جیسے اس کے پاس آگے بڑھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ اسے حوصلہ دینا چاہتا تھا مگر وہ جانتا تھا یہ کافی نہیں ہوگا۔ کسی طرح کوشش کر کے وہ ہربنس پور آنے والی ٹرین پکڑ کر یہاں تک آ گئے تھے مگر آگے راستے مسدود دکھائی دیئے تھے۔ عین النور پٹوڈی نے Mount Hotel کی طرف اشارہ کیا تھا۔ شاید اسے لگا تھا کہ کچھ دیر ستا کر توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ سفر لمبا تھا اور مشکلات بہت زیادہ تھیں۔ ہر شے غیر متوقع طور پر وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ کوئی ایک معاملہ نہیں تھا جس کے بارے میں فکر کی جاتی۔ تیمور بہادر یار جنگ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور بہت مایوس ہو کر اسے شرمندگی سے دیکھا تھا۔ اس کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں کہ وہ وہاں قیام کرنا افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے یہ ناممکن تھا جیسے تبھی وہ بولا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارا مقصد کہیں رکنا یا قیام کرنے سے زیادہ آگے بڑھنا ہے۔ اگر رک گئے تو تھکن مزید بڑھ جائے گی۔ ویسے بھی کہیں رکنے کے لئے حالات سازگار دکھائی نہیں دے رہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا۔ کتنا مشکل وقت چل رہا ہے؟'' تیمور بہادر یار جنگ نے اسے جتایا تھا۔ عین النور بنا کچھ کہے اس کی طرف سے نظریں پھیر گئی تھی۔ تبھی جیب سے کچھ چنے نکال کر تیمور یار جنگ نے بند مٹھی اس کی طرف بڑھائی تھی مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔ کسی سے مدد لے کر وہ کسی طرح ناگ پور پہنچے تھے۔

''میں تھک گئی ہوں اور سفر نہیں کر سکتی!'' عین النور نڈھال سی اس کے شانے پر جھول گئی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ نے اس کا جھکا ہوا سر اپنے شانے پر دیکھا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے وجود کو تھام کر سہارا دے سکتا۔ احتراماً اسے دیکھ کر نگاہ بدل لی تھی۔

''وہ تھکن کسی مسئلے کا حل نہیں ہے عین النور پٹوڈی...... قدم روکنے کا مطلب جانتی ہیں آپ؟ قدم رکنے کا مطلب ہے سفر رک جانا...... اور سفر رک جانے کا مطلب ہے ہم کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے!'' تیمور اسے جتا رہا تھا تب ہی ایک ہندو خاتون بہت غصے سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

''کہاں بھاگ رہے ہو۔ مارے جاؤ گے تم دونوں۔ یہاں کہیں کوئی پاکستان نہیں ہے۔ کوئی پاکستان کبھی نہیں بنے گا۔ مارے جاؤ گے تم۔''

اس کا انداز نفرت سے بھرا تھا۔ عین النور نے آنکھیں کھول کر اس عورت کو دیکھا تھا وہ اور بھی خوفزدہ ہو کر تیمور بہادر یار جنگ کے ساتھ چپک گئی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے عین النور کے گرد اپنی باہوں کا حصار باندھا تھا اور مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

"There would definitely be Pakistan."

تیمور بہادر یار جنگ کا لہجہ اعتماد سے بھرا تھا۔ وہ ہندو عورت غصے سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"You are Pak people, will go to hell."

وہ شدید نفرت سے کہہ کر مڑ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ عین النور اس کی گرفت میں کانپ رہی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا ہم پاکستان پہنچ پائیں گے۔ ہمیں ہار مان لینا چاہیے۔ جس طرح لوٹ مار اور بلوے ہو رہے ہیں یہ سفر ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا اس ہندو عورت کی نفرت؟ یہ ہم سے اتنی نفرت کرتے ہیں ہمیں پاکستان کی زمین پر قدم رکھنے کے لئے زندہ نہیں چھوڑیں گے!'' عین النور خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ مگر تیمور بہادر یار جنگ اسے لے کر آگے بڑھا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے راستوں پر تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ جاننے پر بضد ہوئی تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ چلنے کی مزید ہمت نہیں تھی۔ تبھی تیمور

بہادر یار جنگ نے اسے بازوؤں پر اٹھا لیا تھا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا تھا۔ مختلف راستوں سے وہ ایک گلی میں داخل ہوا تھا اور دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ عین النور کوشش کے باوجود آنکھیں کھول کر نہیں دیکھ پائی تھی۔ اس کی آنکھیں غنودگی کے باعث بند ہو رہی تھیں۔ کسی نے دروازہ کھولا تھا۔

''اوئے تیمور بہادر یار جنگ تو؟ اوکداں؟ اے کون؟ بھابی اے؟'' سکھو یندر سنگھ نے دروازہ کھولتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی مگر تیمور بہادر یار جنگ اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہوا فوراً اندر آیا تھا۔ سکھو یندر نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تھا اور ان دونوں کو دیکھا تھا۔

''اوئے ماجرا کیا ہے؟ پاکستان جا رہا ہے تو؟ میری مان تو رسک مت لے یار۔ بہت اوکھا ہے۔ ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کوئی ٹرین صحیح سلامت پاکستان جانے نہیں دے رہے۔ لوٹ مار، بے حرمتی، عصمت دری عام ہے۔ یہ تجھے بھابی کو لے کر پاکستان جانے کی کیا سوجھی؟ میری مان۔ یہاں رک جا۔ میرا گھر محفوظ ہے۔ بہت مشکل ہو گا تیرا بارڈر کے اس پار جانا۔'' سکھو یندر اس کے لئے پریشان نظر آیا تھا۔ تیمور نے کوئی جواب دیئے بنا عین النور کو چارپائی پر لٹایا تھا۔

''سکھو یندر یار تھوڑا پانی ملے گا؟ یہ کل سے پیاسی ہیں۔ اس حالت میں ہم آگے سفر نہیں کر سکتے۔ راستے بھی بند ہیں۔'' تیمور بولا تھا۔ اور سکھو یندر نے آگے بڑھ کر جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔ تیمور بہادر یار جنگ نے پانی کا گلاس عین النور کے لبوں سے لگایا تھا۔ جسے عین النور نے بمشکل پیا تھا۔ سکھو یندر نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔ بہت مشکل صورت حال ہے۔ یہ ہندو پاگل ہو رہے ہیں۔''

سکھو یندر مدد کرنے کو تیار دکھائی دیا تھا۔ مگر تیمور بہادر یار جنگ نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

"This would have only put three lives at risk.

''میں مشکور ہوں لیکن اگر تم نے ہماری مدد کی تو ہمارے ساتھ ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے اور میں تمہاری جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہوں گا۔'' تیمور بہادر یار جنگ انکاری ہوا تھا۔ سکھو یندر مسکرایا تھا۔

''یاراں دی جان، یاراں تے وارتی۔ جان دا کی اے یار؟ دوست سے بڑھ کر جان نہیں ہے۔'' سکھو یندر جانباز سپاہی تھا مگر تیمور نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔ مگر سکھو یندر کے الفاظ تیمور بہادر یار جنگ میں توانائی کی ایک نئی لہر بھر گئے تھے۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد انہوں نے دہلی سے ٹرین پر سفر کا آغاز کیا تھا۔ سکھو یندر مددگار رہا تھا۔

ٹرین کا ماحول ایک سکوت میں گھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف جیسے موت کا راج تھا۔ ایک طویل گہری خاموشی تھی۔ ایک خوف کی فضا تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ کی جانچتی نظروں نے نوٹ کیا تھا۔ ٹرین میں کل دس افراد تھے اور سب کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ کسی کو خبر نہیں تھی اس سفر کا انجام کیا ہو گا۔ وہ کسی منزل پر پہنچیں گے بھی یا نہیں۔ سب چہروں پر خوف کی دبیز تہہ تھی۔ سب جیسے دم سادھے بیٹھے تھے۔

''جو ٹرین اس سے قبل پاکستان گئی ہے کوئی حال نہیں تھا اس کا۔ سو مسافر تھے اور ان میں سے نوے مسافر مارے گئے!'' ایک بزرگ دھیرے سے بولے تھے اور عین النور نے خوف سے تیمور بہادر یار جنگ کی سمت دیکھا تھا اور اس کی بازو پر اس کی گرفت غیر دانستہ مضبوط ہو گئی تھی۔

''مشکل وقت ہے صاحب، کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں رک کر بھی شامت کو آواز ہی دینا ہے۔ جب سے تقسیم کا اعلان سنائی دیا ہے ان ہندوؤں نے تو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کو جیسے کمر کس لی ہے۔ میں ناگ پور سے آ رہا ہوں میری بیٹی ساتھ تھی مگر انہوں نے اسے چھین لیا اور پھر......!'' ان بزرگ کی آواز بھرا گئی تھی۔

''اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا ہے میں نے اپنی پھولوں سی بچی کو۔ بیس برس عمر تھی اس کی۔ وہ چاہتی تھی ہم پاکستان روانہ ہوں۔ لکھنؤ کی سرزمین چھوڑتے ہوئے مجھے اندازہ نہیں تھا بیٹی کو گنوا دوں گا۔ وہ پرہمت تھی۔ کہتی تھی پاکستان کی فضا میں سانس لینا خواب ہے اس کا مگر وہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔'' اس خوف کی فضا میں ان کی لرزتی ہوئی آواز ابھری تھی۔

"ہم بھی نہیں رہیں گے نا؟" عین النور نے سر اٹھا کر تیمور بہادر یار جنگ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور تیمور بہادر یار جنگ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔ وہ نیم جان سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی جب دوسرے بزرگ کی آواز سنائی دی تھی۔

"میں نے اپنے بیٹے، بہو اور پوتے کے ساتھ سفر کا آغاز کرنال سے کیا تھا مگر جانے راستے میں وہ کہاں چھوٹ گئے۔ اتنی بھیڑ تھی کہ افراتفری میں خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں اس آس میں پاکستان جا رہا ہوں کہ ان سے جا ملوں گا۔ شاید وہ سب پاکستان پہنچ چکے ہوں۔ پرسوں ایک ٹرین پاکستان پہنچنے کی خبر آئی تو تھی۔ مجھے امید ہے وہ باخیر و عافیت پہنچے ہوں گے۔" دوسرے بزرگ نے ایک آس بھرے لہجے میں کہا تھا۔

عین النور پٹوڈی بغور ان بزرگ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوف بھری آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور پر یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ ہمت نہ ہاریئے...... میری ذمے داری ہے صحیح سلامت آپ کو پاکستان پہنچانا۔ حوصلہ رکھیے۔ جب تک میں زندہ ہوں یہ آس باقی رہنا چاہیے۔ میں باقی نہ رہوں تو آپ ایسا قیاس کر سکتی ہیں کہ آپ صحیح سلامت پاکستان نہیں پہنچ سکیں گی!" تیمور بہادر یار جنگ نے مکمل یقین سے اسے دیکھا تھا۔ عین النور نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا اور کچھ فاصلے پر بیٹھے بزرگ کی طرف دیکھنے لگی تھی جو دوسرے کو بتا رہے تھے۔

"تین دن پہلے جو ٹرین دہلی سے لاہور پہنچی تھی اس میں تمام ملٹری کے عہدیداران تھے۔ سنا ہے اس میں تمام آفیسرز اور ان کے خاندان مارے گئے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان کی حکمت عملی تھی کہ پاکستان کے پاس عسکری اور سول خدمات دینے والے حضرات کی طاقت نہیں ہونا چاہئے جو کہ نئے بنے پاکستان کو آگے بڑھنے میں مدد دے سکے۔ ان کا ارادہ اس طاقت سے پاکستان کو محروم کرنا تھا۔ دی انڈین منسٹر آف Interior مسٹر پائل کا بیان آیا تھا اس متعلق کہ نیا بننے والا نوزائیدہ پاکستان زیادہ پھل پھول نہیں سکے گا اور بہت جلد دوبارہ انڈیا کا حصہ بننا چاہے گا۔ تبھی وہ ایسے ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔" بزرگ نے پر افسوس لہجے میں کہا تھا۔ سامنے بیٹھی خاتون نے دل تھام لیا تھا۔

"یا اللہ خیر......! بوا حمیدہ کے بیٹے کا کیا ہوا ہوگا؟ وہ بھی تو ملٹری میں تھے؟" وہ خوف سے لرز گئی تھی۔

"کیا کر رہے ہیں بیگم ہم تو دنیا کے ساتھ ہیں۔ جہاں اتنے مر رہے ہیں ہم موت کو اپنی طرف آنے سے کیسے روک پائیں گے؟ مگر ایک آس تو ہے کہ ہم نوزائیدہ پاکستان دیکھنے جا رہے ہیں آگے جو اللہ کو منظور......!" بزرگ بے خوف دکھائی دیئے تھے۔

"بالکل سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔ خال خال ہی کوئی ٹرین صحیح سلامت پاکستان پہنچی ہوگی مگر ہم امید تو رکھ سکتے ہیں نا!" دوسرے بزرگ بھی پرامید دکھائی دیئے تھے۔

"آپ سو جایئے۔ بے فکر رہیے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔" تیمور بہادر یار جنگ نے اسے تحفظ کا احساس دلاتے ہوئے کہا تھا۔ ٹرین تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ عین النور نیم جاں سی آنکھیں میچ گئی تھی۔ تمام واقعات نظروں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ کتنی سفاکی سے اس نے حملہ آوروں کو بے قصوروں کی جان لیتے دیکھا تھا۔ وہ خوف سے آنکھیں کھول کر تیمور بہادر یار جنگ کی طرف دیکھنے لگی تھی اور تیمور بہادر یار جنگ جیسے اس کی کیفیت سمجھتا تھا تبھی نرمی سے بولا تھا۔

"اچھے دنوں کے بارے میں سوچیے۔ ان قتل و غارت گری کے واقعات سے دھیان ہٹایئے اپنا۔ موت برحق ہے۔ آنی ہے تو آتی ہے۔ ہم بزدل نہیں بن سکتے۔ مگر اتنا یقین رکھیے جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں، کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" تیمور بہادر یار جنگ اسے بھرپور یقین دلا رہا تھا۔ عین النور پٹوڈی نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور پھر آنکھیں دوبارہ میچ لی تھیں۔ اپنوں کے کتنے چہرے اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ زندگی کتنی آسودگی لیے ہوئے تھی۔ ہر طرف کتنا سکون اور اطمینان تھا۔ مسکراتے چہرے فکر سے بے پرواہ تھے۔ وہ سکون سے اپنے آپ کو ان چہروں سے اپنے اندر کے سلسلے جوڑنے لگی تھی۔

☆☆☆......

حکمت بہادر یار جنگ نے شطرنج کی چال چلتے ہوئے نواب سیف الدین پٹوڈی کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔

”مبارک ہو وہاں آپ کے سمدھی مرزا نثار سراج الدولہ آجکل کانگریس میں شمولیت کے لئے پر تول رہے ہیں۔“ حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے اور نواب سیف الدین پٹوڈی نے سر ہلا دیا تھا۔

”حکمت بہادر یار جنگ صاحب، ہمیں اس سیاست کی خبروں سے کیا لینا دینا۔ ہم ٹھہرے نواب۔ یہ سیاست کے داؤ پیچ ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ ہم نے تو اپنے ہونے والے سمدھی سے صاف کہہ دیا ہے ہماری طرف گزر ہو تو ایسی گفتگو سے پرہیز کیجئے گا۔“ نواب صاحب مسکرائے تھے۔ حکمت بہادر یار جنگ ہنسے تھے۔

”جانے دیجئے نواب صاحب، آپ تو خود خبروں کا حصہ رہتے ہیں۔ آپ کا اثر و رسوخ کس سے چھپا ہے۔ آپ کا نام لینے سے ہی کئی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔“ حکمت یار مسکرائے تھے۔ نواب صاحب نے کچھ مزید کہے بغیر انہیں دیکھا تھا۔ تبھی حکمت بہادر یار جنگ بولے تھے۔

”ویسے سیاست کا بھی کوئی حال نہیں ہے جناب۔ کل کی بات ہی سنئے۔ نہرو کا کیا چونکا دینے والا بیان آیا ہے کہتے ہیں کہ یہ حقیقت حیران کن ہے کہ انگریز حکومت نے یہ نظام ہم پر مسلط کیا ہے۔ حیران کن بات تو یہ ہے کہ ہماری اکثریت نے انگریز کے اس ڈھانچے کو قدرتی اور ناگزیر طور پر اپنی زندگی کا طریقہ کار اور قسمت تسلیم کر لیا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی راج کی یہ نفسیاتی فتح دنیا کی کسی بھی فوج یا سفارتکاری کی کامیابی سے بڑھ کر ہے۔“ حکمت بہادر یار جنگ کی بات سن کر نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

”ٹھیک کہا۔ نہرو صاحب کا یہ اعتراف دراصل مقامی حکمران طبقے کی رجعتی اور غلامانہ سوچ کو بے نقاب کرتا ہے۔ اب اٹھارہویں صدی کے وسط میں شروع ہونے والے صنعتی انقلاب کو ہی دیکھئے اس نے تو یورپ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ دو سو سال کے اندر برطانیہ دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک بن گیا تھا۔ برطانیہ کی تیز صنعت کاری میں نو آبادیات سے لوٹی جانے والی قدر زائد کے مطابق برصغیر پر گرفت مضبوط کر لینے کے بعد یہاں کے جی ڈی پی کا 70 سے 80 فیصد برطانیہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس صنعتی انقلاب کو برپا کرنے میں ہمارے حکمرانوں کی ناکامی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اب جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ یہ فرنگی یہاں سے جائیں گے بھی کہ نہیں کسے خبر......!“ نواب صاحب نے سگار کا کش لیتے ہوئے مسکرا کر اپنی شطرنج کی چال چلی تھی۔

”صحیح فرما رہے ہیں آپ نواب صاحب۔ اب جواہر لال نہرو کو ہی دیکھئے وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے بالادست طبقے کی سیاسی و نظریاتی تربیت ہی سامراجی نظام کو قائم اور جاری رکھنے کے لئے کی گئی تھی۔ یہ سیاسی رہنما ایٹن، ہارو اور وچسٹر جیسے برطانوی تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہیں اور شعوری یا لاشعوری طور پر ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں دوسرے درجے کا انسان سمجھتے ہیں۔ نہرو صاحب کا بیان دراصل اسی تناظر میں تھا لیکن کون سمجھتا ہے یہاں۔“ حکمت بہادر یار جنگ نے افسوس سے کہا تھا۔

”لمبی کہانی ہے حضرت۔ 1500ء میں عالمی سطح پر برصغیر کی معیشت چین کے بعد دوسرے نمبر پر تھی جبکہ 1700ء میں پہلے نمبر پر تھی اور دنیا کی 25 فیصد پیداوار اس خطے میں ہوتی تھی۔ 1600ء میں ہندوستان کی کل آمدن 17.5 ملین پاؤنڈ تھی جو کہ برطانیہ کی 1800ء کی کل آمدن سے بھی 1.5 ملین پاؤنڈ زیادہ تھی۔ سترہویں صدی تک ہندوستان دنیا کا امیر ترین خطہ تھا جس کی معیشت دنیا میں سب سے بڑی تھی۔ اس میں تمہیں تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا کہ اچانک ان فرنگیوں کو یہاں سے مسالہ جات کی ٹریڈ یاد کیوں آ گئی اور یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی لے کر کیوں آن دھمکے۔ فرنگی چالاک ہیں۔ ان کی نظر برصغیر کی کل آمدن پر تھی۔ سو آ گئے اور لوٹنے لگے۔ ہمارے آباؤ اجداد کی محنت تھی۔ ہم شرمسار ہیں ہم اس زمین کی حفاظت نہیں کر پائے۔ فرنگیوں نے برٹش راج کے تحت ایسا جکڑا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں بھی مار نہیں پا رہے ہیں۔ بس سانس روکے ساکت ان کے جال میں پھنسے بیٹھے ہیں اور ہمارے حکمران ان کے حکم پر عمل کیے جا رہے ہیں۔ ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے ہیں۔“ نواب صاحب بولے تھے۔

حکمت بہادر یار جنگ نے تائید میں سر ہلایا تھا۔

''ہم صرف افسوس کر سکتے ہیں جناب۔ ایسا ہے کہ ہم تو ایوانوں میں بیٹھے نہیں اور جو بیٹھے ہیں وہ کچھ کرتے ہیں۔ یہ سب ایسے ہی چلتا رہے گا۔ کیا کہیں بھیا، آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔''

''بمبئی میں وہ جو کانفرنس ہوئی تھی اس کا کیا ہوا؟''

حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

''سنا ہے آپ کے قریبی دوست مسٹر نہرو نے پپ کو کانگریس کے اجلاس میں مدعو کیا تھا؟ گئے نہیں تھے آپ؟''

حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

نواب صاحب مسکرا دیئے تھے۔

''بات اگلوانے میں ماہر ہیں آپ حکمت بہادر یار جنگ۔ ہمارا تعلق کہاں جوڑنے لگے آپ؟ نہرو صاحب سے علیک سلیک ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم قریبی دوستوں میں شمار ہونے لگے۔ دوستی تو ہماری مسلم لیگ کے کئی اراکین سے بھی ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے ہمارے ابا مرحوم فریڈم فائیٹر رہے ہیں۔ گوروں نے انہیں سر نہ جھکانے کی سزا دی تھی۔ مگر یہ خون جوش مارنے والا ہے۔ ہار ماننے والا نہیں۔ ابا حضور مرحوم کہتے تھے سر مت جھکانا۔ سر جھکاؤ گے تو دشمن گیدڑ بھی ہوگا تو شیر بن جائے گا۔ سو ہم نے سر جھکانا نہیں سیکھا اور نہرو صاحب تو یوں بھی ہندوؤں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ بھلا کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں؟ مسلم لیگی رہنما کا ساتھ دینا چاہیں گے ہم تو۔ ان کی بات میں دم ہے اور میں فخر یہ ایک بات کہہ سکتا ہوں میں مسلم لیگی رہنماؤں کے خیالات سے متفق ہوں۔'' نواب صاحب مسکرائے تھے۔

''ہم اسی بات کی طرف آ رہے تھے نواب صاحب۔ مسلم لیگی رہنماؤں سے تو آپ کی ملاقاتیں عام ہیں۔ ان کے نظریات سمجھ میں آنے والے ہیں۔'' حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

''مسلم لیگی رہنماؤں کی محبت ہے وہ یاد رکھتے ہیں مگر آپ تو جانتے ہیں ریاستی معاملات حساس ہیں۔ ہم ان معاملات کو اس طور ڈسکس نہیں کر سکتے۔ مگر ہم مسلم لیگ کے ساتھ کھڑے ہیں ان کی حمایت کرتے ہیں۔'' نواب صاحب نے کہا تھا اور شطرنج کی چال چلتے ہوئے مسکرائے تھے۔

''آپ کا تجسس کمال عروج پر رہتا ہے میاں۔ آپ اچھے سے واقف ہیں ہم سیاست سے فی الحال پرہیز کر رہے ہیں۔ فی الحال اور بہت سی مصروفیات آڑے آ رہی ہیں مگر مسلم لیگی رہنماؤں کی طرف جب بھی کوئی دعوت نامہ موصول ہوتا ہے ہم اسے اپنا اعزاز سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔'' نواب صاحب مسکرائے تھے۔

''ارے جناب بات تجسس کی نہیں ہے نواب صاحب۔ بیٹھکوں میں بیٹھوں تو کئی چہ میگوئیاں سننے کو ملتی ہیں۔ ویسے آپ کو یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا نظر آتا ہے؟ یہ تحریک کا عمل جو چل رہا ہے اس کا کوئی حاصل حصول بھی ہے؟ نہرو صاحب کی بات سنو تو الگ بات کرتے ہیں۔ ادھر مسٹر جناح کی بات الگ سمجھ بوجھ رکھتی ہے۔ انگریز راج کیا کرے گا؟ کس کی سنے گا؟ یا پھر کسی کی نہیں سنے گا؟ ویسے یہ فرنگی بہت سیانے ہیں۔ یہ دونوں کو کہیں بے وقوف نہ بنا رہے ہوں کیونکہ روز نئے نئے اجلاس تو ہوتے ہیں مگر کوئی مدلل اور ٹھوس بات نکلتی دکھائی نہیں دیتی۔'' حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے اور نواب صاحب سر ہلانے لگے تھے۔

''ہم قیاس آرائیاں نہیں کر سکتے جناب۔ ہم اس نظریاتی جنگ کو فی الحال کہیں نہیں دیکھ رہے۔ ہمارے رہنما کمزور ہیں اور فی الحال کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ ہم قانون جانتے ہیں، قانون پڑھا ہے، پریکٹس بھی کی ہے مگر فی الحال جتنے بھی لیڈران ہیں ان میں رسہ کشی ہو رہی ہے اور برٹش راج بندر بانٹ والا کام کر رہی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہیں دونوں کی لڑائی میں کوئی تیسرا فائدہ نہ اٹھا جائے۔'' نواب صاحب فکر مندی سے بولے تھے۔

حکمت بہادر یار جنگ نے سر ہلایا تھا۔

''بجا فرمایا آپ نے نواب صاحب۔ یہ نظریاتی لڑائی کہیں ختم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ برٹش راج چالاک ہے۔ ان کی عیاری سے سب واقف ہیں۔ وہ سدھرنے والی سرکار نہیں۔ جو اقتدار چھینتے ہیں واپس دینے کے لئے نہیں چھینتے۔ ان کے جو مقاصد ہیں جب تک وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ جائیں یہ برٹش راج چھوڑنے والا نہیں۔'' حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

عین النور نے گرما گرم سیاسی بحث کو سنتے ہوئے قدم اندر رکھا تھا۔ ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی اور لوازمات۔

"السلام علیکم چچا جان۔" عین النور نے مسکراتے ہوئے چائے ٹیبل کی سطح پر رکھتے ہوئے حکمت بہادر یار جنگ کی طرف دیکھا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو؟" حکمت بہادر یار جنگ نے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"مجھے معلوم تھا ابا جان اور آپ ایک طویل بحث میں الجھے ہوں گے سو آپ کے لئے چائے بنوا لائی۔" عین النور مسکرائی تھی۔

"ہماری بچی کتنی عقلمند ہے نواب صاحب۔ اپنے چاچا کی محبت کا اتنا خیال کرتی ہے اور ایک آپ دوست ہو کر بھی ابھی تک بحث پر ٹرخا رہے تھے۔" حکمت بہادر یار جنگ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مسکرائے تھے اور نواب صاحب مسکرا دیئے تھے۔

"یہ نئی نسل کے بچے ہیں جناب حکمت بہادر یار جنگ صاحب۔ ان کو جنگوں کی کہانیاں ڈراؤنے خواب جیسی لگتی ہیں۔ یہ سیاست کی بات بھی سننا نہیں چاہتے گھر میں۔ یہ ہم اور آپ سے مختلف ہیں۔" نواب صاحب مسکرائے تھے۔

"عینی بیٹی اپنے چاچا کے خیالات کی حمایتی ہیں۔ دنیا میں امن ہونا چاہئے۔" حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

"بالکل چاچا جان، کیا رکھا ہے ان لڑائی جھگڑوں میں۔ کتنی خلقت نقصان اٹھاتی ہے۔ یہ جنگیں انسانی دشمن ہیں۔ ہمیں تو گولی کی آواز سے ہی ڈر لگتا ہے۔" عین النور مسکرائی تھی اور لوازمات کی پلیٹ نواب صاحب کی طرف بڑھائی تھی۔ نواب صاحب اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرائے تھے۔

"دیکھو میاں حکمت بہادر یار جنگ، یہ بچی ہمارے خاندان سے کتنی مختلف ہے۔ دادا، باپ، بھائی سبھی انقلابی سوچ کا حصہ ہیں اور یہ امن کی شمع لئے کھڑی دکھائی دیتی ہے۔"

"ابا جان، امن اس دنیا کے لئے بہت ضروری ہے۔ دیکھئے پہلی جنگ عظیم کے نقصانات کتنے ہیں۔ ہم میں سے

حکمت کے موتی

+ ایمان داری سے خرید و فروخت کرنے والے کا انجام نیکوکار اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔
+ بنی اسرائیل اس لیے تباہ ہوئے کہ وہ غریبوں کو سزا دیتے تھے اور امیروں کو چھوڑ دیتے تھے۔
+ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرے وہ خدا کا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔
+ سب سے بہتر جہاد یہ ہے کہ تم انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے بھی غصہ کو پی جاؤ۔
+ علم مال سے بہتر ہے کہ وہ تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو۔
+ صرف خواہش کرنے سے ہر چیز نہیں مل جاتی، خواہش کے ساتھ جدوجہد بھی لازمی ہے۔
+ کسی کی خوبیوں کی تعریف کرنے میں اپنا وقت برباد نہ کرو بلکہ اس کی خوبیاں اپنانے کی کوشش کرو۔
+ اللہ سے اس کا فضل طلب کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے۔

سونی علی...... ریشم گلی، مورو سندھ

......☆☆......

قطعہ

یہ سب میری بربادی کا کب پوچھ رہے ہیں
کیوں زندہ ہوں اب تک یہ سبب پوچھ رہے ہیں
وہ شدت غم ہے میری جاں پر بنی ہے
اور دوست سوالات عجب پوچھ رہے ہیں

راؤ تہذیب حسین تہذیب...... رحیم یار خان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کون ہے جو دوسری جنگ عظیم کے خطرات کو دیکھنا چاہے گا۔ خدا نہ کرے ہم ایسا کوئی وقت دیکھیں۔ بہت تباہی ہوگی اور ہم ایسی تباہی افورڈ نہیں کر سکتے۔“ عینی نے کہا تھا۔ حکمت صاحب مسکرائے تھے۔

”بچی کی بات میں دم ہے نواب صاحب۔ ہمیں سب باتیں بھول کر ایک کام کرنا چاہئے۔ آنے والے وقت کی بھاگ دوڑ ان بچے بچیوں کے ہاتھ میں دے دینا چاہئے۔“ حکمت صاحب نے مشورہ دیا تھا۔ نواب صاحب مسکرائے تھے۔

”آنے والے وقت کی بھاگ دوڑان بچوں کے ہاتھ آنا ہے جناب۔ ہم نے کب انکار کیا ہے۔ اچھا وہ آپ کے صاحبزادے انگلستان سے تعلیم ختم کر کے آنے والے تھے ان کا کیا ہوا؟“ نواب صاحب نے پوچھا تھا۔

”بچے نئے خیالات کے مالک ہیں نواب صاحب۔ صاحبزادے فرما رہے تھے فرنگیوں کی غلامی ہی کرنا ہے تو وہاں واپس آ کر کیوں کریں؟ یہیں راہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔“ حکمت بہادر یار جنگ نے کہا تھا۔ عین النور چونکی تھی۔

”چاچا جان آپ کے صاحبزادے اور ایسی سوچ؟ یقین نہیں ہوتا۔ آپ یہاں مسلم لیگ کا حصہ ہیں۔ آزادی کے لئے کام کر رہے ہیں اور وہاں انگلستان میں موجود آپ کے صاحبزادے غلامی کو ترجیح دے رہے ہیں؟ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو ان جناب کا دماغ ٹھکانے لگانے کی اشد ضرورت ہے۔“ عین النور نے سخت لفظوں میں مزاحمت کی تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ابا جان ہم فتح النساء کی طرف جا رہے ہیں۔ اماں کو بتا دیجیے گا اور دادی جان کو بھی خبر نہیں ہونے دیجیے گا۔ ورنہ ہمیں کی شام کے وقت جوان بچیوں کا گھر سے نکلنا کوئی اچھی بات نہیں۔“ عین النور مسکرائی تھی۔ نواب صاحب نے سر ہلایا تھا اور عین النور باہر نکل گئی تھی۔

......☆☆☆......

درس گاہ میں کسی بہت بڑے مشاعرے کے ہونے کی خبر ہے۔ سنا ہے بہت چیدہ چیدہ شاعر حضرات مدعو ہیں۔ میرا خیال ہے کوئی مضائقہ نہیں اگر ہم بھی اس تقریب میں ہو آئیں؟“ فتح النساء نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ عین النور نے سوچ بنا سر انکار میں ہلایا تھا۔

”تم جانتی ہو دادی جان کو ایسی جگہوں پر جانا پسند نہیں۔ بڑی مشکل سے یونیورسٹی جانے کی اجازت ملی ہے ورنہ گھر میں بیٹھ کر پڑھ پڑھ ہم کسی پنجرے میں قید انجان بلبل بن گئے تھے۔ اب ایسی ویسی کوئی خبر عام مت کرنا۔ گھر کی دہلیز پار کرنے پر بھی پابندی عائد ہو جائے گی۔“ عین النور نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ فتح النساء نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”ہمارے بے شمار پسندیدہ شاعروں کی آمد متوقع ہے۔ ہم تو جانے کی ٹھان چکے ہیں۔ ویسے سیاسی فضاؤں میں رہتے رہتے آپ بھی کچھ عجیب ہوگئی ہیں عین النور۔ اور وہ آپ کے انتہائی بے تکے قسم کے منگیتر صاحب۔ ان کی تو کوئی بات ہماری عقل میں ہی نہیں آتی۔ سمجھ نہیں آتا آپ ان کے ساتھ گزارہ کیسے فرمائیں گی؟ نواب زادی عین النور پٹوڈی اور مرزا حیدر سراج الدولہ کی جوڑی کچھ جچتی نہیں۔“ فتح النساء صاف گوئی سے بولی تھی۔

”ایسا مت کہو فتح النساء۔ ہماری منگنی بچپن سے مرزا حیدر سراج الدولہ کے ساتھ طے ہے اور اب تو ہمیں ان کا نام اپنے نام کے ساتھ سننے کی عادت بھی ہوگئی ہے۔“ عین النور نے کہا تھا تو فتح النساء نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ عین النور نے کہا تھا۔ فتح النساء مسکرا دی تھی۔

”کچھ نہیں۔ بس یونہی ایک بات سوچ رہے تھے ہم۔“

”کیا......؟“ عین النور نے ابرو چڑھا کر پوچھا تھا۔ فتح النساء مسکرا دی تھی۔

”یونہی سوچ رہے تھے۔ تمہیں مرزا حیدر سراج الدولہ سے محبت ہے کہ نہیں؟ آپ کی نسبت ان کے ساتھ آپ کے بچپن سے طے ہے تو ضرور کوئی دل کا تعلق تو بن ہی گیا ہوگا نا؟“ فتح النساء مسکرائی تھی۔ عین النور نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ اس کا ذہن فکروں میں ڈوبا دکھائی دیا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو آپ؟“ فتح النساء نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں یونہی سوچ رہے تھے ہم۔“

”اگر آپ کو ان سے محبت نہیں تو زندگی کیسے ساتھ

گزاریں گی آپ؟" فتح النساء نے چھیڑا تھا۔عین مسکرادی تھی۔

"ہم نہیں جانتے۔ ہمیں ان سے محبت ہے کہ نہیں لیکن ہم حیدر کا نام سن کر بڑے ہوئے ہیں۔ ہماری عقل اور دل صرف ایک نام سننے کا عادی رہا ہے اور اس نام کے علاوہ ہم کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ اب یہ محبت ہے یا کوئی انسیت؟ ہم نہیں جانتے مگر اس انسیت میں کوئی بھید ضرور ہے۔" عین النور مسکرائی تھی۔

"کیسی عجیب ہیں آپ عین النور آپ کو محبت ہی کی کچھ خبر نہیں؟ ایسا ہوتا ہے کوئی؟" فتح النساء نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"محبت کی خبر ہونا کیسا ضروری ہے فتح النساء؟" عین النور نے حیران ہو کر اسے ایسے دیکھا تھا جیسے کوئی بہت عجیب بات کہہ رہی ہو۔

"یہ آپ پوچھ رہی ہیں نواب زادی عین النور؟ آپ کو محترم حیدر صاحب سے پوچھنا چاہیے۔" فتح النساء نے کہا تھا۔عین النور مسکرادی تھی۔

"ہمیں حیدر صاحب سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ہم ان سے بات کرسکیں۔ بہت اچھے سے جانتی ہیں آپ۔ ہم ان کا سامنا نہیں کر سکتے۔" عین النور مسکرائی تھی۔

"یا اللہ۔ اتنے ہی خوفناک ہیں آپ کے حیدر میاں؟ نواب زادی ان کے تیور نہیں سنبھال سکتیں زندگی میں انہیں کیسے سنبھالیں گی؟" فتح النساء مسکرائی تھی۔ عین النور مسکرائی تھیں۔

"ہمیں تیور سنبھالنا نہیں آتے۔ ہم ان طور طریقوں سے واقف نہیں ہیں۔ ہمیں تو ایسے مشوروں سے نوازنے سے پرہیز ہی کریں آپ۔" عین النور مسکرائی تھی اور جھولے پر بیٹھ کر بادام سے بنی کھیر کھانے لگی تھی۔ تبھی فتح النساء آکر اس کے قریب بیٹھی تھی اور رازداری سے عین النور کے کان کے قریب جھک کر بولی تھی۔

"اور کیا ہوا اگر جو آپ کو محبت ہو جائے نواب زادی؟" فتح النساء کی آنکھوں میں شرارت تھی اور عین النور اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھیں۔

"کیا مطلب؟" وہ لاعلم سے لہجے میں حیرت سے آنکھیں

پھیلائے انہیں دیکھتی ہوئی بولی تھیں اور فتح النساء مسکرادی تھی۔

"ہائے اللہ یہ بے خبری۔ آپ کا کچھ نہیں ہوسکتا نواب زادی۔" فتح النساء نے جیسے اس کی عقل پر افسوس کیا تھا اور مسکراتے ہوئے شرارت سے آنکھیں پھیر گئی تھی۔

"ہمیں آپ کی بات سمجھ نہیں آئی فتح النساء۔ آپ محبت کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟ ہر وقت تو آپ چچا جان کی لائبریری میں موٹی موٹی کتابوں سے الجھی رہتی ہیں۔ ہمیں تو ان کتابوں کو دیکھ کر بھی کوفت ہوتی ہے قسم سے۔ ہمیں تو آپ اس محبت سے معاف ہی رکھئے!" عین النور نے مسکراتے ہوئے معذرت چاہی تھی۔ فتح النساء شرارت سے ہنستی چلی گئی تھی۔

"اف تو بہ نواب زادی آپ کی ناک پر بہت غصہ ہے۔ حیدر میاں نے تو نہیں کہہ دیا کہ آپ کتنی خوبصورت لگتی ہیں اس غصے میں؟" فتح النساء مسکرائی تھی۔

"آپ بات بے بات بیچارے حیدر میاں کو بیچ میں کیوں کھینچ لاتی ہیں؟" عین النور کو فتح النساء کے انداز پر غصہ آیا تھا۔

"اف...... اللہ اللہ...... نواب زادہوں کو اب یہ بھی منظور نہیں کہ کوئی "ان" کے "اُن" کا ذکر بھی کرے؟ اف یہ پردہ داری...... یہ احتیاط...... سننے میں آتا ہے محبت کے وصف ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ ہماری پیاری دوست کو محبت ہوگئی تو ہم کیا کریں گے؟ سنا ہے عشق ہو جائے تو بندہ کسی کام کا نہیں؟ سوتے جاگتے ایک ہی نام کی مالا جپتا ہے۔ اسی کا ذکر کرتا ہے اور راتوں کو جاگ جاگ کر اختر شماری کرتا ہے۔ نا کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ اف نواب زادی آپ تو ہمیں بھی بھول جائیں گی؟" فتح النساء نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

عین النور نے نگاہوں میں غصہ بھر کر ان کو دیکھا تھا پھر ہاتھ کا مکا بنا کر ان کے بازو پر دے مارا تھا۔ فتح النساء ہنسنے لگی تھیں۔

"اف یہ اتنی احتیاط کس خوشی میں؟ سہیلی ہیں ہم آپ کی۔ اتنی رازداری اچھی نہیں۔ اچھا جانے دیجئے۔ جانتے ہیں ہم آپ کے بس کا روگ نہیں یہ عشق...... جانے دیجئے...... کہتے ہیں عشق و عاشقی کرنا مردوں کو زیب دیتا

ہے۔ بہت خوبصورت احساس ہوتا ہے جب مرد کی طرف سے ایک خوبصورت اظہار ہوتا ہے۔ ہم تو اس وقت کا انتظار کریں گے۔ آپ کو مشورہ ہے کہ آپ بھی اس دن کا انتظار کریں جب محترم حیدر سراج الدولہ کو آپ سے عشق ہو جائے۔ ویسے علی گڑھ یونیورسٹی سے خبر آئی تھی۔ آپ کہیں تو بتا دیں؟" فتح النساء نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ عین النور نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"ہم جانتے ہیں کوئی خاص راز ہے آپ کے پاس۔ یا پھر کوئی بہت ہی خاص خبر...... سنا دیجیے۔ آپ کو خاص انعام سے نوازا جائے گا۔" عین النور مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"ارے رہنے دیں۔ انعام کا لالچ آپ کی سہیلی فتح النساء کو نہیں ہے۔ ہم تو آپ کو خاص خبر دینے والے تھے۔" فتح النساء مسکرائی تھی۔

"اچھا اب کہہ بھی دیجیے۔ ہم سننے کو بہت منتظر ہیں۔ اب کیا جان لیں گی آپ؟ جس سے برا حال ہوا جا رہا ہے۔ ہمیں خبر ہے آپ کے پاس مرزا صاحب سے جڑی کوئی خبر ہے۔" عین النور کے چہرے پر فطری رنگ اتر آئے تھے۔ فتح النساء مسکرا دی تھی۔

"اف یہ قوسِ قزح کے سارے رنگ جو آپ کے چہرے کو اتنا پرنور کر رہے ہیں کاش ان کو آپ کے محترم مرزا صاحب بھی دیکھ سکتے۔" فتح النساء مسکرائی تھی۔ عین النور نے بہت الجھن سے اسے دیکھا تھا۔

"جانے بھی دیجیے فتح النساء۔ اتنا زچ کرنے لگیں آپ تو۔ اچھا ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں۔ پھر ملاقات ہوگی۔" عین النور کھیر کا پیالہ ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فتح النساء نے فوراً اٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"ارے ارے ایسے خفا ہو کر مت جائیے۔ اچھا ہم بتاتے ہیں۔ آپ کے مرزا حیدر سراج الدولہ نے مشاعرے میں بڑی دھواں دھار غزل کہی ہے۔ بہت دور دور تک خبر گئی ہے۔ سنا ہے عشق ہو گیا ہے انہیں۔ پتہ کر لیجیے وہ آپ کی زلف کے ہی اسیر ہیں نا؟ کہیں معاملہ کوئی اور نہ ہو۔" فتح النساء نے چھیڑا تھا۔ عین النور اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی۔

"ہم نہیں جانتے ہم اس کی خبر نہیں رکھتے۔ ہم کبھی ان کی آنکھوں میں جھانک نہیں پائے۔ لیکن ہمیں یقین ہے ہم ان کے دل میں یا سوچوں میں کہیں ضرور ہوں گے۔" عین النور کا لہجہ افسردہ تھا۔ فتح النساء اس کو جھولے پر بٹھاتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"امید کرتی ہوں ایسا ہی ہو عین صاحبہ۔ ان محترم کی محبت پر آپ کا حق ہے مگر آپ تو جانتی ہیں آج کل کے مردوں کو۔ خیر جانے دیں۔ آپ غصہ مت کریں۔ اماں مغلائی پلاؤ بنا رہی ہیں کھانا کھا کر جائیے گا۔" فتح النساء نے کہا تھا اور عین النور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہمیں نہیں پتہ مگر ہم چاہتے ہیں مرزا حیدر سراج الدولہ ہم سے وفادار رہیں۔ جیسے کہ ہم ان سے وفادار ہیں۔" عین النور پٹوڈی کی نظروں میں کئی فکریں دکھائی دے رہی تھیں۔ فتح النساء کو اپنے دوست کی فکر ہوئی تھی تبھی بولی تھی۔

"معافی چاہتے ہیں ہم نواب زادی عین النور ہم تو آپ سے مذاق کر رہے تھے۔ ہمارا قصد آپ کو افسردہ کرنا یا محترم حیدر میاں سے بدظن کرنا نہیں تھا۔" فتح النساء نے بے چین ہو کر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ تبھی عین النور بولی تھی۔

"ہم جانتے ہیں آپ ہم سے مذاق نہیں کر رہی تھیں فتح النساء۔ خیر جانے دیجیے۔ آپ ہمیں اتنے تکلف سے نواب زادی مت کہا کریں۔ ہمیں بہت اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہم آپ کے کچھ نہیں لگتے یا جیسے آپ ہماری دوست نہیں۔" عین اس قصے کو جیسے دانستہ نظر انداز کرتی ہوئی مسکرائی تھی۔ فتح النساء نے اسے بغور دیکھا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں اب آپ فتح النساء؟ اس خوبصورت چہرے کے پیچھے اب کیا چل رہا ہے آپ کے دماغ میں؟" عین النور نے مسکراتے ہوئے فتح النساء کو دیکھا تھا۔ پھر پرسوچ انداز میں سر جھٹک کر نفی میں ہلاتی ہوئی بولی تھی۔

"میں نہیں چاہتی آپ کوئی دکھ اٹھائیں۔ آپ ہماری سب سے اچھی اور بچپن کی سہیلی ہیں۔ ہم آپ کو بہت خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی سچی محبت سے جلد ملا دے اور وہ محبت آپ سے کبھی نہ بچھڑے!" فتح النساء نے اسے دل سے دعا دی تھی۔ عین النور مسکرائی تھی۔

ہجر و فراق کے رنگوں سے مزین
نائلہ طارق کا سلسلے وار ناول
شب آرزو تیری چاہ میں
جلد حجاب کے صفحات کی زینت بنے گا
عشق و محبت کے انداز بھی
تو جدائی کے جاں گسل لمحات بھی ہیں
غم جاناں، غم دوراں کی بھرپور عکاسی کرتا
یہ ناول آپ کی سوچ کو نیا رخ عطا کرے گا

"آمین! اتنی اچھی دعا دے ڈالی آپ نے ہمیں۔ اور وہ محبت تو ہمارے پاس بچپن سے ہے۔ بس دعا کریں، حیدر ہم سے اپنی محبت کا کھل کر اظہار کردیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے انہوں نے ہمیں کبھی کچھ کہا ہی نہیں آج تک۔ کوئی چھوٹا سا اشارہ بھی نہیں دیا۔ یہ کیسی محبت ہے فتح النساء جو خاموش رہتی ہے؟" عین النور نے پوچھا تھا۔

"پتہ نہیں عین۔ ہم نہیں جانتے۔ ابھی تک ہمیں محبت ہوئی نہیں۔ جس دن ہوجائے گی آپ کو آکر سب سے پہلے بتائیں گے۔ اف کتنا خوبصورت دن ہوگا نا وہ جب ہمارا دل کسی خاص لے میں دھڑکے گا؟ وہ بھی کسی ایک خاص کے لئے۔" فتح النساء مسکرائی تھی۔

"اچھا بس اب ہم چلتے ہیں۔ آپ سے ملنے کے لئے اچھی خاصی خاطر مدارات کروانا پڑتی ہے دادی جان سے۔" عین النور مسکرائی تھی۔

"فی امان اللہ۔ ہم چلتے ہیں۔ پھر ملیں گے۔" عین دہلیز پار کرگئی تھی۔

فتح النساء سہیلی کو جاتا دیکھ کر مسکرائی تھی پھر کھیر کا پیالہ اٹھا کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

......☆☆☆......

دو قومی نظریے کی قرارداد پاس ہوئے بھی کئی دن گزر گئے۔ اب اور کیا ہونا باقی ہے؟ یہ فرنگی کچھ نہیں کرنے والے۔ لوٹ مار کررہے ہیں بس۔ برصغیر ان کے لئے سونے کی چڑیا ہے بس اور کچھ نہیں۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی کا فائدہ اٹھائیں گے بس۔ یہ نظریاتی جنگ کسی سمت جاتی دکھائی نہیں دیتی ہمیں۔" حکمت بہادر یار جنگ نے حقے کا کش لگاتے ہوئے نواب صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

نواب صاحب نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا تھا۔

"کیا کرسکتے ہیں جناب۔ ہم بھی سبھی کے ساتھ ہیں۔ چلیں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔ کوئی قرارداد منظور ہونا بڑی بات ہوتی ہے۔ اب فرنگیوں نے آخرکار یہ تو مان ہی لیا نا کہ ہم ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور ہم ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ کل کو یہ بات کوئی پیش رفت اختیار بھی کرسکتی ہے۔ ہمارے رہنما قائل کرنے پر اتر آئے ہیں۔ جو کمی تھی ان کو پورا کیا جارہا ہے۔ نئے تعلیمی ادارے اور درس گاہیں بن رہی ہیں۔ لوگوں کو شعور مل رہا ہے۔" نواب صاحب نے کہا تھا اور حکمت یار نے سر ہلایا تھا۔

"یہی بات تو میں سوچ رہا تھا۔ ہم تو وہ تھے جو انگریزی زبان بولنا بھی گناہ کبیرہ سمجھ رہے تھے۔ بھلا ہو ہمارے رہنماؤں کا جنہوں نے یہ تو واضح کردیا کہ تعلیم کے بنا کوئی راہ نہیں اور انگریزی بولے بنا کوئی ترقی ممکن نہیں۔ کل محترمہ بی اماں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان کی باتیں سن کر عقل دنگ رہ گئی۔" حکمت یار نے کہا تھا اور نواب صاحب چونکتے ہوئے مسکرائے تھے۔

"آپ کی ملاقات عابدی بیگم سے ہوئی؟ ہمارا آداب کہا ہوتا۔ ہم تو ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ کیا بہادر خاتون ہیں۔ وہ بے شک زیادہ پڑھی لکھی نہیں۔ ہندوؤں کی عورتوں نے سیاست میں اپنا حصہ بہترین انداز میں ڈالا ہے کیونکہ وہ پڑھی لکھی ہیں مگر عابدی بیگم ان پڑھ ہوکر بھی ایک نئی سوچ کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے عورتوں کا موقف بہت بہترین پیرائے میں دیا ہے۔ ہم نے سنا تھا انہوں نے اپنے ہونہار سپوت مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی سے فرمایا تھا کہ اگر گرفتار ہوگئے تو سر مت جھکانا۔ اس ماں کو سلام کرنا چاہیے۔ بہت ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔" نواب صاحب نے کہا تھا۔

"بے شک...... درست فرمارہے ہیں آپ نواب صاحب!"

"جب مولانا جوہر صاحب برٹش کسٹڈی میں تھے ان کی دختران بیمار پڑگئی تھیں۔ تب برٹش راج نے چاہا تھا کہ اگر مولانا صاحب معافی مانگ لیں تو وہ اپنی قریب المرگ دختران کو قید سے رہائی پاکر مل سکتے ہیں۔ مگر بی اماں وہ عظیم خاتون تھیں جنہوں نے مولانا صاحب کو لکھا تھا کہ اگر مولانا صاحب نے وہ آفر قبول کی تو ان کے بوڑھے ہاتھوں میں اب بھی اتنی طاقت باقی ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے مولانا صاحب کا گلا دبا دیں۔ مولانا صاحب کی دختران چل بسی تھیں وہ برٹش کسٹڈی میں تھے۔ وہ اپنی دختران کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوسکے۔ وہ ماں عظیم ہیں جو آزادی کی جدوجہد میں اتنی بڑی قربانی دے

رہی ہیں۔ یہ سفر کہیں بھی رکے، فتح ہو یا نہ ہو مگر غلامی سے نکلنے کی جدوجہد زور پکڑ رہی ہے۔ حوصلے بڑھ رہے ہیں اور ایک جوش و ولولہ پایا جا رہا ہے۔ اس جدوجہد کو دیکھ کر لگتا ہے برٹش راج میں اب بس آخری کیل ٹھونکنے کی کسر باقی رہ گئی ہے۔" نواب صاحب نے کہا تھا اور شطرنج پر اپنی چال چلی تھی۔

حکمت بہادر یار جنگ نے سر ہلایا تھا۔

Muhammad Ali possessed the pen of Macaulay, the tongue of Burke and the heart of Napoleon

ایسا حوصلہ کم لوگوں میں ہے جو اتنی بڑی قربانیاں دیں۔ اللہ ہم مسلمانوں کی ان قربانیوں کا اجر دیں۔ آمین۔" حکمت یار بولے تھے۔

"ثم آمین۔ ہماری مسلم لیگی خواتین میں بھی بہت حوصلہ ہے میاں خواہ وہ نصرت ہارون ہوں، بیگم رعنا لیاقت علی، بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم جہاں آراء شاہنواز یا محترمہ فاطمہ جناح۔ سبھی اپنا کردار اس آزادی کی لڑائی میں بخوبی ادا کر رہی ہیں۔ ہماری محترمہ فاطمہ جناح تو سیکڑوں ہندو سیاسی خواتین لیڈران پر بھاری ہیں۔ انہی کی مہربانی ہے جو خواتین اس جدوجہد میں اپنا کوئی کردار ادا کر پائی ہیں ورنہ یہ خواتین تھیں جو گھر سنبھالنے میں مصروف عمل تھیں۔" نواب صاحب نے فرمایا تھا اور حکمت بہادر یار جنگ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"آپ نے تو چند سال قبل کی یاد دلا دی۔ مئی 1973ء میں جب ڈاکٹر اقبال نے مسٹر جناح کو ایک خط لکھا اور واضح کر دیا تھا یہاں ہم مسلمانوں کے مسائل کیا ہیں۔ انہوں نے ایک الگ مسلم ریاست کا تصور بہت پرزور انداز میں واضح کر دیا تھا۔ انہوں نے بہت واضح اور بھرپور الفاظ میں ایک پیغام لکھا تھا کہ

"Don't you think that the time for such a demand has already arrived?"

اقبال صاحب اس ریاست کو ابھرتے بہت واضح انداز میں دیکھ رہے تھے۔ اسی برس 21 جون کو دوبارہ ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ

"A separate federal state of Muslim provinces, formed on the lines I have proposed is the only way by which we can have a peaceful India and save Muslims from the rule of non-Muslims."

یہ بات اس قرارداد کا پیش خیمہ بنی ہے۔" حکمت یار نے مدلل لہجے میں کہا تھا۔

"23 مارچ کی قرارداد میں یہ موقف واضح ہو گیا ہے جناب۔ مجھے تو یہ قرارداد منظور ہونا بڑی کامیاب لگ رہی ہے۔ اقبال صاحب نہیں رہے مگر ان کی سوچ نے ایک نئی ریاست کا نظریہ تو بلاشبہ دے دیا ہے۔ ہو سکتا ہے جو ریاست اقبال صاحب نہیں دیکھ پائے وہ ان کی آنے والی نسلیں دیکھ پائیں۔ یہ جدوجہد کوئی رنگ تو لائے گی نواب صاحب مجھے تو ایسا لگتا ہے۔" حکمت یار مسکرائے تھے۔

نواب صاحب نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"بلاشبہ اور ہم بھی یہی امید کرتے ہیں کہ جو آزادی ہم نے محسوس نہیں کی وہ ہماری آنے والی نسلیں محسوس کریں۔ غلامی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں میاں۔ یہ برٹش راج برصغیر کے رہنے والوں پر ایک عذاب مسلط ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز کرنے کی اجازت نہ دی گئی ہوتی۔" نواب صاحب بولے تھے۔

"Even the Mughal emperor Akbar's effort to unify both of the Hindus and Muslims into a single nation had miserably failed."

نواب صاحب بولے تھے اور حکمت یار نے سر ہلایا تھا۔

"کہنے کی بات نہیں ہے مگر ایک بات تو حتمی ہے۔

The Muslims are in a state of agony at the hands of Hindus and the British as well.

اب بھی اپنے اپنے موقف پر ڈٹ تو گئے ہیں پھر بھی ایک دھڑکا سا ہے کہ یہ آنے والا وقت کیا لائے گا۔ ہم تو یہی دعا کرتے ہیں یہ دوقومی نظریہ کی قرارداد کوئی اہم پیش رفت کرے۔'' نواب صاحب نے کہا تھا حکمت یار نے سر ہلایا تھا۔ پھر شطرنج کی بساط پر اپنی چال چلتے ہوئے بولے تھے۔

''مسٹر جناح نے نہرو صاحب کی سوچ کو رد تو کر دیا ہے۔

British imperialism and Indian nationalism as represented by hte Congress is only two forces in India.

مسٹر جناح نے واضح کیا ہے کہ یہاں ایک اور سیاسی جماعت بھی ہے جس کا موقف صحیح معنوں میں واضح ہے کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے نظریات کی جماعت ہے اور دراصل حقیقت بھی یہی ہے کہ مسلم لیگ ہی واحد سیاسی جماعت ہے جو یہ دوقومی نظریہ پیش کرنے کا حق رکھتی ہے اور مسلمانوں کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ نہرو صاحب تو حیلے بہانے سے کام لیتے ہیں۔ اپنی بات کو توڑ مروڑ کر مصلحت پسندی اختیار کرتے ہیں۔ مسٹر جناح دوٹوک واضح بات کہنے کے عادی ہیں۔'' حکمت بہادر یار جنگ نے کہا تو نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''درحقیقت یہ آزادی کی جنگ تو تبھی شروع ہوگئی تھی جب مسلمانوں نے برصغیر میں قدم رکھا تھا۔ تاریخ گواہ ہے اس بات کی۔ مسلمان عظیم فاتح کی طرح اس سرحد میں داخل ہوئے تھے۔ مغرب سے جنوب مغربی علاقوں میں۔ محمد بن قاسم نے 712ء میں سندھ فتح کرکے اس تحریک کی داغ بیل رکھ دی تھی۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک آزاد مسلمان ریاست کا نظریہ کیا رنگ لاتا ہے؟'' نواب صاحب بولے تھے۔

حکمت بہادر یار جنگ نے سر ہلایا تھا اور تائید کی تھی۔

پھر نرم لہجے میں بولے تھے۔

''اپریل کا مہینہ شروع ہوا ہے۔ امید کرتے ہیں، انہی چند دنوں میں ہم کوئی اچھی خبر سن لیں۔ ہو سکتا ہے 1947ء کا یہ برس برٹش راج کا خاتمہ کردے۔'' حکمت بہادر یار جنگ کی آنکھوں میں امید کے جگنو تھے اور نواب صاحب مسکرائے تھے۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا حکمت میاں۔ اقبال نے کیا خوب کہا کہ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ ان فرنگیوں کو مار بھگانا ہے اس ریاست سے۔ برطانوی حکومت کو اس Imperialism کا خاتمہ تو کرنا ہی ہوگا۔''

حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا نواب صاحب۔ گرتی دیوار کو ایک دھکا اور دینا ہے بس۔'' حکمت بہادر یار جنگ نے کہا تھا تو نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

18 اپریل 1947ء

عین النور بٹوڈی کی گاڑی یکدم ویرانے میں بند ہوئی تھی تو اس کی جیسے سانس رکنے لگی تھی۔ جان منہ کو آرہی تھی۔ ایک تو ویرانہ اور اس پر گہری ہوتی شام کے سائے۔

''یا اللہ......اب کیا کریں گے ہم؟ آپ نے گاڑی کو اچھی طرح چیک نہیں کیا تھا نکلنے سے قبل؟'' عین النور نے ڈرائیور کو ڈپٹا تھا۔

''نواب زادی صاحبہ۔ بے فکر رہیں۔ میں اتر کر ابھی دیکھتا ہوں۔ نئی موٹر گاڑی ہے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوگا۔'' ڈرائیور نے کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ عین کی جان لرزنے لگی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ایک گاڑی کے قریب آنے کی آواز سنائی دی تھی۔ عین النور نے اپنی آنکھیں بہت زور سے بند کر لی تھیں۔

''یا اللہ، کہیں فرنگیوں کی کوئی گاڑی نہ ہو۔ ہم نے دادی جان کی بات نہ مان کر غلطی کر دی۔ وہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو شام کے وقت گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔ مگر ہماری عقل میں کوئی بات آئے بھی تو۔'' عین النور نے خود کو ڈپٹا تھا۔

گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی اور اس کی جان اور لرزنے لگی تھی۔

''ہم کیا کریں گے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس گاڑی سے نکل کر کہیں بھاگ جانا چاہیے۔ ان فرنگیوں کا کوئی پتہ نہیں۔ یا اللہ خیر......! یا اللہ مدد فرما......!'' عین النور کے لبوں سے کلمات ادا ہوئے تھے اور اس نے فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر قدم باہر نکالا تھا۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ کوئی اس کی طرف بڑھا تھا۔ عین النور کی جان منہ کو آنے لگی تھی۔ اس نے ایک سڑک پار کر کے جھاڑیوں کی طرف بڑھنا چاہا تھا جب کسی نے اس کے بازو کو دبوچ لیا تھا۔ عین النور پٹوڈی کی جیسے جان فنا ہوگئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کی بجائے آنکھیں سختی سے بھینچ لی تھیں اور با آواز بلند اعلان کرتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

''لکھنؤ کے نواب سیف الدین پٹوڈی کی صاحبزادی ہوں۔ آپ ہمیں زک نہیں پہنچا سکتے۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ برائے مہربانی ہماری راہ چھوڑ دیں۔'' اس کے ذہن میں بس ایک ہی قیاس آرائی تھی کہ اس کی کلائی فرنگی عہدیدار کے ہاتھ میں ہے تبھی جتاتے ہوئے بولی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی اور آنکھیں سختی سے بند تھیں۔

تیمور بہادر یار جنگ نے اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ صبیح چہرہ عجیب ایک کشش اپنے اندر رکھتا تھا۔ نگاہ ساکت رہ گئی تھی۔ ایک لمحے کو وہ پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ اس نے جو اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا تو اب ساکت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ حسن کتنا خاص تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ مگر اس حسن میں کوئی بات تھی کہ اس کی نگاہ وہیں تھم گئی تھی۔ وہ اس خوف کے باعث اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ واقعی اتنی دلکش تھی؟ تیمور بہادر یار جنگ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''ہم نے آپ سے کہا ہاتھ چھوڑیے۔ ہمارے ابا حضور کے اثر ورسوخ سے واقف نہیں آپ شاید۔ ورنہ ہاتھ تھامنے کی گستاخی نہیں کرتے۔ ہم نے کہا ہاتھ چھوڑیے اور ہمیں جانے دیجیے۔ ورنہ آپ کی خیر نہیں ہوگی!'' عین النور نے دھمکاتے ہوئے کہا تھا۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔

تیمور بہادر یار جنگ نے اس کا چہرہ بغور دلچسپی سے دیکھا تھا۔

''آپ کی دھمکی بہت دلچسپ ہے۔ مگر کیا ہی بہتر ہوتا

سات موتی

- زندگی کی مالا میں ایسے قیمتی موتی جمع کرو جن کی چمک سے سارے جہاں میں روشنی پھیل جائے۔
- اپنی زندگی میں ایسی شمعیں روشن کرو، جن کی روشنی سے آنے والی نسلیں روشنی حاصل کریں۔
- وہ انسان جو علم حاصل کر کے بھی گناہ کرے وہ اس پھول کی طرح ہے جو شوخ رنگ ہونے کے باوجود خوشبو نہ دے سکے۔
- کتابوں کو زمین پر نہ گرنے دیا کرو کیونکہ کتابیں انسان کو آسمان پر لے جاتی ہیں۔
- عادتیں ابتدا میں کچے دھاگے کی طرح ہوتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ لوہے کی تار بن جاتی ہیں جن میں شخصیت محصور ہو کے رہ جاتی ہے۔
- جب سچائی دل میں ہو تو کردار میں حسن پیدا ہوتا ہے اگر کردار میں حسن ہو تو ماحول خوش گوار ہوتا ہے۔
- اچھی بات چاہے کوئی بھی کہے پلو سے باندھ لو کیونکہ جب موتی کی قیمت مقرر کی جاتی ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سمندر کی تہہ سے لانے والا شریف ہے یا ذلیل۔

ارم کمال...... فیصل آباد

محبت کیا ہے؟

محبت کیا ہے؟ محبت کتاب ہے اخبار نہیں جو آج پڑھا اور کل باسی ہو جائے۔ محبت ٹشو پیپر کا باکس نہیں جسے استعمال کے بعد پھینک دیا جائے۔ محبت تو عطر میں بھیگا ہوا رومال ہے جو ہزار بار دھل جائے تو بھی عطر کی مہک دیتا رہتا ہے اور ہر وقت استعمال میں رہتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے درمیان ذات کی نفی، وقت کی کمی، مالی مسائل اور ذاتی رکھ رکھاؤ حائل نہیں ہوتے۔ محبت تو شیئرنگ کا دوسرا نام ہے بیگانگی کا نہیں۔

عاصمہ بٹ...... گوجرانوالہ

اگر آپ دھمکانے سے ذرا پہلے آنکھیں بھی کھول لیتیں تو شاید اس دھمکی کا بھرپور اثر ہو جاتا۔" تیمور بہادر یار جنگ نے مسکراتے ہوئے اس چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

عین النور نے یقین کر کے کہ وہ فرنگیوں میں سے کوئی ایک نہیں اپنی آنکھیں کھول کر تیمور بہادر یار جنگ کو گھورنا چاہا تھا۔ مگر ان لبوں کی مسکراہٹ پر بے انتہا غصہ آیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ آپ کی ہمت کیسے ہوئی ہمارا ہاتھ تھامنے کی؟ جانتے نہیں ہیں آپ ہمیں۔ اگر جانتے تو یہ گستاخی نہ کرتے۔ دیکھنے میں تو اچھے خاصے معقول لگتے ہیں آپ۔ پڑھے لکھے ہیں پھر ایسی حرکت کرنے کی ضرورت کیونکر پیش آگئی؟" عین النور نے اسے ڈپٹا تھا۔ مگر تیمور بہادر یار جنگ مسکرادیا تھا۔

"آپ کے چہرے پر نہیں لکھا تھا کہ آپ لکھنؤ کے نواب کی بیٹی ہیں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ آپ کی گاڑی کو یہاں ویرانے میں خراب کھڑے دیکھا تو مدد کا خیال آگیا۔ اس وقت آپ کا تنہا گھر سے نکلنا ایک احمقانہ فیصلہ تھا جب کہ آپ جانتی ہیں آپ کن حالات میں یہاں رہ رہی ہیں۔ آپ میرے ساتھ آیئے۔" تیمور اس کا ہاتھ تھام کر پلٹا تھا جب وہ درشت لہجے میں بولی تھی۔

"آپ ہمارا ہاتھ چھوڑیئے۔ ہم آپ کو نہیں جانتے۔ ہم آپ کی مدد قبول نہیں کر سکتے۔ آپ حلیے سے سوٹڈ بوٹڈ ہیں۔ تمیز سے بات کرنے سے پڑھے لکھے بھی خوب لگتے ہیں مگر آپ کے دل میں کیا ہے؟ ہمیں کیا خبر؟ آپ کوئی بھی ہو سکتے ہیں اور ہم آپ پر اعتبار کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے۔" عین النور نے اس کی مدد لینے سے واضح انکار کر دیا تھا۔ تیمور بہادر یار جنگ اسے خاموشی سے سکون بھرے انداز سے دیکھنے لگا تھا۔

"آپ نے کہا میں معقول بندہ ہوں تو آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔" تیمور بہادر یار جنگ نے بھرپور یقین دلانا چاہا تھا۔

"آپ ہاتھ چھوڑیئے اور جایئے یہاں سے۔ ورنہ ابھی ہم اپنے ڈرائیور کو بلا کر آپ کے ہوش ٹھکانے لگا دیں گے۔" عین النور نے دھمکی دی تھی مگر وہ مسکرادیا تھا۔ عین النور نے چڑیا کی طرح اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑانا چاہا تھا مگر تیمور کی گرفت مضبوط تھی اور وہ ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے میں ناکام رہی تھی۔ تبھی بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔

تیمور بہادر یار جنگ اسے دیکھ کر ملائمت سے مسکرایا تھا اور اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت دانستہ مضبوط کر دی تھی اور اس کے صبیح چہرے کو بغور دلچسپی سے دیکھنے لگا تھا۔ آسمان پر مکمل چاند بہت انہماک سے ان کی طرف تکتا جا رہا تھا۔

"سرد چاند کو تھامنا آسان نہیں۔ مراسم بننے میں وقت لگتا ہے۔ تغافل کے موسموں میں بات ممکن نہیں۔ اسرار بڑھتا ہے۔ انہماک دیدنی ہوتا ہے اور چاند بولتا نہیں۔ ایسے میں چاند کا ہاتھ تھامنا اور ساتھ چلنا ممکن کیسے ہو؟" تیمور مدھم لہجے میں بولا تھا اور عین النور اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔ تبھی وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے سر ذرا جھکا کر مدھم لہجے میں بولا تھا۔ چاند کی روشنی کا ہالہ جیسے اس چہرے کے گرد تھا۔ وہ بے خود سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"محترمہ عین النور پٹوڈی۔ آپ اس اجنبی پر اعتبار کر سکتی ہیں۔ اگر اس اجنبی نے آپ کا ہاتھ تھاما ہے تو آپ کو زک دینے کے لئے نہیں تھاما۔" تیمور بہادر یار جنگ نے کہا تھا اور عین النور اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

"آپ کو میرا نام معلوم ہے؟ کیسے؟ کون ہیں آپ؟" عین النور نے گردن اکڑا کر بہت رعب سے پوچھا تھا۔ انداز میں ایک تمکنت تھی یا پھر وہ اس پر رعب جما کر اسے زیر کرنا چاہتی تھی۔ جو بھی تھا تیمور بہادر یار جنگ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"میں ابھی تک اندازہ نہیں کر پایا، سوال آنکھوں میں زیادہ ہیں یا باتوں میں؟ باتیں مختصر ہوتی ہیں، کبھی طویل، سمجھنے میں الجھنیں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ مگر آنکھوں کے الجھاوے لامحدود سوالوں میں قید کرنے والے ہیں ایسے میں تالوں کی چابیاں ڈھونڈنے کی سعی کون کرے گا جبکہ دیکھنے والی نگاہ کو تالے بھی دکھائی نہ دے رہے ہوں تو سود و زیاں کا شمار کرنا کیسے یاد رہے گا؟" تیمور بہادر یار جنگ اس چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

عین النور اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

"آپ مجنون ہیں؟ کیسی سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کرتی ہیں آپ؟ ہم نے کہا ہاتھ چھوڑیئے ورنہ ہم شور مچا دیں گے۔ پتہ نہیں کون ہیں آپ۔ کوئی چور اچکے، ڈاکو،

لٹیرے کیا پتہ۔ کیا پتہ کوئی جادوگر۔ تبھی تو ہمارا نام بھی پتہ کرلیا آپ نے۔ ہمیں تو بڑے چالباز لگتے ہیں آپ۔ کتنی چالباز آنکھیں ہیں آپ کی۔ ایسے ایک ٹک ٹکٹکی باندھ کر کیا دیکھے جارہے ہیں آپ؟ ہاتھ چھوڑیئے اور ہمیں راستہ دیجئے۔ آپ جیسے چالبازوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں ہم۔" عین النور نے رعب سے کہا تھا۔ تیمور اسے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

"اب ایسے کیوں مسکرا رہے ہیں آپ؟ اگر نام سے واقف ہیں تو حیثیت اور مرتبے سے بھی واقف ہوں گے۔ آپ کا تو وہ حال کریں گے ہم کہ آپ......!" عین النور پٹوڈی بولے جارہی تھی جب تیمور بہادر یار جنگ نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ حیرت سے کھلی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ مگر وہ پرسکون لہجے میں بولا تھا۔

"میں جو کوئی بھی ہوں آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے۔ اب آپ ایک لفظ نہیں بولیں گی۔ خاموشی سے ساتھ چلئے۔ جیسا میں کہتا ہوں ویسا کریں۔ اس ویرانے میں کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے عین۔ مجھے آپ کی عزت کا پاس ہے۔ پلیز غلط سمجھنے سے پہلے ذرا اعتبار کرلیں۔ میں آپ کو کوئی زک نہیں پہنچاؤں گا۔" تیمور بہادر یار جنگ نے بارعب لہجے میں کہا تھا۔ لمحہ بھر کو اسے چاند کی مدھم روشنی میں بغور دیکھا تھا۔ عین النور اسے حیرت سے پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جس طرح اس نے عین النور کو "عین" پکارا تھا وہ ششدر رہ گئی تھی۔ مگر تیمور بہادر یار جنگ نے اس کے لبوں سے کمال رسانیت سے ہاتھ ہٹایا تھا اور پھر پلٹ کر اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھنے لگا تھا۔

کس سمت لے جارہا تھا وہ اسے؟ عین النور اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی چوڑی پشت کو دیکھتے ہوئے وہ اندازہ نہیں کرپائی تھی وہ کون تھا اور کیا نیت رکھتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کوئی بات تھی کہ وہ کچھ بول ہی نہیں پائی تھی۔ اس کا ہاتھ اس اجنبی کے ہاتھ میں تھا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اجنبی تھا مگر اس کے اقدام میں ایک تحفظ کا احساس کیوں محسوس ہورہا تھا؟ عین النور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ عین ماؤف دماغ کے ساتھ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ تبھی اس کا پاؤں جھاڑی میں اٹکا تھا اور توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی زمین پر آرہی تھی۔

"اف......!" ایک سسکی سی حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا اور فوراً جھک کر اسے سہارا دے کر اسے اٹھایا تھا۔ عین النور اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے اس طرح برتاؤ کررہا تھا جیسے وہ اسے ہمیشہ سے جانتا تھا۔ مدھم لہجے چاند کی روشنی میں وہ اس کے پاؤں کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو تو موچ آگئی ہے۔" عین کی ٹانگ اور ٹخنے سے خون رس رہا تھا مگر اس نے جتائے بنا نمکین پانیوں سے بھری آنکھوں کو اس اجنبی سے ہٹا کر اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اس بوکھلاہٹ میں وہ دوبارہ لڑکھڑا گئی تھی۔ یکدم اس اجنبی کی آستین کو زور سے مٹھی میں دبوچ لیا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش میں اس کا سر اس اجنبی کے شانے سے ٹکرا گیا تھا۔ ایک ہوش اڑا دینے والا احساس تھا۔ عین النور پٹوڈی پر عجیب بوکھلاہٹ سوار تھی۔ کسی اجنبی سے اتنی قربت کا احساس اس کے لئے جان لیوا تھا۔ سو سنبھل کر سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ نگاہ جھکتی چلی گئی تھی۔ تیمور اس کی سمت ایک نگاہ دیکھتا ہوا چہرہ پھیر گیا تھا۔ شاید اس نے یہ اقدام دانستہ کیا تھا۔ اس سے اگلے ہی لمحے وہ اسے اس کی طرف دیکھے بنا سہارا دینے کی کوشش کررہا تھا۔ عین النور نے دیکھا تھا وہ اس کی جانب دیکھنے سے مکمل گریز کرتے ہوئے اسے سہارا دے کر کھڑا ہونے میں مدد دے رہا تھا۔ عین کو اندازہ ہوا تھا وہ شریف النفس بندہ ہے۔ پڑھا لکھا اور بہت سلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ بات کرنے سے پتہ لگتا تھا کسی بڑے گھر سے تھا۔ لباس سے اس کے اعلیٰ ذوق کا پتہ چل رہا تھا۔ بولنے اور بات کرنے کا سلیقہ بتا رہا تھا وہ کوئی معمولی بندہ نہیں ہے مگر وہ عین النور کو کیسے جانتا تھا؟

عین نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ اس کے دیئے گئے سہارے کی مدد سے چلتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا تھا مگر تکلیف کے احساس سے آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے تھے اور تبھی اس اجنبی نے اسے پلٹ کر دیکھا تھا۔ ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے دانستہ نگاہ پھیر لی تھی اور پھر جھک کر اسے بازوؤں پر اٹھا لیا تھا۔

عین اس اقدام پر اسے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی مگر وہ اس کی طرف متوجہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ

ایک اجنبی کے ساتھ تھی۔ ایک اجنبی کے بازوؤں میں تھی۔ یہ قربت...... یہ نزدیکی...... اس کی عقل کو ماؤف کر رہی تھی۔ مگر اس اجنبی کا انداز بھرپور تحفظ دینے والا تھا۔ وہ اس کی جانب سرے سے متوجہ ہی نہیں تھا۔ جیسے وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے کلون کی مہک عین النور کے حواس خطا کر رہی تھی۔ یہ اچانک چند لمحوں میں کیا ہوا تھا۔

''یا اللہ......کوئی دیکھ نہ لے!'' اس نے آنکھیں زور سے میچ کر دل ہی دل میں دعا کی تھی۔ سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے کا شور سنائی دیا تھا۔ عین النور نے دانستہ اپنا چہرہ آنچل سے چھپاتے ہوئے اس کے سینے کی طرف پھیر لیا تھا۔ اس کی خوشبو ناک کے نتھنوں میں گھسنے لگی تھی۔ اجنبی شاید گاڑی کی سمت بڑھا تھا۔ اسے تھامے تھامے دروازہ کھولا تھا اور اسے گاڑی میں بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ عین النور نے اسے دیکھنے سے مکمل گریز کیا تھا۔ وہ اسے بٹھا کر تسلی کرتا ہوا دروازہ بند کر کے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا اور اسے دیکھا تھا۔

''عین آپ ٹھیک ہیں؟'' وہ اس کا نام مکمل بے تکلفی سے پکارتا ہوا پوچھنے لگا تھا۔ عین النور کو اپنا نام اس اجنبی کے منہ سے سننا ایک عجیب تجربہ لگا تھا۔ آج تک مرزا حیدر سراج الدولہ نے بھی اسے عین کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ اسے خاص و عام النور، عین النور یا نواب زادی کے نام سے پکارتے تھے۔ کجا اسے کوئی عین پکار رہا تھا۔ یہ احساس حیران کن تھا۔ عین النور اس کی جانب دیکھ نہیں رہی تھی مگر سراثبات میں ہلا دیا تھا۔

''کہاں لے جا رہے ہیں آپ ہمیں؟'' عین النور نے پوچھا تھا۔

''اعتبار کر ہی لیا ہے تو تھوڑا اعتبار اور کر لیجئے۔ کہہ دیا کہ آپ کی عزت و حرمت کا پورا پاس ہے ہمیں۔ ہم دل سے عزت کرتے ہیں آپ کی۔ ایسے شک کر کے ہمیں ہماری نظروں میں مت گرائیے!'' تیمور بہادر یار جنگ اس کی جانب سے نگاہ ہٹاتا ہوا بولا تھا اور گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ یہ سفر عجیب لگا تھا۔ عین النور خاموشی سے اپنے آنچل کے کونے سے اپنا چہرہ ڈھانپے بیٹھی تھی۔ سینے میں موجود دل عجیب دھکم پیل مچائے ہوئے تھا۔ وہ کسی اجنبی کے ساتھ تھی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو کہانیاں بن جاتیں۔ وہ کسی کے نام سے منسوب تھی۔ نواب خاندان کی عزت تھی۔ اس کا اس طرح کسی کے ساتھ دیکھا جانا کئی افسانے اور کہانیاں پھیلا سکتا تھا۔

تیمور بہادر یار جنگ نے دانستہ اس پری رخ کی طرف نگاہ نہیں ڈالی تھی اور خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا تھا۔

''آپ ہمیں کیسے جانتے ہیں؟'' عین النور نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''عین آپ پریشان نہ ہوں۔ فضول کی باتوں میں مت الجھیں۔ کوئی آپ کو میرے ساتھ دیکھے گا تو کیا ہوگا۔ میں آپ کا دفاع کرنا بھرپور انداز میں جانتا ہوں۔ آپ کی طرف کوئی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ انگلی آپ کی طرف اٹھانا تو دور کی بات ہے۔'' تیمور بہادر یار جنگ نے کہا تھا۔ عین النور اس کی طرف حیرت سے بغور دیکھنے لگی تھی۔ ایک خاص تحفظ تھا اس لہجے میں اور رعب بھی۔ وہ کون تھا؟ کیا کرتا تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اسے ایسے تخاطب سے کیونکر پکار رہا تھا؟ ایسی اپنائیت کیوں تھی اس لہجے میں؟ اسے اس تخاطب سے پکارنے والا کون ہو سکتا تھا؟ کہیں وہ اس کے سسرالی رشتے داروں میں سے تو نہیں تھا؟ اس نے اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی ایک خوف سے تیمور بہادر یار جنگ کو دیکھا تھا۔

''کون ہیں آپ؟ کیا ہم آپ کا نام جان سکتے ہیں؟ کہیں آپ مرزا صاحب کے دوستوں میں سے تو نہیں؟ یا ہمارے کوئی سسرالی رشتے دار؟'' عجیب معصومیت سے اسے دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں اتنی حیرت تھی کہ وہ لحہ بھر کو ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

''ہم نے حیرت کو کسی کی آنکھوں میں اس طور تیرتے پہلی بار دیکھا ہے۔ سمجھ نہیں پایا آپ کی آنکھیں خوبصورت ہیں یا حیرتیں ان آنکھوں کو یہ کمال عطا کر رہی ہیں؟ دونوں صورتوں میں عجیب پراسرار سا سحر پھیلتا دکھائی دیتا ہے!'' تیمور بہادر یار جنگ بولے بنا نہیں رہا تھا۔ عین النور پٹوڈی نے اسے ان الفاظ پر کسی حیرت اور غصے سے دیکھا تھا۔

''لگتا ہے آپ کے دماغ کی کوئی کل ڈھیلی ہے۔ کافی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں آپ۔ ہمارا دماغ چل گیا

تھا جو ہم آپ کے ساتھ آ گئے۔ بلکہ ہمارا کوئی برا وقت چل رہا ہو گا ضرور...... دادی جان کہتی ہیں شام کے اندھیرے میں لڑکیوں کو باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ اب خبر ہوئی کوئی اسرار تو ہو گا۔ کہیں آپ کوئی جن یا دیو کی نسل سے تو نہیں؟ ایسے ویرانوں میں جن اور دیو پائے جا سکتے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولی تھی اور تیمور بہادر یار جنگ مسکرا دیا تھا۔ کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عین النور نے کلائی ذرا اوپر کی تھی۔ آنچل کو درست کر کے چہرہ چھپانے کے لئے۔ تبھی کلائی کی کھرونچ میں ایک درد کی لہر سی اٹھی تھی وہ کراہ کر رہ گئی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ کو اس کی تکلیف کا احساس ہوا تھا تبھی بولا تھا۔

"آپ کو زخم گہرا لگا ہے۔ آپ کو اس کے لئے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔"

گلا کنج سے گزرتے ہوئے تیمور بہادر یار جنگ نے کو دیکھا تھا۔ وہ غالباً اسے بلرام پورا اسپتال لے جانے کا بھرپور ارادہ رکھتا تھا جب عین النور نے فوراً اس کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں...... ہمیں کسی اسپتال نہیں جانا۔ آپ ہمیں گھر چھوڑ دیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔" عین النور نے لال مجد پر واقع بل رام پور اسپتال کو دیکھتے ہوئے واضح انکار کیا تھا۔

"دیکھئے، آپ کے زخم گہرے لگ رہے ہیں اور آپ کے پاؤں میں موچ بھی آ گئی ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔" تیمور بہادر یار جنگ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"آپ سے کہا نا ہمیں نہیں دکھانا۔ برائے مہربانی اب ہمیں گھر تک چھوڑ دیں۔ آپ جو کوئی بھی ہیں، کوئی آدم زاد یا جن زاد، ہماری بس اتنی مدد فرما دیں آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے اور ہم اتنی شام تک گھر سے باہر نہیں رہ سکتے۔" عین النور نے درخواست کی تھی۔
تیمور بہادر یار جنگ اس کے انداز اور لہجے پر مسکرایا تھا۔

"اب آپ مسکرا کیوں رہے ہیں؟ ایسا کیا کہ [illegible] نے؟" عین النور نے جس طرح اپنا چہرہ [illegible] دیا ہم چھپا رکھا تھا اس سے [illegible] چہرہ [illegible] چل کے پلو سے رہی تھیں [illegible] آنکھیں بہت واضح دکھائی دے [illegible] اور ان آنکھوں کا سحر بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اقوال زریں

- لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے ایسے عمل کرو کہ لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعا نکلے۔
- دوست پھولوں کی طرح ہوتے ہیں انہیں گرم و سرد ہوا سے بچانا پڑتا ہے۔ کسی بھی دوست کے دل کو اس طرح نہیں توڑتے جیسا کہ شاخ سے پھول توڑا جاتا ہے۔
- کامیابی حوصلوں سے ملتی ہے اور حوصلے دوستوں سے ملتے ہیں، جبکہ دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور مقدر انسان خود بناتا ہے۔

سیدہ علیشاہ...... بہاولپور

توبہ

یہ زلزلے شہر روشنی کے بدل گئے نالہ و فغاں میں
نوائے غم ہے ہر اک صدا میں
مہکتی شاموں کے پھول چہرے
دھوئیں کے بادل میں اٹ گئے ہیں
لہو میں رنگ تڑپ تڑپ کر گزر رہے ہیں
حیا کی پتلی جواں بیٹی سڑک پر بکھری
حریص نظروں سے منہ چھپائے
ردائے عصمت کو ڈھونڈتی ہے
سیاسی جلسوں میں حکمران ہمارے! نام اپنا کما رہے ہیں
مگر یہ دعویٰ ہے ان کا یہ مملکت ہے عظیم جس میں
ہماری طاقت جمہوریت ہے اگر یہی وہ جمہوریت ہے
تو میری توبہ ہے ایسی زندگی سے

طیبہ نذیر...... شادیوال گجرات

تیمور بہادر یار جنگ نے ان آنکھوں کو بغور دیکھا تھا۔

"اگر ہم جن زاد ہوتے تو؟" اس نے جتایا تھا۔

"ہمیں کیا۔ آپ جو کوئی بھی ہوں!" عین النور لاتعلقی سے بولی تھی۔

"آپ کو فرق نہیں پڑتا؟" تیمور بہادر یار جنگ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ اسے اس اجنبی لڑکی کا لب و لہجہ، تمکنت، غرور سب بہت بھایا تھا جیسے ان تیوروں میں کچھ خاص تھا کہ وہ اسے بولنے پر مزید اکسا رہا تھا۔ جیسے اس مختصر سفر میں وہ بہت سی باتیں کر لینے کا خواہاں تھا۔ جیسے وہ اس مختصر اتفاقی ملاقات کو صدیوں پر محیط کر دینے کی چاہ میں تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟ موٹر گاڑی سامنے دیکھ کر چلائیے آپ، مارنا ہے کیا ہمیں؟" وہ ایک تمکنت سے اسے ڈپٹتی ہوئی بولی تھی۔ تیمور ایک نگاہ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے ونڈ اسکرین کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"سوچ لیں اگر ہم واقعی کوئی جن زاد ہوئے تو؟" وہ شرارت پر آمادہ ہوا تھا۔ عین النور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"یا اللہ...... ایسی خوفناک ہولناک باتیں مت کیجئے آپ۔ ہمارا دل دہل جائے گا۔ ہمیں جن زاد کے ساتھ سفر کرنے کا کوئی شوق نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

"کیوں نہیں؟ جن زاد کسی پری زاد کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا کیا؟" وہ ایک نگاہ ان جادوئی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"ہماری دادی جان کہتی ہیں کسی پری زاد کا کسی جن زاد سے کوئی رابطہ ممکن نہیں۔ آپ ایسی گفتگو سے پرہیز کریں۔ ورنہ ہم ناپسند کریں گے۔ ہمیں آپ کی ایسی گفتگو ہضم نہیں ہو رہی۔ ہماری طبع نازک کو بہت ناگوار گزر رہا ہے۔" عین النور بولی تھی پھر یکدم چونکی تھی۔

"یا اللہ...... آپ نے ہمیں ہمارا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔" ان جادوئی آنکھوں کی حیرتیں دوچند ہوئی تھیں۔

"اف...... آپ ہمارا نام جان پائے کیوں کہ آپ آدم زاد نہیں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے حتمی انداز میں بولی تھی۔ وہ محظوظ ہوتا ہوا مسکرایا تھا۔

"جن زاد کو پری زاد سے عشق ہو سکتا ہے۔ سوچ لیں اگر عشق ہو گیا تو؟" تیمور بہادر یار جنگ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ اسے ناگواری سے دیکھا تھا۔

"ایسی باتیں مت کریں۔" وہ جادوئی آنکھیں غصے سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"کیوں نہیں؟ کیا آپ ہونے سے روک سکتی ہیں؟" وہ اسے جیسے زچ کرنے لگا تھا۔

"ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے!" وہ تمکنت سے بولی تھی جیسے اس کو سب باتوں پر اختیار ہو۔

"اچھا کیا کریں گی آپ؟" وہ جیسے اسے زچ کرنے میں ایک لطف محسوس کر رہا تھا۔ عین النور نے اسے گھورا تھا اور نگاہیں پھیر لی تھیں۔ تیمور بہادر یار جنگ نے ان آنکھوں کو لمحہ بھر کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں جیسے خفا ہوئی تھیں۔ وہ بولنے پر مائل نہیں تھیں۔ تیمور بہادر یار جنگ ان آنکھوں کو دیکھ کر مسکرایا تھا اور پھر ونڈ اسکرین کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" عین النور نے اس کی جانب دیکھے بنا بولی تھی۔

"چاند دیکھ رہا ہوں!" تیمور بنا اس کی طرف دیکھے مسکرایا تھا۔

"چاند......؟" وہ حیرت سے چونکی تھی۔ ان جادوئی آنکھوں نے اسے ناگواری سے دیکھا تھا اور تیمور بہادر یار جنگ نے اسے دیکھا تھا۔

"آپ کی آنکھوں میں ٹھہر گیا ہے!" وہ مذاق کر رہا تھا یا سنجیدہ تھا وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ کی آنکھوں میں شرارت صاف دکھائی دی تھی اور وہ غصے سے الجھتی ہوئی اسے دیکھنے لگی تھی۔

"دیکھئے جن زاد یا آدم زاد ہمیں ایسی گفتگو پسند نہیں۔ سو آپ اجتناب برتیے۔" وہ اسے باور کرواتی ہوئی بولی تھی۔

"ایسا کیا کہہ دیا؟ نواب زادی کی شان میں اب کیا گستاخی ہو گئی؟ چلیے معاف کر دیجیے۔ آپ ٹھہریں پری زاد اور ہم جن زاد۔ ہماری دنیاؤں میں ایک کشش ہے اور اس کے معنی نا سمجھ میں آنے والے ہیں۔ ویسے چاند آپ کی آنکھوں میں واقعی ٹھہر گیا ہے اور ہم اس چاند کے سفر کو دیکھتے ہوئے حیران تھے۔ اس میں کیا غلطی کر لی ہے؟ چاند

سے پوچھنا چاہیں گی آپ؟ یا ان آنکھوں سے؟" وہ مسکرایا تھا۔ اور عین النور اس کی سمت سے آنکھیں پھیر گئی تھی۔

"تیز چلایئے موٹر کار...... ہمیں جلدی گھر پہنچنا ہے!" وہ ایک خاص رعب سے اسے حکم دیتی ہوئی بولی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ اسے دیکھے بنا مسکرا دیا تھا۔

"کہاں لے جاؤں آپ کو؟ پرستان؟ یا اپنے جنوں کے قبیلے میں؟"

"یا اللہ...... اب بس بھی کیجئے۔ آپ تو جان کو آ گئے۔ جانتے ہیں ہم کون ہیں؟ آپ کے ہوش ٹھکانے لگا دیں گے۔ ہمیں اس طرح زچ کرنا بند کیجئے۔" وہ ایک خاص تمکنت سے بولی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ کے لبوں سے مسکراہٹ معدوم نہیں ہوئی تھی۔

"چاند کی سمت دیکھنے کا شوق تھا مگر نگاہ الجھی اور الجھتی چلی گئی، دھیان نہیں رہا کہ چاند کتنا خوبصورت تھا، مگر غور کرنے پر اتنا پتہ چلا کہ چاند کو باتیں کرنا یاد نہیں رہا تھا اور رستہ بھول گیا تھا!" وہ مدھم لہجے میں بولا تھا۔ عین النور نے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

"آپ ہمیں کوئی پاگل لگتے ہیں۔ بہت کھسکے ہوئے! آپ ہمیشہ سے ایسے تھے یا یہ اثر کسی حادثے کے بعد ہوا؟" وہ چڑ کر بولی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ اس کی جانب دیکھے بنا مسکرایا تھا۔

"سفر تمام ہو تو قیاس کی باتوں کو دل سے دور رکھنے کی کوشش کرنا کارگر ہو سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آسان باتیں اور کبھی کبھی سفر کی بہت سی مشکلات کو ختم کر دیتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو مسکرا کر دیکھیں۔ زمین پر کئی معجزات کو ہوتے دیکھنے کا منظر یقیناً بہت حیران کن ہوگا۔" عین النور نے اسے ناگواری سے دیکھا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

"کیا آپ خاموش رہ سکتے ہیں؟" وہ اسے جیسے درخواست کرتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔ تیمور مسکرا دیا تھا۔

"آپ نے غور نہیں کیا آپ کی باتوں میں چھپی کئی سرگوشیاں ساری توجہ اپنی سمت کھینچ لیتی ہیں جب آپ بات نہیں کرتیں تو بہت سے جگنو فضاؤں میں اڑتے ہوئے ان سرگوشیوں کا تعاقب کرتے دور تک نکل جاتے ہیں اور اپنا رستہ بھول جاتے ہیں۔" تیمور بہادر یار جنگ کو جیسے اسے زچ کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

"اف...... ! یہ سفر اور کتنا طویل ہوگا؟ ہمیں پرخاش ہونے لگی ہے۔ آپ ایسا مت کیجئے ہمیں یہیں اس موٹر گاڑی سے اتار دیجئے۔ ہم پیدل چل کر پہنچ جانا زیادہ مناسب سمجھیں گے۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"آپ کے جواب اکثر لاجواب کرتے ہیں کیونکہ ان میں لفظ نہیں ہوتے اور دلچسپی سوا ہو جاتی ہے جب معنی ڈھونڈنے کی سعی کرتے ہوئے کوئی لفظ یہاں سے وہاں ہو بھی جائے تو خواص کھوتے نہیں۔ آپ نا مانیں مگر یہ وصف صرف آپ کی خاموشی کو ہی آتا ہے!" وہ مدھم لہجے میں بولا تھا۔ عین اس کی جانب سے نگاہ چرائے رستوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اسے اطمینان ہوا تھا۔ وہ گھر سے زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ وہ اجنبی اسے صحیح سمتوں سے لے کر ہوتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ عین نے اس کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ کوئی چالباز یا غلط شخص نہیں تھا۔ کوئی تھا جسے وہ نہیں جانتی تھی مگر وہ یہ بھید کھولنے کو تیار نہیں تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟ جن زادے سے انسیت ہونے لگی ہے؟" وہ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر مسکرایا تھا۔ عین النور پٹوڈی فوراً نگاہ چرا گئی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ مسکرا دیا تھا۔

"میں نہیں جانتا راستوں کو کہاں اور کیسے بانٹنا ہے، آغازِ سفر کرتے ہوئے اس اعداد و شمار پر نگاہ نہیں تھی اور سفر کے اختتام کی اگرچہ خبر نہیں مگر محبت کہیں دور کھڑی چپ چاپ تکتی ہے تو الہام یہ بھی ہوتا ہے کہ اختتام چاہے کچھ بھی ہو، مگر یہ سفر بہت دلچسپ ہوگا۔" تیمور بہادر یار جنگ کے لہجے میں ہزار معنی تھے۔ عین النور سمجھ پائی تھی کہ نہیں مگر وہ اسے بغور دیکھنے لگی تھی۔ وہ پراعتماد تھی، پڑھی لکھی تھی۔ غرور اس کے حسن کو دوچند کرتا تھا اور ایک تمکنت تھی جو اس کے رعب حسن کو بڑھاتی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ کو کوئی شے جیسے باندھ رہی تھی۔ وہ کیوں اس سفر کو طویل کرنا چاہ رہا تھا اور کیا بات تھی جو اس سفر کی خوبصورتی بڑھا رہی تھی۔ کوئی اسم تھا جو ان لمحوں میں تھا۔ فضا کچھ نئی معلوم ہو رہی تھی۔

وہ بہت جانتا تھا زندگی میں یہ موڑ بھی آئے گا کہ وہ ایسا کچھ محسوس کرے گا۔ مگر اس چہرے میں کوئی خاص بات تھی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد
نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی
فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم
نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق
رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اور وہ جادوئی آنکھیں جیسے کوئی خاص اسرار رکھتی تھیں۔

''آپ ہمیشہ ایسی باتیں کرتے ہیں؟'' عین النور نے پوچھنا مناسب خیال کیا تھا۔

''نہیں عین...... آپ کو حیرت ہوگی مجھے اتنا بولنا پسند نہیں مگر آپ کو دیکھ کر لفظوں کے معنی بدل رہے ہیں۔ اب یہ مت کہیے گا میں پھر لفظوں کو کسی اور سمت لے جا رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تمام باتوں کے رخ موڑ کر اس سمت بھی لگا سکتی ہیں جہاں معجزات ہوتے ہیں۔'' وہ مسکرایا تھا اور عین النور جان گئی تھی کہ وہ باتوں میں ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ گفتگو میں کمال رکھتا تھا۔ بہت خوبرو بھی تھا۔ پھر ایسی باتیں؟ شاید وہ ایسا دوستانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت میں یہ بات تھی کہ وہ دل مائل کر سکتا تھا۔ مگر عین النور اس دنیا کی نہیں تھی۔ اس کی زندگی...... اس کی دنیا پہلے سے کسی سے جڑی ہوئی تھی اور وہ شاید اس لئے بہت محتاط تھی۔

''اتنا مت سوچیں عین......! دماغ کو کبھی کبھی آزاد چھوڑ دینا مناسب ہوتا ہے اور دل...... دل کو اس طرح خاموش نہیں کرواتے......!'' وہ اس کو سوچوں میں غلطاں دیکھ کر مسکرایا تھا۔ عین النور پٹوڈی چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس کی سوچیں تک پڑھنے پر قادر تھا؟ اسے اس کی سوچوں تک رسائی کیسے مل رہی تھی؟ ایسا کیا جادو تھا اس کے پاس؟ کیا وہ واقعی آدم زاد نہیں تھا؟ عین النور نے اسے الجھتے ہوئے دیکھا تھا۔

''کون ہیں آپ؟''

''آپ جان کر کیا کریں گی؟''

''آگاہ کر دیجئے۔ ہمیں الجھن ہونے لگی ہے۔''

''کس بات کی الجھن؟''

''پتہ نہیں مگر ایک الجھن ہے!''

''کہیں یہ محبت کا آغاز تو نہیں؟'' تیمور بہادر یار جنگ مسکرایا تھا۔

''محبت......؟'' عین چونکی تھی۔ اسے اپنا لہجہ خود اجنبی لگا تھا۔

''محبت کی خبر نہیں آپ کو؟ یہ لفظ اتنا اجنبی کیوں ہے آپ کے لئے؟''

''پتہ نہیں۔ ہم نے اس بارے میں سوچا نہیں۔'' وہ کہہ کر نظریں چرا گئی تھی۔

''سوچنا حق بنتا ہے آپ کا۔ آپ کا دل ہے۔ اپنے دل کو اس طرح مٹھی میں دبا کر رکھنا جائز نہیں۔ کھل کر سانس لینے دیں اسے!'' تیمور نے مشورہ دیا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ہم نے دل کو مٹھی میں نہیں دبایا!'' وہ اس کی بات کی نفی کرتی ہوئی نگاہ پھیر گئی تھی...... تیمور اس کی سمت دیکھے بنا مسکرایا تھا۔

''پھر دل آپ کو اتنی الجھن میں کیوں ڈال رہا ہے؟''

''ہمارے دل کی خبر آپ کو کیسے ہے؟'' وہ چونکی تھی۔

''کیونکہ آپ کے دل کی خبر آپ کو خود نہیں ہے!''

''آپ کو کیا۔ ہمارے دل کا کچھ بھی ہو۔ آپ کیوں فکر کیے جا رہے ہیں؟'' وہ ناگواری سے لاتعلقی سے چہرہ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

''آپ کے دل کی خبر رکھنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ آپ کے دل سے کئی نامعلوم لہریں میری سمت بے خبری میں آ رہی ہیں!'' وہ اسے ستاتے ہوئے مسکرایا تھا۔

''ایسا ممکن نہیں!'' وہ پریقین انداز میں بولی تھی۔

''سب ممکن ہے عین۔ آپ کو خبر نہیں ہے۔ بھولی ہیں آپ۔ اتنے بھید جانتی نہیں۔'' وہ اسے غلط قرار دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔ عین کو خود کو جھٹلایا جانا پسند نہیں آیا تھا تبھی اسے گھورتی ہوئی بولی تھی۔

''ہمارے دل کی خبر ہمیں ہے۔ ہمارا دل کسی سے وابستہ ہے اس کی خبر بھی ہمیں ہے۔ آپ فضول کی باتوں میں اپنا وقت صرف مت کریں جن زاد یا آدم زاد جو کوئی بھی آپ ہیں۔ اپنی دنیا میں رہیے۔ ہماری دنیا میں جھانکنے کی جسارت مت کیجئے!'' وہ ایک خاص رعب سے جتاتی ہوئی بولی تھی۔ تیمور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔

''زندگی خاموشی میں چھپے لفظوں کو سمجھنا اور ان کے معنی ڈھونڈنا ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ لفظوں کے معنی کتنے الجھے ہوئے ہیں۔ خاموشی کے راز جان لینے سے تمام الجھنیں سلجھنے لگتی ہیں بشرطیکہ آپ کو سننے اور سمجھنے کی عادت اور صلاحیت ہو!'' تیمور بہادر یار جنگ بولا تھا۔ لہجہ مدھم تھا۔

''عجیب ہیں آپ!''

''بہت عجیب!'' اس نے جیسے اقرار کیا تھا۔
''اتنے عجیب ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
''مطلب یہ ہوتا ہے کہ دو الگ دنیائیں ہیں مگر ایک دوسرے کے لئے ایک خاص کشش کا باعث ہیں!'' وہ الجھانے لگا تھا۔
''دو الگ دنیائیں کسی کشش کا باعث نہیں ہوتیں!'' وہ جیسے باور کرانے لگی تھی۔
''آپ کے جھٹلانے سے حقیقتوں کی نفی نہیں ہوگی!'' وہ سرشار سا مسکرایا تھا۔
''حقیقت ابھی جانتے ہی نہیں آپ!'' عین النور اسے جتانے لگی تھی۔
''بے خبر آپ ہیں۔ میں بے خبری میں بھی سارے دھیان رکھتا ہوں!''
''مجھے کچھ واسطہ نہیں آپ سے اور آپ کی دنیا سے!''
''آپ سے کس نے کہا کہ واسطہ بنایئے؟'' وہ مسکرایا تھا۔
وہ ساکت سی اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اسے دانستہ الجھا رہا تھا اور وہ الجھتی چلی گئی تھی۔ وہ اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔
''آپ جانتے نہیں ہم کو آپ کو جانتے نہیں۔ سو فضول گفتگو سے اجتناب کیجئے!'' وہ ایک رعب سے گویا ہوئی تھی۔
''جان لیجئے!'' تیمور جیسے اسے آفر دے رہا تھا۔
''ہمیں جان لینے کی کوئی تمنا نہیں۔ آپ ہم سے الجھنا بند کیجئے!''
''یہ الزام ہے کہ ہم آپ کو الجھا رہے ہیں۔ آپ کی الجھنوں کا سرا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں ہم!'' وہ مسکرایا تھا۔
''آپ ہمارا تخاطب کیوں اپنا رہے ہیں؟ مذاق اڑا رہے ہیں آپ ہمارا؟'' وہ اسے گھورنے لگی تھی۔ تیمور مسکرا دیا تھا۔
''دلچسپ باتیں کرتی ہیں آپ۔ آپ کا خود کو ''ہم'' کہنا کچھ اوڈ ہے۔ مجھے اس کی عادت نہیں۔ ہماری دنیا میں ہم کہنا کئی لوگوں کو ساتھ ملا کر چلنے کی ترجمانی کرتا ہے اور میری دنیا میں میری موجودگی کسی ''ہم'' کی محتاج نہیں ہے۔ میں جو ہوں وہ ہوں۔ ''میں'' پراعتمادی ہے اور ''ہم'' غیر اعتمادی۔ کہیں آپ بہت کمزور تو نہیں؟ ''ہم'' کا صیغہ استعمال کر کے خود کو پراعتماد اور بہادر ظاہر کرنا چاہتی ہیں؟ کبھی ہم کسی جگہ ''میں'' استعمال کر کے دیکھئے۔ یہ صرف صیغہ نہیں ہے۔ ایک باور کرانے والی حقیقت بھی ہے۔ آپ مانیں نہ مانیں نواب زادی عین النور پٹوڈی مگر اس ''میں'' میں بڑا دم ہے!'' وہ اسے سکھاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ عین اسے دیکھنے لگی تھی۔
''ہماری عادت ہے۔ ہم اسی طرح کہتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ ہماری تربیت اسی طور ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کمزور ہیں۔'' وہ جتانے لگی تھی۔ وہ مسکرایا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ مسکرایا تھا اور ایک نگاہ بغور اسے دیکھ کر ونڈ اسکرین کی طرف دیکھنے لگا تھا۔
''خاموشی میں سوال اور سوالوں کے اطراف بہت سے حاشیے اور دائرے اور دائروں میں دبی سرگوشیوں میں چلتی پھرتی خاموشی مجھے اندازہ نہیں ہو پاتا۔ خاموشی میں سوال زیادہ بولتے محسوس ہوتے ہیں یا خاموشی زیادہ بولتی ہے؟ ان خاموشیوں میں سوال دب کیوں نہیں جاتے؟'' تیمور بہادر یار جنگ اس کی طرف دیکھے بنا بولا تھا۔
عین النور نے اس کی طرف دیکھنے سے مکمل گریز کیا تھا۔
''کون ہیں آپ؟'' قدرے توقف سے وہ پوچھنے کے قابل ہوئی تو بولی تھی۔
''آپ نے خود کہہ دیا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے یاد دلانے لگی تھی۔
''کیا؟'' وہ چونکی تھی۔
''یہی کہ میں آدم زاد نہیں ہوں!'' وہ مسکرایا تھا۔
''کوئی تو ہیں!'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے الجھن سے بولی تھی۔
''سو تو ہوں!'' وہ مسکرایا تھا۔
''وہی تو پوچھ رہی ہوں کون ہیں؟'' وہ جاننے کو متلاشی ہوئی تھی۔
''آپ کی اتنی دلچسپی کس بات کو ظاہر کرتی ہے عین

النور پٹوڈی؟"

"یہ دلچسپی نہیں ہے۔" وہ ماننے کو تیار نہ ہوئی تھی۔

"پھر کیا ہے؟" وہ اسے الجھا کر ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

"بس ایک سوال ہے!" عین نے جیسے اسے ایک بار پھر جھٹلایا تھا۔

"یہ بس ایک سوال نہیں ہے عین۔ یہ ایک تجسس ہے اور تجسس بہت سے سوالوں کے جواب رکھتا ہے۔"

"کوئی تجسس نہیں ہے۔ میں آپ کے بارے میں کیوں متجسس ہونے لگی؟ آپ کوئی بھی ہو۔" وہ لاتعلقی سے بولی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ ہنسا تھا۔

"اثر قبول کرنے لگی ہیں آپ یہ کس جانب اشارہ کرتا ہے؟"

"کس بات کا اثر؟" وہ چونکی تھی۔

"اپنی گفتگو پر دھیان دیں عین۔ آپ "میں" کا صیغہ استعمال کر رہی ہیں۔" وہ جتاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ عین النور چونکی تھی اور پھر اس کی طرف سے دھیان پھیر گئی تھی۔ تبھی وہ مدھم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"دل کو بولتے ہوئے بھی نہیں سنا کیونکہ شاید آس پاس شور بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اتنا کہ بہت قریب کی آواز سنائی نہیں دیتی نا آنکھ کو اتنے قریب کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ مگر قریب کے منظر دیکھنے کے لئے اور دور کی آوازیں سننے کے لئے کہیں دور جانا نہیں پڑتا، اس کے لئے اپنے اندر مکمل خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس خاموشی میں جو سنائی دیتا ہے اس کے معنی بہت واضح ہوتے ہیں کہ پھر کوئی اور شواہد ڈھونڈنا نہیں پڑتے!" وہ جانے اسے کیا جتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

کون تھا وہ؟ اسے کیسے جانتا تھا اور ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا؟ ان تمام باتوں کے کیا معنی نکلتے تھے؟ اور ان معنوں میں کون سے راز چھپے تھے؟ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس نے الجھی نظر راستوں پر جمائی تھی۔ وہ منزل کے بہت قریب تھی۔ وہ عجیب باتیں کر رہا تھا اور اس کی باتیں عین النور کو الجھا رہی تھیں۔ وہ شام کچھ عجیب کیوں لگ رہی تھی؟ اس شام میں ہونے والا یہ واقعہ اتنا حیران کیوں لگ رہا تھا؟

اس شخص سے ملنا، اس کا اس طور بات کرنا؟ اس میں کیا اسرار تھا؟ اور اس کی باتوں سے وہ خود اتنا اثر پذیر کیوں ہو رہی تھی؟ وہ باتوں میں کمال رکھتا تھا تو وہ اس کی خاصیتوں سے اتنا الجھ کیوں رہی تھی؟ اتنی جلد اثر پذیری کا کیا بھید تھا؟

"محبت دور ستاروں کی کہکشاؤں پر بنا کوئی گھر لگتا ہے جس کے بارے میں سوچنا خواب لگتا ہے اور وہاں جا کر رہنا ناممکن مگر پھر بھی ان کہکشاؤں کی دنیاؤں کے بارے میں جاننے کا تجسس کہیں بڑھتا جاتا ہے اور اگرچہ عقل جانتی ہے سب ناممکن ہے مگر ان ستاروں سے نگاہ ہٹتی نہیں۔" اسے بغور دیکھتے ہوئے اس نے گاڑی روک دی تھی۔ عین النور نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ دوپٹے کا کونہ چہرے سے سرک گیا تھا۔ وہ چہرہ نمایاں ہو کر دکھائی دیا تھا۔ تیمور نے اسے بغور دیکھا تھا۔ اس لمحے میں ایسا کیا تھا کہ وہ نگاہ جھپک نہیں پایا تھا۔ عین النور اس کی طرف سے نگاہ ہٹاتے ہوئے گردن موڑ کر دروازہ کھول کر گاڑی سے اترنے کی کوشش کرنے لگی تھی مگر پاؤں کی موچ اور ٹخنے پر لگی چوٹ کے باعث تکلیف سے کراہ کر رہ گئی تھی۔ تیمور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے اترا تھا۔ اسے سہارا دینے کو آگے بڑھا تھا مگر عین النور نے دانستہ اسے روک دیا تھا اور خود ہمت کر کے گاڑی سے اتری تھی اور محل کے اندر داخل ہونے کے لئے چھوٹے چھوٹے قدم لینے لگی تھی۔ تیمور نے اسے جاتے ہوئے بغور دیکھا تھا۔ چاند کی روشنی میں وہ چلتے ہوئے اس کی توجہ کا مرکز رہی تھی۔ وہ ایک آسمان کے نیچے کھڑے تھے۔ ایک چاند کی کرنیں ان دونوں کو ڈھانپ رہی تھیں۔ ستارے انہیں خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے سے اجنبی تھے۔ کسی تعلق کے بنا وہ اس روشنی کے احساس کو اپنے وجود سے لپٹتے دیکھ رہے تھے۔ وہ محل کے اندر داخل ہونے سے پہلے پلٹ کر اسے ایک لمحے کو دیکھنے لگی تھی۔ پھر اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر فوراً محل کے اندر قدم رکھ دیئے تھے۔

تیمور نے اسے خاموشی سے محل کے اندر جاتے دیکھا تھا اور پھر پلٹ کر گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی اور گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

☆☆☆......

مرزا سراج الدولہ نے ایک ہرن پر فائر کرتے ہوئے اپنے ملازم کو دیکھا تھا اور مسکرایا تھا۔

''شکار کو پھڑ پھڑاتے دیکھ کر جو لطف آتا ہے وہ لطف کسی اور بات میں نہیں ہے۔ جاؤ جا کر اسے اٹھاؤ۔ آج دن اچھا تھا۔ بہت آرام سے، بنا محنت کئے شکار ہاتھ لگ گیا۔'' وہ بندوق دوسرے ملازم کو پکڑاتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ ملازم نے اس کی تقلید کی تھی۔

''مرزا صاحب آپ کا تو ہر دن اتنی رحمتیں لاتا ہے۔ آپ کی بات سے یاد آیا۔ خاتون حاکم کا پیغام آپ کے نام آیا تھا۔

''خاتون حاکم کو ہماری یاد کیسے آگئی؟ ہم نے سنا تھا جو دیوانہ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں ان کو پلٹ کر پھر یاد بھی نہیں آتی۔'' مرزا حیدر سراج الدولہ کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ملازم نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔ تبھی وہ معدوم ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

''چلیے خبر کر دیجئے خاتون حاکم کو کہ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ سن کر شاید ان کے بہت بے قرار دل کو کچھ قرار آ جائے۔ یہ حسن کے تیور بھی نہ سمجھ میں آنے والے ہیں۔ حسن کو مات کرنے کی ٹھانو تو پے در پے مات ہونے لگتی ہے اور جب تھک ہار کر بیٹھ جاؤ تو پھر حسن کی بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ بے نیازی میں نظر انداز کرنے کا لطف ہے۔ دانستہ ایسا کرنے سے یہ لطف دو چند ہو جاتا ہے۔ تب تو اور بھی لطف آتا ہے جب حسن دیوانہ وار سایہ بن کر لپکتا ہے، پکڑنے کی کوشش کرتا ہے سب یہ اضطراب نہ سمجھ میں آنے والا ہوتا ہے۔'' مرزا حیدر مسکرایا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے ملازم کو جانے کا اشارہ دیا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

''خاتون حاکم! چلیے آپ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ کوئی حسرت نہ رہے آپ کو......!'' مرزا حیدر مسکرایا تھا۔

......☆☆☆......

''اوہ یہ کالی بلی رستہ کاٹ گئی۔ اب تو ہم بالکل بھی شاہ جہاں بیگم سے ملنے نہیں جا رہے۔'' ظہوری بیگم نے دادی جان کے تخت کے کونے پر جگہ بناتے ہوئے کہا تھا۔ دادی جان نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے پان پر چونا لگاتے ہوئے بغور دیکھا تھا۔

''ظہوری بیگم، مغلوں کے دور گئے اور فرنگی سرکار کا دور بھی اب ختم ہونے کو ہے اور آپ ایسے دور میں اتنی دقیانوسی کی باتیں کرتی ہیں؟ اللہ بخشے ہماری مرحوم اماں کو۔ ایسی پرانی کہاوتوں کو لے کر اکثر نالاں رہتی تھیں۔ ہمارے یقین اتنے کمزور کب سے پڑ گئے کہ ایسی بے سر و پا باتوں پر ہم آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے لگے؟ بہو بیگم ظہوری بیگم کچھ عقل کے ناخن لیجئے۔ آپ کی اماں نے آپ کو سکھایا نہیں کہ یہ اندھے یقین کی باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔'' ظہوری بیگم نے خاموشی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

حمیدن بوا باورچی خانہ سے چائے کی طشتری لا کر بیگم عالم آراء کے سامنے تخت پر رکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

''دادی جان جانے دیجئے۔ آپ نے تو بھابھی جان کی سبکی کر دی۔'' حمیدن بوا نے مسکراتے ہوئے ظہوری بیگم کی طرف چائے کا کپ بڑھایا تھا۔

''بھابھی بیگم، نواب صاحب ٹیلی فون پر ابھی کسی دوست احباب سے بات کر رہے تھے۔ ہم نے پوری بات تو نہیں سنی مگر نواب صاحب کسی عشائیے کا ذکر کر رہے تھے۔ لگتا ہے نواب صاحب کسی کو دعوت پر مدعو کر رہے ہیں۔'' حمیدن بوا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ظہوری بیگم نے انہیں دیکھا تھا پھر بیگم عالم آراء کے ہاتھ سے سروتا لے کر چھالیہ کترنے لگی تھیں۔

''نواب صاحب ایسا کچھ ذکر تو کر رہے تھے۔ اپنے قریبی دوست کو بمعہ اہل و عیال بلانے کا۔ ہمارے ذہن سے نکل گیا۔'' ظہوری بیگم نے کہا تھا۔

''ظہوری بیگم، بادام کھایا کریں آپ۔ آپ کی یادداشت تو ابھی سے ساتھ چھوڑنے لگی۔ ہم آپ کی ساس ہیں۔ دیکھئے ہماری عقل اب بھی کوسوں دور کی باتوں کو درست قیاس کر سکتی ہے۔ حمیدن تمہارے نام ایک اہم ذمہ داری لگاتے ہیں آپ ہماری بہو بیگم کو باداموں والی کھیر کھلانے کا کام آپ کے سر ہے اور ایسا بلا ناغہ ہونا چاہئے۔'' بیگم عالم آراء نے کہا تھا۔ ظہوری بیگم انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''جانے بھی دیجئے اماں۔ اب آپ تو ہر بات کی کھال نکالنے لگتی ہیں۔ ہماری عقل کی تو جانے بھی دیجئے۔ آپ کو خوش کرنا آسان نہیں۔'' ظہوری بیگم مسکرائی تھیں۔

"چلئے ہم آپ کے لئے کاجو کا بادام کی کھیر اپنے ہاتھوں سے بنا کر لاتے ہیں۔ حمیدن بوا کسی ملازم کو اجازت نہیں ہے ہماری اماں جان کے کام کرنے کی۔ جو کرنا ہو آئندہ سے ہمیں مطلع کریں۔ ہماری پیاری اماں جان کے سارے کام ہم کریں گے۔" ظہوری بیگم نے کہا تھا۔ بیگم عالم آراء انہیں موٹے عدسوں والی عینک کے پیچھے سے دیکھ کر واضح حیران نظر آئی تھیں۔

"بہو بیگم ایسے شگوفے چھوڑنا بند کیجئے۔ ہماری سماعتوں پر خاصا ناگوار گزرتا ہے۔ یوں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپ کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور کہاں آپ ہماری خدمتوں پر اتر آئی ہیں۔ اچھا جانے دیجئے۔ دعوت کی باتیں ہو رہی ہیں تو یاد دلاتا تھا کہ نواب زادہ سے کہئے اپنے سمدھیوں کو نہ بھول جائیں۔ ایسے موقعوں پر بننے والے نئے رشتوں کو نظر انداز کرنا دلوں میں میل لا سکتا ہے۔" بیگم عالم آراء نے مشورہ دیا تھا۔

ظہوری بیگم نے سر ہلایا تھا اور تائید کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"آپ کا کہا کون ٹال سکتا ہے اماں جان؟ آپ فکر مند نہ ہوں ہم نواب صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دیں گے۔" ظہوری بیگم نے کہا تھا تو اماں جان نے تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

......☆☆☆......

عین النور اس اجنبی سے ہونے والی ملاقات پر اب تک حیران تھی۔ وہ کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہیں کر سکی تھیں۔ فتح النساء سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ انہیں اس ملاقات کا ذکر فتح النساء سے کرنا چاہئے؟ کیا وہ ملاقات یا اجنبی اتنا اہم تھا کہ اس کا تذکرہ کیا جاتا؟ شاید نہیں۔ عین النور پٹوڈی نے اپنا جواز خود رد کر دیا تھا۔ وہ ایک الجھن سے راہداری سے گزرتی ہوئی رکی تھی۔ فتح النساء مسکراتی ہوئی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی تھی۔

"آداب عرض ہے نواب زادی۔ بڑی دعوتوں کے ذکر سن رہے ہیں ہم۔ محل میں خبر عام ہے۔" فتح النساء مسکرائی تھی۔ اور قریب آ کر اسے گلے ملی تھی۔

"آداب عرض۔ آتے ہی ملک بھر کی خبریں اٹھا کر جمع کر لائیں آپ؟ حد ہے فتح النساء۔" عین النور مسکرائی تھی۔ تبھی فتح النساء نے مسکراتے ہوئے اس کے کان کے قریب رازداری سے کہا تھا۔

"مرزا حیدر سراج الدولہ تشریف لا رہے ہیں۔ عشائیے کے چیدہ چیدہ مہمانوں میں سے ہیں آپ کے محترم جناب مرزا حیدر سراج الدولہ۔ اب سوچ لیجئے ان کا سامنا یہ نظریں کیسے کریں گی؟ سن کر دل کی رفتار بڑھ جائے تو گلہ مت کیجئے گا۔ کیونکہ اس دل کو دھڑکانے میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ سارا قصور تو آپ کے ان منگیتر صاحب کا ہے!" فتح النساء نے چھیڑا تھا اور مسکرائی تھی۔ عین النور نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ اتنی بڑی خبر سن کر بھی وہ مسکرا نہیں سکی تھی۔

"کیا ہوا؟ آپ کا چہرہ اتنا ہونق کیوں ہو رہا ہے؟ خیریت؟ مرزا حیدر کو دیکھنے سے پہلے یہ حال ہے آپ کا؟ خدا خیر کرے!" فتح النساء شرارت سے مسکرائی تھی۔ عین النور نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ یہ خبر سن کر اس کے اندر کوئی احساس جاگا تھا یا نہیں وہ سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ مسکرا ضرور دی تھی۔

"فتح النساء بہت شرارتی ہوتی جا رہی ہیں آپ۔ چلئے آیئے ہمارے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔" عین النور بولی تھی۔ تبھی فتح النساء نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"یہ کیا ماجرہ ہے عین النور پٹوڈی؟ کس بات کی رازداری برت رہی ہیں؟ کیا ہے آپ کے دل میں؟ ویسے اب اعلانیہ مت کہہ دیجئے گا کہ آپ کے دل میں مرزا حیدر سراج الدولہ رہتے ہیں۔" فتح النساء مسکرائی تھی۔

"ایسا تو ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے فتح النساء۔ ہمارے دل میں مرزا حیدر سراج الدولہ ہی ہیں۔ ہماری نسبت بچپن سے طے ہے ان کے ساتھ۔ یہ انسیت پرانی ہے۔ اچھا ہم آپ کو ایک بات بتاتے ہیں۔ ہم جب پچھلی پھوپھی جان سے مل کر آ رہے تھے تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہم آپ کو وہ بتانے جا رہے تھے۔" عین النور نے کہا تھا۔

فتح النساء نے حیرت سے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ کوئی خیر کی خبر ہے نا؟ کہیں ہمارا کلیجہ سن کر منہ کو نہ آ جائے۔ بہت نازک دل ہے ہمارا کوئی خبر سنانے سے پہلے سوچ لیجئے گا۔" فتح النساء مسکرائی تھی۔ اس کی

آنکھوں میں شرارت تھی اور عین النور پٹوڈی نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا تھا۔
''آپ ہمیں تنگ کرنا بند کیجئے فتح النساء ورنہ ہم آپ سے خفا ہو جائیں گے۔'' عین النور نے کہا تھا۔ فتح النساء نے شرارت سے تکیہ اٹھا کر اس کی طرف اچھالا تھا اور بھاگ کر راہداری کی طرف دوڑی تھی۔ عین النور کو اس کے پیچھے دوڑنا پڑا تھا۔ راہداری میں بھاگتی ہوئی فتح النساء شرارت سے منہ چڑاتی ہنستی جا رہی تھی۔ عین النور اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے تھی۔ جب وہ اچانک کسی سے ٹکرائی تھی۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ وہ جیسے کسی مضبوط ستون سے ٹکرائی تھی۔ آنکھیں کھول کر سنبھل کر دیکھا تھا۔ کسی نے اسے سہارا دے کر سنبھالا تھا۔
''اف...... وہ چہرہ...... اس کے خیالوں میں تھا؟ یا واقعی وہ موجود تھا؟ اس نے حیرت سے بھری آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تیمور بہادر یار جنگ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔
''آپ یہاں؟'' عین النور نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔
''وہم نہیں ہوں۔ آپ کا کوئی بھولا بھٹکا خیال بھی نہیں ہوں! حقیقت ہوں۔ یقین کر لیجئے آپ کی نظروں کے سامنے موجود ہوں!'' تیمور بہادر یار جنگ مسکرایا تھا۔
عین النور اسے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔ فتح النساء نے اسے راہداری کے اختتام پر کھڑے ہو کر حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ کسی اجنبی کے ساتھ کھڑی تھی اور وہ اجنبی کتنا پر وجاہت اور اونچا لمبا تھا۔
''یہ کون ہے؟ نواب زادی اسے کیسے جانتی ہیں؟'' فتح النساء حیرت سے اسے دیکھتی ہوئی خود کلامی کرتی ہوئی بولی تھی۔
''پہلے ان حضرت کو اس محل میں نہیں دیکھا۔ یہ کون ذاتِ شریف ہیں؟'' فتح النساء نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھی تھی۔ عین النور اس اجنبی کی کسی بات پر الجھی ہوئی دکھائی دی تھی۔ جب کہ وہ اجنبی مسکرا رہا تھا۔ فتح النساء قریب آئی تھی۔
''عین...... یہ کون ہیں؟'' عین نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور چونکا تو تیمور بہادر یار جنگ بھی تھا مگر اسی دوستانہ انداز سے دوسرے ہی پل مسکرا بھی دیا تھا۔
''میں آدم زاد نہیں ہوں جن زاد ہوں شاید؟ ابھی فی الحال اس بات کا انداز کرنا مشکل ہے۔ حتی الامکان اور حتمی نتائج آنا ابھی باقی ہیں۔ جب کسی اور کو خبر ہو جائے گی تو اپنا تعارف آپ سے بھی کروا دوں گا۔'' تیمور بہادر یار جنگ مسکرایا تھا۔
فتح النساء چونکی تھی پھر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔
''یا اللہ آپ تو بہت دلچسپ شخص معلوم ہوتے ہیں اور یہ خبر ہونا کیسے باقی ہے؟ کس نے آپ کو جن زاد تصور کر لیا؟ ویسے جتنے معقول آپ دکھائی دیتے ہیں لگتے تو آپ کوئی شاہِ جنات ہی ہیں۔ اب کوئی جنات زاد ہیں کہ نہیں اس کی خبر ہمیں نہیں۔'' فتح النساء مسکرائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور تیمور بہادر یار جنگ مسکرایا تھا۔
''ویرانے میں ملا تھا آپ کی ان سہیلی صاحبہ کو۔ معاف کیجئے گا میں یہ تکلف والی زبان نہیں بول سکتا۔ میرے جہاں میں ایسی زبان استعمال نہیں ہوتی۔'' وہ معذرت کرتا ہوا بولا تھا۔ فتح النساء مسکرائی تھی اور حیرت سے ششدر کھڑی عین النور کو دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی یہ عجیب واقعہ عین النور پٹوڈی کے ساتھ پیش آیا تھا۔
''آپ کے دیس میں کونسی زبان بولی جاتی ہے؟'' فتح النساء نے شرارت سے کریدا تھا۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔
''محبت کی زبان...... مجھے نہیں معلوم آپ کے دیس میں اس زبان کو کیا کہہ کر پکارتے ہیں۔'' وہ شخص اپنی ذات میں واقعی عجیب تھا اور عین النور کو حیرت اسے اپنے سامنے دیکھ کر تھی۔ وہ اس محل میں کیسے آیا تھا؟ اس کی ہمت کیسے ہوئی تھی؟
''آپ یہاں کیوں آئے؟ کیسے داخل ہوئے؟ ہمت کیسے ہوئی آپ کی؟'' عین النور نے پوچھا تھا۔ انداز میں غصہ نمایاں تھا اور وہ اطمینان سے مسکرایا تھا۔
''جن زاد ہوں۔ ک قبیلے سے ہوں۔ مجھے اجازت کی ضرورت نہیں۔''

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

خون کی گواہی

ریاض بٹ

لکھاری جو کچھ اپنے اردگرد دیکھتا ہے اسے ہی لفظوں سہارا لے کر صفحۂ قرطاس پر بکھرتا ہے یہ کہانی بھی اردگرد بکھرے ہوئے کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔

نئے افق کا سنگھار، جرم اور سزا پر مبنی ایک خوب صورت تحریر

سورج تو اللہ کے فضل و کرم سے روز ہی نکلتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ضرور ہوتا ہے کہ بادل اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ یہ کسی دن تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے اور کیلنڈر میں کوئی دن ایسا بھی آجاتا ہے۔ جب یہ آنکھ مچولی پورے دن جاری رہتی ہے۔

اس دن بھی آسمان پر بادل گھرے نہیں تھے کہ دھرتی کو جل تھل کر دیتے۔ البتہ سورج کا راستہ انہوں نے ضرور روک رکھا تھا۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ میں ابھی ابھی اپنے فرائض منصبی نبھانے تھانے آیا تھا۔

اچانک سپاہی قدیر کمرے میں داخل ہوا۔ آگے بڑھنے سے پہلے سپاہی قدیر کے متعلق بتاتا چلوں۔ یہ ابھی کچھ دن پہلے ٹرانسفر ہو کر میرے پاس آیا تھا۔ بلا کا ذہین تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے محاورے، فقرے اور شعر پڑھ دیتا تھا۔ اس کے آنے سے تھانے کا ماحول کافی خوش گوار ہو گیا تھا۔ ورنہ دن رات مجرموں، قاتلوں، چوروں، ڈاکوؤں کے پیچھے بھاگ کر زندگی خشک ہو گئی تھی۔

یہ گویا ایک ایسا چھتنار درخت تھا۔ جس کے نیچے بیٹھ کر تفتیش کی لمبی دوڑ کے دوران ذہن کو تروتازہ بلکہ باغ و بہار کیا جا سکتا تھا۔

یہ اندازہ میں نے چند دن میں لگا لیا تھا۔ بہر حال وہ اطلاع تو ایک دہرے قتل کی لے کر آیا تھا۔

''سر...... ادھر رانا پرویز صاحب کی کوٹھی میں قتل کی دہری واردات ہو گئی ہے۔''

''اچھا۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس سے تفصیل پوچھنے لگا۔

''سر...... رانا صاحب کے دونوکر یہ بتانے آئے ہیں کہ رانا پرویز کے منجھلے بیٹے کو اور ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے۔ دونوں لاشیں ان کے بیٹے ناصر کی خواب گاہ میں پڑی ہیں۔''

میں نے کہا۔

''دونوں اطلاع کنندہ کو بھیج دو۔'' وہ مجھے سلوٹ کر کے ایڑھیوں پر گھوما اور یس سر کہہ کر باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد دونوں میرے سامنے تھے۔ دونوں کی عمریں تقریباً برابر ہی تھیں۔ ایک کا رنگ ذرا گندمی جب کہ دوسرے کا ذرا صاف تھا۔

ان سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ صرف اتنا ہی پتا چلا کہ دونوں لاشیں ناقابل بیان حالت میں ناصر کی خواب گاہ میں پڑی ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ عورت کے متعلق بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔ بہر حال میں نے انہیں باہر انتظار کرنے کے لیے کہا اور کانسٹیبل وزیر کو بلا کر ضروری تیاری کا حکم دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رانا پرویز کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔

میرے ساتھ کانسٹیبل وزیر اور سپاہی قدیر تھے۔ لاشیں بالکل برہنہ حالت میں تھیں اوپر چادر ڈال دی گئی تھی۔ لاشوں کی حالت جو کہانی سنا رہی تھی اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پولیس والوں کو وہ کام بھی کرنے پڑتے ہیں جن کا تصور بھی عام آدمی نہیں کر سکتا۔

بہر حال میں نے لاشوں کا معائنہ کیا۔ دونوں کو خنجر کے پے در پے وار کر کے قتل کیا گیا تھا۔

اور یہ کسی ایسے شخص کا کام تھا جو دونوں کے لیے یا کم از کم ایک کے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ غم و غصہ رکھتا تھا۔

کیونکہ دونوں کے جسموں پر کل ملا کر بیس کے قریب زخم تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دونوں کے جسموں سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل گیا ہو۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کر کے لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادیں۔ کانسٹیبل وزیر ساتھ چلا گیا۔ ہمارے ساتھ رانا پرویز اور اس کا بڑا بیٹا عامر بھی تھا۔

سپاہی قدیر کو میں نے باہر ہی رہنے دیا اور خود ان صاحب کی بیٹھک میں آبیٹھا۔ اس نے اپنے بیٹے عامر کو بھی باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔

''رانا صاحب...... یہ سب کیا ہے؟''

''تھانے دار صاحب میں تو خود حیران ہوں کہ یہ سب کیسے اور کیوں ہو گیا؟''

رانا پچاس سالہ ایک کٹیلے بدن کا لمبا تڑنگا بندہ تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اس نے رکھ چھوڑی تھیں۔ لگتا یہی تھا کہ اس کی دوسری آنکھ میں کوئی نقص ہے۔

میں نے اس پچاس سالہ شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ عورت جو آپ کے بیٹے کے ساتھ قتل ہوئی ہے۔ یہ کون تھی......؟ اور......؟''

میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رانا صاحب نے ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''یقین کریں میں اس عورت کو نہیں جانتا۔ ناصر کے کمرے کا دروازہ پچھلی طرف کھلتا ہے وہ کب سے یہ غیر نصابی سبق پڑھ رہا تھا۔ اس سے...... یقین کریں میں لاعلم ہوں۔''

چند لمحے اس نے توقف کیا پھر بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب میں بہت دکھی ہوں۔ بیوی پانچ سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔ عامر کے علاوہ دونوں بیٹے ناصر اور صابر میرے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں۔ اب ان میں سے ایک تو ٹھا ہو گیا ہے۔''

''سب کی شادیاں ہو گئی ہیں......؟''

''صرف عامر کی شادی ہوئی ہے...... اس کا ماشاء اللہ ایک بچہ بھی ہے۔''

''ماشاء اللہ ناصر بھی ایک گھبرو جوان تھا۔ صابر کی کیا عمر ہے؟'' رانا صاحب میری بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ انتہائی افسردہ لہجے میں بولا۔

''صابر بھی گھبرو ہی ہے۔ دراصل تینوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگر ناصر اور صابر ٹھیک ہوتے تو رونا کس بات کا تھا۔'' وہ اندر سے باہر تک ٹوٹا پھوٹا لگتا تھا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے کی طرف تھیں اور کان اس کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔

''تھانے دار صاحب...... میں کسی کے دل کے ٹکڑے

کورسک کی سولی پر نہیں چڑھا سکتا تھا۔ اس لیے دونوں نے شادی نہیں کی۔"

یہاں میں اس سے متفق نہیں تھا۔ اس لیے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"رانا صاحب...... شادی بڑوں بڑوں کو سدھار دیتی ہے۔ اگر آپ ناصر کی شادی کر دیتے تو اس کے سدھرنے کے امکان تھے۔"

"تھانیدار صاحب اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔"

واقعی اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب مجھے قاتل کو تلاش کرنا تھا اور باقی باتیں مخبروں کے ذریعے معلوم کرنا تھیں۔ ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے میں آ گئے۔ راستے میں سپاہی قدیر نے مجھ سے کہا تھا۔

"سر جو بچے سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ ہم نے مقتولہ کے چہرے کی تصویریں لی تھیں۔ ان سب سے پہلے مقتولہ کی شناختی پریڈ ضروری تھی۔ اب اس سلسلے میں ہم جو کچھ کر سکتے تھے کیا۔ بقیہ اس کے چہرے کی فوٹو مخبروں کو دے دیئے۔

تین دن تک کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی۔ البتہ اس دوران پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ جس کے مطابق دونوں نے شراب پی تھی اور جسمانی تعلق بھی قائم کیا تھا۔ زخموں کی نوعیت وہی تھی جو بیان کی گئی تھی۔

ناصر کی لاش میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد رانا صاحب کے حوالے کر دی تھی۔ جب کہ مقتولہ کی لاش سرد خانے میں رکھوا دی تھی۔

تیسرے دن ایک مخبر نے آ کر بتایا۔ کہ مقتولہ کا نام ناصرہ تھا۔ وہ ہمارے تھانے سے تقریباً دو کلومیٹر دور ایک بستی میں رہتی تھی۔ یہ بستی ہمارے تھانے کی حدود میں آتی تھی۔ شام کو میں سپاہی انور کے ساتھ اس بستی میں پہنچ گیا۔ یہ بستی تقریباً سو کے قریب گھروں پر مشتمل تھی۔ ہماری منزل بستی کے وسط میں واقع ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ یہ عمارت ایک بیوہ کی ملکیت تھی۔ جو نچلی منزل پر اپنے اکلوتے بیٹے عدنان کے ساتھ رہتی تھی۔ اوپری منزل پر مقتولہ ناصرہ کرایہ دار کی حیثیت سے رہتی تھی۔

تعارف پر بیوہ کا نام صابرہ معلوم ہوا۔ یہ ایک دھان پان سی خاتون تھیں۔ رنگ ذرا سانولا تھا۔ عمر چالیس سال کے ارد گرد قریب ہو گی۔ یہ خاتون نظریں جھکا کر بات کرتی تھی۔ اس نے ہمیں ایک بیٹھک نما کمرے میں بٹھایا۔ کمرے کی ہر چیز سے نفاست اور سادگی ٹپکتی تھی۔

"بی بی...... آپ کی کرایہ دار قتل ہو چکی ہے۔" میں نے مناسب الفاظ میں اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ یہ خبر اس کے لیے کسی بم سے کم نہیں تھی اور خاص کر جن حالات میں ناصرہ قتل ہوئی تھی۔ وہ اس کے لیے ناقابل یقین تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانے دار صاحب۔ ناصرہ ایسی تو نہیں تھی۔"

میں نے چالیس سالہ بے خبر خاتون کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بی بی ناصرہ کے متعلق جو کچھ آپ کے علم میں ہے مجھے بتائیں۔"

"تھانے دار صاحب...... ایک دن ناصرہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ مجھے رہنے کے لیے اوپر والی منزل کرائے پر دے دیں۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ یہاں مجھے تحفظ ملے گا۔"

"تھانے دار صاحب میں خود بیوگی کی تنہا زندگی گزار رہی ہوں۔ میں نے سوچا یہ دکھی عورت ہے۔ پھر مجھے بھی کم از کم کچھ آمدنی ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے زیادہ تحقیق کیے بغیر اسے رہنے کے لیے اوپر والا پورشن کرایہ پر دے دیا۔"

"بی بی آپ نے اپنی سوچ کے مطابق ٹھیک ہی کیا"...... میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ جو کچھ میں کہنے لگا تھا وہ کہنا اس بیوہ خاتون کے سامنے مناسب نہیں تھا۔ ذہین قارئین سمجھ گئے ہوں گے۔ میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔

"کبھی کوئی مرد، عورت یا کوئی بچہ ناصرہ سے ملنے آیا تھا۔ یعنی اس کے یہاں رہائش حاصل کرنے سے لے کر قتل ہونے تک۔"

"نہیں کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا۔"

"آپ کو کرید تو ہوئی ہوگی"...... میں نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔

"تھانے دار صاحب۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس لیے مجھے حیرانگی نہیں ہوئی۔"

"قارئین یہ ہماری مجبوری ہوتی ہے کہ ہم جان بوجھ کر ایک سوال کے مختلف زاویوں سے بار بار کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر جواب ایک جیسے ہوں تو ہم مطمئن ہوتے ہیں۔"

"اچھا خاتون آخری سوال۔ اس نے کیا بتایا تھا کہ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے؟"

"تھانے دار صاحب اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گھی بنانے والی مل میں ملازم ہے۔ ایک ہفتہ وہ دن کی ڈیوٹی کرتی تھی اور ایک ہفتہ رات کی۔" خاتون نے جواب دیا۔

خاتون واقعی سادہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والی تھیں ورنہ وہ جس قسم کی ڈیوٹی کر رہی تھی وہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ پھر میرے پوچھنے پر خاتون مل کا نام بھی نہ بتا سکی تھی۔

بہر حال وہاں سے واپس آنے سے پہلے ہم نے ناصرہ (مقتولہ) کے کمرے کی تلاشی لی تھی۔ وہاں سے ہمیں کچھ سراغ ملا تھا۔ جس کا ذکر ابھی کرنا مناسب نہیں۔

لاش کو دفنانے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ خاتون نے اس کی ذمہ داری لے لی تھی۔ اتنے سوال و جواب کرنے کے بعد میرا دماغ کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

اس لیے تھانے میں واپس آکر میں نے سپاہی انور کو چھٹی دے دی تھی اور خود بھی آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔

یہاں میں یہ بات بتاتا چلوں کہ مقتولہ کے کمرے کو میں نے سیل کروایا تھا۔

دوسری صبح میں نے تھانے میں اپنی سیٹ سنبھالنے کے بعد سپاہی قدیر کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

وہ مجھے سلوٹ کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھئی...... کیا خبریں ہیں؟"

"سر رات کو آپ نے مجھے جو کام بتایا تھا وہ اللہ کے فضل اور آپ کی دعاؤں سے ہو گیا ہے۔"

اچھا اس کی لمبی چوڑی بات سن کر میرے لبوں پر ہنسی آ گئی۔

"پھر شروع ہو جاؤ۔"

"دراصل رات اپنے کوارٹر میں جانے سے پہلے میں نے اس کے ذمہ ایک کام لگایا تھا۔ سر مقتولہ جہاں جاتی تھی۔ اس جگہ کا سراغ میں نے لگا لیا ہے۔ لیکن اس کے لیے مجھے بابائے قوم کی تصویر والا کاغذ دینا پڑا تھا۔"

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کاغذ تمہیں مل جائے گا۔ اگر تمہاری معلومات میرے کام کی ہوئیں۔"

"یہ مجھے نہیں پتہ سر کہ......"

"خیر تمہاری معلومات کی پٹاری سے دیکھتے ہیں کونسا سراغ نکلتا ہے۔ تم تیاری کرو۔"

اس وقت سر......؟ اس نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں اس وقت کیا قباحت ہے۔" میں نے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر...... اس وقت وہاں ہو کا عالم ہوگا......؟" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جہاں ہم نے جانا تھا وہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ جی ہاں ہمیں بازار حسن میں جانا تھا۔

بہر حال اس وقت جانے کا مقصد اور تھا۔ دراصل تفتیش کے لیے یہ وقت موزوں تھا۔ بہر حال ہمیں بڑی نائیکہ کو جگانے میں کافی وقت ضائع کرنا پڑا تھا۔ وہ ہمارے سامنے یوں آکر بیٹھیں جیسے کسی الو کی مادہ کو پکڑ کر دھوپ میں بٹھا دیا گیا ہو۔

وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ اس کا نام عشرت تھا عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ اس کے ہونٹ پان سے رنگے ہوئے تھے۔ میں نے کوٹھے پر موجود دونوں پہلوان نما بندوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ میں نے جیب سے مقتولہ کے چہرے کا فوٹو نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اور...... اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بی بی...... اس کو پہچانتی ہو۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ بہر حال وہ کسی گاہک یا عام بندے کے سامنے نہیں بیٹھی تھی۔ وہ ایک

تھانے دار کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس لیے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں اس کا نام ناصرہ ہے۔ اس نے شاید چند لمحے کچھ سوچا۔ پھر گویا ہوئی۔

"تھانے دار صاحب یہ ایک دکھی عورت ......" یہاں پہنچ کر وہ رکی پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس کو کیا ہوا ہے؟ آپ کے پاس صرف اس کے چہرے کی تصویر کیوں ہے؟"

"بی بی...... بڑی دیر بعد یہ خیال آیا۔"

پھر میں نے مناسب الفاظ میں اسے حالات سے آگاہ کیا تھا۔

"اوہ ...... بڑا افسوس ہوا۔ دراصل اس کی کہانی بڑی دکھ بھری ہے۔ ماں باپ نے اس کی شادی اس کی پسند کے لڑکے حامد سے کردی تھی۔ یہ روزی کی تلاش میں اس شہر میں آ گئے۔ حامد کو ایک فیکٹری میں معقول تنخواہ پر نوکری مل گئی۔ وقت بہت اچھے طریقے سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک دن فیکٹری میں حامد کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اسے فیکٹری کے بندے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ وہاں ٹیسٹ وغیرہ سے پتہ چلا کہ اسے کینسر ہے۔ اسے اسپتال میں داخل کرلیا گیا۔ فیکٹری والوں نے جو پیسے دیئے وہ دس دن کے علاج میں ختم ہوگئے۔"

"بی بی مجھے اس کے کمرے کی تلاشی کے دوران اس کی ڈائری ملی تھی۔ یہ سب کچھ اس میں درج تھا آگے کی بابت میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ آج کل بھی وہ اسی شہر کے ایک بڑے اسپتال میں داخل ہے۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ کینسر اس حد تک پھیل چکا ہے کہ بچنے کے کم چانس ہیں لیکن محبت کی ماری پھر بھی جسم فروشی کر کے اپنے شوہر کا علاج کروا رہی تھی۔" میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر عشرت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بتاؤ وہ تمہارے پاس جسم فروشی کے لیے آئی تھی۔ تم نے اسے رانا پرویز کے گھر بھیجا تھا اور کیا کوئی ایسا شخص بھی تھا جو یہ چاہتا ہو کہ وہ صرف اس کے لیے مخصوص ہو۔"

"تھانیدار صاحب یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس کوٹھے پر یہ دھندہ نہیں ہوتا۔"

"پھر کیا یہاں سلائی کڑھائی کا کام ہوتا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہاں صرف ناچ گانا ہوتا ہے۔" عشرت نے گویا احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"چلو تمہاری یہ بات بھی ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں پھر ناصرہ تمہارے پاس کیوں آئی تھی؟"

"تھانیدار صاحب ہم اگرچہ اس بازار میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ہمارا بھی دل ہے آپ یقین کریں ناصرہ نے مجھ سے یہ التجا کی تھی کہ اسے ناچ گانا سکھایا جائے وہ زیادہ عرصہ دھندہ نہیں کرسکے گی اور میں نے اسے استاد کے حوالے کردیا تھا وہ سہ پہر کو ایک گھنٹے کے لیے آتی تھی۔"

میں جس مقصد کے لیے آیا تھا یعنی کسی سراغ کی تلاش میں وہ تو نہیں ملا تھا البتہ مقتولہ یہاں کیوں آتی تھی۔ یہ معلوم ہوگیا تھا۔ اب ہمیں قاتل کو اپنی ہی دنیا میں تلاش کرنا تھا۔ کسی قتل کا سراغ لگانے کے لیے سب سے پہلے قتل کی وجہ ضروری ہوتی ہے۔

لیکن اس کیس میں ابھی تک ہنوز دلی دور والا معاملہ تھا تھانے کی طرف واپس آتے ہوئے سپاہی قدیر سے بات چیت جاری تھی۔

"سر مقتولہ ایک نیک مقصد کے لیے ایک برا دھندہ کر رہی تھی وہ کوئی اور کام بھی کرسکتی تھی۔"

"بھئی مردوں کے اس معاشرے میں اکیلی عورت کے لیے کام کرنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے خاوند کا مہنگا علاج کروا رہی تھی آگے تم خود سمجھ دار ہو۔" اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم تھانے میں واپس آ گئے اسی شام میں نے رانا پرویز کے بیٹے عامر کو تھانے بلا لیا۔ یہ مجھے سلجھا ہوا اور ذہین لگا۔ میں نے اسے عزت سے بٹھایا اور چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

"عامر تم اپنے گھر میں ہونے والے واقعے کے متعلق کچھ روشنی ڈال سکتے ہو؟"

"تھانیدار صاحب یہ تو مجھے پتہ تھا کہ ناصر بری صحبت میں پڑ چکا ہے لیکن وہ اس حد تک گر چکا ہے مجھے اس کا ادراک نہیں تھا۔"

"عامر کھل کر بات کرو۔ میں نے قاتل کو گرفتار کرنا ہے تمہارے خیال یا معلومات کے مطابق ناصر کیا کرتا تھا۔"

"وہ شراب پیتا تھا اور جوا بھی کھیلتا تھا۔"

"جوا۔" میں نے عامر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کہاں جوا کھیلنے جاتا تھا؟"

"تھانے دار صاحب آپ کی ناک کے نیچے جوا ہوتا ہے۔" اچانک وہ خاموش ہوگیا۔ جیسے اس کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو۔

"عامر گھبراؤ نہیں اور نہ ڈرو۔ کئی دفعہ ایسے ہوتا ہے کہ جرم ہماری ناک کے نیچے ہورہا ہوتا ہے اور ہم بے خبر ہوتے ہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تھانے دار صاحب چھوٹے منہ سے بڑی بات نکل گئی ہے معاف کردیں اور ساتھ میرے تحفظ کی ذمہ داری اٹھائیں تو میں آپ کو جگہ بتادیتا ہوں۔"

"تم بالکل بے فکر ہو اور نڈر ہو کر بتاؤ۔"

"تھانیدار صاحب ہوٹل کوہ نور کے تہہ خانے میں بڑے پیمانے پر جوا ہوتا ہے۔" اس نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"لیکن عامر تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانے دار صاحب ایک دن ناصر کسی سے بات کررہا تھا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ اوٹ میں میں کھڑا ہوں۔"

"خیر اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ جب کوئی بات کسی تک پہنچانی ہوتی ہے تو سبب خود بخود بن جاتا ہے۔ خیر ہمیں اس سے بحث نہیں تھی میں نے عامر سے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔

"عامر تمہارے والد صاحب نے تمہاری شادی تو کردی لیکن ناصر اور صابر کے متعلق نہیں سوچا؟"

"تھانیدار صاحب ابو یہ کہتے تھے کہ دونوں اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ کسی کی بیٹیوں کو اس آگ میں جھونک کر اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔"

میں نے اس موضوع پر عامر سے بحث کو فضول سمجھتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اس کے بعد میں نے اے ایس آئی ابرار کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ورنہ وہ میرے تیور دیکھ کر میرے سامنے مودب کھڑا ہوگیا تھا۔

"ابرار مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے تھانیداری چھوڑ دینی چاہئے۔" مجھے بہت کم غصہ آتا تھا لیکن جب آتا تھا تو سب عملہ مجھ سے پناہ مانگتا تھا۔

"سر کیا ہوا؟" ابرار نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ابرار یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا؟" میں نے غصے میں اپنی اسٹک کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اسے ہوٹل کوہ نور کے متعلق بتایا تھا۔

"سر یہ واقعی میری کوتاہی ہے کہ میں اس بات سے بے خبر رہا...... اب میں ایسی کارروائی کروں گا کہ اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا۔" اے ایس آئی ابرار نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

"دیکھو ہوٹل کا مالک اثر ورسوخ والا ہے میں خود اپنی نگرانی میں چھاپہ ماروں گا۔ تم مخبروں کے ذریعے صرف اتنا کرو کہ طریقہ کار معلوم کرو۔"

"وہ ٹھیک ہے سر۔" کہہ کر چلا گیا۔

واقعی یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔ خیر کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے۔ ہم بھرپور کارروائی کرکے شرمندگی کے اس داغ کو دھو دینا چاہتے تھے۔

قصہ مختصر یہ کہ چار دن بعد ہم نے کامیاب چھاپہ مار کر تیس کے قریب جواریوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور ہوٹل کو سیل کردیا۔ ہوٹل کا مالک فی الحال ہمارے ہاتھ نہیں آیا تھا خیر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

یہ قصہ تو تمام ہوا۔ یعنی جوئے خانے کو ہم نے بند کروادیا لیکن ابھی تک دہرے قتل کا معمہ حل ہونا باقی تھا۔ ویسے ہمارا شک رانا پرویز اور صابر پر بھی تھا اور یہاں یہ بات بتانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ صابر منظر سے غائب تھا۔ رانا صاحب نے بتایا تھا کہ وہ ہفتہ ہفتہ غائب رہتا ہے۔ عجیب حالات تھے رانا صاحب کے ہاتھ سے اولاد نکل چکی تھی صرف عامر کو ابھی باہر کی ہوا نہیں لگی تھی۔

ویسے یہ بات میرے لیے باعث اطمینان تھی کہ ایک بہت بری برائی کو ہم نے ختم کر دیا تھا جو ایک ایسی برائی ہے جو بہت سے جرائم کو جنم دیتی ہے۔ ہم نے رانا صاحب کو پیغام بھجوایا ہوا تھا کہ جو نہی صابر آئے اسے تھانے میں بھیج دیں۔ ویسے سپاہی انور کو میں نے رانا صاحب کی خفیہ نگرانی پر مامور کر دیا تھا...... یہ کیس ذرا لمبا ہو گیا تھا۔

ایک دن سپاہی انور نے مجھے آ کر بتایا کہ رانا پرویز بھی عیاش طبع آدمی ہے۔ وہ ہر روز گلبہار کے کوٹھے پر جاتا ہے میں نے اسی دن اسے تھانے میں بلوالیا۔ وہ اس طرح بلائے جانے سے کافی پریشان لگتا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''رانا صاحب صابر کہاں ہے؟''

''تھانیدار صاحب میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ اولاد عامر کے علاوہ میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔'' اس نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے کہا۔

''رانا صاحب لیکن آپ بھی تو کم نہیں ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟ تھانیدار صاحب۔'' وہ اس طرح اچھلا جیسے کرسی میں موجود کسی بچھو نے اسے ڈنگ مار دیا ہو۔

''اوہ...... آخر آپ کو بھی پتہ چل ہی گیا۔'' اس نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا۔ تھانیدار صاحب یہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔''

''دیکھیں رانا صاحب ہم یہاں کہانیاں ہی سننے کے لیے بیٹھے ہیں انہی کہانیوں سے ایسی باتیں نکلتی ہیں جو ہمارے لیے کسی کیس کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔''

قارئین چاہے بات حال کی کی جائے چاہے ماضی کی یہ بات ہمارے معاشرے میں موجود ہے جب انسان کو سیدھا رستہ نہیں ملتا تو وہ برا راستہ اختیار کرتا ہے کیونکہ جب دریا میں طغیانی آتی ہے تو پانی اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ بہر حال کہانی رانا صاحب کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب جیسا کہ آپ کے علم میں یہ بات آ گئی ہے کہ میری بیوی فوت ہو چکی ہے۔ اس کے مرنے کے ایک سال بعد میں نے دوسری شادی کا سوچا لیکن ناصر اور صابر نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر بولا۔

''تھانیدار صاحب اگر مجھے ایک گلاس پانی منگوا دیں تو مہربانی ہوگی۔'' میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ اس وقت وہ مجھے اندر باہر سے ٹوٹا پھوٹا لگتا تھا۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا کہ پانی پینے کے بعد وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا یعنی اس نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا لیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

''تھانیدار صاحب انسان کو آخری عمر میں ساتھی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔ میں نے مجبور ہو کر یہ راستہ اختیار کیا ہے اب اس بات کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ میری شادی والی بات کرنے کے بعد صابر اور ناصر باغی ہو گئے تھے۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ جو باتیں وہ نہیں کہہ سکا تھا وہ بھی میں سمجھ گیا تھا۔

''رانا صاحب شاید آپ کے بیٹوں کو آپ کی سرگرمیوں کا پتہ چل چکا ہے۔ اسی لیے......'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تھانیدار صاحب میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''رانا صاحب...... اگر میں آپ کو تھانے میں روک لوں تو کیا صابر حاضر ہو جائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب آپ بادشاہ ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں میں حاضر ہوں لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ کیا آپ صابر پر کسی قسم کا شبہ کر رہے ہیں؟''

''رانا صاحب شبہ کرنا تو ہماری مجبوری ہے اس کے بغیر ہماری گاڑی نہیں چلتی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن میں نے رانا صاحب کو پابند کر کے نہیں بٹھایا بلکہ اسے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ جو نہی صابر گھر آئے ہمیں اطلاع دے دیں۔

اس کیس نے مجھے چکر پر چکر دیئے تھے کوئی سراغ کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اگر قتل کی کوئی وجہ ہمارے علم میں آ جاتی تو ہم قاتل تک پہنچ جاتے۔ بہر حال رات جتنی بھی

اندھیری ہواس کی سحر ضرور ہوتی ہے۔ ہم ہر بندے کو ٹٹول رہے تھے صرف صابر تک ہماری رسائی فی الحال نہیں ہو رہی تھی۔ مخبر بھی اپنا کام کر رہے تھے میں نے اسپتال جا کر مقتولہ کے شوہر کو دیکھ لیا تھا وہ تو بس چند ہفتوں کا مہمان تھا۔ وہ صرف ٹیکوں کے سہارے جی رہا تھا اب تو وہ بھی نہیں تھا۔

قارئین انسان بھی کتنا مجبور ولاچار ہے۔ تھانیدار بھی انسان ہوتے ہیں ان کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے پتھر نہیں۔

میں اس کی حالت دیکھ کر دکھی ہوگیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے میں نے اس ڈاکٹر سے بھی بات کی تھی جو اس کا علاج کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے۔

''تھانیدار صاحب میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کسی میاں بیوی میں اتنا پیار بہت کم دیکھا ہے۔ میں نے بیوی کو بتادیا تھا کہ علاج کا کوئی فائدہ نہیں لیکن وہ کہتی تھی کہ میں اپنا سب کچھ بیچ کر بھی علاج کرواؤں گی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا تھا کہ اس لب مرگ شخص کی بیوی قتل ہوچکی ہے لیکن اس کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دھندہ کرتی تھی۔

یہ غالباً رانا صاحب کے تھانے سے جانے کے تیسرے دن کا واقعہ ہے کہ صابر کی شکل تھانے میں نظر آئی۔ میں نے اسے باپ سے شباہت پر پہچان لیا۔ پھر میری چھٹی حس نے فوراً الارم بجادیا کہ یہی وہ صابر ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔

میں نے اسے بیٹھنے نہیں دیا بلکہ سپاہی قدیر کو بلا کر اس کے سر پر مسلط کردیا سپاہی قدیر صرف باتوں سے دل نہیں بہلاتا تھا بلکہ وقت پڑنے پر منہ پر لگے تالے بھی کھول لیتا تھا۔ میں نے کڑے تیوروں سے صابر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے صابر کے کیا معنی ہیں؟''

''جی جناب صبر کرنے والا۔''

''بالکل ٹھیک تم نے ہمیں بہت صبر کروایا اب تمہارے صبر کا امتحان ہوگا؟''

''سر اگر آپ اجازت دیں تو پرچہ میں بناؤں۔'' سپاہی قدیر نے صابر کو گھورتے ہوئے کہا۔

''دیکھو قدیر تم کاغذ قلم تیار رکھو۔ پہلے ذرا مجھے زبانی

سوال جواب کرنے دو۔"

"ٹھیک ہے سر آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ویسے یہ مجھے لاتوں کا بھوت لگتا ہے۔"

میں نے صابر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ اتنے دن کس دشت کی سیاحی میں گزارے۔"

"جناب لگتا ہے میرے والد بزرگوار نے میرے خلاف آپ کو خوب بھڑکایا ہے۔" صابر نے معصوم سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

"دیکھو مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو۔ میں تھانیدار ہوں کوئی بچہ نہیں ہوں جو کسی کے بہکانے یا بھڑکانے میں آجاؤں میرے سوالوں کے سیدھے سیدھے جواب دو ورنہ......" میں نے سپاہی قدیر کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب میں ذرا سیر سپاٹے کے لیے لاہور کی طرف نکل گیا تھا۔ گھر میں سوائے ٹینشن کے رکھا کیا ہے؟"

"تمہیں پتا تو چل گیا ہوگا کہ ناصر کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"تھانیدار صاحب پتا تو چل گیا ہے لیکن ناصر کے ساتھ جو عورت قتل ہوئی ہے وہ کون تھی؟"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ مجھے تو یہ پتہ چلا ہے کہ مقتولہ ناصرہ پہلے تمہاری محبوبہ تھی۔" میں نے ہوا میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔

"تھانے دار صاحب یہ بات شاید آپ کو میرے والد صاحب نے بتائی ہے۔"

میں نے سپاہی قدیر کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک زوردار لات اس کی کمر پر رسید کردی۔ وہ منہ کے بل سیدھا میری میز پر آیا۔ میں نے اٹھ کر اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا اور ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نہ کہ میرے سوالوں کے سیدھے سیدھے جواب دو۔ یہ نہ پوچھو کہ مجھے کس نے کیا بتایا ہے اور کیوں بتایا ہے؟" اس خاطر کے بعد وہ سیدھی راہ پر آ گیا اور بتایا کہ "اس کا باپ عیاش ہے۔ وہ طوائفوں کے کوٹھے پر جاتا ہے۔ ہمیں اس سے نفرت ہے۔ میں تو خوش ہوتا اگر ناصر کی جگہ وہ قتل ہوتا۔"

لگتا تھا اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت کا ایک وسیع سمندر موجزن ہے۔" لیکن...... قارئین مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کہ وہ دل میں اپنے باپ کے خلاف کیسے جذبات رکھتا ہے۔ یا اس کا باپ بیٹوں کے خلاف کیسے جذبات رکھتا ہے۔ مجھے تو قاتل یا قاتلوں کو پکڑنا تھا۔

میں نے صابر کو اتنا غصہ دلایا کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ سپاہی قدیر صحیح کہہ رہا تھا کہ وہ لاتوں کا بھوت ہے۔ اس میں اکڑ تھی لیکن میں نے نفسیاتی طریقہ علاج سے اس سے ایک ایک بات اگلوائی۔ جو شاید وہ کبھی نہ بتاتا۔ آخر اسے اپنے بھائی کا پردہ تو رکھنا ہی تھا لیکن جب اس نے یہ پردہ چاک کیا تو ہمارے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ یہ بات تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ ہمیں قتل کی اصل وجہ معلوم ہوگئی تھی۔

میں نے صابر کو اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ جب تک قاتل گرفتار نہیں ہوجاتے اسے دوبارہ سیر سپاٹے کے لیے نہیں جانا ہے۔

اس کے بعد میں نے سپاہی قدیر کو بھی جانے کی اجازت دے دی تھی اور کانسٹیبل وزیر اور سپاہی قدیر کو اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔

اس دوران اے ایس آئی ابرار بھی میرے کمرے میں آ گیا۔

میں نے ابرار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وزیر اور قدیر کو ساتھ لے جاؤ اور آفتاب کو پکڑ کر لے آؤ۔" پھر میں نے آفتاب کا پتہ بتایا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد مطلوبہ بندہ میرے سامنے تھا۔

یہ ایک دبلا پتلا کمزور سا جوان تھا۔ عمر تیس بتیس کے اریب قریب ہوگی۔ رنگ سانولا اور آنکھیں کسی سانپ کی طرح حرکت کرتی دکھائی دیتی تھی۔

اس نے ہمیں زیادہ محنت کرنے کی زحمت نہیں دی اور سب کچھ بتادیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ شاید ندامت کے آنسو تھے۔ اس کے کالے کرتوت پانی بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ ویسے اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس دبلے پتلے بندے نے بے دردی سے دہرے قتل کی یہ واردات کی تھی۔ بہر حال کہانی

آفتاب کی زبانی ہی سنیے۔

''تھانے دار صاحب میں بہت بد بخت ہوں۔ بہت کمینہ ہوں۔ بہت ذلیل ہوں۔ جوئے کی لت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ ایک دن میں ناصر کے آگے اپنی بیوی ہار گیا۔ میری بیوی بہت صابر تھی۔ میں اس کی قدر نہ کرسکا۔ تھانے دار صاحب جب میں یہ ذلیل حرکت کر چکا تو میرے دل کا چین اور راتوں کی نیند اڑ گئی۔ سب سے بڑا مسئلہ بیوی کو منانے کا تھا۔ ناصر نے مجھے کہا میں نے تمہاری بیوی کا اچار نہیں ڈالنا۔ صرف ایک رات کے لیے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ صبح آ کر لے جانا۔ میں نے اس سے ایک ہفتے کا وقت مانگا کہ میں اپنی بیوی کو قائل کرلوں گا لیکن تھانے دار صاحب۔ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ البتہ میں نے بیوی کا زیور چوری چھپے بکس سے نکالا اور ناصر کے پاس پہنچ گیا۔''

''میں اس کے کمرے میں چلا گیا اور اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور زیور اس کی جھولی میں ڈالتے ہوئے کہا۔''

''ناصر بھائی یہ زیور لے لو اور مجھے بخش دو...... یعنی میری بیوی کا خیال دل سے نکال دو۔ میرے اندر اتنی جرات نہیں تھی کہ میں کھل کر اس سے بات کرتا۔'' اس لیے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس سے بات کی۔ اس نے زیور کی پوٹلی میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بیوی زلیخا نے ایک دن مجھے جوتی دکھائی تھی۔ میں نے تو شکر کیا ہے کہ مجھے موقع مل رہا ہے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا۔ صرف تین دن رہ گئے ہیں تین دن بعد زلیخا میرے بستر کی زینت ہونی چاہیے۔ آج رات تو ہم ناصرہ سے اپنا پہلو گرم کریں گے۔''

''تھانے دار صاحب ناصرہ سے میری جان پہچان بھی ناصر کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔ میں نے زیور کی پوٹلی جو پھینکنے سے کھل گئی تھی دوبارہ باندھی اور ایک فیصلہ کرکے وہاں سے نکل آیا۔''

''میرے پاس دو خنجر ہمیشہ رہتے ہیں۔ یقین کریں مجھے صرف یہی راستہ نظر آیا کہ میں ناصر کو دنیا کے تختے سے اکھاڑ پھینکوں۔ اب ناصرہ کی موت بھی آئی ہوئی تھی۔ میں کیا کرسکتا تھا۔ اس دن ناصرہ مجھے بازار میں مل گئی میں نے اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے کہا۔''

''ناصرہ آج سنا ہے رانا ناصر کے پاس جاؤ گی؟''

''کیا کروں مجبوری ہے۔ خدا کسی کو مجبور نہ بنائے۔'' وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

''میں نے اسے کچھ روپے دیتے ہوئے کہا۔ تم اس طرح کرنا کہ آدھی رات کے بعد پچھلے دروازے کی کھڑکی کھول دینا۔''

''کیوں؟'' اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دراصل میرے چار ہزار روپے ناصر دبا کر بیٹھا ہوا ہے میں وہ وصول کروں گا۔ اس میں سے ہزار روپے تمہارے ہوں گے۔'' وہ چلی گئی۔

''یہ بھی میں نے ایک قسم کا جوا کھیلا تھا۔ یہ ایک بچگانہ حرکت تھی لیکن میرا داؤ چل گیا۔ ورنہ مجھے ناصر کے کمرے تک پہنچنے کے لیے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے۔''

''مجھے ناصر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ جونہی میں نے اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالا دروازہ کھل گیا۔ اندر زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ دونوں شراب کے نشے میں دھت تھے۔ میرا کام آسان ہوگیا۔ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ مجھے ناصرہ کو قتل کرتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ کیونکہ کچھ وقت میں نے بھی اس کے ساتھ گزارا تھا مگر میں کوئی گواہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔''

آفتاب نے اپنی دانست میں کوئی گواہ نہیں چھوڑا تھا لیکن شاید اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ خون اپنی گواہی خود دیتا ہے۔ ناصر نے اپنے بھائی صابر کو یہ بتا دیا تھا کہ آفتاب اس کے آگے اپنی بیوی ہار چکا ہے۔ آفتاب اس بات کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا کہ اس نے ناصرہ پر اتنے زیادہ وار کیوں کیے تھے۔''

طلوعِ سحر

طیبہ افتخار

اگر عزم سچا اور مضبوط ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے رحمت کے در وا کر دیتا ہے۔ سنگلاخ پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو کر راستہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
اک معصوم حسینہ کا فسانۂ عجیب، وہ اک باغی لڑکے سے محبت کر بیٹھی تھی۔

قارئین نئے افق کے لیے ایک محبت بھری سچی داستان

آج پھر وہ وہیں موجود تھی۔ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی وہاں وہ بیٹھی ہوئی مجھے نظر آ گئی تھی۔ اب اسے دیکھنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ پارک میں داخل ہوتے ہی میری متلاشی نظریں اس بینچ کی طرف اٹھتی تھیں۔ جہاں وہ روزانہ اردگرد سے بے نیاز مکمل طور پر اپنے آپ میں گم دکھائی دیتی تھی۔

مجھے اس پارک میں باقاعدگی سے آتے ہوئے تقریباً دو سال ہوئے ہیں۔ تنہائی' اکیلے پن اور سنسان گھر کی خاموشی سے گھبرا کر میں اس پارک کا رخ کرتا ہوں۔ زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل رہی ہے۔ نو سے پانچ کی جاب اور اس کے بعد وہی ویرانی اندر کی بے سکونی اور خاموشیاں جو مجھے اس پارک کی ہلچل سے بھرپور زندگی کی طرف لے آتی ہیں۔

میں ایشان احمد ایم بی اے ڈگری ہولڈر اور تین سال سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا ہوں۔ بظاہر میں ایک کامیاب زندگی گزار رہا ہوں۔ ملنے جلنے والے لوگ جہاں میری کامیاب معاشی زندگی پر رشک کرتے ہیں وہیں شادی کر لینے کا مشورہ بھی ساتھ ہی حاضر ہوتا ہے۔ اور میں جہاں ان کے اظہار رشک کو خاطر میں نہیں لاتا وہیں ان کے مشورے کو بھی ٹال جاتا ہوں۔ کیونکہ کسی کو مشورہ دینا تو آسان ہے۔ لیکن میرے لیے اس پر عمل کرنا کس قدر مشکل ہے یہ اندازہ صرف مجھے ہے۔ اب اگر میں سوچوں تو لگتا ہے کہ جیسے اپنی ان تنہائیوں کا ذمہ دار میں خود ہوں کیونکہ اگر میں چاہتا تو لوٹ سکتا تھا۔ لیکن انسان کی انا اور اس کے اندر کی "میں" ہمیشہ اسے واپسی کے سفر سے روکتی ہے۔ مجھے بھی میری انا نے روک رکھا ہے۔ اور اب لگتا ہے کہ جیسے اندر کی تمام چاہتیں مردہ ہو گئی ہیں۔

آفس سے واپس گھر جاتے ہوئے کوئی امنگ نہیں ہوتی دل میں جلدی گھر پہنچنے کی۔ اس کے برعکس گھر سے باہر جانے میں عجلت ہوتی ہے۔ شام کو کم از کم ایک گھنٹا پارک میں گزرتا ہے۔ یہ معمول دو سال سے ہے۔ ان دو سالوں سے اگر پچھلے دو ماہ نکال دیئے جائیں تو یہاں اس پارک میں سب عام ہی ہوتا تھا۔ وہی مخصوص بچوں کا شور جو کوئی نہ کوئی گیم کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کچھ خواتین جو وزن کم کرنے کے خبط میں مبتلا واک میں مصروف ہوتی ہیں یا کچھ بوڑھے لوگ جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی اولاد ان کو گھر میں ریٹائر سمجھنا شروع کر دیتی ہیں۔ لہٰذا انہیں اپنا وقت ایسی جگہوں پر ہی صرف کرنا پڑتا ہے جہاں ان کی ہلچل مچاتی ماضی کی زندگی کا کچھ عکس ہو۔ یہ دیکھنا معمول کی بات تھی۔

آفس کے بعد میں اس پارک کا رخ کرتا ہوں اور سیدھا اس بینچ پر ہی بیٹھتا ہوں جہاں پارک کے مین گیٹ سے لے کر تقریباً پورے پارک کا نظارہ ہو سکتا ہے۔ در حقیقت میں اپنے اندر کی تنہائی سے گھبرا کر یہاں آتا ہوں۔ لیکن ایک گھنٹہ بعد جب یہاں سے اٹھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اندر کی ویرانی ویسی کی ویسی ہے۔ لیکن

اگلے دن بھر میں یہاں موجود ہوتا ہوں۔ تقریباً دو ماہ پہلے وہ لڑکی اس پارک میں آنا شروع ہوئی۔ بظاہر اس میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی کہ جو کسی کو چونکنے پر مجبور کردے سو میں نے بھی کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ صرف ایک بات جو اسے دیکھ کر میں نے سوچی وہ یہ تھی کہ اسے اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں جتنے بھی لوگ تھے وہ تقریباً سارے اسی کالونی کے تھے اور باقاعدگی سے یہاں آنے کی وجہ سے میں ان سب سے واقف ہوچکا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید یہاں نئی آئی ہو۔

لیکن کچھ روز بعد ہی میں نے اسے نوٹس کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ ہمیشہ کونے والی بینچ پر آ کر بیٹھتی اور وہ بات جس نے چونکنے پر مجبور کیا وہ تھی کہ وہ کبھی بھی آگے پیچھے نہیں دیکھتی تھی۔ بس سیدھی جا کر اس کارنر والے بینچ پر بیٹھ جاتی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی۔ میری نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کی طرف اٹھتی تھیں لیکن اس نے کبھی نظر اٹھا کر اپنے اردگرد نہیں دیکھا۔ بس کچھ دیر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہتی اور پھر اٹھ کر چلی جاتی۔

پچھلے دو مہینوں سے وہ باقاعدگی کے ساتھ پارک آتی اور اپنے اسی مشغلے میں مصروف رہتی۔ اور اب تو میں روزانہ اسے دیکھتے ہوئے یہ سوچتا ہوں کہ آخر اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہوگا۔ وہی انسان کی ازلی تجسس کی فطرت میں بھی اسی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بارے میں سوچے چلا جاتا ہوں۔

آج بھی اسے دیکھتے ہی میں نے یہی بات سوچی اور پھر بغیر کچھ اور سوچے سیدھا اس کی جانب چلا آیا۔ بینچ کے ایک سرے پر وہ بیٹھی تھی دوسری طرف میں نے جگہ سنبھالی۔ مجھے بیٹھے ہوئے پانچ منٹ گزار گئے لیکن اس کی

سابقہ پوزیشن برقرار رہی۔ اس نے میرے بیٹھنے کا نوٹس نہیں لیا۔ یا پھر وہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھی کہ اسے کسی اور کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔ بہرحال میں تو تب سے یہی سوچنے میں مصروف تھا کہ بات شروع کہاں سے کروں؟

"ہیلو! کیسی ہیں آپ؟" میں نے ہمت کر ہی لی اور پھر دل ہی دل میں شرمندگی ہوئی کہ سلام سے پہل کرنی چاہیے تھی۔ اس نے فوراً چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں از حد حیرانگی تھی اور ساتھ ہی حیرانگی کی جگہ سرد مہری نے لے لی۔ اس نے اپنا چہرہ مخالف سمت میں موڑ لیا۔ میں اپنے سوال کے جواب کے لیے ابھی تک منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ کیا بغیر مجھ پر دوسری نظر ڈالے وہ اٹھ کر چل دی اور میں وہیں بیٹھا دیکھتا رہ گیا۔ میں نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کوئی متوجہ تو نہیں لیکن سب اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ دل ہی دل میں خود کو سرزنش کی کہ کیا ضرورت تھی یوں اس کو مخاطب کرنے کی۔ دل میں انسلٹ فیل ہوئی کہ وہ بغیر بات کیے اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن کیا کیجیے اس تجسس کا کہ اب بھی میں اس کے رویے کے پیچھے چھپی وجہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ بہرحال اس معاملے کو کل پر چھوڑ کر میں نے گھر کی راہ لی۔

گھر پہنچتے ہی مغرب کی اذان ہو گئی نماز ادا کر کے میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔ پھر سوچا کہ ڈنر کا کچھ کیا جائے اتنے سال سے اکیلا رہ رہا ہوں کہ اب ان تمام کاموں کی اچھی طرح پریکٹس ہو چکی ہے۔ کھانا وغیرہ بھی خود ہی بنا لیتا ہوں اور اگر کبھی نہ بن رہا ہو تو ہوٹل کا رخ کرتا ہوں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ ابھی بھی ہلکا پھلکا ڈنر کیا اور پھر عشاء کی نماز ادا کر کے لیٹ گیا۔ نیند ہمیشہ کی طرح آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کوئی بھی رات ایسی نہ گزرتی تھی جس میں ماضی کی یادوں نے نہ ستایا ہو۔ سوچتے ہوئے ہی آدھی سے زیادہ رات بیت جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر نیند کی دیوی مہربان ہوتی ہے۔ سارا دن خود سے لڑتے ہوئے اور ماضی سے پیچھا چھڑاتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اس کوشش میں اس وقت تک اتنا تھک جاتا ہوں کہ خود کو ماضی کی تلخ یادوں کے حوالے کر دیتا ہوں۔

✿ ✿ ✿ ✿

میرا تعلق سرگودھا سے تھا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر پہلا ہے۔ والد صاحب کا کریانہ اسٹور تھا جو اچھا چلتا تھا۔ وہی مڈل کلاس طبقے کا عمومی ماحول تھا ہمارے گھر کا بھی کہ ابا کا گھر میں خاصا رعب تھا اور وہ جو ایک عام سوچ ہوتی ہے کہ پہلی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے تو یہاں ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔

پیار تو والدین کرتے ہی تھے آخر کو اولاد سے والدین پیار کرتے ہی ہیں۔ لیکن ابا کا مشہور زمانہ غصہ بھی سب سے زیادہ مجھ پر ہی اترتا تھا۔ ابا کی مار میں نے بہت زیادہ کھائی اور اسی کا اثر تھا کہ دل میں کچھ کچھ بغاوت کے جراثیم بھی پیدا ہو گئے۔ اب اکثر میں وہی کام کرتا جس سے ابا منع کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں مزید ابا کے غضب کا نشانہ بنتا۔ اماں بے چاری میری ڈھال بننے کی کوشش کرتے ہوئے بھی نہ بن پاتی۔ لیکن بہرحال کچھ حد تک بچت ہو ہی جاتی تھی اماں کی بدولت۔

ابا کے اس رویے کا ہی اثر تھا کہ نوجوانی تک آتے آتے میں کافی حد تک بے ڈر ہو گیا تھا۔ اس لیے پہلی اولاد ہونے کے باوجود میں ابا کی گڈ بک میں شامل نہیں تھا۔ باقی بہن بھائی ابا کے غصے سے ڈر سے جاتے تھے اور ڈر کر دبک بھی جاتے تھے سو ان کی خلاصی ہو ہی جاتی تھی۔

اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے ماں جیسی عظیم ہستی کو کھو دیا۔ عمر اتنی نہ تھی لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ میں کھلے آسمان تلے آ گیا ہوں۔ کیونکہ ابا سے تو کبھی بے تکلفی ہوئی ہی نہیں تھی ایک اماں ہی تھیں جو میرا سہارا بن جاتی تھیں سو اس سہارے سے محرومی کا صدمہ برداشت کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میں بڑی اولاد تھا اس لیے کچھ حوصلے سے کام لیا اور چھوٹے بہن بھائیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ ابا کا رویہ بھی کچھ نرم ہو گیا تھا۔ شاید انہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب وہی ہمارا سہارا ہیں۔

کامران اور ندا اور ردا جو کہ جڑواں تھیں بالترتیب سولہ اور چودہ سال کے تھے۔ وہ تینوں تو پھر کچھ سمجھ دار تھے۔ لیکن ذیشان اور آرزو کی عمر تو ابھی دس اور بارہ سال ہی تھی ان دونوں کو سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ کچھ دن تک تو مہمانوں کا آنا جانا لگا رہا لیکن بالآخر سب کو اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جانا ہوتا ہے سو ہم بھی صرف گھر کے افراد ہی رہ

گئے اپنے غم کو منانے کے لیے۔ گھر کی حالت ابتر تھی ان دنوں۔ ندا اور ردا گھر کے کچھ کام وغیرہ تو کر لیتی تھی لیکن وہ ابھی بہت کم عمر تھیں اس لیے گھر کو صحیح طرح نہیں چلاسکتی تھیں۔

انہی دنوں ابا پھر سے اپنے رویے میں لوٹنے لگے۔ وہی بات بات پر غصہ کرنا اور رعب جمانا۔ میں ان دنوں تھرڈ ایئر میں تھا۔ فائنل اگزیم نزدیک تھے کہ ابا نے نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ وہ میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی مجھ سے چھ سال بڑی لڑکی سے۔ اس دن میں کالج سے واپس آیا تو ابا خلاف معمول گھر پر تھے ورنہ عموماً مغرب کے بعد گھر آیا کرتے تھے۔ کالج سے آ کر کھانا کھانے کے بعد میں کمرے کا رخ کرنے لگا تھا کہ ابا کا بلاوا آیا۔

''جی ابا! آپ نے بلایا تھا؟'' میں نے کمرے میں داخل ہو کر دریافت کیا۔

''ہاں ایشان' آؤ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے بیٹھو۔'' ابا کے لہجے میں انتہائی سنجیدگی تھی۔ جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اور اب بس عمل کرنا باقی ہے۔

میرا دھیان فوراً ہی شازیہ والے قصے کی طرف گیا۔

امی کی وفات کو چار مہینے ہو چکے تھے۔ اور ایک ہفتے پہلے ہی ابا نے مجھ سے شازیہ کے بارے میں بات کی تھی۔ شازیہ ابا کے کسی دوست کی بیٹی تھی اور بقول ابا کے انتہائی سگھڑ اور سلیقہ مند تھی۔ ابا کا خیال تھا کہ اس گھر کو شازیہ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے جو گھر کو احسن طریقے سے چلا سکے۔

ایک ہفتے پہلے جب ابا نے مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تو میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔ میری عمر ابھی اٹھارہ سال تھی اور پڑھائی کے علاوہ ابھی تک میں نے کسی اور بات کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور شادی کے بارے میں تو کہیں ذہن میں دور دور تک بھی خیال نہیں تھا۔ سو حیرت کی زیادتی کی وجہ سے ابا کو کوئی جواب نہ دے سکا اور ابا نے بھی مجھے سوچنے کا وقت عنایت کیا۔ بعد میں جب میں سوچنے بیٹھا تو یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ ابا کو صاف انکار کر دوں گا۔ کیونکہ ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور دوسرا مجھ سے چھ سال بڑی لڑکی کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔ میرے خیال میں تو میری کم عمری ہی میرے فیصلے کی سب سے بڑی دلیل تھی۔

''پھر تم نے کیا سوچا ایشان!'' ابا کا سوال مجھے اپنے خیالات سے کھینچ لایا۔

''کس بارے میں ابا؟'' میں نے نظریں چراتے ہوئے استفسار کیا۔ کیونکہ بہرحال جو بھی تھا میں ابا کی آس کو توڑنے جا رہا تھا۔

''تم بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ مجھے شازیہ تمہارے لیے بہت پسند ہے اور میں نے محمود سے بات بھی کر لی ہے۔ تم نے بہت وقت لے لیا ہے بس تم اب یہ بتاؤ کہ نکاح کی کیا تاریخ رکھی جائے کیونکہ میں محمود کو زبان دے چکا ہوں اور اب وہ بھی انتظار میں ہے کہ ہم کب تاریخ رکھنے آتے ہیں۔'' ابا نے انتہائی دوٹوک انداز میں یہ سب کہہ دیا اور میں حیرت اور صدمے سے کچھ بولنے کے قابل بھی نہ رہا کہ میں جو انکار کا فیصلہ لے کر آیا تھا تو میرے فیصلے کی تو یہاں ضرورت ہی نہیں ہے۔ ابا تو سب طے کیے بیٹھے تھے۔

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ابا جی؟ آپ...... میرا مطلب ہے کہ...... آپ ابا جی آپ یہ کیسے......؟''

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیسے اپنی بات ابا تک پہنچاؤں۔ میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی لیکن پھر میں نے سوچا کہ یہ کوئی ایک دو دن کی نہیں بلکہ ساری زندگی کی بات ہے۔ میں کیسے ساری زندگی کے لیے ایک ان چاہا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھ سکتا ہوں۔

''میں کیا کیسے؟ میں تمہارا باپ ہوں ایشان احمد! اور میں یہ کر سکتا ہوں۔ اب تو تمہارے پاس انکار کرنے کا بھی وقت نہیں تم یہ وقت کھو چکے ہو۔ میں زبان دے چکا ہوں اور تمہاری وجہ سے میں اپنے برسوں پرانے دوست کو نہیں کھو سکتا یہ بات یاد رکھنا تم۔'' ابا جی کا لہجہ انتہائی غصیلا تھا انہیں شاید میرے فیصلے کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن ان کی آخری بات نے تو بھڑکا ہی دیا مجھے یعنی کہ بیٹے سے زیادہ عزیز انہیں اپنا دوست ہے۔

''بے شک آپ میرے باپ ہیں۔ لیکن یہ میری پوری زندگی کا فیصلہ ہے اور آپ اکیلے نہیں کر سکتے ابا جی! پہلی بات تو یہ کہ ابھی میں نے شادی کا سوچا نہیں ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ اور دوسری بات کہ وہ مجھ سے چھ سال بڑی

ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کرسکتا۔" میرا جواب دوٹوک تھا۔

"تم...... تم نے ہمیشہ میری نافرمانی کی ہے...... میں اپنے دوست کو زبان دے چکا ہوں۔ اور تمہیں یہ شادی کرنی ہی ہوگی۔" اباجی کا انداز بھی فیصلہ کن تھا۔

"میرا فیصلہ انکار میں ہی ہے ابا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" میرا انداز پرسکون تھا جس نے اباجی کے مزاج کو مزید بھڑکا دیا۔

"تمہیں اس گھر کا کوئی خیال نہیں ایشان؟ حالت دیکھی ہے تم نے گھر کی۔ اس گھر کو ایک سلیقہ مند عورت کی ضرورت ہے تم کیوں نہیں سمجھتے اس بات کو؟ تمہاری بہنیں ابھی چھوٹی ہیں وہ نہیں سنبھال پارہی ہیں اس گھر کو۔ تمہاری شادی ہی واحد حل ہے۔ شاذیہ بہت اچھی لڑکی ہے تم بہت خوش رہو گے۔" ابا کے لہجے میں بے بسی اور پھر التجا اتر آئی۔ اور میں سمجھ گیا اب وہ مجھے اموشنلی بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔

"میں آپ کو اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں ابا! آخری فیصلہ۔" میں نے ابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میرا بھی آخری فیصلہ سن لو۔" ابا نے ایک پل کے لیے توقف کیا ان کے لہجے میں انتہائی سردمہری تھی اور آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا جس نے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کردی۔

"اگر تم نے اس شادی کے لیے ہاں نہ کی تو پھر تم اس گھر میں رہنے کے اہل نہیں۔ اگر تمہیں یہاں رہنا ہے تو میرا فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا۔" ان کا لہجہ اٹل تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ مجھے اس گھر سے نکال رہے ہیں؟ آپ نے ہمیشہ ایسے ہی کیا ہے میرے ساتھ ابا۔" میرا لہجہ روہانسا تھا۔ مجھے ساری ڈانٹ اور مار یاد آئی جو بچپن سے لے کر اب تک میں نے ابا سے کھائی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے میں آپ کی سگی اولاد ہی نہیں آپ نے کبھی مجھ سے پیار نہیں کیا۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے ایسے گھر میں رہنے کا۔ آپ کو مبارک ہو آپ کا گھر۔ میں جارہا ہوں آپ کا یہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے۔" میری آواز میں پہلے دکھ اور پھر غصہ شامل ہوگیا۔ ابا کا رویہ دیکھ کر اتنا شدید غصہ حاوی ہوگیا تھا دماغ پر کہ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہوکر رہ گئی تھیں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا بول رہا ہوں۔

"ہاں ہاں جاؤ چلے جاؤ تم جیسی نافرمان اولاد کو میں مزید برداشت نہیں کرسکتا اپنے گھر میں۔ چار دن میں زمانے کی ٹھوکریں کھاؤ گے ناں تو پھر گھر کی یاد آئے گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا دوبارہ کبھی پلٹ کر ادھر کا رخ مت کرنا کیونکہ آج کے بعد اس گھر کے دروازے تمہارے لیے بند ہوچکے ہیں ہمیشہ کے لیے۔ جاؤ دفع ہوجاؤ۔" ابا دھاڑے تھے اور ان کی اونچی آواز سن کر تمام بہن بھائی کمرے کے دروازے میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن ان سب میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کمرے کے اندر ہی داخل ہوسکتے۔

اور ابا کی یہ بات تو تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ میں نے میز کو ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور تیزی سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ میرے اندر غم وغصے کا طوفان برپا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے بس اتنا چاہتا تھا کہ اس گھر میں اب ایک منٹ بھی نہیں ٹھہرنا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے بیگ نکالا اور اس میں اپنے کپڑے رکھنے لگا کہ اتنے میں میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور کامران، ردا اور ندا داخل ہوئے۔ کامران نے میرے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"بھیا! پلیز یہ کیا کررہے ہیں آپ؟ ابا تو غصے میں ہیں آپ ہی کچھ ضبط کریں۔ یوں گھر چھوڑ کر مت جائیں۔" اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

"نہیں کامران! میں مزید ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ بہت ضبط کرلیا میں نے اب اور نہیں۔" میں تیزی سے اپنے دو چار جوڑے بیگ میں ڈالتا رہا۔

"بھیا! پلیز مت جائیں۔" ندا نے کہا تو میں نے اس کی طرف رخ کیا وہ رو رہی تھی۔

"دیکھو گڑیا! مجھے جانا ہی ہوگا۔ تم رو مت میں ہمیشہ کے لیے تھوڑی جارہا ہوں جب ابا کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو واپس آجاؤں گا۔" ندا اور ردا کے آنسو دیکھ کر مجھے اپنا لہجہ نرم کرنا پڑا ورنہ یہ بات تو میں بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ابا کبھی بھی

اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹیں گے اور اس صورت میں میرا دوبارہ اس گھر میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجھ میں اب مزید حوصلہ نہیں تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں کی التجائیہ نظروں کا سامنا کرتا۔ اس لیے میں نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر ذیشان اور آرزو کھڑے تھے وہ دونوں ابھی چھوٹے تھے لیکن بہر حال رویوں کی زبان تو سمجھ ہی لیتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ان دونوں کو پیار کر کے بغیر ادھر ادھر دیکھے میں اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل آیا۔ پیچھے میرے بہن بھائیوں کی التجائیں تھیں لیکن میں نے اپنے کان بند کر لیے کیونکہ اگر مزید سنتا تو شاید نہ نکل پاتا اور اگر اب بھی اس گھر سے نہ نکل پاتا تو کبھی ابا کے آگے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کے قابل نہ رہتا۔

❁ ❁ ❁ ❁
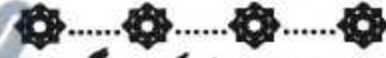
صبح ہوتے ہی وہی معمول کی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ فجر کے وقت الارم کی آواز سے آنکھ کھلتی ہے اور نماز کی ادائیگی کے بعد پھر سے سو جاتا ہوں۔ پھر آٹھ بجے اٹھتا ہوں اور تیار ہو کر آفس چلا جاتا ہوں۔ ناشتہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے جو بنانا نہ پڑے یعنی کبھی دودھ کا گلاس پی لیا یا کبھی فروٹ کھا لیا۔ میں نے کبھی بھی خود کو کسی اسپیشل چیز کا عادی نہیں بنایا۔ زندگی کے کئی سال میں نے اکیلے گزارے ہیں بلکہ اب بھی گزار رہا ہوں۔ نخرے وہاں ہوتے ہیں جہاں کوئی نخرے اٹھانے والا ہو۔ اور میں نے بھی اس گھر میں بھی نخرے نہیں اٹھوائے جہاں میری زندگی کے ابتدائی اٹھارہ سال گزرے ہیں۔ حالانکہ تب تو ماں بھی موجود تھی جو اولاد کے ہر طرح کے نخرے برداشت کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس تنہا زندگی کا آسانی سے عادی ہو گیا ہوں۔

اس گھر کو چھوڑے ہوئے مجھے دس سال ہو گئے ہیں۔ یہ لفظ دس سال کہنے کو بہت آسان ہے لیکن میں نے یہ دس سال گزارے ہیں بالکل اکیلے بغیر کسی سہارے کے، کسی رشتے اور بغیر کسی محبت کے۔

اس گھر کو بغیر سوچے سمجھے چھوڑ کر تو آ گیا لیکن آگے کا لائحہ عمل طے کرنا آسان نہ تھا۔ میری جیب میں اس وقت چند سو روپے تھے جس سے ایک نئی زندگی کی شروعات ناممکن تھی۔ لیکن یہ طے تھا کہ مجھے لوٹ کر نہیں جانا۔

اسد میرا کالج کا دوست تھا فی الوقت مجھے اسی کے گھر جانا مناسب لگا۔ میرا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ لیکن اسد امیر کلاس سے تعلق رکھتا تھا سو اس کے لیے مجھے اپنے ساتھ رکھنا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن میں نے اس سے صرف چند دن اس کے گھر رہنے کی اجازت طلب کی۔

زندگی ایک دم سے بہت مشکل لگنے لگی تھی۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے کوئی ذریعہ معاش ہونا ضروری تھا میں اس وقت تھرڈ ایئر میں تھا اور اپنی تعلیم کے معاملے کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ کالج گورنمنٹ کا تھا سو تعلیم کا خرچ اتنا زیادہ نہ تھا لیکن دیگر ضروریات زندگی کے لیے بھی بھاگ دوڑ کرنی ہی پڑتی تھی۔ ایک ایف اے پاس شخص کو کوئی بھی معقول نوکری ملنا مشکل تھا۔ میں نے بھی بہت سے اداروں میں کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ پھر اسد نے میری مایوسی دیکھتے ہوئے ہوم ٹیوشنز کا مشورہ دیا۔

اسد کی بہن کے دو بچے تھے۔ بیٹا تھری اور بیٹی فورتھ کلاس میں۔ انہوں نے اسد سے ہوم ٹیوشن کے لیے کہا تو اسے میرا خیال آیا اور یوں میں نے ہوم ٹیوشنز کا آغاز کیا۔ اسد کی بہن کے گھر کے علاوہ اور بھی تین، چار جگہوں سے ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیں یوں زندگی کچھ سہل ہوئی۔

ٹیوشن کے سہارے میں نے اپنا بی اے مکمل کیا اور یہ سارا عرصہ میں نے اسد کے گھر گزارا۔ اس نے ایک سچا دوست ہونے کا ثبوت دیا اور ایک دن بھی مجھے اپنے دست نگر ہونے کا طعنہ نہ دیا۔ لیکن میری انا نے یہ گوارہ نہ کیا کہ میں اپنے دوست پر بوجھ بنا رہوں۔ اس لیے میں نے اسے کرائے کے طور پر کچھ رقم دینا چاہی جس سے وہ بہت ناراض ہوا اور رقم لینے سے انکار کر دیا اور یوں میں نے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ اسد کے گھر گزارا۔

بی اے کے بعد مجھے قدرے بہتر نوکری مل گئی تو میں نے اسد کا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں رہنے کو ترجیح دی۔ اسد اس بات پر راضی نہ تھا مگر میرے حتمی فیصلے پر اس کو قائل ہونا ہی پڑا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

نو سے پانچ کی جاب اور ایوننگ کلاسز میں ایم بی اے کرنا۔ زندگی میرے لیے ان دنوں جہد مسلسل کا ہی نام تھا۔ لیکن میں نے محنت جاری رکھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے اپنے لیے خود ہی کرنا ہے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا کہ میں اکیلا ہوں اور مجھے اکیلے ہی رہنا ہے لیکن کسی نے میرے اندر ایک سے دو ہونے کی خواہش پیدا کرنی شروع کردی تھی۔

وہ رابیل ناز تھی جو آہستہ آہستہ میرے حواسوں پر چھانے لگی تھی۔ میری زندگی میں ایک لگی بندھی روٹین تھی۔ صبح آفس اور شام کو ایم بی اے کی کلاسز لیکن آفس کے بعد کا ایک گھنٹہ فری ہوتا تھا۔ جو میرا روم میں ہی گزرتا تھا۔ میرا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ کیونکہ میری زندگی میں فارغ وقت نہیں تھا۔ لیکن اس ایک گھنٹے میں میں بور ہوجایا کرتا تھا ایک دن میں کمرے کی کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوا۔

یہ کھڑکی ہمارے ہاسٹل کی بیک سائیڈ پر کھلتی تھی۔ اس طرف آبادی والا علاقہ تھا جب کہ ہاسٹل کی اگلی جانب کمرشل ایریا تھا۔ اس ہاسٹل میں مجھے دو مہینے ہوچکے تھے لیکن آج تک کھڑکی میں کھڑے ہوکر ارد گرد دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ابھی بھی میں نے سرسری سی نگاہ دوڑائی۔

آبادی کا علاقہ تھا کئی لوگوں کے صحن نظر آرہے تھے کیونکہ میں ہاسٹل کی دوسری منزل کے کمرے میں رہائش پذیر تھا۔ بور ہوکر میں نے نگاہ ہٹائی اور دوبارہ سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا اور پھر کلاس میں جانے کے لیے مقررہ وقت پر ہی اٹھا۔ اگلے دن پھر اسی وقت غیر ارادی طور پر کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوا۔

سامنے کی چھت پر ایک لڑکی کپڑے پھیلا رہی تھی۔ میری طرف اس کی کمر تھی دوپٹہ اس نے ایک طرف کندھے پر ڈال رکھا تھا اس لیے اس کے لمبے بال سامنے نظر آرہے تھے۔ جب وہ بالٹی سے دوسرا کپڑا اٹھانے کے لیے مڑی تو میں مبہوت رہ گیا۔ کائنات گویا رک گئی تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ میں نے شاید اس سے پہلے کبھی اتنی حسین لڑکی نہ دیکھی تھی یا شاید میں نے کبھی کسی لڑکی کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اتنی کہ بیان کے لیے شاید مجھے الفاظ بھی نہ مل سکیں۔ میں اس کی ایک جھلک میں کھویا رہا اور مجھے پتہ بھی نہ چلا اور وہ وہاں سے چلی بھی گئی۔ کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو وہاں کوئی نہ تھا وہ جا چکی تھی۔ میں نے یک دم کھڑکی بند کی اور اپنے حواسوں کو دیکھا۔

”یہ مجھے کیا ہوگیا تھا“ میں نے خود سے سوال کیا۔ لیکن اس کا جواب میرے پاس بھی نہ تھا شاید۔ میں نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی جدوجہد میں اس قدر مصروف تھا کہ کبھی ارد گرد دھیان ہی نہ رہا تھا اور اب جب دیا تو سارا دھیان ہی کہیں چلا گیا۔ بہرحال وقت تیزی سے گزرنے کا احساس ہوا تو میں نے یونیورسٹی کا رخ کیا۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے میں روزانہ کھڑکی میں ایک گھنٹہ کھڑا رہتا لیکن میں اسے نہ دیکھ پایا۔

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہوگیا تھا آفس میں بھی تمام وقت غیر حاضر رہتا جس کی وجہ سے تین بار باس کی ڈانٹ بھی کھا چکا تھا۔ لیکن دل کا اضطراب اور بے چینی ختم ہونے میں نہ آرہی تھی۔ شاید وہ نظر آجاتی تو اس اضطراب میں کچھ کمی آجاتی۔ اتنے دن کی بے چینی مجھے یہ سمجھا چکی تھی کہ مجھ پر وہ رات گزر چکی ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ اور محبت بھی وہ جسے پہلی نظر کی محبت کہا جاتا ہے۔ پورے سترہ دن میں مسلسل ایک گھنٹہ کھڑکی میں کھڑا ہوتا لیکن وہ نظر نہ آئی بالآخر اٹھارویں دن میں نے پھر سے اسے دیکھا۔ وہ چھت پر موجود تھی جب میں نے کھڑکی کھولی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جس کے ساتھ وہ باتیں کررہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر ہوش حواس سے بے گانہ ہوکر اسے دیکھے گیا۔ وہ اپنی ساتھی لڑکی سے باتوں میں مگن تھی کہ اچانک چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شاید اسے نظروں کا ارتکاز اپنے چہرے پر محسوس ہوچکا تھا۔ میں چونکہ اونچائی پر تھا سو اسے نظر نہ آسکا وہ پھر سے اس لڑکی کے ساتھ باتوں میں مگن ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئیں اور میں بے بسی کے ساتھ وہیں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میری راتیں جو ماضی کی تلخ یادوں کے سنگ گزرا کرتی تھیں وہ اس کے حسین وجود کے تصور سے آباد ہوگئی تھیں جس کے نام تک سے بھی وہ واقف نہ تھا۔

پھر کچھ دن اسی کیفیت میں گزر گئے کہ آنکھیں دیدار کے لیے بے تاب تھیں اور وہ گوہر مقصود دکھائی نہ دیتا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھا۔ ایک دن میں یونہی چہل قدمی کے ارادے سے ہاسٹل سے باہر نکل آیا۔ طبیعت پر عجیب بے زاری سی طاری تھی۔ شام کے ساڑھے پانچ کا وقت تھا اور سورج اپنے دن بھر کے سفر کو طے کر کے شام کے حصے میں داخل ہو چکا تھا۔ اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں چھایا تھا میں سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ مین روڈ نہیں تھی سو رش بھی اتنا نہ تھا۔ کہ مجھے وہ نظر آئی اس کے ساتھ وہی اس دن والی لڑکی تھی جس کے ساتھ وہ چھت پر کھڑی باتیں کر رہی تھی۔

ایک لمحے کو تو میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا لیکن جب اسے سڑک کا موڑ مڑ کر گلی میں جاتا دیکھا تو ایک دم خود بھی ادھر کا رخ کیا۔ مجھے لگا کہ یہی صحیح موقع ہے۔ گلی کے اندر داخل ہو کر میں تیز قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا ان کی رفتار اتنی زیادہ نہ تھی۔ گلی کے آدھے حصے میں پہنچ کر میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ایکس کیوزمی!'' میں نے شائستگی سے مخاطب کیا۔

''جی؟'' اس کی ساتھی لڑکی نے مڑ کر استفسار کیا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں استعجاب تھا اور میں ہونق پن سے ان کی شکلیں دیکھنے لگا کہ اب آگے کیا کہوں۔

''کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟'' جلد بازی میں میں نے غلط سوال کر دیا اور پھر پچھتایا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہوں گی کہ میں راہ چلتی لڑکیوں کے نام پوچھتا پھرتا ہوں۔ ان کی طرف دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں کی آنکھوں میں ناراضگی کی واضح جھلک تھی۔ میری مخاطب ''وہ'' تھی جس کا میں نے نام جاننا چاہا تھا لیکن ناگواری کی لہر دونوں کے چہرے پر تھی۔

''دیکھیے پلیز غلط مت سمجھیے۔ میں...... اصل میں مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیسے بات کروں۔'' میرے لہجے میں واضح لرزش تھی لیکن میں نے بات جاری رکھی کیونکہ اگر آج موقع ضائع کر دیتا تو پھر شاید موقع نہ ملتا۔

''اصل میں اس ہاسٹل میں رہتا ہوں جو کہ آپ کے گھر کی بیک سائیڈ پر ہے۔ میں نے آپ کو اپنے روم کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ آپ...... آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

میں نے جلدی جلدی جو سمجھ آ رہا تھا کہہ دیا اور پھر اس کے تاثرات جاننے کے لیے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میری آنکھوں کے اشارے سے سمجھ گئیں تھیں کہ میری مخاطب ان دونوں میں سے کون ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ازحد حیرانگی لیے میری طرف دیکھا۔

''کیا اب میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟'' اب کے میرے لہجے میں شوخی نمایاں تھی۔

''رابیل ناز......'' اس نے اسی انداز میں یک دم سے اپنا نام بتا دیا جب کہ فٹافٹ نام بتا دینے پر اس کی ساتھی کی آنکھوں میں واضح ناگواری کی لہر آئی تھی۔ جب کہ میں اس کا نام سن کر مسحور رہ گیا۔

''آپ کا نام بھی آپ کی طرح بہت خوب صورت ہے۔'' میری تعریف کرنے پر وہ پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ جب کہ اس کی دوست کے چہرے پر ناگواری واضح دیکھی جا سکتی تھی۔

''اصل میں مس رابیل! یہاں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔ کیا مجھے آپ کا فون نمبر مل سکتا ہے؟'' مجھ میں جانے اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر بات کر رہا تھا اور پھر ڈائریکٹ نمبر بھی مانگ لیا۔

''اے مسٹر یہ کیا طریقہ ہے یوں سڑک پر کھڑے ہو کر کسی انجان لڑکی سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ آپ شرافت کا ثبوت دے رہے ہیں کیا؟ اور آپ کے خیال میں ہم راہ چلتے شخص کو اپنے نمبر بانٹتی پھرتی ہیں؟ اور رابی تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ یوں کوئی بھی بندہ تم سے پوچھے گا اور تم اسے اپنا نام اور نمبر بتا دو گی؟ چلو یہاں سے۔'' بالآخر اس کی ساتھی لڑکی اپنی ناپسندیدگی کو مزید نہ چھپا سکی اور ہم دونوں پر ہی الٹ پڑی۔ اس نے رابیل کا ہاتھ تھاما اور چلنے لگی جب کہ میں نے بوکھلا کر پھر سے انہیں مخاطب کیا۔

''دیکھیے محترمہ! میں کوئی ایسا ویسا بندہ نہیں ہوں اور سڑک پر کھڑے ہو کر نام اور نمبر مانگنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ان کی بابت دریافت کرنے کا۔'' سنجیدگی سے وضاحت کرنے کے بعد میری آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔

''او کے! آپ میرا نمبر نوٹ کریں۔'' رابیل نے توجہ سے میری بات سننے کے بعد مجھے اپنا نمبر نوٹ کروایا۔ جب

کہ اس کی دوست بے یقینی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"اب ہم چلتے ہیں اللہ حافظ۔" جلدی سے نمبر نوٹ کروا کر اس نے تیزی سے اپنی دوست کا ہاتھ پکڑا اور واپس مڑ گئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟ ایک انجان شخص کو اپنا نمبر دے دیا؟"

"ثناء! یار گھر چل کر بات کرتے ہیں ناں!" اس کی دوست نے کہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولی اور اسے خاموش رہ کر چلنے کے لیے کہا۔ میں ابھی تک وہیں کھڑا ان دونوں کو دور جاتے دیکھ رہا تھا۔

مجھ پر ایک سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ واپس اپنے روم کی طرف جاتے ہوئے میں حیرانگی سے سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی میں اس کا نام جان چکا ہوں اور اس سے رابطے کا ذریعہ بھی بن چکا ہے لیکن میرے موبائل میں فیڈ نمبر میری بے یقینی کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔

اسی شام یونیورسٹی سے واپسی پر میں نے اسے فون کر لیا۔ اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس نے اپنے بارے میں سب کچھ مجھے بتا دیا اور یہ بھی کہ وہ مجھے دیکھ کر اسی جذبے کا شکار ہوئی ہے کہ جس میں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ہماری روز ہی بات ہونے لگی۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے ایک یا دو گھنٹے رابی سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اور sms تو ہم ہر وقت ہی ایک دوسرے کو بھیجتے رہتے تھے۔ جب مجھے اسے دیکھنا ہوتا تو میں اسے میسج کر دیتا کہ چھت پر آؤ اور پھر کھڑکی میں کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے۔ میں نے بھی اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ بس یوں ہی ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہوئے تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے۔

ایک دن مجھے رابیل کا میسج موصول ہوا۔ اس نے مجھے ملنے کو کہا تھا۔ چھ ماہ سے ہم لوگ بات کر رہے تھے لیکن کبھی بھی ہم یوں باہر ملے نہیں تھے سو مجھے حیرانگی ہوئی اور میں نے اس کی وجہ بھی پوچھ لی تو اس نے بتایا۔

"کوئی ضروری بات ہے اور ہمارا ملنا بہت ضروری ہے۔" سو میں نے ملنے کی ہامی بھر لی اور اگلے دن ایک قریبی کیفے میں ہماری ملاقات ہوئی۔

وہ بہت پریشان تھی اس نے مجھے بتایا کہ اس کے والد نے اس کا رشتہ اچانک طے کر دیا ہے۔ اپنے کسی کزن کے بیٹے سے۔ جس سے وہ صرف نام کی حد تک واقف ہے۔ میں جو اسے صرف اور صرف اپنا مان چکا تھا اور اسے اپنا بنانا چاہتا تھا اس صورت حال پر شاک رہ گیا۔ لیکن میں نے اسے حوصلہ دیا اور یقین دلایا۔

وہ صرف میری ہے اور میں اسے کسی اور کا ہونے نہیں دوں گا۔ لیکن تقدیر وہیں کھڑی میرے یقین کو غلط ثابت کر رہی تھی۔

بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے رابی کے لیے اپنا رشتہ بھیجنا چاہیے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ رشتہ لے کر جائے گا کون؟ بہت سوچنے کے بعد مجھے اسد کا خیال آیا اور آج تقریباً ایک سال کے بعد میں نے اسے کال کی۔

پہلے تو مجھے اس سے بہت سی باتیں سننی پڑیں اس بے وفائی پر کہ میں نے پھر مڑ کر اس کی خبر بھی نہ لی لیکن میں نے اپنی مصروفیات کا بتا کر مطمئن کر دیا۔ اور پھر اپنا مسئلہ بیان کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے والد کو تیار کرے کہ وہ میرا رشتہ لے کر جائے۔ اسد نے مجھے یقین دہانی کرائی کہ ایسا ہی ہو گا۔ اس نے اپنے والد کو کیسے تیار کیا یہ ایک الگ کہانی ہے لیکن وہ راضی ہو گئے کیونکہ جو ڈیڑھ سال میں نے ان کے گھر گزارا تھا وہ میرے کردار سے اچھی طرح واقف تھے سو اسد کے والد میرے رشتے کے لیے رابیل کے ہاں گئے لیکن رابیل کے والد نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے اور یہ کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اسد کے والد نے انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے تو ان کو مایوس لوٹنا پڑا۔

اور اس سے بڑی قیامت مجھ پر تب ٹوٹی جب رابی نے مجھے روتے ہوئے فون کیا اور کہا کہ اس کے والدین نے پندرہ دن کے اندر اس کی شادی کی تاریخ رکھ دی ہے۔ میں تقدیر کی ستم ظریفی پر بے بسی کی تصویر بنا کھڑا رہا اور رابی کسی اور کی بنا دی گئی۔

رابی کی شادی کے دن مجھے ہوش نہ تھا اور ہفتہ بھر میں بخار سے بے سدھ پڑا رہا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ رابی کو کھو دوں گا وہ میرے زندگی میں اور میرے دل میں

آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ اسد نے کہا کہ اسے بھول جاؤ لیکن اسے بھولنا آسان نہ تھا۔ زندگی سے میرا جی اچاٹ ہوگیا تھا۔ پھر اسد نے مجھے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا سچ ہے کہ اچھے دوست بھی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔

شاعری سے تو مجھے پہلے بھی لگاؤ تھا لیکن اس کیفیت میں تو اور ہی شغف پیدا ہوگیا۔ میرے سیل فون کے ذریعے بہت سے دوست بن چکے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ لڑکے تھے یا لڑکیاں کیونکہ میں نے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔ صرف میسجز اور وہ بھی اچھی اچھی شاعری کے۔ اگر کوئی شاعری سے ہٹ کر بات کرتا تو میں اس سے رابطہ ہی ختم کر دیتا۔

ثانیہ وہ واحد لڑکی تھی جس سے میں نے شاعری سے ہٹ کر بات کی۔ میری اس سے کافی اچھی بات چیت ہوگئی تھی۔ موبائل نیٹ ورکس کے سستے پیکجز کی بدولت یہ سب کتنا آسان ہو چکا ہے۔ اس سے سب اچھی طرح واقف ہیں۔ میری بھی اس سے لمبی بات چیت ہونے لگی لیکن جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ ایک مختلف راستے پر چلنے لگی ہے۔ جب کہ میرے لیے رابی کے علاوہ کسی کے بارے میں اس طرح سوچنا ناممکن تھا سو میں نے اسے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ آگے بڑھتی ہی چلی گئی سو مجھے اس سے رابطہ ختم کرنا پڑا۔

اس کے بہت مجبور کرنے پر میں اسے اپنی تصویر بھی بھیج چکا تھا اور وہ بقول اس کے میری محبت میں بہت آگے بڑھ چکی تھی لیکن میرے لیے چونکہ اسے کچھ بھی دینا ناممکن تھا سو میں نے اس سے قطع تعلق کرلیا لیکن وہ پھر بھی میسجز بھیجتی رہتی تھی اور آخر میرے جواب نہ دینے پر اس نے بھی رابطہ ختم کردیا۔ میرے پھر سے وہی لیل و نہار تھے۔

ثانیہ کے رابطہ ختم ہونے کے ڈیڑھ سال بعد تقریباً اس جیسی ایک اور سرپھری سے میرا پالا پڑا۔ بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ سرپھری تھی۔ چاہے کوئی لڑکا ہو یا لڑکی مجھے صرف اچھی شاعری چاہیے ہوتی تھی اور اس کے علاوہ میں کسی سے بات نہیں کیا کرتا تھا۔ سدرہ حیدر سے رابطہ بھی اسی سلسلے میں ہوا تھا وہ بھی ایک رانگ کالر کے طور پر میرے موبائل پر ایڈ ہوئی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مجھ میں دلچسپی لینے لگی۔

ثانیہ والے تجربے کے پیش نظر سدرہ کو میں نے پہلے ہی اپنے اور رابی کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن وہ عجیب ہی لڑکی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ رابی کا مجھ سے اب کوئی تعلق نہیں سو مجھے اس کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ میں اسے کہتا کہ یہ آسان نہیں لیکن وہ مجھے کوشش کرنے پر مجبور کرتی رہی۔ تنگ آکر میں نے اسے ثانیہ کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر اس نے کسی اور حوالے سے میرے میں دلچسپی کا اظہار کیا تو اس کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو ثانیہ کے ساتھ ہوا۔ یعنی میں اس سے بات کرنا ترک کردوں گا۔

ان دنوں میرا ایم بی اے مکمل ہوئے تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے اور مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب بھی مل چکی تھی۔ ایک ٹف روٹین کے باعث اس سے بات کرنا بہت مشکل تھا جب کہ وہ مجھے مجبور کرتی کہ میں اس سے کال پر ضرور ہی بات کروں۔ کبھی کبھی تو میں کر بھی لیتا اور کبھی ٹال دیتا۔ اکثر اس کی وجہ سے مجھے اپنا موبائل آف رکھنا پڑتا کیونکہ وہ بہت زیادہ میسجز کیا کرتی تھی اور اگر میں جواب نہ دیتا تو کال پر کال کرتی جاتی اور مجبوراً مجھے موبائل آف کرنا پڑتا۔

میرے ہزار روکنے اور احتیاطی تدابیر کے باوجود اس کی مجھ میں دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ میں اسے اپنے بارے میں جو بھی بتاتا وہ یقین کرتی جاتی کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ وہ کبھی میری کسی بات کو جھوٹ مان ہی نہیں سکتی۔ وہ بہت شدت پسند لڑکی تھی اور اس کی شدت پسندی روز بروز بڑھتی جارہی تھی جس پر بند باندھنا میرے لیے مشکل ہوتا جارہا تھا۔ پھر سدرہ نے اپنی بیسٹ فرینڈ ثوبیہ سے بات کروائی۔ ایک اور ٹینشن جو شروع ہوئی کہ اب وہ باتیں جو سدرہ حیدر مجھ سے نہ کہہ سکی وہ اس کی دوست کہنے لگی اور یہ عموماً ایسی باتیں ہی ہوا کرتی تھیں کہ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے اور میں اسے ناراض نہ کیا کروں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ثوبیہ سے کہا کہ وہ سدرہ کو سمجھائے کہ میں اس کا کبھی بھی نہیں ہوسکتا سو وہ میرا خیال اپنے دل سے نکال دے اور بقول ثوبیہ کہ اس نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن سدرہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ میں نے اسے اگنور کرنا شروع کردیا۔ اب میں بھی کبھار ہی اس کے میسج کا جواب دیتا اور کال تو کبھی پک کرتا

ہی نہ تھا۔
اگر میں چاہتا تو اس سے ایک دم رابطہ ختم کرسکتا تھا لیکن ایسا نہ کرنے کی ایک بہت بڑی وجہ تھی اور وہ یہ کہ ثوبیہ نے مجھے بتایا تھا کہ جب جب میں سدرہ کو اگنور کرتا ہوں اس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ اس کی شدت پسندی ہی اس بات کی وجہ ہے کہ میری طرف سے انکار کو برداشت نہیں کرپائی اور اب تو اس کے سائیکاٹرسٹ سے باقاعدہ سیشن چل رہے ہیں۔ اس بات نے مجھے سنجیدگی سے اس سے قطع تعلق پر مجبور کردیا۔ میں اسے ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ چکا تھا اور میرے دل میں بھی اس کے لیے کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ سو میرے لیے یہ نسبتاً آسان تھا لیکن اس کا بھی خیال تھا مجھے۔ سو میں نے آہستہ آہستہ اگنور کرتے کرتے بالکل ہی اس سے رابطہ ختم کردیا لیکن اس سے پہلے جو آخری بات ہوئی وہ اگر نہ ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔

ہوا کچھ یوں کہ جن دنوں میں سدرہ حیدر سے رابطے میں تھا ان ہی دنوں میں رابی سے بھی رابطے میں تھا۔ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ رابی اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی اور اس بات سے میں بہت تکلیف میں تھا۔ رابی سے میں مسلسل رابطے میں تھا۔ ان ہی دنوں میں مس سدرہ حیدر کو اگنور کررہا تھا کہ ایک دن کسی بات پر میری رابی سے تلخ کلامی ہوگئی اور ہماری بات چیت بند ہوگئی۔ شومئی قسمت کہ اسی دن سدرہ نے کئی دنوں کے بعد مجھے گھیر لیا۔ رابی سے لڑائی کا اثر تھا کہ میں سدرہ سے نارمل موڈ میں بات کرتا رہا۔

وہ مجھے کہتی رہی کہ میں اپنے گھر والوں سے راضی ہوجاؤں اور اسے اپنالوں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی والدہ اس پر شادی کے لیے زور ڈال رہی ہیں اور وہ صرف میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ جہاں تک بات تھی گھر والوں سے راضی ہونے کی تو مجھے گھر چھوڑے ہوئے پانچ سال ہوچکے تھے اور چھوٹے بھائی کا ہر دوسرے ہفتے مجھے فون آتا تھا کہ میں گھر واپس آجاؤں لیکن میں ہمیشہ انکار ہی کرتا تھا۔

سدرہ کے اصرار پر میں نے اسے بتایا کہ ''میں گھر والوں سے راضی ہوجاؤں گا اور اس سے شادی بھی کرلوں گا۔ لیکن اس کے لیے مجھے ایک سال چاہیے۔'' یہ سب رابی سے لڑائی کا اثر تھا کہ میں اپنے دل کے خلاف ہی فیصلہ کردیا اسی رات سدرہ مطمئن ہوئی تھی لیکن میں بے چین تھا رات گئے رابی کا فون آیا اور اس نے مجھ سے معذرت کی اور میں نے اسے معاف بھی کردیا۔

اگلے دن صورت حال یہ تھی کہ میں بہت پریشان تھا۔ صرف ایک جملے سے میری پریشانی ختم ہوجاتی تھی لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اسی ایک جملے سے کسی کی ساری زندگی پریشان گزرنے والی ہے۔

''میں تم سے شادی نہیں کرسکتا مجھے بھول جاؤ۔'' میں نے سدرہ حیدر کو یہ میسج کیا اور اپنے تئیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل آیا۔ اس کے بعد اس کے میسج پر میسج آئے پر میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔

آج جب سوچتا ہوں تو یہ کل کی ہی بات لگتی ہے۔ لیکن اس سب کو گزرے بھی پانچ سال ہوگئے۔ گھونسلے سے اڑے پنچھی نے پھر بھی واپسی کا رخ نہیں کیا۔ مجھے گھر سے نکلے دس سال ہوگئے۔ کامران' ردا اور ندا کی شادیاں ہوگئیں۔ ان سب نے مجھے بہت بلایا لیکن میں پلٹ کر نہیں گیا۔ اور پچھلے سال ذیشان کا نکاح ہوا تو اس نے مجھے فون کیا لیکن میں نے اسے بھی انکار کردیا۔ اس کے بعد کسی نے مجھے کال نہیں کی۔ سب نے مجھے بلایا تھا جس انتظار میں میں تھا میرا وہ انتظار انتظار ہی رہا۔ زندگی کی اٹھائیس بہاریں دیکھ چکا ہوں لیکن یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ اٹھائیس سال نہیں بلکہ اٹھائیس صدیاں ہوں۔ اب تو میں اس اکیلے پن کا بہت حد تک عادی ہوچکا ہوں۔

رابیل ناز سے رابطہ بھی میں نے خود ختم کیا۔ کیونکہ مجھے بہت بعد میں یہ احساس ہوا کہ میں خوش نہیں اور میں اپنا گھر نہیں بنا سکا تو کم از کم اسے اس کا بنا بنایا گھر تو بسانے دوں۔ سو میں نے اسے چھوڑ دیا لیکن دل سے نہیں نکال سکا۔ دل میں کہیں کہیں خیال ہے ثانیہ کا بھی لیکن اس سے زیادہ خیال آتے ہیں سدرہ حیدر کے۔

آج پھر پارک میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر اسی بینچ پر پڑی لیکن وہ وہاں موجود نہ تھی۔ میں کچھ دیر روش پر چہل قدمی کرتا رہا اور پھر ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے

ہوئے پانچ منٹ ہوئے تھے کہ وہ مجھے آتی دکھائی دی۔ میں اسے باقاعدگی سے دیکھنے کا عادی ہوگیا تھا کہ پہلی نظر میں ہی پتہ چل گیا کہ آج کچھ مختلف ہے اور وہ مختلف کیا تھا اس کے ہاتھ میں موجود بلیک کلر کی ڈائری۔

پہلے وہ ہمیشہ خالی ہاتھ ہوتی تھی۔ وہ آ کر اپنے مخصوص بینچ پر بیٹھ گئی اور سامنے کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے لگی۔ میں اسی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس نے میری طرف پلٹ کر دیکھا۔ میں مسلسل اسی کی طرف دیکھتا رہا۔ میری طرف دیکھتے دیکھتے اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈائری بینچ پر رکھی اور اٹھ کر چل دی۔ میں حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیا وہ یہ چاہتی تھی کہ میں وہ ڈائری اٹھالوں؟ اس کے طرز عمل سے تو یہی لگتا تھا۔

میری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا وہ پارک کے گیٹ سے باہر نکل گئی تو میری نظریں پلٹ کر اس ڈائری پر رک گئیں میں آہستگی سے اٹھا اور جا کر ڈائری اٹھالی۔

ڈائری اٹھاتے ہوئے چور نظروں سے میں نے ارد گرد نظر دوڑائی کہ کوئی متوجہ تو نہیں لیکن کوئی بھی میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ڈائری اٹھا کر میں پارک سے نکل آیا۔ میرے قدموں میں تیزی تھی۔ میں جلد از جلد اپنے فلیٹ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ آخر کیا ہے اس ڈائری میں؟ گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے روم میں گیا اور بے صبری سے ڈائری کھولی۔ وہ تقریباً ساری ہی لکھی ہوئی تھی بس آخر کے چند صفحے خالی تھے۔ بہرحال میں نے پہلا صفحہ کھولا اور نام پر ہی چونک گیا۔ "سدرہ حیدر۔"

میں نے زیر لب وہ نام دہرایا۔ میری بے چینی حد سے سوا ہوگئی۔ دماغ میں سوالات کی بوچھاڑ اٹھی۔

"کہ کیا یہ وہی سدرہ حیدر ہے؟ کیا یہ جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟" اور اسی طرح کے دوسرے کئی سوالات میں نے بے صبری سے اگلہ صفحہ پلٹا۔

ڈائری کیا تھی کہ کسی کی پوری زندگی قلم بند تھی اس میں۔ دو صفحے پر ہی مجھے پتہ چل گیا کہ یہ وہی سدرہ حیدر ہے۔ بہرحال میں پڑھتا گیا۔ شروع سے اس کی ساری زندگی رقم تھی۔ مختصر یہ تھا کہ وہ تین بہنیں اور دو بھائی تھے اور وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ بہت حساس تھی اور بہت سی ایسی باتوں کو بھی محسوس کرجاتی تھی کہ جنہیں

کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ بہت سادہ تھی اور اس کے شوق بھی بہت محدود قسم کے تھے اسے کسی سے بھی زیادہ توقعات نہ تھیں لیکن جو بہت کم توقعات تھیں وہ بھی کبھی پوری نہ ہو کر ہمیشہ دکھ ہی دیتی تھیں۔

وہ کوئی بہت ہی ذہین قسم کی اسٹوڈنٹ نہ تھی بس پاسنگ مارکس ہی لیا کرتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت بھی نہ تھی اسے اپنے بس قبول صورت ہی ہونے پر بھی کوئی احساس کمتری نہ تھا۔ اس نے گریجویشن تک ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور جب وہ تھرڈ ایئر میں تھی تو تب اس کا مجھ سے رابطہ ہوا تھا۔ مجھے چونکہ ڈائری کے شروع سے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ وہی سدرہ ہے سو یہاں پر آ کر میں چونکا نہیں۔ شروع میں اسے مجھ سے ہمدردی ہوئی کہ میں اکیلا رہتا ہوں۔ میرے میری فیملی سے کلیشز ہیں اور مجھے محبت میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ یہ محض ہمدردی نہیں کیونکہ وہ یہ چاہنا شروع ہو گئی تھی کہ میں ہر وقت اس سے رابطے میں رہوں اور یہ کہ میں کسی اور لڑکی سے بات نہ کروں۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ اسے آہستہ آہستہ رابی کا ذکر بھی ناگوار گزرنے لگا تھا۔

یہ سب باتیں اس سمت اشارہ کرتی تھیں کہ اسے محبت ہو گئی ہے اور وہ بھی ایسے شخص سے جو اس سے ایسا کوئی سلسلہ چاہتا ہی نہیں۔ ان دنوں اس کی دوسری بہن کی شادی ہوئی تھی اور اب سافیہ اس کا نمبر تھا اور اسے لگا کہ اس کی بے قراریوں سے مجھے یہ اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ معاملا گڑبڑ ہے سو اس لیے میں اسے اگنور کرنے لگا تھا۔

اس نے اپنی دوست کو میرے بارے میں بتایا کہ وہ مجھ سے بات کرے کیونکہ وہ لڑکی ہو کر خود سے اسے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ فطرتاً وہ ایک شرمیلی اور دبو قسم کی لڑکی تھی۔ اس کی دوست نے مجھ سے بات کرنے کے بعد اسے سمجھایا تو اسے یہ اچھا نہ لگا اور اس کی اپنی دوست سے تلخ کلامی ہو گئی۔ بہر حال اس کے لیے یہ بات بہت اذیت کا باعث تھی کہ میں اب اس سے بات نہیں کرنا چاہتا چونکہ وہ بہت حساس تھی سو یہ برداشت نہ کر سکی اور اسے سائیکولوجیکل اٹیک ہونے لگے۔

اس کے سائیکاٹرسٹ سے سیشن ہونے لگے اور طویل علاج چلنے لگا۔ ان دونوں جب علاج کی بدولت وہ کچھ بہتری کی طرف راغب تھی کہ اس کی مجھ سے طویل گفتگو ہوئی اور وہ بہت خوش تھی کہ وہ مجھے راضی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اتنی خوش تھی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی اس نے اپنی دوست سے بھی اپنی خوشی شیئر کی۔

اس کی خوشی کو گھر والوں نے بھی محسوس کیا لیکن وہ ٹال گئی اور گھر کے افراد سمجھے کہ یہ علاج کی بدولت بہتری واقع ہوئی ہے لیکن اگلے ہی دن اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ جب اس نے میرا پیغام پڑھا کہ ''میں تم سے شادی نہیں کر سکتا مجھے بھول جاؤ۔'' وہ مجھے میسج اور کال کر کے تھک گئی لیکن میں جواب نہ دیا اور کال پک نہ کرتا۔

اب کے اسے چپ لگ گئی تھی۔ اتنی گہری چپ کہ کوئی بھی اس چپ کا توڑ نہ کر سکا۔ اب اس نے علاج کرانا بھی چھوڑ دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹرز اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے بلکہ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا اور جو کر سکتا ہے وہ کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ اسی خاموشی میں اس نے پانچ سال گزار دیئے۔ ان پانچ سالوں میں کیا کیا نہیں ہو گیا۔

اس کا ایک بھائی جو رہ گیا تھا اس کی بھی شادی ہو گئی۔ گریجویشن کے بعد اس نے کچھ کمپیوٹر کورسز کیے اور ایک کمپنی میں جاب اسٹارٹ کر دی۔ جاب کے ساتھ ہی اس نے پرائیویٹ ایم اے کیا اس دوران اس کی فیملی کی طرف سے اس پر بہت دباؤ رہا شادی کے لیے لیکن اس نے ہاں کر کے نہ دی۔

جب بھائیوں اور والدین کا اصرار بڑھا اور بھابیوں کو بھی بوجھ لگنے لگی تو اس نے اپنی رہائش الگ کر لی۔ فیصل آباد میں رہنے والی سدرہ حیدر نے اسلام آباد میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ ایم اے وہ کر چکی تھی سو اسے اسلام آباد میں ہی جاب مل گئی۔ دو تین جگہوں پر اپلائی کیا اور ایک جگہ سے اسے کال آ گئی۔ گھر والوں نے اس کے اس فیصلے کو قبول نہ کیا۔ گھر میں کمانے والے اور گھر کو چلانے والے بھائی تھے سو والدین کو بھی بھائیوں کے فیصلے کو ہی اولیت دینا تھی۔ بھائیوں کا فیصلہ تھا کہ وہ شادی کر کے اپنے گھر کی ہو جائے اس کا جاب کرنا اور وہ بھی کسی دوسرے شہر میں اور اکیلے رہنا انہیں منظور نہ تھا۔

اسے سب کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے

فیصلے سے پیچھے نہ ہٹی اور عمل کر کے رہی۔ امی کبھی کبھار اس کے پاس آتی تھیں اور کچھ دن رہ جاتی تھیں۔ بھائیوں اور بھابیوں کا رویہ بھی آہستہ آہستہ نارمل ہو ہی گیا۔ پچھلے دو سال سے وہ اسلام آباد میں رہ رہی تھی۔ پہلے ایک سال اس نے ورکنگ ویمن ہاسٹل میں گزارا۔ اسے لوگوں کا اپنی ذات میں انٹرفیئر کرنا بالکل پسند نہ تھا۔ لیکن ویمن ہاسٹل میں ایسا ممکن نہ تھا کہ وہ الگ تھلگ رہ سکتی۔ پھر اس نے اس کالونی میں ایک کمرے کا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ یہ تھی سدرہ حیدر کی داستان زیست جو وہ چاہتی تھی کہ میں جان لوں۔ آخری صفحے پر جو تحریر تھی وہ نئی تھی شاید کل کی کہ جب میں نے اسے مخاطب کیا اور وہ یقیناً میرے لیے ہی لکھی گئی تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں۔ میں کچھ عرصے سے یہ بات نوٹ کر رہی تھی کہ آپ مجھے فوکس کیے ہوئے ہوتے ہیں اور اس بے چینی کو بھی میں نے دیکھا ہے جو آپ کی آنکھوں میں ہوتی ہے اور یہ یقیناً تجسس ہی ہے۔ جو آپ کو میری ذات کے بارے میں ہے۔ آج بالآخر آپ نے مجھے مخاطب کر ہی لیا اور مجھے یہ بالکل پسند نہیں آیا۔ میں نے جب آپ کی طرف دیکھا تو مجھے کچھ عجیب محسوس ہوا جو مجھ سمجھ نہیں آئی کہ کیا تھا۔ جبھی میں خاموشی سے اٹھ کر آ گئی۔ لیکن بعد میں نہ جانے کیوں میرا یہ دل چاہا کہ میں آپ کو سب بتا دوں میں جانتی ہی کہ آپ پھر بھی مجھ سے ضرور پوچھیں گے۔ یہ ڈائری بہت پرانی ہے لیکن اس شخص سے ملنے کے بعد کی ساری روداد اس میں لکھی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میں آپ کو یہ سب کیوں بتا رہی ہوں لیکن بہرحال یہی میرے دل کی خواہش ہے آج کہ میں آپ کو بتا دوں۔''

یہ سب پڑھ کر میری عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ وہیں بیٹھ کر سوچتے ہوئے میں نے صبح کر دی۔ اور فجر کی اذان کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں چونکا۔ لیکن یہ نئی صبح جو طلوع ہوئی تھی وہ میری زندگی کا ایک بہت اہم فیصلہ لے کر طلوع ہوئی تھی اپنے فیصلے پر مطمئن ہوتے ہوئے میں اٹھا اور وضو کرنے چل دیا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی تو واجب تھا جس نے مجھے بروقت فیصلہ کرنے کی ہمت عطا کی۔

❀ ❀ ❀ ❀

''بھابھی! پلیز سامنے دیکھیں۔'' ذیشان ہاتھ میں کیمرہ تھامے التجائیہ انداز میں بولا۔ وہ بے چارہ سدرہ کو کئی بار کہہ چکا تھا لیکن وہ نظریں ہی نہیں اٹھا رہی تھی۔

جی ہاں! سدرہ حیدر جواب سے چار گھنٹے پہلے سدرہ ایشان حیدر بن چکی تھی اور جی ہاں! یہ میں ذیشان صاحب ہمارے چھوٹے بھائی جو کیمرہ تھامے کھڑے ہیں اور جن کا جی ہی نہیں بھر رہا تصویروں سے۔

آپ یقیناً حیران ہو رہے ہوں کہ یہ سب اچانک؟ نہیں یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ اس رات جب میں نے سدرہ کی ڈائری پڑھی تو میرے لیے سوچ کا ایک نیا در وا ہوا۔ میں نے حقیقت پسندی سے سوچا کہ اگر رابیل ناز میری قسمت میں ہوتی تو مجھے مل جاتی اور اگر سدرہ حیدر زندگی میں دوبارہ مجھ سے ٹکرائی ہے تو یقیناً اس میں اللہ کی رضا شامل تھی۔ اللہ کی رضا تھی کہ وہ میری زندگی میں شامل ہو۔ اور یقیناً کامیابی ان ہی کے لیے ہے جو اس کی رضا میں راضی رہتے ہیں۔

باقی سارے مرحلے بھی اتنے آسان نہ تھے لیکن مختصر یہ کہ میں نے اپنے ابو جی کو کال کی اور ان سے معافی مانگی وہ بھی شاید اسی انتظار میں تھے کہ میں رابطہ کروں جب کہ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ وہ پہل کریں۔ پھر مجھے تمام بہن بھائیوں کو بھی راضی کرنا پڑا۔ ان سب میں مجھے دو ہفتے لگے اور جب سب سیٹ ہو گیا تو پھر میں نے ابو سے سدرہ کے بارے میں بات کی۔ ابو تو بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ اس بات پر بہت رنجیدہ تھے کہ میں ابھی تک اکیلا ہوں اور یہ بات ان کے لیے بہت خوشی کا باعث تھی کہ میں ان کی رضا مندی سے شادی کرنا چاہتا ہوں سدرہ کو منانا ایک الگ مرحلہ تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سب مراحل طے ہو گئے اور آج میری زندگی کا انتہائی اہم دن تھا۔ اب سے چار گھنٹے پہلے میرا سدرہ سے نکاح ہوا اور ابھی ہم گھر پہنچے ہیں اور یہاں سب کے ارمان ہی ختم نہیں ہو رہے۔ سمجھا کریں ناں بھئی! آخر کو اتنے سالوں بعد میں واپس آیا ہوں اور ابھی شادی بھی ہے اور میں بھی بہت خوش ہوں بلکہ ہم سب بہت خوش ہیں تو پھر خوشی کو انجوائے بھی تو کرنا ہے ناں! آپ کا کیا خیال ہے؟

عامر زمان عامر

حسن کا جال مکڑی کے جالے کی طرح کم ذہن مردوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے پھر اس میں پھنسنے والے چاہنے کے باوجود بھی اس جال سے نکل نہیں پاتے۔

ایسے ہی کمزور فطرت مرد کا قضیہ، وہ اک حسینہ کے جال میں پھنس گیا تھا

''گاہک اور موت کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا کب آجائے' راہ میں آنکھیں بچھائے صبح سے شام ہوگئی گاہک تو کوئی نہیں آیا مگر یہ فاقہ کشی یونہی جاری رہی تو لگتا ہے موت ضرور آجائے گی۔''

''تو بھی نرا لکیر کا فقیر ہے اگر لمبے روٹ کی کوئی سواری ہاتھ نہیں لگی تو کیا ہوا فارغ خوار ہونے سے تو بہتر ہے اندرون شہر ایک دو شٹری لگا لیتا تیرا آج کا چائے پانی تو آرام سے بن جاتا۔'' اس نے ادھ جلا سگریٹ آخری کش لگا کے اسے پیش کرتے ہوئے اپنائیت سے مشورہ دیا۔

''بات تو تیری سولہ آنے ٹھیک ہے' منحوس سیٹھ کی نئی فراری لے کر خوامخواہ اپنے گلے مصیبت کا پھندا ڈال لیا ہے۔ آج تیسرا دن ہے حرام ہے جو ایک ٹکا بھی کمایا ہو' اپنے بال بچوں کے لیے دال روٹی پوری نہیں ہوتی سیٹھ کی ہوس کی تجوری کہاں سے بھروں؟ میں نے تو ناٹی کو صاف کہہ دیا ہے بس ہفتہ بھر اور دیکھوں گا دھندے میں کچھ بہتری آئی تو ٹھیک ورنہ گاڑی اس کے منہ پر ماروں گا۔''

وہ بجھے ہوئے دل سے گھر جانے کے لیے گاڑی کی طرف بڑھا' سست رفتاری سے مختلف گلیاں عبور کرتے ہوئے وہ مین روڈ پر آ گیا۔ بظاہر اس کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں مگر خیال کہیں اور ہی اٹکا ہوا تھا اچانک اس نے ماڈل ٹاؤن جانے والی سڑک کی طرف اسٹیئرنگ گھما دیا وہ گنجان آباد علاقہ تھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی منزل کی جانب رواں تھا۔ اس کا ذہن انجانے خوف کے خدشات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔

اسٹینڈ پر مکھیاں مارتے صبح سے شام ہوگئی کوئی سواری نہیں ملی ہاتھوں پر ہاتھ دھرے نکما بیٹھ کے دیہاڑی ضائع کرنے سے تو بہتر ہے بندہ کوئی اور کام کرے ڈرائیوری میں کیا رکھا ہے خوانچا فروش اور ریڑھی پر بیٹھ کے سبزی فروخت کرنے والے بھی مجھ سے زیادہ پیسے کما لیتے ہوں گے۔ اچھا بھلا لیدر فیکٹری میں کام لے رہا تھا خوامخواہ ڈرائیوری کا پنگا لے کے لگی لگائی روزی پر خود لات ماردی۔ وہ بڑبڑاہٹ کے انداز میں خود کو کوسنے لگا' ریل بازار سے کلب روڈ کی جانب مڑتے ہوئے تازہ ہوا کھانے اور بیرونی ماحول کا جائزہ لینے کے لیے اس نے ائرکنڈیشنڈ بند کر کے ڈرائیور سائیڈ والا شیشہ نیچے سرکا دیا۔ میوزک سے اکتاہٹ ہونے لگی تو اس نے سوئچ آف کر کے گاڑی کی رفتار میں مزید کمی کردی جس آبادی کے سامنے سے گاڑی گزر رہی تھی اس کے بارے میں زیادہ معلومات تو نہیں تھی اسے ایک دو بار اس علاقے میں وہ سواری چھوڑنے آیا تھا اس سے آگے کون سی سڑک مین روڈ کی طرف جاتی تھی اس کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا۔

پوش علاقہ ہونے کے باوجود سڑک دور تک ویرانی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس نے ایک ڈرنک کارنر کے سامنے بریک لگا کے اندر سے ہی سر باہر نکال کے ایک ادھیڑ عمر باریش شخص کو مخاطب کیا۔

''بھائی صاحب یہ کون سا علاقہ ہے کیا یہ سڑک آگے چل کے مین روڈ پہ چڑھ جائے گی؟'' اس نے پہلے اندر

بیٹھے ڈرائیور کو عجیب نظروں سے گھورا جیسے کسی اور جہاں کی مخلوق راستہ بھٹک کے ادھر آ گئی ہو۔

"بیٹا جہاں تم کھڑے ہو یہ پرانی غلہ منڈی ہے پرانے وقتوں میں یہاں غلہ منڈی ہوا کرتی تھی مگر اب یہ علاقہ گلشن کالونی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی حدود ماڈل ٹاؤن کے اختتام سے ہی شروع ہو جاتی ہے مگر تم نے کدھر جانا ہے کسی دوسرے شہر سے آئے ہو؟"

"نہیں میں اسی شہر کا ہوں' راستے کا پتا نہیں تھا زیادہ کبھی آیا گیا نہیں ہوں ناں اس علاقے میں۔"

"اوہ اچھا ویسے تو کالونی اسٹیل مارکیٹ تک پھیلی ہوئی ہے تھوڑی دور آگے چل کے ریلوے پھاٹک آئے گا وہاں پھاٹک کراس کرو گے تو اسٹیڈیم والی سڑک پر دائیں طرف مڑ جانا وہی روڈ تجھے مین روڈ تک لے جائے گا۔"

"جی بڑی مہربانی۔" اس نے شیشہ بند کر کے ہیڈ لائٹ آن کر دی خاتون کے اشارے پر اس نے پوری قوت سے بریک لگا دی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی فراری ایک دم ساکت ہو گئی۔

"شکل اور حلیے سے تو اچھے گھرانے کی لگتی ہے ہونہہ...... موٹی اسامی لگتی ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"سپر مارکیٹ چلو گے؟"

"جی میڈم! آؤ بیٹھو۔" اس نے آگے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ادب سے کہا۔

"سنو سپر مارکیٹ سے مجھے ڈی بلاک جانا ہے کوئی دو گھنٹے وہاں لگ سکتے ہیں وہاں دعوت ہے۔"

"ڈی بلاک...... میڈم ڈی بلاک تو شہر کے وسط میں ہے واپس آنے تک صبح ہو جائے گی اور پیسے بھی۔"

"جانتی ہوں میں بھی اسی شہر سے ہوں کوئی ولایت سے نہیں آئی آنے جانے میں کتنا وقت لگے مجھے علم ہے کوئی مفت میں تھوڑی لے کر جا رہی ہوں' پیسے کی فکر مت کرو تمہاری سوچ سے بڑھ کے کرایہ دوں گی اور ہاں تیز چلاؤ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔" میڈم کی رعب دار آواز نے اس کے منہ پر چپ کی مہر لگا دی۔

"سنو کیا نام ہے تمہارا تم کچھ بولتے ہی نہیں کیا گاڑی تمہاری اپنی ہے؟"

"جی اسلم...... اسلم نام ہے میرا' یہ گاڑی کسی کی ہے کرائے پر چلاتا ہوں جی۔" اس نے بیک مرر میں ایک نظر اس کی چمکتی آنکھوں میں جھانک کے مختصراً جواب دیا۔

"رکو رکو...... بریک لگانا۔" اس نے ایزی لوڈ شاپ کے سامنے گاڑی کھڑی کرنے کا اشارہ کیا۔

"میرے موبائل میں بیلنس نہیں ہے گاڑی ذرا سائیڈ پر کھڑی کر کے ایک ٹیلی نار اور ایک موبی لنک کا کارڈ پکڑ لاؤ۔" اس نے لیدر کے امپورٹڈ پرس سے پانچ سو ٹکا کا نوٹ نکال کے اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو میڈم!" اس نے کارڈ اور باقی پیسے ہتھیلی پر رکھ کے پیچھے مڑ کے ہتھیلی اس کی طرف لہرائی۔

"یہ تم رکھ لو۔" وہ ہتھیلی سے کارڈ اٹھا کے موبائل میں لوڈ کرنے لگی پیسے اور ہتھیلی اس نے پیچھے کر دی۔

"نہیں میڈم! اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے

مڑ کے دوبارہ وہ پیسے اس کی طرف بڑھا دیئے۔
"ارے کیوں ضد کر رہے ہو رکھ لو اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔"
"ارے واہ اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اتنی ٹپ' میڈم تو حاتم طائی کے خاندان سے لگتی ہے۔" اس نے دل میں سوچتے ہوئے مٹھی بند کر کے پیسے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ سپر مارکیٹ میں ایک ہائی کلاس بیوٹی سیلون کے سامنے اس نے اتارتے ہوئے پوچھا۔
"میڈم کتنا وقت لگے گا سیلون میں اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں کسی قریبی ہوٹل پر بیٹھ کے چائے پیتا ہوں آپ فارغ ہو جائیں تو مجھے بلا لینا۔"
"او کے ٹھیک ہے اپنے موبائل سے میرے نمبر پر مس کال کر دو اور ہاں زیادہ دور مت جانا۔"
"ارے واہ میڈم تو بالکل انگریزی میم بن کے نکلی ہے۔" اسے اپنی آنکھوں پر بالکل یقین نہیں آ رہا تھا بھاری میک اپ نے چہرے کی جھریاں چھپا کے عمر کی نصف دہائی کو کم کر کے چھپا لیا تھا ایک لمحے کے لیے وہ اس کے چہرے سے آنکھیں ہٹانا بھول گیا۔
"اسلم کیا سوچ رہے ہو' گاڑی اسٹارٹ کرو' جلدی چلو۔" میڈم کے مد بھرے الفاظ کی گونج اس کے کانوں میں رس گھولنے لگی وہ ایک دم خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔
"نہیں...... نہیں گھر سے تو کافی دیر سے نکلی ہوئی ہوں بس راستے میں ہوں ہاں...... ہاں بس ڈی بلاک میں انٹر ہو گئے ہیں۔ ہاں...... ہاں ایک منٹ صبر یہ لو ڈرائیور کو سمجھا دو تمہاری بات کروا دی ہوں۔" کسی سے بات کرتے کرتے اس نے فون اسلم کو پکڑا دیا۔
"جی صاحب! ہاں...... ہاں' اچھا اسکول کا کیا نام ہے؟ اچھا ٹھیک ہے کون سی گلی...... اچھا بینک والی گلی' اچھا سمجھ گیا صاحب آپ فکر نہ کریں سمجھو ہم پہنچ گئے' اچھا ٹھیک ہے۔"
بینک والی گلی میں مڑتے ہی اس نے دوسرے بنگلے کے سامنے گاڑی کھڑی کر کے زور سے ہارن بجا کے گویا اپنی آمد کا اعلان کیا تقریباً میڈم کا (ہم عمر) ایک شخص جھٹ سے باہر آ گیا' میڈم کو دیکھتے ہی اس کی دور سے ہی باچھیں کھل گئیں۔ میڈم کی خوشی بھی دیدنی تھی اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کے میڈم اس کے ساتھ اندر چلی گئی وہ دل ہی دل میں قیاس آرائیاں کرنے لگا۔
"ارے میڈم تو کہہ رہی تھی وہاں کوئی دعوت ہے مجھے تو لگتا ہے اس شخص کی علاوہ گھر میں اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اتنے بڑے بنگلے میں سمندر کا سکوت نہ کوئی آواز نہ شور یہ کیسی دعوت ہے۔ ارے چھوڑو مجھے کیا لینا دینا' مجھے تو اپنی مزدوری سے مطلب ہونا چاہیے۔" مزید مغز ماری کرنے کی بجائے اس نے سارے اندازے اور خیال دل سے فوراً جھٹک دیئے اور آرام سے بیٹھ گیا۔
"ہاں بھئی کیا لو گے ٹھنڈا' گرم چائے یا کافی؟" کچھ دیر بعد وہ شخص باہر آیا اور خاطر تواضع کے لیے اس سے پوچھا۔
"صاحب بہت شکریہ' ایک گلاس سادہ پانی بس۔"
"ارے میاں تم تکلف سے کام لے رہے ہو۔" اس نے سگار کا کش لگاتے ہوئے رسانیت سے مسکرا کے کہا۔
"نہیں صاحب بہت شکریہ' چائے کی طلب نہیں ہے تھوڑی دیر پہلے پی ہے۔"
"اچھا میاں تیری مرضی' اچھا میں تمہارے لیے شربت بھجواتا ہوں۔"
تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد میڈم کو دیکھتے ہی وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا' وہ شخص بھی باہر گیٹ تک ان کے ساتھ آیا جو ابھی تک اسلم کے لیے اجنبی تھا۔ گاڑی میڈم کے بنگلے کے سامنے رکی وہ بڑی پھرتی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کے ذرا فاصلے پر ادب سے کھڑا ہو گیا۔
"یہ لو۔" میڈم نے ہرے رنگ کے پانچ نئے لشکارے مارتے ہوئے نوٹ پرس سے نکال کے دیتے ہوئے کہا۔
"میڈم پانچ ہزار...... نہیں میڈم! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" دو ہزار روپے رکھ کے اس نے باقی پیسے واپس کرنا چاہے۔
"ارے کوئی بات نہیں ہے رکھ لو آئندہ کا ایڈوانس سمجھ کے رکھ لو اب لگتا ہے تمہاری گاڑی کی مجھے ضرورت پڑتی رہے گی۔ آئندہ تمہاری ضرورت پڑی تو میں تمہیں کال کر کے بلا سکتی ہوں۔"

''جی بالکل میڈم! کیوں نہیں۔ اسلم تابعدار ہے آپ جب بھی حکم کریں گی میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

گھر کے در و دیوار گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے مگر ایک کمرے کے دروازے سے ملگجی رنگ کی روشنی کی کرنیں باہر آ رہی تھیں۔

''ہونہہ کوثر ابھی تک جاگ رہی ہے۔'' وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا روشنی والے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں کوثر ہمیشہ کی طرح دودھ کے انتظار میں شیر خوار بچے کو اپنے سینے پر لٹائے خالی نظروں سے دروازے کو تک رہی تھی۔

''کوثر! تم سوئی نہیں، تجھے کہا تھا مجھے کام سے اکثر دیر سویر ہو جاتی ہے اب دھندا ہی ایسا ہے کیا کریں۔''

''میں کیسے سوتی اسد بھوک سے رات بھر بلکتا رہا ہے، مجال ہے کہ خود سویا ہو یا مجھے ایک لمحہ بھی آنکھ بند کرنے دی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے رو رو کے بڑی مشکل سے سویا ہے۔'' اس نے آرام سے بچے کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے جواب دیا۔

''یار میں تو سوچ سوچ کے پاگل ہو گیا ہوں، کچھ سمجھ نہیں آ رہا سواری کم ہو گئی ہے کہ میری قسمت کو تالے لگ گئے ہیں۔ اس دھندے میں اب پہلے والی بات نہیں رہی میں تو بہت پہلے گھر آ جاتا مگر راستے میں...'' اس نے تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر راستے میں کیا ہوا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ تشویش سے ایک دم اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''ارے ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں پہلے میری پوری بات تو سن لو میں تو آج بھی خالی ہاتھ مایوسی سے گھر واپس لوٹ رہا تھا مگر بھلا ہو اس میڈم کا وہ مل گئی ورنہ ہمارے گھر کچھ دن اور فاقے رہتے۔ بڑی پیسے ہے، اس کا دل بہت بڑا ہے، آج اس کی وجہ سے ڈبل دیہاڑی لگی ہے۔'' اس نے جیب سے لشکارے مارتے ہوئے کورے نوٹ نکال کے میز پر رکھ دیئے۔ عورت خواہ عمر کے کسی بھی حصے میں ہو وہ اپنے میاں کے منہ سے دوسری عورت کی تعریف گوارہ نہیں کرتی۔ وہ بھوک پیاس غربت سب کچھ سہہ جاتی ہے، مگر دوسری عورت کا وجود اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے مگر غربت بھی کتنی ظالم شے ہے اس پر دولت کا خول چڑھائے تو ہر خدشے کو سر اٹھانے سے پہلے ہی ڈھانپ لیتی ہے۔ سبز رنگ کے نوٹوں کا عکس اس کی آنکھوں میں پھیل گیا ایک عجیب سرشاری حساس اسے گدگدانے لگا پیسے دیکھ کے اس کے وہم کی تاریکی اس حقیقت کے اجالے پر غالب نہ آ سکی۔

''ارے واہ اسلم آج تو قدرت خوب مہربان ہو گئی۔ کھانا لاؤں آپ کے لیے۔'' وہ چہک کے بولی۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے بہت زور کی نیند آئی ہے دس بجے جگا دینا میں سونے لگا ہوں۔'' وہ لمبی تان کے

سوال

حضرت علیؓ ایک دشمن سے جنگ لڑ رہے تھے انہوں نے تلوار کا زور سے وار کیا اور اس کی تلوار دو ٹکڑے کر دی۔ حضرت علیؓ غیر مسلح شخص پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اس لیے فوراً ہاتھ روک لیا وہ شخص کہنے لگا۔

''مجھے تلوار دو میں مقابلہ کروں گا۔''

حضرت علیؓ نے اپنی تلوار دی، وہ حیران ہو کر بولا۔

''تعجب ہے آپ خود غیر مسلح ہو گئے۔''

حضرت علیؓ نے جواب دیا ''ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے مانگنے والے کا سوال رد کیا ہو، تم نے مجھ سے تلوار مانگی میرے پاس ایک ہی تلوار تھی، اس لیے میں نے تمہیں وہ دے دی۔''

یہ دیکھ کر وہ کافر مسلمان ہو گیا۔

عظمیٰ فرید خان...... ڈی آئی خان

دھوکا

ایک بدصورت فعل کا بدہیت نام ہے۔

عہد وفاداری میں ہو یا محبت میں، غلامی میں ہو یا مختاری میں، انسانی اعصاب پر چیونٹیوں کی مانند چمٹ جاتا ہے جس کے بعد انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا وجود کائنات سے کٹ گیا ہو۔ وہ خود کو اتنا خالی محسوس کرتا ہے اور اتنا تنہا کہ اسے پوری دنیا فریب کا جال نظر آنے لگتی ہے۔

رفعت سراج کے شاہکار سے اقتباس

آمنہ امداد...... سرگودھا

سو گیا۔

"کوثر...... او کوثری...... کہاں مر گئی ہے تجھے کہا بھی مجھے جگا دینا' نائیک کو حساب دینے جانا ہے دیکھو سورج سر پر چڑھ آیا ہے تجھے کچھ یاد بھی رہتا ہے کہ نہیں۔" وہ سخت غصے میں چلانے لگا۔

"مجھے یاد تھا مگر آپ گہری نیند سو رہے تھے میں نے سوچا تھوڑا آرام......"

"ارے نیند گئی تیل لینے آرام گیا بھاڑ میں' ہمارے نصیب میں آرام کہاں۔ کتنے دنوں سے سیٹھ بھوکا منہ کھول کے بیٹھا ہے اس کا منہ بند کرنا ضروری تھا کہ نیند اگر آج بھی اسے ہڈی نہیں ڈالی وہ باؤلے کتے کی مافق کاٹنے کو دوڑے گا۔ ارے یہ گاڑی جس سے روزی کما کے ہم کھا رہے ہیں اسی کی ہے۔ میرے باپ کی نہیں ہے اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے جلدی سے میرے نہانے تک ایک پیالی چائے بنا دو۔"

"وہ...... پتی...... نہیں ہے۔" نظریں جھکائے سہمے ہوئے انداز سے وہ بڑی مشکل سے کہہ پائی۔

غسل خانے جاتے ہوئے آدھے راستے اس کے بڑھتے ہوئے قدم ساکت ہو گئے اس نے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"کیا مصیبت ہے' پتی نہیں ہے' کبھی چینی نہیں ہے۔ رات اتنے سارے پیسے تجھے دیئے تھے' وہ میری قبر پر نچھاور کرو گی' منگوا نہیں سکتی تھیں۔ ارے گھر میں زہر ہے وہی پی لیتا ہوں جان چھوٹے روز کے عذاب سے۔" وہ غسل خانے سے نکلا تو وہ بت بنی پھر سامنے کھڑی تھی۔

"اب کیوں منہ لٹکائے کھڑی ہو؟" اس نے ناگواری سے پھر جھٹک دیا۔

"وہ...... جی آپ اسد کو ایک منٹ پکڑ لیتے تو میں پتی منگوا کے ابھی چائے......"

"رہنے دو کوئی ضرورت نہیں تمہاری چائے کے چکر میں شام ہو جائے گی۔" وہ تیار ہو کے آگ اگلتا ہوا باہر نکل گیا اس نے سلف کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ موبائل کی بیل نے اس کا پارہ مزید ہائی کر دیا۔

"لو آ گیا پھر پاپی سیٹھ کا فون' حساب تو ایسے مانگتا ہے جیسے پیسے درختوں پر لگے ہوں۔" اسکرین پر میڈم کا نمبر دیکھ کے ایک دم اس کے لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا۔

"اسلم کہاں ہو تم؟"

"جی میڈم! گھر پر ہوں' آپ حکم کریں۔"

"مجھے ذرا ریشم مارکیٹ جانا ہے' شاپنگ کرنی ہے تم جلدی سے میرے گھر آ جاؤ۔" وہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکا' چھلاوے کی طرح بنگلے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ پہلے سے تیار بیٹھی تھی' پہلے ہی ہارن پر جھٹ سے باہر آ گئی۔

دوپہر سے شام ہو گئی اس نے اسے ریشم مارکیٹ سے نکلتے ہی کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں چلنے کا حکم دیا۔

"میڈم! یہ یہاں کا سب سے اچھا ریسٹورنٹ ہے' شہر کے سارے امیر ترین لوگ اسی ریسٹورنٹ سے کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسلم آؤ' تم کیوں گاڑی میں بیٹھ گئے؟"

"م...... میں میڈم! میں گاڑی میں ہی آپ کا انتظار کرتا ہوں آپ جائیں۔"

"کیوں تم اندر کیوں نہیں آؤ گے' کیا تمہیں بھوک نہیں لگتی' چلو گاڑی پارک کر کے جلدی سے آؤ شاباش۔" اس ہوٹل میں وہ سواری کے ساتھ تو بہت دفعہ آیا تھا مگر کھانا کھانے کا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا وہ کھانے کی ٹیبل پر میڈم کے سامنے بیٹھا حیران کن نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

"ارے اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو' کھانے کے پیسے تمہارے کرائے سے نہیں کاٹتی۔" دھیمی سی مسکراہٹ اس نے اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے تکلف کی فضا توڑنے کی کوشش کی۔

وہ ایک عرصے سے گاڑی چلا رہا تھا دن رات طرح طرح کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا' دنیاداری کا اچھا خاصا تجربہ تھا اسے۔ وہ امیر طبقے کی روایتی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا' وہ جانتا تھا امیر خوامخواہ کسی پر مہربان نہیں ہوتے ان کی کرم فرمائی کے پیچھے کوئی نہ کوئی ان کا مفاد ضرور ہوتا ہے مگر میڈم کا کون سا مفاد ہے اس کے پاس پیسے ہیں وہ باہر آنے جانے کے لیے کسی بھی گاڑی والے کو بلا سکتی ہے۔ میڈم اس قدر مجھ پر مہربان کیوں ہے' میڈم کی دریا دلی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

"اسلم کن سوچوں میں ڈوب گئے' چلیں۔" اس نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سے گم صم دیکھ کے جھنجوڑا۔

"کچھ نہیں میڈم! کچھ نہیں...... جی چلیں۔" وہ بوکھلا کے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا' جیسے اس کے اندر اٹھنے والے سوالات اس کے چہرے سے میڈم نے پڑھ لیے ہوں۔

"سنو دو عدد چکن بریانی بھی پیک کر کے لاؤ اس کا بل بھی اس میں شامل کر کے دوبارہ لاؤ۔" ویٹر نے بریانی کے ساتھ بل بھی کھانے کی ٹیبل پر رکھ دیا۔

"ہونہہ...... میڈم نے بل کے ساتھ لال رنگ کا نوٹ ویٹر کو ٹپ کے طور پر دیتے ہوئے کہا۔

"چلو اسلم۔" اور خود پرس کندھے پر لٹکائے اس کے آگے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"اسلم کتنے بچے ہیں تمہارے؟" اس نے آدھے راستے سوال کر کے پھر خاموشی توڑنا چاہی۔

"جی میڈم تین...... ایک بیٹی ہے دو بیٹے ہیں خیر سے۔"

"ماشاء اللہ۔" پھر دونوں طرف چپ کا سکوت طاری ہو گیا۔ گاڑی سے اتر کے وہ کپڑے کے بیگ تھامے اندر جانے لگی دو قدم چلنے کے بعد اس نے پھر اسے مخاطب کی۔

"اسلم باقی چیزیں اٹھا کے اندر لے آؤ۔"

"جی میڈم!" وہ اثبات میں سر ہلا کے اس کے پیچھے دونوں ہاتھوں میں شاپر تھامے چلنے لگا۔

اس بنگلے میں اس نے پہلی بار قدم رکھا تھا اتنا عالی شان بنگلہ دیکھ کے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آدھے سے زیادہ حصہ تیار ہو چکا تھا ایک چوتھائی حصہ زیر تعمیر تھا۔

"واہ میڈم! آپ کا بنگلہ تو بہت خوب صورت ہے' کتنے لوگ رہتے ہیں اس گھر میں میرا مطلب ہے آپ کے شوہر...... بچے......" اس نے مسکرا کے اس طرف دیکھا پھر سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"فی الحال تو اس میں صرف میں رہتی ہوں دراصل شارجہ میں میرے شوہر کا ٹرانسپورٹ کا بزنس ہے۔ ہم گزشتہ بیس سال سے وہیں رہ رہے ہیں زندگی کا ایک حصہ پردیس میں گزارنے کے بعد ہمارا دل وہاں سے اچاٹ ہو چکا ہے اب ہم نے مستقل طور پر اپنے ملک میں رہنے کا

باتیں کچھ خاص

ہمیشہ یہ ہی سوچ کے جیو کہ میرے ربّ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اگر وہ مجھے میرے اعمال کے برابر دیتا تو میرے پاس آج کچھ بھی نہ ہوتا
دو چیزیں زندگی کی وضاحت کرتی ہیں:
"آپ کا صبر جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔
آپ کا رویہ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔"

نادیہ یٰسین...... ساہیوال

نفرت اور انتقام

نفرت اور انتقام کی آگ میں ہم خود جل رہے ہوتے ہیں' نفرت بھی تو ہمیں اسی شخص سے ہوتی جسے انتہا کی حدوں تک چاہا ہو۔ انتقام اندھا ہوتا ہے نہ غیروں کو دیکھتا ہے نہ اپنوں کو۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب نفرت کی آگ سرد ہوتی ہے تو تب خبر ہوتی ہے کہ نقصان تو خود ہمارا اپنا ہوا ہے۔ اس آگ میں ہم خود جھلسے ہیں۔

فائزہ بلال اقرا آفرین...... جام پور

حرف اول

ایک بات تو یہ طے ہے کہ
تاریخ ادب میں جتنا بھی محبت پر لکھا ہے
مرد نے ہی لکھا ہے
لیکن اب علم کے درجے طے کرتے ہوئے
مجھے یہ تو پتا چل گیا کہ
کم از کم جو لوگ جس موضوع پر لکھتے ہیں
کبھی کبھی
اس کے حرف اول
سے بھی واقف نہیں ہوتے

امبر گل...... جھڈو سندھ

فیصلہ کیا ہے گزشتہ سال میرے شوہر آئے تھے انہوں نے بنگلے پر کافی کام کروایا تھا مگر پھر بھی کچھ حصہ رہ گیا۔ تمہیں نظر آ ہی گیا ہوگا وہ اپنے کاروبار کو سمیٹنے میں مصروف ہیں اور بچوں کے ایگزام تھے اس لیے انہوں نے مجھے بھیج دیا جب تک کام مکمل ہوا وہ لوگ بھی آجائیں گے۔ ارے تم نے مجھے کن باتوں میں لگالیا اچھا کیا لوگے چائے یا کولڈ ڈرنک؟'' وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں میڈم! مجھے اجازت دیں پھر کبھی سہی۔'' اس نے معذرت خواہ لہجے میں اٹھتے ہوئے اجازت چاہی۔

''ارے ایسے کیسے اجازت' شرافت سے بیٹھ جاؤ بھئی تم پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو آرام سے بیٹھو میں ماسی کو چائے کا بتا کے ابھی آئی مجھے پتا ہے تم چائے کے بڑے شوقین ہو۔''

چائے کا آخری گھونٹ ابھی اس کے حلق سے نہیں اترا تھا وہ کپ ٹرے میں رکھ کے جلدی سے باہر نکل گیا۔

''اسلم..... او اسلم! کیا ہوگیا کدھر دوڑ لگادی۔'' یہ کہتے ہوئے میڈم ماسی کا اور ماسی میڈم کا منہ تکنے لگی۔

''معاف کرنا میڈم! وہ بریانی میں گاڑی میں ہی بھول آیا وہی اٹھانے گیا تھا۔''

''ارے پاگل یہ بریانی تمہاری لیے ہے' تمہاری بیوی اور بچوں کے لیے تم بھی کمال کرتے ہو۔''

''ارے نہیں میڈم! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم غریب لوگ پانی کے ساتھ سوکھی روٹی کھا کے گزارہ کرنے والے ہیں۔ میری بیوی اور بچوں کو ایسے کھانے' کھانے کی عادت ہے آپ ہماری عادتیں مت بگاڑیں' ہم غریبوں کو اپنی اوقات میں ہی رہنے دیں۔ پہلے آپ کے بہت احسانات ہیں' ہمیں اپنی نوازشات کے بوجھ تلے مت دبائیں اتنے وزنی احسانوں کا بوجھ ہمارے ناتواں کندھے نہیں سہار پائیں گے۔''

''دیکھو اسلم! اپنوں کا خلوص بوجھ نہیں ہوتا جب سے آپ سے تعلق جڑا ہے ایسے لگتا ہے تعلق اپنائیت میں بدل گیا ہے۔ اسلم تمہاری باتوں میں اپنائیت کا رس قطرہ قطرہ شبنم کی مانند تصور کی گود میں بیٹھ کے قلب و روح میں اتارنے کو جی چاہتا ہے تم اپنے اپنے لگتے ہو جہاں اپنائیت ہو وہاں ٹکا پیسا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔'' اس نے بڑے

خوب صورت انداز سے پینترا پھینکا مگر اسلم کے پلے کچھ نہ پڑا۔ میڈم کی گہری باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئیں' وہ اس کی رفاقت اور تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کھل کر دل کے اندر اٹھنے والے طوفانوں کا رخ اس کی طرف موڑنا چاہتی تھی مگر ماسی کی آمد سے اس کی جان چھوٹ گئی مگر حقیقت میں جب سے اس کی زندگی میں میڈم آئی تھی اس کی فاقہ کشی خوشحالی میں بدل گئی تھی۔ ایک دم مایوس خزاں رسیدہ زندگی میں جیسے بہار آگئی' میڈم کی عنایت کا ڈنکا اس کے گھر بھی بجنے لگا' وہ سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے اسی کے راگ الاپنے لگا۔

''کھانا لاؤں آپ کے لیے۔'' کوثر نے پانی سے بھرا جگ اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں کھانا کھا کے آیا ہوں یہ پیسے اندر رکھ دو۔''

''یہ شاپر میں کیا ہے؟''

''بریانی ہے میڈم نے تمہارے اور بچوں کے لیے بھیجی ہے۔''

''میڈم...... میڈم...... یہ میڈم زیادہ ہی نہیں مہربان ہوگئی آپ پر' آپ کے منہ سے میڈم والا راگ کثرت سے سننے کو مل رہا ہے آج کل' کبھی کھانا ہے تو کبھی پھول اتنی نوازشات آخر راز کیا ہے جب بھی دیکھو آپ کی زبان پر میڈم کے چرچے ہیں۔''

''سچ کہا ہے کسی نے بندر کیا جانے ادرک کا سواد' دراصل تم ہو ہی ناشکری اچھی چیز تجھے ہضم نہیں ہوتی۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے چار پیسے گھر میں آتے تجھے اچھے نہیں لگ رہے' نہیں کھانی بریانی تو مت کھاؤ دفع ہو جاؤ میری آنکھوں سے میرا دماغ مت کھاؤ' تجھے سمجھانا اور اونٹ کو رکشے میں......''

''دماغ میرا نہیں تمہارا خراب ہوگیا ہے جو ایک فرنگن کی وجہ سے اپنے ہنستے بستے گھر کو اپنے ہاتھوں سے اجاڑنے پر تلے ہو۔ میں گزشتہ کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں اب آپ کو گھر اچھا لگتا ہے نہ گھر والے ہر وقت اس فرنگی عورت کے خیالوں میں رہتے ہو۔ زیادہ وقت تو تمہارا میڈم کے ساتھ گزرتا ہے ہمارے ساتھ تو واجبی سا تعلق رہ گیا ہے۔'' اس سے پہلے دونوں کے درمیان تکرار طول پکڑتی وہ غصے سے پھنکارتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ

میڈم کے خلاف کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا کیونکہ اس کا جادو اس کے سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ رات اس نے اسٹینڈ پر گزاری' صبح ناشتے کے بعد بن بلائے ہی اس نے بنگلے کا رخ کیا وہ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں بیٹھ کے حسرت بھری نظروں سے ٹکٹکی باندھے گیٹ کو تکے جا رہا تھا' موبائل کی گھنٹی نے خیالات کے جمود میں ارتعاش پیدا کیا۔

"ہیلو اسلم! کہاں ہو تم؟" دوسری طرف وہی مہربان آواز تھی۔

"میں جہاں بھی ہوں اس بات کو چھوڑیں آپ حکم کریں۔"

"تم کتنا جلدی میرے گھر آسکتے ہو۔"

"آپ کتنا جلدی تیار ہو کر باہر آسکتی ہیں؟"

"میں تو بالکل تیار ہوں۔"

"تو میں بھی آپ کے دروازے پر بالکل تیار کھڑا ہوں۔" اسے کھڑے پا کے سمجھنے میں ذرا دیر نہیں ہوئی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی وہ پوری طرح اس کی عنایات کے جال میں پھنس چکا تھا اس کا تیر بالکل صحیح نشانے پر لگا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ کے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا وہ اسے نظر انداز کر کے دروازہ کھول کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پچھلی سیٹ سے فرنٹ تک کا فاصلہ کیسے ایک ہی لمحے میں سمٹ گیا' وہ سمجھ نہیں پایا مگر اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ وہ سارے فاصلے' تمام دوریاں ایک پل میں مٹا دینا چاہتی تھی۔ بیوی سے کشیدگی کا اسے بخوبی علم تھا ان کے درمیان گھریلو ناچاقی ہی باہمی تکلف توڑنے کے لیے بہترین ہتھیار تھا۔ وہ بظاہر اس کی بیوی بچوں کی خیر خواہ تھی حقیقت میں وہ ان کے درمیان غلط فہمی کی چنگاری کو بھڑکانے کے لیے جان بوجھ کے کھانے اور تحفے بھجواتی تھی وہ اس کے گرد مکروہ عزائم کا دائرہ روز بروز تنگ کرتی جا رہی تھی۔ وہ جوں جوں بیوی بچوں سے دور ہوتا جا رہا تھا اتنا ہی میڈم کے قریب آ رہا تھا' دن شاپنگ کرتے ہوئے میڈم کے ساتھ گزر گیا' شام کو انہوں نے کھانا ایک ساتھ ہوٹل سے کھالیا وہ میڈم کے بنگلے پر چھوڑ کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے تمہارا چہرہ کیوں لٹکا ہوا ہے پھر بیوی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟" چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے جلتی پر تیل ڈالا۔

"چھوڑو میڈم! اس کی تو روز کی عادت ہے۔" اسلم نے بے زاری سے مختصر جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے تم آج بھی اپنے گھر نہیں جاؤ گے کوئی ضرورت نہیں اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ ذلیل ہونے کی۔ تم آج میرے پاس ہی رک جاؤ آج ماسی بھی نہیں ہے میرا بھی دل بڑا اداس ہے۔" اس نے شیشے میں اتارنے کے لیے لوہا گرم دیکھ کے چوٹ کی' اس کا ردعمل جانے بغیر زبردستی ہاتھ پکڑ کے کھینچنے لگی۔ وہ تذبذب کا شکار تھا۔

"ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ ہوں ہاتھ تو چھوڑیئے گاڑی تو پارک کرنے دو۔"

اس نے نظر سے اشارہ کرتے ہوئے اپنی کلائی کو ہلکی سی جنبش دی جو اس نے بڑے مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ میڈم سے آپ...... آپ سے تم...... تکلف کی فضا ٹوٹی تو تعلق کو گہرے مراسم میں تبدیل ہونے میں دیر نہیں لگی۔ گاڑی پارک کر کے وہ بے دھڑک اس کے بیڈ روم میں پہنچ گیا' وہ اسے بٹھا کے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کچھ دیر کے لیے آنکھ سے اوجھل ہو گئی' واپس آئی تو ریشمی چست لباس میں اس کا سراپا حسن قیامت خیز لگ رہا تھا۔ مرد کو اپنے گھر میں سکون میسر نہ ہو تو غیر محرم عورتوں کی جانب فطرتاً اس کا رجحان بڑھنے لگتا ہے اس کے لیے جائز ناجائز حقوق فرائض بے معنی ہو جاتے ہیں ازدواجی رشتوں میں دراڑ پڑ جائے تو اعتماد کی دیواریں چکنا چور ہو جاتی ہیں۔ وہ مسلسل کئی راتوں سے ذہنی کوفت میں مبتلا تھا وہ جواں امنگوں سے اپنے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے اس بوجھل وجود کو گدگدا رہی تھی بے زور جذبے سرکتے لمحوں پر طاری ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ہونٹوں کی خواہشات آنکھوں میں جم کے رہ گئیں' دھڑکنیں آنکھوں کی گفتگو میں محو ہو گئیں۔ گہری رات تاریکی میں وہ اجالے کی بلندیوں سے گناہ کی دلدل میں گرتے رہے۔ ہوس کے نشے میں دھت ہو کے ان کے بہتے ہوئے ضبط کی تمام حدیں عبور کر گئے۔

اس رات کے بعد تاریکی اور اجالے کی کوئی تفریق نہ رہی اس کے شب وروز میڈم کے بیڈروم کی نذر ہوگئے۔ اس کے بنگلے کی جانب اٹھتے ہوئے قدم اپنے گھر کا راستہ بھول گئے اس نے چند ساعتوں کے سکون پر خون کے رشتے قربان کردیئے۔

"آج گھر کا راستہ کیسے بھول گئے' کچھ دن اور گزار لیتے اپنی فرنگی میڈم کی بانہوں میں۔"

"کیا بکواس کررہی ہو کچھ بھی بولتی رہتی ہو۔ میں اپنے دھندے میں مصروف تھا تمہارے اعصاب پر بس میڈم ہی سوار رہتی ہے اور پیسے تو میں گھر بھجواتا رہا ہوں اور کیا چاہیے کیا چاہتی ہو تم جتنے دنوں بعد بھی گھر آؤں تمہاری دو گز لمبی زبان قینچی کی طرح چلتی ہی جاتی ہے۔" اس نے اپنے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے بلاوجہ کی ڈانٹ پلا کے اس کی آواز دبانے کی کوشش کی۔

"جان چکی ہوں تمہارے دھندے کو اور تجھے بھی اچھی طرح مگر اب میں چپ نہیں رہ سکتی' آنکھوں دیکھا زہر نہیں کھا سکتی۔ میں اپنے حق کے لیے بولوں گی تم اونچی آواز میں برس کے میری آواز میرے حق کو نہیں دبا سکتے۔ عورت زندگی میں ہر معاملے پر سمجھوتہ کرسکتی ہے مگر اپنے حق سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتی۔" اسلم نے عرصہ دراز بعد گھر میں قدم رکھا کوثر کو بلاوجہ کی جھاڑ پلائی تو کئی دنوں سے اس کے اندر ابلنے والا لاوا پھٹ کے زبان کے راستے باہر آگیا۔

"زبان کو لگام دو ورنہ...... اچھا نہیں ہوگا کیا اول فول بکے جارہی ہو دماغ تو نہیں خراب ہوگیا تمہارا' اب زبان کھولی تو کاٹ کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔"

"دماغ میرا نہیں تمہارا خراب ہوگیا ہے جو اپنی بیوی بچے بھول کے اس فرنگی میم پر عاشق ہوگئے' پاگل ہوگئے ہو۔ میں آخری بار تمہارے تجھے سمجھا رہی ہوں باز آجاؤ ایسی حرکتوں سے جن راستوں پر تم چل رہے ہو اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں' اپنے بچوں پر ترس کھاؤ یہ فرنگی تہذیب کی عورتیں کسی کی نہیں ہوتیں جب بے حسی کے خمار سے نکلو گے تو کچھ بھی نہیں رہے گا کیوں ایک غیر عورت کے لالچ میں آکے اپنے گھر کو برباد کررہے ہو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔" کوثر نے بکھرے گھر کے چند تنکے سمیٹتے ہوئے گڑگڑا کے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"کوثر منہ بند کرو ورنہ...... دفع ہوجاؤ میرے گھر سے۔"

"ورنہ کیا ہوگا' مجھے مار بھی ڈالو تب بھی میں تجھے اس ذلیل عورت کے ساتھ گمراہ نہیں ہونے دوں گی۔"

"ذلیل عورت تیری اتنی مجال اپنے شوہر سے زبان لڑاتی ہے۔" آخری الفاظ اس کے منہ میں تھے اس نے زوردار زناٹے دار تھپڑ رسید کردیا۔

"دیکھ لینا جس فرنگی عورت کے دم پر تم ہواؤں میں اڑ رہے ہو وہی اپنے ہاتھوں سے تجھے منہ کے بل گرائے گی' ایک لمحے میں تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ تمہارا غرور خاک میں مل کے مٹی ہوجائے گا۔ میری اور میرے بچوں کی پروا نہیں ہے تو زہر دے کے مار ڈالو اور جاکے اس کے قدموں سے لپٹ جاؤ ہمیشہ کے لیے نکاح کرلو اس سے۔" اس کے اندر کی عورت جاگ اٹھی وہ غصے کی آگ میں جل بھن رہی تھی۔

"چل تمہاری یہی خواہش ہے تو اسے بھی پورا کردیتا ہوں اٹھا اپنے بچے اور میرے گھر سے دفع ہوجا میں تجھے آزاد کرتا ہوں میں نے تجھے طلاق...... طلاق...... طلاق دی۔" درودیوار کے ساتھ ان الفاظ کی گونج سے آسمان کا دل بھی دہل گیا اس بے رحم کو اپنی بیوی کی حالت پر رحم آیا نہ معصوم بچوں پر ترس اس نے بچوں سمیت بالوں سے گھسیٹتے ہوئے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

اس پر جنون سوار تھا اس کی آنکھوں میں وحشت اتری تھی' وہ اپنے ہی آشیاں کو غصے کی آگ میں جھونک کے میڈم کی زلفوں کا اسیر ہوکے رہ گیا۔ میڈم کی تو چاندی ہوگئی وہ عیاشی کے لیے دونوں ہاتھوں سے اس پر دولت نچھاور کرنے لگی' جذبات کے دھارے میں بہتے ہوئے اس نے جھوٹی تسلی سے اس کا دل بہلائے رکھا۔

"چند دنوں کی بات ہے میرے خاوند نے جیسے ہی سارے پیسے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیئے میں اس سے خلع لے لوں گی' پھر میں تمہارے ساتھ شادی کرلوں گی۔ یہ بنگلہ میری دولت اور سب سے بڑھ کے میں سب کچھ تمہارا ہوگا۔ تمہارے پاس تمہاری اپنی گاڑی ہوگی خوب مزے اور عیش سے تمہاری زندگی آرام سے گزرے

گی۔"

"یار یہ سب تو ٹھیک ہے طاہر میرا اکلوتا چھوٹا بھائی ہے تجھے بتایا تھا ناں اس کا رشتہ اچھے خاندان میں طے ہوا تھا اب وہ شادی کے لیے بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔ اتنے دنوں سے تم مجھے اور میں ان لوگوں کو وعدوں پر ٹالتا آ رہا ہوں مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ لوگ انکار نہ کردیں' اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا مجھے اور کچھ نہیں چاہیے بس وہ اپنے گھر بار والا ہو جاتا تو میرے کندھوں کے ساتھ ساتھ من سے بھی بوجھ اتر جاتا۔" وہ فکرمندی سے جواب طلب نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو میں کتنی بار سمجھا چکی ہوں میرا جو کچھ ہے وہ سب کچھ تمہارا تو ہے بھلا میں تمہارے کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ تم جانتے ہو دو چار لاکھ کی میرے لیے کوئی پرابلم نہیں ہے تم اس کے سسرال والوں سے ایک دو ماہ کے لیے وقت مانگ لو میں نے اپنے شوہر سے بات کی ہے وہ تیزی سے کاروبار سمیٹ رہا ہے اگلے مہینے کے آخری عشرے تک وہ تمام پیسے میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردے گا پھر وہی ہوگا جو تم چاہو گے۔" میڈم نے ایک نئے وعدے کا میٹھا لڈو دیتے ہوئے بڑے پیار سے یقین دلایا۔

"ٹھیک ہے میں ان سے کل ہی بات کرتا ہوں مگر یاد رکھنا جب تک طاہر کی شادی نہ ہوئی ذمہ داری کی تلوار میرے سر پر لٹکی رہے گی۔"

کتنے ہی دنوں تک وہ اضطراب کی سولی پر لٹکا رہا دوطرفہ گہرے مراسم میں اکتاہٹ کی دراڑ پڑ چکی تھی۔ جذبات ٹھنڈے پڑنے سے خواہشات کے سمندر خشک ہوگئے اس نے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرکے پھینک دیا اس کا دل بھر گیا تو دھیرے دھیرے اس نے پاؤں کھینچنے شروع کردیئے۔ ملاقات تو کجا وہ اس کا فون سننے سے بھی کان کترانے لگی وہ بلندی سے گر کے پستی پر آن پڑا' عالی شان محلوں سے پھر اپنی کٹیا میں آ گیا۔ عیش و عشرت لگاتار فاقوں میں تبدیل ہوگئی اسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا لہجہ میڈم کی چاہت بھری رفاقت کیسے حقارت میں بدل گئی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی باوجود کوشش کے ان کے درمیان فاصلوں کی خلیج بتدریج بڑھتی جا رہی تھی وہ اس سے ملنا چاہتا تھا بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب بھی بنگلے کا رخ کرتا اکثر باہر لگا ہوا تالا اس کا منہ چڑا رہا ہوتا۔ گاڑی کے مالک کی طرف سے آخری وارننگ مل چکی تھی اس ہفتے کے آخر تک حساب کتاب برابر کرجاؤ ورنہ میری گاڑی میرے گھر کھڑی کردینا۔

❀.......❀.......❀

تیسری بیل پر دروازہ کھل گیا' میڈم نے اتنی رات کو اسے اچانک دیکھ کے حیرانگی کا اظہار کرنے کی بجائے بڑی شدت سے منتظر ہونے کی اداکاری کی۔

"اسلم آؤ...... اندر آؤ میں ابھی تجھے ہی یاد کررہی تھی۔" دروازہ بند کرنے کے بعد اس کے قدم بیڈ روم کی طرف بڑھنے لگے۔

"ذلیل عورت' دھوکے باز تم نے مجھے برباد کرڈالا' میرا ہنستا بستا گھر تمہاری وجہ سے اجڑ گیا' مجھ سے دل بھر گیا تو مجھے اشاروں پر نچا رہی ہو۔" اس نے بالوں سے پکڑ کے زور سے زمین پر پٹخ دیا۔

"دیکھو اسلم! یہ تم اچھا نہیں کررہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ دیکھو...... میری بات سنو! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کل صبح سے میں نے تمہیں بہت فون کرنے کی کوشش کی میں نے تمہیں بتانا تھا میرے شوہر اسی ہفتے شارجہ سے آ رہا ہے تم جتنے پیسے چاہو مجھ سے لے لینا' مجھے چھوڑ دو۔" وہ التجا کرتے ہوئے قدموں سے لپٹ گئی۔

"بند کرو اپنا ناٹک...... ڈرامہ باز عورت بہت بے وقوف بنا چکی مجھے' اب میں تمہاری باتوں میں نہیں آنے والا تو میری تو نہیں رہی تو تجھے میں کسی اور کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا' تجھے برباد کرڈالوں گا۔" اس نے تیزاب کی ساری بوتل اس کے چہرے اور کھلے بدن پر انڈیل دی۔

اگلے روز اخبار کے فرنٹ پیج پر یہ سرخی درج تھی "مطلوبہ رقم کا مطالبہ پورا نہ ہونے پر شارجہ پلٹ حسینہ کے آشنا نے تیزاب پھینک کے جلا ڈالا۔ شارجہ پلٹ حسینہ اسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئی۔"

بدلتے رنگ

ممتاز احمد

وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا یہ قانون قدرت ہے ہر رات کے بعد سویرا اور دن کے بعد رات ہوتی ہے، اس قانون کو سمجھنے کے باوجود کچھ لوگ زمین پر خدا بن بیٹھے ہیں۔

پریشان حال لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے ایک لالچی، بے رحم اور ظالم ڈاکٹر کا فسانہ، ایک رات وہ خود پریشانی کا شکار ہو گیا۔

ایک معمولی سیلز مین کی روداد، جس پر قسمت کی دیوی مہربان ہو گئی تھی

میرا نام رفیق ہے اور ایک فیکٹری میں سیلز مین ہوں۔ میرا بچپن غربت اور افلاس میں گزرا۔ والد صاحب مزدور تھے انہیں کبھی مزدوری مل جاتی اور کبھی نہ ملتی تو یہی وجہ تھی گھر میں کبھی کھانے کو کچھ ہوتا اور کبھی نہ ہوتا۔ انہی حالات میں بمشکل مڈل تک پڑھ سکا پھر والد صاحب نے مجھے ایک جگہ کام پر رکھوا دیا تاکہ چار پیسے آ سکیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ جوان ہوتا گیا۔ اسی دوران کئی کام بدلتے بدلتے بالآخر ایک فیکٹری میں سیلز مین کی جاب مل گئی جو اب تک جاری تھی۔ گزارے لائق تنخواہ کے ساتھ تھوڑا بہت کمیشن بھی مل جاتا۔ وقت گزر رہا تھا تین ٹائم کھانے کو مل جاتا تھا۔

جب میری عمر چوبیس سال ہوئی تو والدہ صاحبہ کو میرے سر پر سہرا باندھنے کی سوجھی اور جھٹ پٹ میرے لیے ایک رشتہ ڈھونڈ لیا۔ اب ظاہر ہے رشتہ بھی اپنے جیسے غریب غرباء میں جوڑا کیونکہ کسی خوشحال گھرانے سے بھلا ایک مفلس اور معمولی سیلز مین کو رشتہ کیسے مل سکتا تھا تو اس طرح صابرہ میری بیوی بن کر آ گئی۔

خدا کا شکر یہ تھا کہ صابرہ بہت ہی بھلی مانس اور اپنے نام کی طرح صابر شاکر لڑکی تھی۔ اس نے اپنے اچھے اخلاق اور اطوار سے سب کے دل جیت لیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف وقت بڑے سکون سے گزر رہا تھا بلکہ صابرہ اماں کی لاڈلی بہو تھی اور اس سے بہت خوش تھیں۔ وقت اپنی ڈگر پر چلتا رہا اور پندرہ سال کا عرصہ بیت گیا۔ اللہ پاک نے دو بیٹیاں اور دو بیٹے دیئے۔ ابا جان کا تین سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ لگی بندھی تنخواہ تھی جو ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو مل جاتی جس سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

ایک دن رات کے بارہ بجے کے قریب میری سب سے بڑی بیٹی عارفہ کو پیٹ کے نچلے حصے میں شدید درد اٹھا اور ساتھ قے بھی آ گئی تو فوری طور پر میں اور صابرہ اسے گھر کے قریب واقع ایک پرائیویٹ اسپتال کی ایمرجنسی میں لے گئے۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود جونیئر ڈاکٹر نے چیک اپ کیا کچھ ٹیسٹ کروائے تو انکشاف ہوا کہ بچی کو اپینڈکس کا درد ہے۔ سرجن ڈاکٹر کی فیس جمع کروانے کے بعد ہمیں سرجن کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس اسپتال کا مالک شہر کا مشہور اور مایہ ناز سرجن ڈاکٹر جواد تھا۔ جس نے معائنے کے بعد اپینڈکس کی تشخیص کی اور بتایا کہ اس کا فوری علاج آپریشن ہے۔ اگر دیر

کی تو اپینڈکس پھٹ بھی سکتا ہے۔ لہذا ہمیں کہا گیا کہ کاؤنٹر پر دس ہزار روپے جمع کروا کر رسید دکھائیں تاکہ مریضہ کو آپریشن تھیٹر میں شفٹ کیا جائے۔

اس وقت بڑی مشکل سے ملا جلا کر پانچ ہزار روپے بنے۔ میں نے کاؤنٹر والے سے اصرار کیا کہ آپ اس وقت پانچ ہزار روپے جمع کرلیں باقی پانچ ہزار صبح ہوتے ہی جمع کروادوں گا۔ مگر اس نے کہا کہ وہ ملازم ہے دس ہزار سے کم جمع نہیں کرسکتا آپ ایسا کرو ڈاکٹر جواد سے مل لو تو میں اسی لمحے بھاگ کر ڈاکٹر جواد کے کمرے میں گیا اور اس کی منت سماجت کی کہ فی الوقت میری پاس صرف پانچ ہزار روپے ہیں باقی صبح سویرے انتظام کر کے ادا کردوں گا مگر اس نے نہ صرف انکار کردیا بلکہ جھڑک دیا کہ یہ کوئی خیراتی اسپتال نہیں ہے پوری رقم جمع کراؤ گے تو آپریشن ہوگا ورنہ نہیں میں نے گڑگڑا کر کہا ڈاکٹر صاحب اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں کہاں سے رقم کا بندوبست کروں خدارا مجھ پر رحم کریں تو اس نے بڑی بے رحمی سے کہا کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے اب جاؤ اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ جب رقم کا بندوبست ہوجائے تو آنا ورنہ نہیں۔

عارفہ کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑ رہی تھی وہ تکلیف سے تڑپ رہی تھی۔ میں اور صابرہ پریشانی کی حالت میں بیٹھے تھے۔ صابرہ رو رو کر عارفہ کی زندگی اور صحت کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ میں نے موبائل فون پر اپنے کچھ جاننے والوں سے رابطہ کیا مگر رات کے وقت کسی کے پاس بھی پانچ ہزار روپے نہ تھے۔ پھر میں نے اپنی فیکٹری کے مالک مشتاق صاحب کا نمبر ملایا بیل جارہی

تھی مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ یقیناً موبائل سائیلنٹ پر لگا کر سو رہے ہوں گے۔

میں نے بے بسی کے عالم میں اللہ سے فریاد کی یا پاک پروردگار ہماری مدد فرما ہماری مشکل آسان فرما تو ایمرجنسی میں ڈیوٹی پر موجود ایک نرس نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ ایسا کریں بچی کو فوراً سول اسپتال لے جائیں۔ ڈاکٹر جواد بہت سخت دل اور بے رحم انسان ہیں یہاں آپ کی کوئی نہیں سنے گا۔ اللہ بھلا کرے اس نرس کا اس نے اپنے تجربے کی روشنی میں عارفہ کو ایک انجکشن لگایا جس سے عارفہ کی تکلیف کچھ کم ہوگئی پھر اس نے اپنی ایک دوست نرس جو کہ سول اسپتال میں تعینات تھی اسے فون پر رابطہ کیا تو خوش قسمتی سے اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی اور وہ اسپتال میں موجود تھی تو اس نے کہا کہ آپ مریضہ کو لے کر سول اسپتال آجائیں۔ چنانچہ اسی وقت فوراً عارفہ کو رکشے میں ڈالا اور سول اسپتال لے گئے جہاں اس نرس کی وجہ سے عارفہ کا آپریشن ہوگیا۔

ہمارے دو ہزار روپے خرچ ہوئے۔ دو دن کے بعد عارفہ کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اسے ہم گھر لے آئے۔ کچھ دنوں کے بعد عارفہ بھلی چنگی ہوگئی۔ ہمارے دل سے دونوں نرسوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں نکلیں جن کی وجہ سے عارفہ کی جان بچ گئی۔ ہم نے دونوں کے پاس جا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

کوئی ایک سال گزرا تو ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہوگیا۔ ہوا کچھ یوں کہ ہمارے شہر کا ایک دکان دار جس کو فیکٹری سے مال سپلائی ہوتا تھا اس کی طرف چالیس ہزار روپے تھے۔ مال کے پیسوں کی وصولی میرے ذمہ تھی بار بار چکر لگوانے کے باوجود وہ بل ادا نہیں کر رہا تھا۔ اس روز شام کے وقت میں اس دکان دار کے پاس گیا اور رقم مانگی تو اس نے پہلے مجھے پندرہ منٹ رکنے کا بولا تو میں کھڑا رہا پھر دو دن بعد آنے کا کہا اور میرے ساتھ اس طرح کا رویہ رکھا جیسے میں کوئی بھکاری ہوں اور بھیک مانگنے آیا ہوں۔

مجھے تھوڑا غصہ آگیا اور وہ دکان دار مجھ سے دست و گریبان ہوگیا ہم ایک دوسرے کو تھپڑ مکے مارنے لگے تو اس کے دو ملازموں نے دکان دار کے ساتھ مل کر پہلے تو میری خوب پٹائی کی پھر ۱۵ پر کال کر کے پولیس کو بلا لیا۔

اس نے پولیس کو جھوٹی کہانی سنائی کہ میں دادا گیری اور بدمعاشی کر رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ تو پولیس نے مجھے گرفتار کر کے متعلقہ تھانے کی حوالات میں بند کر دیا۔ مجھے تھانے میں لاتے ہی حوالدار نے میرا موبائل فون اور پرس وغیرہ لے لیا۔ میں تھانے کی حوالات میں بے یار و مددگار پڑا تھا۔ ایک تو تین بندوں کی مار کھانے سے میرا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ بے عزتی اور تذلیل الگ ہوئی دوسرا میں گھر نہیں پہنچا تھا تو یقیناً میری ماں بیوی بچے پریشان ہوں گے کہ رفیق کہاں چلا گیا۔

میں نے بڑی منت سماجت کی کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے تو خدارا مجھے چھوڑ دیں جس پر مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر درشتی سے چپ کروا دیا گیا کہ ایس ایچ او صاحب آئیں گے تو وہ ہی فیصلہ کریں گے۔ کیونکہ تم نے دکان دار سے بدمعاشی اور غنڈہ گردی کی ہے اب تو تمہارے خلاف پرچہ درج ہوگا۔ میرا جسم درد کر رہا تھا سخت بھوک اور پریشانی سے میرا سر بھی چکرا رہا تھا۔ میرے ترلے منتوں سے ایک کانسٹیبل کو مجھ پر رحم آگیا تو اس نے حوال دار سے میرا پرس لا کر دے دیا تو میں نے اسے پیسے دیئے کہ مجھے ہوٹل سے کھانا منگوا دو۔

اس نے میرے پیسوں سے میرے لیے حوال دار اور دوسرے تین سپاہیوں کے لیے کھانا بوتلیں، سگریٹ وغیرہ منگوائے۔ کھانا کھانے کے بعد مجھ پر ایک اور احسان کیا میرا موبائل بھی مجھے واپس دے دیا تو میں نے سب سے پہلے اپنے فیکٹری کے مالک مشتاق صاحب کو کال کر کے ساری صورت حال بتائی کہ میں بے گناہ ہوں اور تھانے کی حوالات میں بند ہوں تو وہ

اس وقت شہر سے باہر تھے اور سفر میں تھے انہوں نے کہا وہ دو گھنٹے تک شہر پہنچ جائیں گے اور سیدھے تھانے آ کر مجھے رہائی دلائیں گے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایس ایچ او سے ان کی دعا سلام ہے۔
دوسری کال میں نے گھر کی اور صابرہ کو بتایا کہ فیکٹری کے ضروری کام کی وجہ سے گھر لیٹ پہنچوں گا۔ گھر والوں کو تھانے میں بند ہونے کا اس لیے نہیں بتایا کہ پریشان نہ ہوں۔ پانچ منٹ کے بعد فیکٹری کے مالک مشتاق صاحب کی کال آئی انہوں نے تسلی دی کہ ایس ایچ او سے بات ہوگئی ہے وہ گشت پر ہیں۔ بس ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں بھی پہنچ جاتا ہوں اور تمہاری گلو خلاصی کرواتا ہوں تم تھوڑا انتظار کرلو۔ مجھے کچھ سکون اور تسلی ہوگئی۔

رات کے گیارہ بجے ایس ایچ او پولیس پارٹی کے ساتھ گشت سے واپس آ گیا۔ ان کی حراست میں ایک جوان لڑکا اور ایک انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ لڑکا لڑکی دونوں پریشان تھے۔ دونوں کے چہروں سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ خاص طور پر لڑکی تو بہت خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی۔ ان دونوں کو حوالات کے بجائے الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔
ایس ایچ او آتے ہی تھانے کے معاملات اور کاموں میں مصروف ہوگیا۔ میں حوالات کی سلاخوں سے ٹیک لگائے اپنے فیکٹری کے مالک کا منتظر بیٹھا تھا۔ ایس ایچ او کا کمرہ تھوڑا دور تھا جو مجھے نظر آ رہا تھا وہ کسی سے ٹیلی فون پر باتیں کر رہا تھا ساتھ مختلف کاغذات بھی دیکھ رہا تھا۔
جب رات کے بارہ بجے تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر جواد ہاتھ میں بریف کیس پکڑے سر جھکائے حوالات کے سامنے سے گزر کر ایس ایچ او کے کمرے کی طرف جا رہا تھا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کو رات کے بارہ بجے تھانے میں دیکھ کر میں چونک گیا کہ یہ کس چکر میں اس وقت تھانے میں آیا ہے۔

اچھی بات

جب تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو تو
سر سے آسمان تک رحمت الٰہی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے
فرشتے تیرے چہرے کی طرف جمع ہو جاتے ہیں
ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی! اگر تو دیکھ لے تیرے سامنے کون ہے اور تو کس سے بات کر رہا ہے تو اللہ کی قسم تو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔
کائنات اشرف...... بوسال سکھا

اہلیت

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس ایک وفد آیا' وفد میں شامل ایک نوجوان اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے لگا۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا "تم خاموش رہو' نوجوان! کسی بزرگ کو بولنے دو۔"
"امیر المومنین!" نوجوان نے کہا۔ "عقل و دانش کا تعلق سن و سال سے نہیں ہوتا ورنہ آپ کی مسند پر کوئی بزرگ تر آدمی نظر آتا۔"
طیبہ نذیر...... شادیوال گجرات

محبت

خدا سے ہو تو بندگی بن جاتی ہے
استاد سے ہو تو دوستی بن جاتی ہے
دولت سے ہو تو مرض بن جاتی ہے
والدین سے ہو تو عبادت بن جاتی ہے
نصرت عارف...... وار برٹن

اشفاق احمد کی کتاب

اشفاق احمد اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ کسی انسان کا پہلا پیار بننا کوئی بڑی بات نہیں بننا ہے تو کسی کا آخری پیار بنو
اس لیے کبھی یہ مت سوچو کہ تم سے پہلے وہ کسی اور سے پیار کرتا تھا' کوشش یہ کرو کہ تمہارے بعد اسے کسی اور کے پیار کی ضرورت ہی نہ رہے۔
فریحہ شبیر...... شاہ نکڈر

ڈاکٹر جواد ایس ایچ او کے پاس جا کر بیٹھ گیا اب میری پوری توجہ اور دھیان اسی کی طرف تھا۔ ان کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی تھی مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایس ایچ او کے دفتر کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے حوالات کے گیٹ کے سامنے سے اٹھ کر آخری کونے میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا جہاں سے اب مجھے ایس ایچ او کے کمرے کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا۔

تقریباً رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب فیکٹری کے مالک مشتاق صاحب بھی آ گئے اور وہ سیدھے ایس ایچ او کے دفتر میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے حوالات سے نکال کر ایس ایچ او کے سامنے پیش کیا گیا تو مشتاق صاحب نے اسے بتایا کہ یہ میرا سیلز مین ہے جو کہ بہت شریف اور ایمان دار ہے۔ ایس ایچ او کے استفسار پر میں نے پوری بات شروع سے آخر تک سچ سچ بتا دی کہ میں نے کوئی بدمعاشی، غنڈہ گردی نہیں کی صرف فیکٹری کے پیسوں کی وصولی کے لیے گیا تھا۔

مشتاق صاحب کی ضمانت پر ایس ایچ او نے مجھے چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ صبح آٹھ بجے دوبارہ تھانے میں حاضری دوں اور اس دکان دار کو بھی بلا لے گا اور سارے معاملے کی چھان بین کرے گا۔ مشتاق صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور اپنی کار میں بٹھا کر رات ڈیڑھ بجے میرے گھر پر چھوڑا اور کہا کہ وہ بھی صبح آٹھ بجے تھانے پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ صبح آٹھ بجے میں بھی تھانے پہنچ گیا۔ مشتاق صاحب بھی آ گئے تو ایس ایچ او نے دو سپاہی بھیج کر دکان دار اور اس کے دونوں ملازموں کو بھی بلوا لیا۔

جب اس نے اپنے طور پر سوال جواب اور تفتیش کی تو اسے جلد معلوم ہو گیا کہ میں بے قصور ہوں۔ زیادتی دکان دار کی ہے تو اس نے دکان دار اور اس کے ملازموں کی خوب چھترول کی اور منشی کو حکم دیا کہ دکان دار اور ملازموں کے خلاف ایف آئی آر کاٹو ایک تو انہوں نے مجھے خواہ مخواہ زدوکوب کیا دوسرا میرے خلاف جھوٹی رپورٹ لکھوائی اس پر وہ دکان دار اور ملازم معافیاں مانگنے لگے۔

قصہ مختصر ہماری صلح کروائی گئی اور فیکٹری کی رقم چالیس ہزار بھی دکان دار سے دلوا دی۔ چنانچہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مشتاق صاحب نے سختی سے منع کر دیا کہ اب آئندہ اس دکان دار کو کبھی مال نہیں دینا۔ مشتاق صاحب فیکٹری چلے گئے۔ دکان دار اور اس کے ملازم بھی چلے گئے۔ اب رات بھر سے میرے ذہن میں سخت تجسس تھا کہ ڈاکٹر جواد رات بارہ بجے تھانے کیوں آیا تھا۔

جب میں تھانے کی بلڈنگ سے باہر آیا تو مجھے رات والا سپاہی مل گیا جس نے مجھے کھانا منگوا کر دیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس سے گزارش کی کہ میرے ساتھ چائے کا ایک کپ پیو اس نے میری بات مان لی۔ میں اسے ساتھ لے کر سامنے والے ہوٹل میں چلا آیا۔ چائے اور لوازمات کا آرڈر دیا۔ سپاہی کے لیے سگریٹ کا پیکٹ منگوایا تو باتوں باتوں میں اس نے ڈاکٹر جواد کی تھانے آمد کی بابت پوچھا تو اس نے جو بات بتائی سن کر میں حیران اور ششدرہ رہ گیا۔

معاملہ کچھ یوں تھا کہ ایس ایچ او معمول کے گشت پر تھا تو شہر سے باہر مین سڑک کے کنارے سنسان جگہ پر ایک کار کھڑی تھی۔ جب ایس ایچ او نے پولیس پارٹی کے ہمراہ کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو ایک لڑکا اور لڑکی قابل اعتراض حالت میں تھے۔ جنہیں پکڑ کر تھانے لایا گیا۔ جب ایس ایچ او نے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ وہ لڑکی ڈاکٹر جواد کی بیٹی تھی اور لڑکا کسی امیر آدمی کا بیٹا تھا وہ لڑکا اور لڑکی آپس میں دوست تھے اور اکثر رات کو کسی سنسان جگہ کار کھڑی کر کے زنا کیا کرتے تھے۔ مگر رات بدقسمتی سے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ دونوں کو تھانے لایا گیا۔

ایس ایچ او نے ڈاکٹر جواد کو فون کر کے اس کی

جوان بیٹی کے کرتوت بتائے اور بیٹی کی باعزت رہائی کے عوض دس لاکھ روپیہ مانگے۔ رات بارہ بجے تک کا ٹائم دیا کہ رقم لے آؤ اور بیٹی لے جاؤ تو ڈاکٹر جواد گڑگڑانے لگا کہ وہ رات کے بارہ بجے اتنی بڑی رقم کا کیسے بندوبست کرے تو ایس ایچ او نے کہا کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے جہاں سے بھی کرواسے ہر حال میں بارہ بجے تک دس لاکھ رچاہیے بصورت دیگر وہ پریس اور میڈیا والوں کو بلالے گا اور لڑکی کو زنا حدود آرڈیننس کے تحت میڈیکل معائنے کے بعد پرچہ درج کر کے جیل بھیج دے گا۔

اسی طرح اس نے لڑکے کے باپ سے بھی بھاری رقم مانگی اور پانچ لاکھ میں معاملہ طے ہوا۔ چنانچہ رات کے بارہ بجے ڈاکٹر جواد جیسے تیسے رقم کا بندوبست کر کے آیا اور رقم سے بھرا بریف کیس ایس ایچ او کو دے کر بیٹی کو ساتھ لے گیا۔

میں یہ بات سن کر گم صم رہ گیا اور سوچنے لگا کہ قدرت نے ڈاکٹر جواد کو کیسی سزا دی ہے۔ بہر حال میں چائے پی کر اٹھ گیا اور اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ اس بات کا میں نے کسی سے کوئی ذکر نہ کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔

کچھ چھ ماہ گزرے تو ایک دن میں سڑک کے کنارے پیدل چل رہا تھا کہ ایک گاڑی مجھ سے ٹکرائی میں سڑک پر گر گیا اور زخمی ہو گیا تو گاڑی والے نے نیچے اتر کر مجھے اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر جواد کے اسپتال ایمرجنسی میں لے گیا۔ جہاں میری مرہم پٹی کر دی گئی۔ زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ گاڑی کے ڈرائیور نے مجھ سے معذرت کی کہ اس کی غلطی سے گاڑی مجھ سے ٹکرائی تھی تو میں نے اسے معاف کر دیا۔ کیونکہ ایک تو اس نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی دوسرا بھاگنے کے بجائے مجھے اسپتال لے آیا۔ تیسرا مرہم پٹی کا سارا خرچہ اس نے ادا کیا۔

وہیں ایمرجنسی میں اسی نرس سے ملاقات ہو گئی۔ جس نے عارفہ کو سول اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا تھا اور اپنی دوست نرس کو فون کیا تھا جس کی بدولت فوری عارفہ کا آپریشن ہوا تھا۔ نرس نے بتایا کہ ڈاکٹر جواد پانچ ماہ پہلے یہ اسپتال فروخت کر کے اپنی فیملی کو ساتھ لے کر بہت دور ایک شہر میں چلا گیا ہے۔

اس نے اچانک اسپتال کیوں بیچا اور کہاں چلا گیا اس کی وجہ کسی کو معلوم نہیں تھی مگر مجھے سمجھ آ گئی کہ اس نے اسپتال بیچ کر یہ شہر کیوں چھوڑا۔

دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا۔ میرے چاروں بچے اپنی محنت اور لگن اور توجہ سے تعلیمی مراحل طے کرتے گئے۔ آج میری بیٹی عارفہ شہر کی مشہور اور انتہائی قابل گائناکولوجسٹ ہے اور اسی اسپتال میں مریضوں کا علاج کرتی ہے۔ اسی کمرے میں بیٹھتی ہے جہاں ڈاکٹر جواد بیٹھتا تھا۔ اب اس اسپتال کا مالک شہر کا ایک بہت نیک سیرت رحم دل اور خدا ترس انسان خادم حسین ہے۔ جو اپنے نام کی طرح انسانیت کی خدمت کرتا ہے اور میرا اسم بامسمیٰ بھی ہے۔ جی ہاں اس کا بیٹا ڈاکٹر ولید ایک چوٹی کا مایہ ناز ماہر اور قابل سرجن ہے۔

عارفہ اس کی بیوی ہے اور خادم حسین کی بہو ہے۔ خادم حسین نے یہ اسپتال ڈاکٹر ولید اور ڈاکٹر عارفہ کے نام لگوا دیا ہے۔

میں اکثر اللہ کی قدرت پر حیران ہوتا ہوں کہ واہ میرے مالک میرے پروردگار تیری شان۔ تو ارض وسما کا مالک ہے۔ تو جو چاہے کر سکتا ہے۔ میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو مجھے یہ محاورہ یاد آ جاتا ہے کہ بدلتا ہے آسماں رنگ کیسے کیسے۔

خلیل جبار

صحافت جو کبھی ایک مقدس پیشہ تھی اب صنعت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اب اس صنعت سے وابستہ افراد خاص طور پر مالکان کا مقصد کالے دھن کو سفید کرنا ہے رہ گیا ہے۔ اسی لیے صحافتی قدریں اب دم توڑ رہی ہیں۔ لیکن اخبارات سے وابستہ عامل صحافی آج بھی خلوص نیت سے فاقہ کشی کا شکار ہیں جبکہ ان کے کچھ ساتھ اپنے پیشے کو کیش کر کے بھی عزت کما رہے ہیں۔

اپنے حالات سے تنگ ایک صحافی کا قضیہ اس نے اچانک اک نیا فیصلہ کرلیا تھا

ساجد علی اسٹاپ پر کھڑا بس کے انتظار میں تھا۔ اس کی بس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اچانک ایک کار اس کے پاس آ کر رکی۔

''ساجد۔'' کار والے نے آواز دی۔

ساجد نے اپنے مخاطب کیے جانے پر کار کی جانب دیکھا۔ کار میں اس کے کالج کے دور کا دوست کامران اسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ساجد نے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' کامران نے پوچھا۔

''یہ عمر کہیں اور جانے کی کہاں ہے سوائے گھر کے۔'' ساجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو ہم لوگ عمر کے اس حصے میں ہیں کہ بیگم ہی لفٹ کرا سکتی ہے۔'' کامران نے زوردار قہقہہ لگایا۔

ساجد نے ایک نظر کامران کے لباس پر ڈالی۔ اس نے بہت ہی قیمتی اور مہنگا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو موبائل تھا اس کی مالیت بھی پچاس ہزار سے زائد ہی ہوگی۔

''چھٹی ہوتے ہی بیگم کا ایس ایم ایس آ گیا ہے، کہاں ہو ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچے؟'' کامران نے دوبارہ زوردار قہقہہ لگایا۔

''ہاں بھئی بیگمات کا کام ہی یہی ہے حالانکہ یہ عمر ہمارے بگڑنے کی نہیں ہے پھر بھی انہیں ہماری فکر رہتی ہے۔''

''عورت ہے نا عورت لاکھ کہے کہ اسے اپنے شوہر پر مکمل اعتماد ہے مگر دل میں اس کے چور موجود رہتا ہے۔'' کامران نے کہا۔

''ویسے شوہر بھی اپنی عورتوں پر تھوڑا بہت شک کرتے ہیں۔'' ساجد نے کہا۔

''یہ مرد کی فطرت ہے جو کبھی نہیں بدل سکتی تھی۔'' کامران نے پھر زوردار قہقہہ لگایا۔

کامران طالب علمی کے دور میں اتنا ہنستا نہیں تھا۔ ہر وقت اس پر سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ اب اس کے بات کرنے کا انداز بدل چکا تھا۔ اس کے رکھ رکھاؤ سے ظاہر ہو رہا تھا وہ بہت اچھی زندگی گزار رہا ہے۔

''ساجد تم نے اخبارات میں کام کرتے ہوئے خوب مال بنا لیا ہوگا؟'' کامران نے پوچھا۔

''مال......! کیوں مذاق کر رہے ہو۔ اخبارات میں کمائی کہاں ہے گزارا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بچے بھی مذاق اڑاتے ہیں کہ ابو تمہاری تنخواہ سے چار گنا ہمارے

اسکول کے چپڑاسی کی تنخواہ ہے۔'' ساجد نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

''میرے کئی جاننے والوں نے اخبارات میں رہ کر بہت مال بنالیا ہے پھر تم کیسے پیچھے رہ گئے؟'' کامران نے حیرت سے ساجد کی طرف دیکھا۔

''ہر شعبے میں دونمبر لوگ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے اخبار کے شعبے میں لوگ صحافی کا لیبل لگا کر مختلف سرکاری محکموں میں جا کر لوگوں کے رکے ہوئے کام کروا کر مال پکڑ لیتے ہیں۔ کام کرانے والے کو کام سے غرض ہوتی ہے وہ اپنا کام ہو جانے پر یہ رقم سوچ کر دے دیتے ہیں کہ وہ آگے پہنچائیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری رقم ان کی جیب میں چلی جاتی ہے۔'' ساجد نے بتایا۔

''ہاں میں نے بہت سارے صحافیوں کو تعمیرات کے ٹھیکے لیتے ہوئے دیکھا ہے میں تمہاری بات سے بالکل اتفاق کروں گا۔'' کامران نے کہا۔

''تم خود سوچو میں نے ساری زندگی ڈیسک پر بیٹھ کر کام کیا ہے۔ میں مال کس طرح بنا سکتا ہوں اگر میں نے مال بنایا ہوتا تو اس طرح اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرتا؟'' ساجد نے کہا۔

''جب تنخواہ میں گزارا کرنا مشکل ہو جائے تو پھر ملازمین آمدنی کے دوسرے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ میں سرکاری ادارے میں انجینئر ہوں میری تنخواہ اچھی ہے۔ اس لیے میں دوسرے ذرائع تلاش نہیں کرتا۔ میرے ماتحت ملازمین جن کی تنخواہیں کم ہیں وہ دوسرے ذرائع سے نوٹ کماتے ہیں۔'' کامران نے کہا۔

''یہ بہت غلط بات ہے۔'' ساجد نے کہا۔

''ہاں ہے مگر اس مہنگائی کے دور میں گزارا کرنے کو

دوسرے ذرائع استعمال کرنا پڑتے ہیں۔" کامران چہرے پر پھیکی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

دونوں کی بات چیت میں سنجیدگی آ گئی تھی۔ کامران نے ماحول کو دوبارہ خوش گوار بنانے کے لیے طالب علمی کے قصے چھیڑ دیئے۔ جس سے ساجد کا موڈ خوش گوار ہو گیا تھا۔ راستے میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل آنے پر کامران نے کار روک دی اور ساجد کو ہوٹل میں لے گیا۔ انہوں نے ڈنر کیا اور خاصی دیر بیتے دنوں کو یاد کرتے رہے۔ اس دوران دونوں کے موبائل پر بیگمات کے ایس ایم ایس آتے رہے اور وہ جواب میں جلد گھر پہنچنے کے ایس ایم ایس کرتے رہے۔

کامران نے ساجد کو گھر ڈراپ کرتے ہوئے اپنا کارڈ دیا اور بولا۔

"ساجد تم طالب علمی کے دور میں میرے اچھے دوست رہے ہو۔ اس لیے میرا فرض بنتا ہے کہ تمہارے کام آؤں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے گھر کے حالات بہتر ہو جائیں۔ رہنے کے لیے اچھا گھر، گھومنے کے لیے کار ہو۔ گھر والے بھی خوش حال زندگی گزاریں تو مجھ سے اس کارڈ پر درج پتے یا موبائل پر رابطہ کر لینا۔ تمہیں مجھ سے مل کر مایوسی نہیں ہو گی۔"

رات خاصی ہو چکی تھی۔ ساجد نے اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ کارڈ ایک مخصوص جگہ پر رکھ دیا اور بستر پر پڑ کر ایسا سویا کہ پھر صبح ہونے پر ہی بیدار ہوا۔ ویسے بھی بیگم کو جگانا خود کو پریشانی میں مبتلا کرنا تھا۔ بیگم کا تنخواہ ملنے پر دس دن تک موڈ خوش گوار رہتا تھا۔ جیسے ہی تنخواہ کے پیسے خرچ ہو جاتے تھے اس کا رویہ بدل جاتا اور وہ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ یہ دن بھی مہینے کے آخری چل رہے تھے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بیگم اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔ اس کی بڑی بیٹی روبینہ نے گھر کا دروازہ کھولا تھا۔ ساجد نے روبینہ کو کہہ دیا تھا کہ وہ کھانا کھا کر آیا ہے اس لیے روبینہ بھی اپنے کمرے میں سونے کو چلی گئی تھی۔

دوسرے دن ساجد شام ڈھلے بسوں کے دھکے کھاتے ہوئے گھر پہنچا تھا۔ اس کی عادت تھی گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے چائے کا کپ پیتا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی صحن میں بیٹھ گیا۔ بچے کمرے میں اسکول کا کام کرنے میں مشغول تھے۔

"بیگم چائے کا کپ مل جائے گا؟" ساجد نے بیگم کو صحن میں آتا دیکھ کر کہا۔

"کوئی چائے وائے نہیں ملے گی، رنگ دیکھا ہے اپنا چائے پی پی کر کیسا توے کی طرح سیاہ ہو گیا ہے۔" بیگم نے غصے سے کہا۔

"بیگم میرا ایک ہی شوق ہے چائے پینا۔"

"مہینے کا آخری ہفتہ چل رہا ہے، چائے کی پتی ختم ہونے کو ہے تمہیں چائے کے کپ پلاتی رہی تو پتی ایک ہی دن میں ہی ختم ہو جائے گی۔"

"دیکھ لو بیگم شاید ایک کپ چائے کی گنجائش نکل آئے۔" ساجد نے مسکین سی صورت بنائی۔

"کہہ جو دیا ہے کہ چائے نہیں ملے گی، میرے نصیب پھوٹ گئے تم سے شادی کر کے۔ اچھی بھلی شادی ہو رہی تھی دوسری جگہ خالہ بتول پتا نہیں کہاں سے ٹپک پڑی کہ شادی رشتہ داروں اور دیکھے بھالے لوگوں میں کرنی چاہیے اور تمہارے لیے مجھے مانگ لیا۔ کاش میری شادی فرحان سے ہو جاتی خوب عیش کرتی۔ کاروں میں گھومتی، اچھے اچھے ہوٹلوں میں کھاتے کھاتی جتنی تمہیں تنخواہ ملتی ہے اتنی تنخواہ کی میری ایک شاپنگ ہوتی۔" بیگم نے کہا۔

"یہ باتیں سنا سنا کر تم مجھے بار بار کیوں شرمندہ کرتی ہو۔"

"میں یہ باتیں اس لیے نہیں کرتی کہ تم شرمندہ ہو، میں تمہیں احساس دلاتی ہوں کہ تم زندگی میں کچھ کرو، ورنہ تم اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"میری ساری زندگی صحافت کرتے ہوئے گزر گئی۔ صحافت کے علاوہ مجھے کسی اور کام کا تجربہ بھی نہیں ہے۔" ساجد نے مایوسی سے کہا۔

"میں کب کہہ رہی ہوں اس عمر میں کوئی اور کام کرو، تم مالکان سے کہہ سکتے ہو کہ وہ تمہاری محنت کا معاوضہ زیادہ کر دیں۔" بیگم نے کہا۔

"بیگم ہم صحافیوں کی مثال ایسی ہے ہم خوب محنت کرتے ہیں لیکن جب مہینہ گزر جانے پر تنخواہ دینے کی باری آتی ہے مالک پہلے دس باتیں سناتا ہے کہ کام صحیح

طریقے سے نہیں ہو رہا ہے۔ کام میں مزید تیزی آنی چاہیے۔ دوسرے ادارے کے لوگ یہاں کام کم پیسوں میں کرنے کو تیار ہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ پرانے اسٹاف کو نکال کر نیا اسٹاف رکھوں۔ لہذا تم لوگ ایسا کام کرو کہ مجھے دوسرا اسٹاف رکھنے کی نوبت نہ آئے۔ یہ کہہ کر پھر ہمیں تنخواہ دیتا ہے۔ اس کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے ہم پر احسان کر رہا ہو۔"

"جب تمہیں معلوم تھا کہ یہ ایسا کام ہے تو جوانی میں ہی اپنا کام بدل لیتے؟"

"بیگم اخبار اور میگزین میں کام کرنے کا نشہ ہی ایسا ہے۔ چالیس سال تک نوکری میں آدمی خود کو بادشاہ سمجھ رہا ہوتا ہے اور وہ اپنے کام کو بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چالیس سال سے عمر زیادہ ہونے لگتی ہے تو اس کی سوچ کا زاویہ تبدیل ہونے لگتا ہے۔ جب وہ دوسرے لوگوں سے اپنا موازنہ کرتا ہے پھر اسے احساس ہوتا ہے اس نے اس کام میں وقت ضائع کر دیا ہے۔ اس کام کی جگہ کوئی دوسرا کام کر لیتا تو زندگی عیش میں گزرتی لیکن وقت گزرنے پر کچھ نہیں ہوتا۔ اس عمر میں آ کر ہاتھ پیر جواب دینے لگتے ہیں اور ہم اس کام سے بے زار ہو کر بھی کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔"

"میں نے ایسے ایسے صحافی بھی دیکھے ہیں۔ جنہوں نے بہت مال بنایا ہے۔" بیگم نے کہا۔

"ہاں زرینہ بیگم ایسے بہت سارے صحافی ہیں جنہوں نے بہت مال بنایا ہے لیکن ایسے صحافی دراصل پیشہ ور صحافی نہیں ہوتے وہ صحافت کی آڑ لے کر دوسرے ناجائز کام کرتے ہیں۔ لوگوں کو بلیک میل کرتے ہیں لیکن ایسے صحافیوں کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ کوئی ان کو گولی مار کر گاڑی کے نیچے کچل کر یا کسی اور آلے سے قتل کر دیتا ہے۔ ایسی خبریں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔"

"تم ہر بات کا کوئی نہ کوئی پہلے سے جواب گھڑ کر تیار رکھتے ہو جیسے ہی میری زبان سے کوئی جملہ نکلا کھٹ سے تم نے اس کا جواب دیا۔" بیگم پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

ساجد علی کو چائے کا کوئی آسرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے وہ تھکے اور بوجھل قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔ کچھ فاصلے پر اس کے دوست چمن کا بک اسٹال تھا ساجد کو آتا دیکھ کر وہ دور سے بولا۔

"ارے بھئی صحافی بھائی آ رہے ہیں۔"

"ہاں بھئی یہ ہم ہی ہیں' ہمارا بھوت نہیں ہے۔" ساجد علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آیئے ادھر بیٹھیے۔" چمن نے ساجد علی کو اسٹول دیتے ہوئے کہا۔

"میں چائے کا بول کر آتا ہوں۔" چمن نے کہا۔

"ارے رہنے دیں کیوں تکلف کر رہے ہو۔"

"کبھی کبھی آپ ہمارے بک اسٹال کو رونق بخشتے ہیں' ایسے میں چائے پلائے بغیر ہم آپ کو کیسے جانے دے سکتے ہیں۔ میں ابھی چائے کا بول کر آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے چمن چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں اسپیشل چائے کی تھالی تھی۔

"چائے لانے والا چائے دینے گیا ہوا تھا۔ اس لیے میں خود ہی چائے لے آیا۔" چمن نے کہا۔

چمن نے چائے تیار کر کے کپ میں چائے ڈال کر ساجد علی کو پیش کی۔

"ارے بھئی تم نے میرا کپ فل کر دیا ہے۔ اس کو کچھ کم کرو۔" ساجد علی نے کہا۔

"آپ کو ایک ہی شوق ہے چائے پینے کا ہم چائے پلا کر کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی کچھ خدمت کر لیں۔"

"اخبار والوں کو دو ہی شوق ہوتے ہیں چائے اور سگریٹ پینا۔ مجھے صرف چائے پسند ہے۔ کام کرتے ہوئے چائے کی بڑی طلب لگتی ہے احساس ہی نہیں ہوتا کہ کتنے کپ چائے کے پی لیے ہیں۔"

"بعض صحافی کہتے ہیں کہ ہم خیالات سے یکسوئی لانے کو سگریٹ پیتے ہیں۔ پریشان حال لوگ سگریٹ اس لیے پیتے ہیں خیالات منتشر نہ ہو جائیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کون سی بات درست ہی۔" چمن نے پوچھا۔

"دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔" ساجد علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

رات جب ساجد بستر پر سونے کو لیٹا۔ اسے اپنے آپ پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ دن بدن مہنگائی اور گھر کے اخراجات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بیگم آئے دن اس سے

جھگڑا کرنے لگی تھی کئی بار تنخواہ دینے پر اس نے تنخواہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

"میں اس تنخواہ میں گھر کا خرچ نہیں چلا سکتی۔ تم خود ہی گھر کا خرچہ چلاؤ۔"

"بیگم مجھے گھر چلانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"میں خود یہ چاہتی ہوں کہ تم گھر کا خرچ چلاؤ تاکہ اندازہ ہو کہ گھر کا خرچ اس تنخواہ میں نہیں چل سکتا۔" بیگم نے کہا۔

"بیگم تم اس ماہ تو کام چلاؤ پھر اگلے ماہ دیکھیں گے۔" ساجد کہتا۔

"اگلے ماہ بھی تم یہ ہی جملہ کہو گے۔" بیگم غصے سے کہتی۔

"اس ماہ تم میری بات رکھ لو پھر اگلے ماہ دیکھیں گے۔" ساجد زبردستی تنخواہ بیگم کو دے دیتا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر بیگم نے یہ کہہ کر تنخواہ لی تھی کہ آئندہ ماہ وہ تنخواہ نہیں لے گی۔ اچانک اسے کامران سے ملاقات یاد آ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور وہ جگہ دیکھی جہاں اس نے کامران کا وزیٹنگ کارڈ رکھا تھا۔ کارڈ موجود تھا۔ ساجد نے کارڈ پر درج نمبر موبائل پر ملائے۔

"ہیلو۔" کامران کی آواز آئی۔

"کامران میں ساجد علی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں ساجد کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں مگر میرے مالی حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔"

"مجھ سے رابطے میں آ جاؤ میں شرطیہ کہہ رہا ہوں تمہاری پریشانی کے دن ختم ہو جائیں گے۔"

"میں خود بھی اس زندگی سے اکتا گیا ہوں اور اچھی زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں۔" ساجد علی نے کہا۔

"میں تمہاری چھٹی ہونے پر تمہیں لے لوں گا۔ پھر ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" کامران نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔" ساجد نے کہا۔

دوسرے دن کامران حسب وعدہ ساجد کو لینے پہنچ گیا اور ایک شاندار ہوٹل سے انہوں نے ڈنر کیا۔ دوران گفتگو اس نے پھر طالب علمی کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر ساجد نے گفتگو میں حصے لیا پھر وہ اکتا گیا۔

"کامران تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟" ساجد علی نے پوچھا۔

"کل تم میرے آفس آنا میں اپنے باس سے تمہاری ملاقات صحافی کی حیثیت سے کراؤں گا۔ تمہیں بس میری ہاں میں ہاں ملانی ہے اور تمہیں ایک اسکول کی تعمیر کرنے کا ٹھیکہ مل جائے گا۔" کامران نے کہا۔

"مجھے ٹھیکے داری کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور میں پیسے کہاں سے لاؤں گا۔" ساجد نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ ٹھیکے کے سارے معاملات میں دیکھوں گا۔ تم صرف چھٹی والے دن آ کر مزدوروں کو اپنا چہرہ دکھا دیا کرنا۔ تین ماہ میں اسکول تعمیر ہو جائے گا اور ٹھیکے کا جو چیک ملے گا اس کے منافع میں ہم دونوں آدھے آدھے کے حصے دار ہوں گے۔" کامران نے کہا۔

"تمہارے باس مجھے ٹھیکہ دے دیں گے۔" ساجد بدستور حیرت زدہ تھا۔

"کل آ کر مجھ سے ملاقات کرو پھر خود دیکھ لینا۔ کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔

دوسرے دن جب کامران نے ساجد کی اپنے باس قاسم سے ملاقات کروائی وہ اسے دیکھ کر خاصا ڈرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ کامران بول رہا تھا اور باس قاسم ہاں ہاں کر رہا تھا۔ جب ساجد اٹھنے لگا تو باس کامران سے مخاطب ہوا۔

"ساجد صاحب کو سمجھا دینا کہ یہ سرکاری ٹھیکے ہوتے ہیں اس میں بڑی دیکھ بھال سے مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے ورنہ مزدور ایسا کام دکھاتے ہیں کہ ٹھیکے دار کو بھی پھر انکوائری کمیٹیوں کے سامنے پیش ہوتے رہنا پڑتا ہے اور چیک الگ رک جاتے ہیں۔"

"ساجد صاحب بہت سمجھ دار آدمی ہیں یہ ان کا پہلا ٹھیکہ نہیں ہے اس سے پہلے بھی کئی ٹھیکے لے چکے ہیں۔" کامران نے بتایا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" باس قاسم نے کہا۔
آفس سے باہر آنے پر کامران نے ساجد کو ٹھیکہ مل جانے کی مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔
"لو بھئی تمہارے برے دن ختم اور عیش کے دن شروع ہوگئے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے باس سے کہا کیا تھا جو وہ اس قدر سہمے ہوئے تھے۔"
"میں نے کیا کہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے کامران نے زوردار قہقہہ لگایا۔
"میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ تم نے اپنی رپورٹنگ سے کئی ڈائریکٹروں کے خلاف انکوائریاں بٹھادی ہیں۔ بعض کو جبری رخصت پر گھر بھجوادیا ہے۔ ساجد کے پاس ہمارے خلاف ایک اسٹوری ہے اگر وہ اخبار میں چھپ گئی تو پھر ہماری فائل کھل جائے گی۔ بس اسٹوری کا نام سن کر باس نے فوری طور پر تمہیں ٹھیکہ دے دیا۔"
اور وہ اسٹوری کون سی ہے؟" ساجد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"باس نے پوچھا ہی نہیں اور اگر پوچھ بھی لیتا تو میں گھر کا بھیدی ہوں کوئی بھی باس کا راز مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ تازہ ترین باس کے کارنامے کے متعلق بتا دیتا کہ وہ ساجد کو پتا چل گیا ہے اور ساجد اس کارنامے کو اسٹوری کی صورت میں چھاپ دے گا اور تمہارا اخبار بھی ایسا ہے کہ اس میں خبر چھپتے ہی انکوائری شروع ہوجاتی ہے۔" کامران نے بتایا۔
"ہاں ہمارے اخبار کے رپورٹر خبریں لانے میں بہت محنت کرتے ہیں اور ان کی خبریں بڑی مستند ہوتی ہیں اسی لیے حکومت کو ان کی خبروں پر نوٹس لینا پڑتا ہے۔" ساجد نے کہا۔
شام کو گھر پہنچ کر جب ٹھیکہ ملنے کی خبر بیگم کو سنائی وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
"اب تم اخبار کو چھوڑ کر توجہ سے ٹھیکے داری پر توجہ دو تاکہ بڑے ٹھیکے ملنے لگے اور ہماری غربت کے دن پھر جائیں۔"
"بیگم تم بے فکر ہوجاؤ۔ میں بہت جلد اخبار کو خیر باد کہہ دوں گا۔ بس ذرا یہ کام چل نکلے پھر دیکھو میں کیا

کرتا ہوں۔'' ساجد نے کہا۔
بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ شام کی چائے بھی انہیں زبردست ملی تھی۔ چائے پی کر ساجد علی کا دل خوش ہو گیا تھا۔
ساجد علی کو اسکول کا ٹھیکہ ملا تھا وہ اس کے دفتر کے قریب ہی تھا اس لیے وہ تقریباً روز ہی اسکول کی تعمیر کا معائنہ کرنے کچھ وقت کے لیے چلا جاتا تھا۔
کامران بھی ساجد سے خوش تھا کہ وہ ٹھیکے میں دل چسپی لے رہا ہے تین ماہ میں مکمل ہو جانے پر اسکول کی تعمیر مکمل ہو گئی اور پھر ٹھیکہ مکمل ہو جانے پر اسے دوسرا ٹھیکہ مل گیا۔ وہ ایک ہائی اسکول کا ٹھیکہ تھا۔ یہ ٹھیکہ اسے چھ ماہ کے اندر مکمل کر کے دینا تھا۔ ساجد ٹھیکہ مل جانے پر خوش بھی تھا اور فکر مند بھی کہ ابھی پہلے ٹھیکے کے پیسے ملے نہیں ہیں دوسرا ٹھیکہ بغیر پیسوں کے کس طرح مکمل ہو گا۔
کامران اس کی پریشانی کو بھانپ گیا اور بولا۔
''ساجد تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ ٹھیکہ مل گیا ہے اور اسے مکمل کرنے کے لیے میرے پاس پیسے کہاں سے آئیں گے؟''
''ہاں تم نے ٹھیک کہا ہے میں یہ ہی سوچ رہا ہوں کیوں کہ سرکاری کاموں کے ٹھیکے زیادہ تر لوگ اس لیے نہیں لیتے کہ ان کے پیسوں کی ادائیگی بہت لیٹ ہوتی ہے۔'' ساجد نے کہا۔
''ہاں جن کی افسران سے سیٹنگ نہیں ہوتی۔ انہیں واقعی چیک بہت ہی لیٹ ملتے ہیں۔ بعض ٹھیکے دار تو کانوں کو ہاتھ لگا لیتے ہیں کہ آئندہ پھر کبھی وہ سرکاری ٹھیکہ نہیں لیں گے۔''
''پھر بھی تم مجھے اس کام میں گھسیٹ لائے۔'' ساجد نے حیرت سے کامران کو دیکھا۔
''تم ان خوش نصیبوں میں سے ہو جن کی افسران سے سیٹنگ ہوتی ہے۔ اسی لیے ادھر تمہارا ٹھیکہ مکمل ہوا اور ٹھیکے کے پیسے بھی مل گئے ہیں۔''
''کیا واقعی؟'' ساجد حیرت سے بولا۔
''ہاں بھئی یہ دیکھو چیک مل گیا ہے اسے میں کل بینک میں جمع کرا دوں گا۔ دو چار دن میں ہمیں پیسے مل جائیں گے۔'' کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

چیک دیکھ کر ساجد علی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔
حسب وعدہ کامران نے ساجد علی کو منافع کی آدھی رقم دے دی۔ وہ رقم اسے سال بھر میں ملنے والی تنخواہ سے بھی زیادہ تھی۔ جب ساجد علی نے وہ رقم اپنی بیگم کے ہاتھوں میں رکھی وہ بھی دنگ رہ گئی۔
''اتنی رقم منافع کی مد میں ملی ہے۔'' بیگم حیرت سے بولی۔
''ہاں بیگم ہماری غربت کے دن پھر گئے ہیں۔ ساجد علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بیگم اب تو خرچے پر جھگڑا نہیں ہو گا ناں؟''
''جھگڑا کیوں ہو گا۔ سارے فساد کی جڑ مہنگائی ہے۔ مہنگائی کے سبب تنخواہوں میں گزارا کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اسی لیے گھروں میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ جب ٹھیکے داری سے اتنی رقم ملنے لگے گی تو پھر کسے شوق آ رہا ہے فضول میں جھگڑا کرنے کا۔'' بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔
ساجد کے دوسرے ٹھیکے کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے ٹھیکے میں ساجد کی دل چسپی بڑھ گئی تھی وہ اس کام کو زیادہ وقت دے رہا تھا اس کی دل چسپی دیکھ کر کامران بھی خوش ہو رہا تھا۔
''ساجد یہ تم بہت اچھا کر رہے ہو اس سے تمہیں مستقبل میں بہت فائدہ پہنچے گا۔'' کامران نے ساجد علی سے ملاقات ہونے پر کہا۔
''میں اس کام کی باریکیوں کو سمجھنا چاہتا ہوں تا کہ مستقبل میں مجھے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔'' ساجد نے کہا۔
''بالکل سیکھو جب تم اس قابل ہو جاؤ کہ اپنا سرمایہ ٹھیکے پر لگا سکو پھر تمہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔'' کامران نے کہا۔
ساجد علی کے اسکول کے ٹھیکے کا کام تیزی سے چل رہا تھا اور اپنی مدت میں مکمل بھی ہو گیا۔ اس کے مکمل ہوتے ہی اسے سرکاری آفس بنانے کا ٹھیکہ مل گیا۔ دوسرے ٹھیکے سے انہیں جو بچت ہوئی تھی وہ پہلے ٹھیکے سے ڈبل ہوئی تھی۔ ساجد نے اب اپنی بچت کے لیے ایک اکاؤنٹ بھی کھول لیا تھا اور ٹھیکے سے ہونے والی آمدنی

اس میں رکھنے لگا تھا۔

آہستہ آہستہ ساجد علی ٹھیکے سے متعلق تمام معاملات سیکھ گیا تھا کہ کون سا کام کیسے ہوگا۔ اخبار میں رہنے کا یہی اسے فائدہ ہوا تھا۔ اسے ٹھیکے پر ٹھیکے ملتے رہے اور ایک ہی وقت میں اس کے دو دو تین ٹھیکے چل رہے تھے۔ پیسے کی ریل پیل ہوگئی تھی۔ وہ اپنا کرائے کا مکان چھوڑ کر ایک بڑے سے ذاتی بنگلے میں شفٹ ہو چکا تھا۔ اسے اکثر اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا تھا کہ کہاں وہ چند روپوں کے لیے ترستا تھا اور اب لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

بچے بھی اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور پھر ساجد علی نے ایک دن اس اخبار سے جان چھڑانے کا فیصلہ کرلیا جس میں کام کرتے ہوئے وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کے بجائے خواہشوں کا گلا گھونٹتا رہا تھا۔ ساجد سب سے پہلے یہ خبر کامران کو سنانا چاہتا تھا اور اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کی مدد نہ ملتی تو وہ کبھی اس اخبار سے جان چھڑانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ ساجد نے جب کامران کو یہ خبر سنائی تو سن کر خوش ہونے کے بجائے وہ پریشان ہوگیا۔

''تم اخبار کیوں چھوڑنا چاہ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ میں پورا وقت ٹھیکے کو دے سکوں۔'' ساجد علی نے کہا۔

''کیا تمہارے اخبار میں ہونے سے کوئی ٹھیکہ متاثر ہو رہا ہے؟''

''نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔''

''پھر کیوں ایسی بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہے ہو؟'' کامران نے کہا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے اب اخبار کی ضرورت نہیں رہی۔'' ساجد علی نے کہا۔

''اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اخبار سے وابستہ رہنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ٹھیکے تمہاری صلاحیت کی وجہ سے مل رہے ہیں؟'' کامران نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تو پھر کس وجہ سے مل رہے ہیں؟''

''اخبار کی وجہ سے مل رہے ہیں۔ تمام سرکاری ڈیپارٹمنٹ میں جو تمہارے کام دنوں میں ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی اخبار کے توسط سے ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ یہی کام جو دنوں میں ہو رہے ہیں مہینوں چکر لگانے پر بھاری رشوت دے کر ہوں گے۔'' کامران نے کہا۔

''پھر میں کیا کروں؟''

''اخبار کو چھوڑنے کی بالکل بھی حماقت نہیں کرنا' اس اخبار میں اگر مفت میں بھی تمہیں کام کرنا پڑے تو کرو۔ لیکن اخبار کی نوکری مت چھوڑنا ورنہ پھر تم واپس اسی پوزیشن میں آجاؤ گے جہاں سے چلے تھے۔'' کامران نے کہا۔

وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ یہ بات ساجد بھی سمجھتا تھا کہ اس میں ایسی کوئی قابلیت نہیں تھی جس کی بناء پر اسے ٹھیکے مل رہے تھے۔ جب کہ دوسرے ٹھیکے دار ٹھیکے کی خاطر خوب بھاگ دوڑ کرتے تھے۔ مگر ہر بار ساجد کی پیش کش میں تمام ٹھیکے داروں سے کم رقم ہوتی تھی۔ اسی لیے اس کا ٹھیکہ فوری منظور ہو جاتا تھا۔ اس کی پیش کش میں رقم سب سے کم ہونے کا راز صرف کامران کو ہی معلوم تھا۔ باقی لوگ اس علم سے ناواقف تھے۔

ساجد نے بہت سوچ بچار کر اخبار چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا وہ دھرا رہ گیا۔ اب اس نے نیا فیصلہ کیا تھا کہ اسے اخبار میں رہنا ہے کیوں کہ اخبار اب اس کی مجبوری بن گیا ہے جو چیز انسان کی مجبوری بن جائے اس سے نجات حاصل کرنا بے وقوفی ہی ہوگی۔

منزلِ مراد

امجد جاوید

کچھ فیصلے انسان خود کرتا ہے ان فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے وہ نجانے کیا کیا پلان تیار کرتا ہے یہ سوچے بنا کہ قدرت نے اس کے لیے کیا پلان تیار کر رکھا ہے۔
انسانی منصوبوں اور قدرت کے فیصلوں کے درمیان جنم لینے والی ایک انوکھی داستان۔
دولت کی ہوس میں انسانیت سے گر جانے والے ایک جوڑے کی روداد۔
رشتوں کی حرمت کا پاس اور لحاظ رکھنے والے ایک نوجوان کا فسانۂ عجیب۔

معروف لکھاری امجد جاوید کی نوک قلم سے جنم لینے والا ایک خوب صورت فسانہ

سرمئی بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ موسم بہار کی پہلی بارش سے ہر شے نکھر گئی تھی۔ اگرچہ سہ پہر کا وقت تھا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے شہر پر شام اتر آئی ہو۔ سڑکیں بھیگ کر زیادہ سیاہ ہو گئی تھیں۔ ایسے میں رضا سلمان نے سڑک کنارے موجود پھولوں کے ایک اسٹال کے پاس اپنی گاڑی روک دی۔ اسے رکتے دیکھ کر اسٹال والے نے تیزی سے پھولوں کا گلدستہ بنایا اور گاڑی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ رضا نے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولا، اس نے گلدستہ وہاں رکھ دیا۔ رضا نے ایک بڑا نوٹ اسے دیا تو وہ سلام کرتے ہوئے دروازہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ رضا نے گاڑی بڑھا دی۔ وہ جلد از جلد قبرستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کا پاپا سلمان اشرف ابدی نیند سو رہا تھا۔ رضا کا گذشتہ ہفتے سے یہی معمول تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پاپا یوں بچھڑ جائیں گے۔ وہ لندن سے پہلی دستیاب فلائٹ سے یہاں پہنچا تو پاپا کا جنازہ تیار تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں سپرد خاک کیا تھا۔ سارا دن وہ تعزیت کے لیے آنے والوں سے ملتا رہتا۔ سہ پہر ہوتے ہی وہ قبرستان کا رخ کرتا۔ وہاں تھوڑا وقت گزار کر اسے سکون ملتا تھا۔

رضا نے قبرستان کے باہر پھاٹک کے پاس گاڑی روکی، گلدستہ اٹھایا اور قبرستان کے اندر چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک بڑا سا شہر خموشاں تھا۔ وہ پختہ روش پر آگے بڑھتا گیا۔ جبکہ اس کے پاپا کی قبر ابھی کچی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا، اس کی نگاہ ایک سیاہ پوش لڑکی پر پڑی جو بڑی شدت سے رو رہی تھی۔ سرمئی بادلوں اور سبز بیلوں کے پس منظر میں وہ سیاہ لباس پہنے، گلابی چہرے والی لڑکی ہر طرف سے بے نیاز یوں شدت سے رو رہی تھی کہ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اسے لگا جیسے آسمان سے بارش تھمی تو اس لڑکی کی آنکھوں سے جاری ہو گئی ہے۔ وہ رک گیا اور پوری محویت سے اس کی شدت گریہ دیکھتا رہا۔ فطری طور پر اس نے سوچا کہ یہ کون ہے؟ ضرور کوئی گہرا جذباتی تعلق ہوگا۔ تبھی آنسو اتنی تیزی سے رواں ہے۔ اس لڑکی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر کے سینے کے قریب چادر کو پکڑا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد اس لڑکی نے خود پر قابو پا لیا۔ پھر اپنی مخروطی انگلیوں سے گالوں پر آئے آنسو صاف کیے اور دھیرے سے مڑی۔ اس کی نگاہ سامنے کھڑے رضا پر پڑی تو وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔ کتنے ہی لمحے وہ اس کے چہرے پر سے نگاہیں نہ ہٹا پائی۔ وہ یوں بے جان بت کی مانند بن گئی جیسے اس نے کچھ انہونا دیکھ لیا ہو۔ چند لمحوں میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گذر گئے۔ جس سے رضا بوکھلا سا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا، وہ لڑکی ایک جھٹکے سے رخ پھیر کر اس کے قریب سے ہوتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ رضا نے متجسس نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر موجود سکھ چین کے درختوں کے پاس کھڑی ادھیڑ عمر خاتون کے پاس جا کر رکی۔ اس سے پرس لیا اور قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر چل دی۔

انہی لمحات میں رضا کو احساس ہوا کہ اس کے پاپا کی قبر پر آنے والے لوگ، اس کے لیے محترم ہیں۔ اخلاقی تقاضا یہی تھا کہ وہ ان کے قریب جاتا اور کسی بھی انداز سے ان کا شکریہ ادا کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاپا بہت سارے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ لوگ انہی احسان مندوں میں سے ہوں۔ اس نے گلدستہ اپنے پاپا کی قبر پر رکھا اور پھر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا، اس ادھیڑ عمر خاتون کے پاس جا کر سلام کیا۔ خاتون نے آنکھیں بند کر کے بڑے جذب سے جواب دیا۔ تب رضا نے بات بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ اور؟''

''میں بلقیس خاتون ہوں اور وہ میری بیٹی ہے۔'' اس نے اختصار سے جواب دیا۔

''آپ دونوں یہاں۔'' اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آئی تھی۔'' اس نے کہا تو وہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ ان چند لفظوں نے اسے پورے وجود سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''اپنے باپ کی قبر پر...... مطلب...... آپ۔'' اس

نے الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ خاتون چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بنا کچھ کہے پلٹ کر اسی جانب بڑھ گئی، جدھر اس کی بیٹی گئی تھی۔ رضا حیرت زدہ سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پاپا نے دوسری شادی کی ہوگی؟ اولاد میں ایک جوان لڑکی بھی ہو گی، جیسے اس نے چند لمحے قبل دیکھا ہے اور یہ سامنے کھڑی خاتون اس کی سوتیلی ماں تھی۔ وہ ایک ایسے شاک میں تھا جس نے وقتی طور پر اس کی ساری سوچیں مفلوج کر کے رکھ دی تھیں۔ اس کا پاپا تو اس کی نگاہوں میں ایسے کردار کا مالک تھا کہ جس کی قسمیں کھائی جا سکتی تھیں اور یہ......اس نے دیکھا، دونوں نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ تبھی اسے خیال آیا کہ اس کے پاپا سے اتنی قربت رکھنے والے یہ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟ یہ تو معلوم کرے، وہ تیزی سے ان کی جانب لپکا۔ جیسے ہی وہ بیرونی پھاٹک تک پہنچا۔ وہ ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی گاڑی میں سوار تھیں، جو رینگتے ہوئے تیز ہوگئی تھی۔ اس نے زور سے آواز دی، لیکن وہ نہیں رکیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ جا چکی تھیں۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ واپس اپنے پاپا کی قبر پر آ گیا۔

رضا کے اندر ہلچل مچ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لمحوں میں سب کچھ بدل گیا ہو۔ اعتماد ٹوٹ جانے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت ایسی ہی کیفیت سے گذر رہا تھا۔ وہ فاتحہ پڑھنے لگا۔ اس کی دعا میں وہ پہلے والا جذب نہیں تھا بلکہ جذب کو شک کا دیمک لگ گیا تھا۔ بلقیس خاتون کے لفظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ قبر اسے جواب نہیں دے سکتی تھی کہ وہ مطمئن ہو جاتا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر پلٹ کر قبرستان سے نکلتا چلا گیا۔

رضا سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی ماما شبانہ بیگم سے پوچھ سکتا تھا کہ پاپا نے دوسری شادی کی تھی؟ جواب ہاں میں ہوتا یا ناں میں، اس کی ماما پر کیا گذرتی، اس کا وہ احساس کر سکتا تھا۔ عورت چاہے جیسی بھی ہو، جیسے طبقے سے بھی تعلق رکھتی ہو۔ اپنے مرد کے ساتھ کسی دوسری عورت کا ذکر سن کر کبھی پرسکون نہیں رہ سکتی۔ اسے تحمل اور صبر سے خود اس سارے معاملے کو دیکھنا تھا۔ اگر اس عورت نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے تو اس کے پاس ثبوت بھی ہوں گے۔ اس کے پاپا کی دوسری شادی ثابت ہو جاتی ہے یا نہیں۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اسے تجسس ہو گیا تھا کہ اس کے پاپا کی زندگی کیسے گذری تھی۔ ایک دکھ کا احساس رضا پر تن گیا تھا، آخر پاپا نے ہم سے یہ بات کیوں چھپائی۔ کیا مجبوری تھی ان کی، کیسے حالات تھے ان کے ساتھ، جو وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو دنیا کے سامنے نہیں لا سکے۔ اب اگر وہ عورت اپنے دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے آ جاتی ہے تو کیا ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں گے، مان جائیں گے؟ اور انہیں تسلیم کر لیں گے۔ اس کے لیے سوچوں کا در، وا ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت اپنی ماما کو اس معاملے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ جب تک وہ خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتا تھا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ قدرے پرسکون ہو گیا تھا۔

رضا کی اپنے پاپا کے آفس میں مصروفیات بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اسے بہرحال اپنے پاپا کی محنت پر رشک آ رہا تھا۔ پاپا نے کتنی محنت کی تھی، اس کا اندازہ ان کے اثاثوں سے ہو رہا تھا۔ اور وہ خوشگوار حیرت میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پاپا کی زندگی کے بارے میں بھی جاننا چاہتا تھا۔ سو پاپا کے قریبی ساتھیوں اور پرانے ملازمین کو زیادہ قریب رکھتا تھا۔ انہی میں ایک فیض الدین بھی تھا۔ جس نے سب سے زیادہ سلمان اشرف گذارا تھا۔ اور شنید یہی تھی کہ پاپا راز و نیاز اسی سے کرتے تھے۔

اگلی سہ پہر اس نے فیض الدین کو اپنے آفس میں بلا لیا۔ چائے کے دوران گپ شپ میں اس نے اپنے پاپا کی باتیں چھیڑ دیں۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے پوچھا۔

”فیض صاحب۔! پاپا کے ساتھ آپ کی طویل رفاقت رہی ہے۔ کیا آپ کے علم میں کوئی ایسا معاملہ ہے کہ انہوں نے دوسری شادی کی ہو؟“

فیض الدین چند لمحے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس دوران رضا کا دل دھڑکتا رہا۔ وہ ہاں یا ناں کے درمیان

اعصاب کو جھنجوڑ دینے کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ تبھی اس نے سر اٹھایا اور آہستگی سے بولا

''جی ہاں، انہوں نے دوسری شادی کی تھی۔ آپ اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ آپ کو تو اولیول کے بعد لندن بھیج دیا گیا تھا۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کو بھی نہیں بتایا کہ بات چھپی ہے تو چھپی رہے یہاں تک کہ وہ دنیا میں نہیں رہے۔''

''دوسری شادی کرنا کوئی جرم نہیں، لیکن دوسری شادی چھپانے کی انہیں مجبوری کیا تھی۔'' رضا نے انتہائی سکون سے کہا۔

''دیکھیں، میں اتنی تفصیل تو نہیں جانتا۔ ہاں وہ کبھی کبھار کافی رقم لیا کرتے تھے اور چند دن کے لیے اپنی دوسری بیگم کے پاس جاتے تھے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں۔ باقی وہ کون ہیں، کہاں رہتی ہیں۔ میں اس بارے میں نہیں جانتا۔'' فیض الدین نے بے چارگی سے کہا۔

''میں اس خاتون سے ملا ہوں اور اس کی بیٹی کو بھی دیکھا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے قبرستان والا واقعہ بیان کر دیا۔ اس دوران فیض الدین خاموشی سے سنتا رہا۔ ''اس وقت میرا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا ایسا کوئی ذریعہ ہے کہ ہم انہیں تلاش کر لیں؟''

''مگر میرا خیال ہے کہ انہیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے وہ خاتون اور لڑکی اگر سلمان صاحب کی بیگم اور بیٹی ثابت ہو گئیں تو جائیداد میں بھی حصہ دار بن جائیں گی۔ وہ تو اگر سامنے آ کر بھی دعویٰ کریں تو آپ انہیں تسلیم نہ کریں۔'' فیض الدین نے خلوص سے مشورہ دیا۔

''پتہ نہیں پاپا کے ساتھ کیسے حالات تھے۔ بات جائیداد کی نہیں، ان سے ہمارے تعلق کی ہے، کیا سلمان اشرف کی بیوی اور بیٹی کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ پھر اگر جائیداد میں ان کا حق ہے تو وہ انہیں ملنا چاہیے۔ فیض صاحب سمجھیں، وہ ہمارے قریبی رشتے دار ہیں۔'' رضا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں اب وہ خود ہی سامنے آ جائیں تو۔'' اس نے حیرت اور بے بسی سے کہا۔

''کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ ہم انہیں تلاش کر لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں عدالت میں یا کسی ایسے فورم پر ملیں، جہاں ہمارا یا ہمارے خاندان کا تاثر غلط چلا جائے۔ مگر یہ ساری باتیں قبل از وقت ہیں۔ ہمیں ان سے مل کر کوئی بات تو کرنی چاہیے۔'' اس نے اپنا نکتہ نظر کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک پرانا ڈرائیور تھا۔ وہی صاحب کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ آپ دو چار دن دیں۔ میں انہیں تلاش کر لیتا ہوں۔'' فیض الدین نے حتمی انداز میں کہا

''لیکن انتہائی رازداری کے ساتھ، پھر بعد میں جو ہو گا، وہ دیکھا جائے گا۔'' رضا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو فیض سر ہلا کر رہ گیا۔

❀❀❀

زاریہ کاریڈور میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ روشن دن کی نرم دھوپ اس کے گورے پیروں سے ذرا فاصلے پر تھی۔ عنابی رنگ کے لیدر سلیپر اور اسی رنگ کے ریشمی لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا آنچل کرسی سے ڈھلک کر آہستگی سے چلنے والی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تازہ اخبار تھا مگر وہ اسے نظر انداز کیے اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر فوراً توجہ حاصل کر لینے والے اس کے ہونٹ تھے۔ سرخ لعلیں ہونٹ، جن کے دائیں جانب نیچے کی طرف سیاہ تل تھا۔ غلافی آنکھوں میں ایک بے طرح کی اداسی اتری ہوئی تھی۔ تیکھے ناک میں لونگ کی جگہ ہلکی سی سونے کی تار تھی۔ لمبے اور گھنے سیاہ بالوں کی کس کر باندھی ہوئی چوٹی سے اس کا ماتھا بڑا کشادہ لگ رہا تھا۔ مجموعی طور پر اس کے حسن میں ایسا تاثر تھا جس میں کھو جانے کی حسرت جھلک رہی ہو۔ حالانکہ گداز بدن والی زاریہ کو دیکھ کر تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ نجانے اپنی سوچوں میں آباد کس دنیا میں موجود تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا جسم تو یہیں ہو لیکن اس کی روح کہیں اور چلی گئی ہو۔

''ناشتہ کرلیا تم نے زاریہ؟'' عقب سے بلقیس خاتون کی آواز آئی تو اس کی سوچوں کا سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔

''جی...... جی ہاں...... کرلیا۔'' اس نے چونکتے ہوئے کہا تو بلقیس نے کھڑے کھڑے کہا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''خیر۔! مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ رضا آج کسی بھی وقت یہاں آئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بڑبڑاتے ہوئے خودکلامی کے انداز میں بولی۔ ''میرے حساب سے اس نے چار دن زیادہ لے لیے ہیں۔''

''کیا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نہ آئے۔'' زاریہ نے آہستگی سے پوچھا۔

''ممکن ہی نہیں ہے۔ کیا تم نے اس کا اضطراب نہیں دیکھا تھا۔ کیسے بھاگتا ہوا پھاٹک تک آیا تھا۔ میں اس کے سکون میں جو چنگاری لگا آئی ہوں۔ وہ بھڑکے نہ۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ آرہا ہے۔ تم تیار رہنا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''آپ نے ہی تو کہا ہے کہ میں اس کا سامنا نہ کروں اور نہ ہی اس سے کوئی بات کروں۔ پھر میں نے کیا تیار ہونا ہے۔'' وہ مضطرب لہجے میں بولی۔

''ہوسکتا ہے تمہارا اور اس کا سامنا ہو ہی جائے۔ کوئی بات کرنی پڑ جائے۔ تم نے وہی کرنا ہے، جو تمہیں کہا گیا ہے۔'' بلقیس نے یوں کہا جیسے اسے سرزنش کر رہی ہو۔

''ویسے ماما! کوئی عقل مند بندہ یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی جائداد کسی دوسرے کو جائے۔ وہ تو ایسے کسی بھی رشتے دار سے انکار کردے گا۔ جس کے باعث جائداد جاتی ہوئی نظر آئے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''یہ میرا معاملہ ہے، میں کیا کرتی ہوں اور کیسے کرتی ہوں، یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ وہ آج کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔'' وہ اعتماد سے بولی۔

''میں تو ابھی آفس چلی جاؤں گی۔ اس دوران وہ آ کر چلا جائے تو مجھے بتا دیں۔ ورنہ میں عاتکہ کی طرف چلی جاؤں گی۔ وہیں سے لیٹ آؤں گی۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔ تمہارا اور اس کا سامنا ہی نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا اور اندر کی جانب چلی گئی۔ تب زاریہ کے چہرے پر کرب پھیل گیا۔ ان نے چند لمحے اخبار کی طرف دیکھا۔ پھر وہیں ایک طرف رکھ کر اندر چلی گئی۔ وہ آفس کے لیے تیار ہونے چل دی تھی۔

❁❁❁

دوپہر سے پہلے ہی رضا ان کے ہاں چلا گیا۔ اس کا چہرہ کسی بھی جذبے سے عاری تھا۔ بلقیس خاتون نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ اس دن فوراً ہی وہاں سے آگئیں۔ ورنہ میں جلد ہی آپ سے ملنے کے لیے آجاتا۔ دراصل مجھے آپ کو تلاش کرنا پڑا۔'' رضا نے بات کا آغاز کیا۔

''کیوں، کیوں تلاش کیا تم نے؟'' بلقیس بیگم کی آواز میں حیرت تھی جیسے رضا کی تلاش سے کوئی سروکا نہ ہو۔

''ظاہر ہے آپ نے پاپا کے حوالے سے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے تو۔'' اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''دیکھو۔ میرا تعلق سلمان صاحب سے تھا۔ ان کے حوالے سے جتنے بھی تعلق ہیں۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں، میں کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔'' اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں، ایسا کیوں، سوچ رہی ہیں آپ؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''تمہارے اس سوال سے تمہاری بے جا ضد ظاہر ہورہی ہے۔ ہم اپنی زندگی میں خوش ہیں۔ پہلے کی طرح میں اب بھی گمنامی کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ہنوز اکتاہٹ ہی سے کہا

''دیکھیں، کسی سے تعلق رکھنا یا نہ رکھنا آپ کا ذاتی

معاملہ ہے۔ لیکن آپ سلمان اشرف کی بیوہ ہیں، جو میرے پاپا ہیں۔'' وہ جذباتی انداز میں بولا تو بلقیس خاتون نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''دیکھو بیٹا! تمہارے پاپا سے میری شادی کچھ ایسے حالات میں ہوئی، جنہیں بہر حال نارمل نہیں کہا جا سکتا۔ میرا ان سے شرعی نکاح تھا۔ اس نکاح کا کوئی دستاویزی ثبوت اگر تھا بھی تو وہ میرے پاس نہیں ہے۔ دو گواہ تھے، جن میں ایک زندہ ہے اور دوسرا فوت ہو گیا۔

''یہ کیسے ہوا؟ کیسے حالات تھے وہ، نکاح کیوں ضروری ہو گیا تھا؟'' اس نے اضطرابی انداز میں کئی سوال کر ڈالے تو بلقیس خاتون نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں تمہارے ان سوالوں کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، اب کیا حاصل۔''

''نہیں، میں مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں میرے پاپا کی زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔'' رضا نے تیزی سے کہا، تب بلقیس خاتون کتنی دیر خاموش رہی پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی تو کہتی چلی گئی۔

وہ نرس تھی اور ان دنوں اسے نرسنگ کرتے ہوئے دو برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ جب سلمان اشرف ان کی گلی میں اپنے دوست کے پاس آن ٹھہرا تھا۔ سلمان اشرف پر ان دنوں کوئی مقدمہ تھا۔ وہ چھپنے کے لیے اپنے شہر سے اُن کے شہر میں آ گیا تھا۔ بلقیس خاتون کو وہ اچھا لگا اور وہ اس میں دلچسپی لینے لگی۔ وہ ان دنوں اتنا امیر نہیں تھا تاہم اس کی شخصیت زیادہ جاذب نظر تھی۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آن پہنچی کہ انہیں شادی کر لینے کا احساس ہو گیا۔ مگر حالات ایسے نہیں تھے کہ ان کی شادی ہو سکتی۔ سو کسی بھی متوقع گناہ سے بچنے کے لیے انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ خاموشی سے نکاح کر لیا جائے۔ بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا۔ ان کا نکاح ہو گیا۔ وہ کچھ عرصہ یونہی رہے۔ اس دوران بلقیس خاتون کے ہاں زاریہ پیدا ہونے والی ہو گئی۔ پھر اچانک ایک دن سلمان اشرف کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ بلقیس خاتون نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا اور وہ سلمان اشرف کا انتظار کرنے لگی۔ دو برس کے بعد وہ واپس آیا۔ تب پتہ چلا کہ جب ان دونوں کا نکاح ہوا تھا اس وقت اس کی پہلے شادی ہو چکی تھی اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ بلقیس خاتون نے اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ تاہم غلط بیانی کے باعث اس نے سلمان اشرف سے قطع تعلق کر لیا۔ یوں دن گزرتے گئے۔ وہ اپنے شہر میں رہی اور سلمان اشرف اپنے شہر میں۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ دونوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ یہاں تک کہ دو برس قبل وہ یہاں اس شہر میں آ کر آباد ہو گئے۔ جس کی وجہ زاریہ کی تعلیم تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ زاریہ کے لیے کچھ کر جاتے، وہ اچانک دنیا چھوڑ گئے۔ ''مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ میری قسمت ہی ایسی تھی۔ اب مجھے کسی شے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زاریہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اب بس یہی میری تمنا ہے۔ اسے کسی بھی اچھے گھر میں رخصت کرنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔'' بلقیس خاتون نے بڑے سکون سے کہا۔

''اتنا کچھ...... مطلب پاپا نے......؟'' رضا نے تیزی سے پوچھا۔

''نہیں میں نے کہا نا تمہارے پاپا زاریہ کے لیے کچھ نہ کر سکے اور نہ ہی میں نے بھی ان کی طرف سے دیا ہوا قبول کیا۔ میں نرسنگ کرتی رہی ہوں۔ میں نے اتنا کمایا ہے کہ باقی زندگی سکون سے بسر کر سکتی ہوں۔ میں اب بھی چاہوں تو بہت کچھ کما سکتی ہوں اور پھر زاریہ ایک برس سے نجی کمپنی میں ملازمت کر رہی ہے۔ اتنا کما لیتی ہے کہ ہم دونوں کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''کس کمپنی میں ملازمت کر رہی ہے؟'' رضا کے پوچھنے پر بلقیس نے کمپنی کا نام بتا دیا۔ وہ اتنی مضبوط کمپنی تھی کہ ملازمین کو بہترین ادائیگی کر سکتی تھی۔ تاہم نجانے رضا کے دل میں ایسی کیا لہر ابھری۔ اسے یہ سن کر اچھا نہیں لگا تھا کہ زاریہ وہاں کام کرے۔ دونوں کے

درمیان خاموشی آن ٹھہری تھی۔ اس خاموشی کو بلقیس خاتون ہی نے توڑا۔

"ممکن ہے تمہیں جو میں نے بتایا۔ اس سے تمہیں شک وشبہات کا احساس ہو۔ میری اس کہانی میں خامیاں اس لیے معلوم ہوں گی کہ بہت ساری کڑیاں غائب ہیں لیکن مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مجھے تمہیں اطمینان دلانے کی یا اپنی کہانی سچ ثابت کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"دیکھیں۔ آپ کو خواہش ہو یا نہ ہو لیکن میں اپنے پاپا کی زندگی سے جڑی ہر بات کو جاننا چاہتا ہوں۔ کم از کم مجھے تو مطمئن کریں نا آپ۔" رضا کے لہجے میں ذرا سا غصہ جھلک رہا تھا۔

"رضا! میں بحث نہیں کرنا چاہتی۔ مگر ایک شرط پر تمہارا اطمینان......" اس نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

"آپ کوئی بھی شرط رکھیں میں مانتا ہوں۔"

"تو سنو۔ میرے پاس سلمان کی چند چیزیں ہیں، جن سے ہو سکتا ہے، تمہارا اطمینان ہو جائے۔ نہ بھی ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"پاپا کی چیزیں...... مطلب......؟" وہ تجسس سے بولا۔

"ہاں۔ ان کی چیزیں، میں لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیدر بیگ تھا۔ وہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لو۔ اس میں تمہارے پاپا کی وہ چیزیں ہیں جو میرے پاس نشانی کے طور پر رہ گئی تھیں۔ یہ بہر حال میرے لیے تو اثاثہ ہیں۔ تم انہیں لے جاؤ۔ کیونکہ ان چیزوں کی تصدیق فقط تمہاری ماما ہی کر سکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ رضا بڑی گہری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔

"میں بہت جلد یہ چیزیں آپ کو واپس کر دوں گا۔" رضا نے کہا

"نہیں، تم ان کے حقیقی وارث ہو۔ انہیں لے جاؤ اپنے ساتھ۔ جب وہ نہیں رہے تو اب ان چیزوں کی اہمیت نہیں رہی۔ یہ میں تمہیں دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ یوں خاموش ہوئی جیسے خود پر قابو پا رہی ہو۔ پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ "رضا! یہ ذہن میں رہے، میں جو تمہیں اطمینان دلا رہی ہوں اور یہ چیزیں سلمان کی بیوہ ثابت کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ مجھے نہ جائیداد کی طلب ہے اور نہ یہ چاہوں گی کہ تم مجھے سلمان اشرف کی بیوہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرو۔ بس شرط یہی ہے۔"

ان کے درمیان ایک بے نام سی خاموشی آن ٹھہری تھی۔ تب رضا ہی نے کہا۔

"زاریہ! میری بہن ہے۔ میں اب تک اس سے نہیں مل سکا، آپ اسے تو بلوائیں، میں اسے بات......"

"اس سے مل کر تمہیں دکھ ہو گا۔ وہ تم سے شدید نفرت کرتی ہے۔" بلقیس خاتون نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ وہ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جس بچی نے اپنا بچپن انتہائی تنگی اور تشنگی میں گزارا ہو اور اسے احساس ہو کہ اس کے باپ کی اولاد عیش کر رہی سارا کچھ اس اولاد کے پاس ہے تو بس کیا بتاؤں۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔" اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو رضا کو بہت افسوس ہوا۔ پھر کافی دیر بعد بولا۔

"وہ گواہ، جو زندہ ہے۔ کیا آپ اس کے بارے میں بتا سکتی ہیں۔ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں۔"

"میں نہیں جانتی اب وہ کہاں ہے، چند سال پہلے تک وہ اپنے آبائی گھر میں رہتا ہے۔ اب نجانے کہاں ہو۔ زندہ بھی ہے یا......" وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر معلومات دینے لگی۔ رضا نے غور سے سنا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ واپس آتے ہوئے وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

❀❀❀

زاریہ اور عاتکہ دونوں اپنے آفس کے سامنے والے ریستوران میں بیٹھی لنچ کر رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک برس کی رفاقت میں بہت گہری سہیلیاں بن چکی تھیں۔ پورے آفس میں یہ دونوں ہی تھیں جو الگ

تھلگ بیٹھ کر راز و نیاز کرلیتی تھیں۔انہیں دفتر کے باقی لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔اس وقت وہ لنچ کے بعد سوڈا پی رہی تھیں جب زاریہ نے پوچھا۔

''کیا بات ہے جو آج تم نے بڑے اہتمام سے مجھے لاکر یہاں لنچ کروایا؟''

تب عاتکہ نے اس کے چہرے پر غور سے دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔''زاریہ۔!میں چند دنوں سے نوٹ کررہی ہوں تم بہت الجھی ہوئی اور بے چین سی ہو۔کیا بات ہے؟کوئی مسئلہ ہے؟''

''مجھے خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے عاتکہ۔میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں ٹکڑوں میں بٹ گئی ہوں۔دل کی اپنی ضد ہے اور ذہن اپنی باتیں منوا رہا ہے۔حالات کی نشاندہی ایک الگ سمت میں ہے اور میری خواہشیں مجھے کچھ اور ہی کرنے پر مجبور کررہی ہیں۔میں حالات کے ایسے دوراہے پر کھڑی ہوں،جہاں مجھے خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔''زاریہ نے الجھے ہوئے انداز میں عجب سے لہجے میں کہا۔

''اس الجھن کی وجہ فیصل تو نہیں ہے۔اس سے کوئی بات......''عاتکہ نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں،وہ نہیں ہے۔''یہ کہتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔''تمہیں تو معلوم ہے وہ بے چارہ اپنا حال دل کہہ کر میری طرف سے اُمید لگائے ہے کہ میں اس کی محبت کا جواب محبت سے دوں لیکن......''

''لیکن کیا؟''وہ تجسس سے بولی۔

''یار مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اگر مجھ سے محبت کرتا ہے تو اس میں میرا کیا دوش،نہ میں اسے محبت کرنے کا کہتی ہوں اور نہ منع کرتی ہوں۔اس کی مرضی لیکن اگر مجھے اس سے محبت نہیں ہے تو میں کیوں مجبور ہو جاؤں۔''

''دیکھو۔ایک لڑکی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی اسے ٹوٹ کر چاہے۔وہ تمہیں ایسے ہی

معلوماتِ دنیا

بلجیئم واحد ملک ہے جہاں ننگے پاؤں چلنا جرم ہے۔

پارسی ایک ایسا مذہب ہے جس میں مردے کو چھونا حرام ہے وہ لوگ اسے اپنے ایسے خصوصی قبرستان میں ڈال دیتے ہیں جہاں گدھ اور چیلیں مردے کا گوشت کھا جاتی ہیں۔

ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک لفظ لکھنے سے 125 آدمی مارے گئے اور اس کا ایک باب لکھنے سے 12 لاکھ افراد کی جانیں گئیں وہ کتاب ہے ہٹلر کی کتاب ''میری سوانح عمری''۔

کتا ایک ایسا جانور ہے جس کی زبان پر پسینہ آتا ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی کتاب برٹش میوزیم (لندن) میں ہے یہ کتاب چارلس دوئم کے عہد میں لکھی گئی اس کے اوراق کی لمبائی تقریباً ▼ فٹ اور چوڑائی سوا تین فٹ ہے اس کی جلد آٹھ بکریوں کی کھال سے تیار کی گئی ہے۔

مراکش کا ایک ایسا حکمران تھا جو 888 بچوں کا باپ تھا اس کا نام شاہ مولائے اسماعیل تھا اس کے دور حکومت میں ایک ایسی رجمنٹ تھی جس میں 540 سپاہی تھی اور یہ تمام اس کے اپنے بیٹے تھے۔

دنیا میں سب سے لمبا درخت امریکہ میں پایا جاتا ہے جس کی اونچائی 673 فٹ ہے اور گہرائی 101 فٹ ہے اگر اس درخت کو کاٹ کر دیا سلائی بنائی جائے تو دنیا کے ہر شخص کو ایک ڈبیا مل سکتی ہے۔

سعودی عرب وہ واحد ملک ہے جس کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔

برونائی ایک ایسا ملک ہے جہاں عورت مرد کی نسبت زیادہ رہائش پذیر ہیں۔

دنیا کا سب سے خوب صورت پرندہ مرغ فردوس ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مہندی کے پھول اور ریحان کی خوشبو پسند تھی۔

امریکی صدر ابراہم لنکن ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔

راشدہ تیجا......ملتان

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

چاہتا ہے تمہیں اور کیا چاہیے۔ وہ ہینڈسم ہے، اچھے خاندان سے ہے۔ اس کی......" عاتکہ یوں بول رہی تھی جیسے وہ فیصل کی وکالت کر رہی ہو۔ اس پر زاریہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے۔" اس کا لہجہ یوں تھا جیسے بکھرتے ہوئے اسے اپنا آپ سمیٹنا اچھا نہ لگ رہا ہو۔

"مجھے تمہاری آج تک سمجھ نہیں آئی زاریہ۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس نے تجھے پسند کیا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ سو طرح کی خوبیاں ہیں اس میں۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور تم...... تم کسی آئیڈیل کی تلاش میں ہو۔ خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آؤ۔ تمہارے سامنے جو دنیا ہے، وہی حقیقت ہے۔ کسی آئیڈیل کا مل جانا یہاں ناممکن ہے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہتی چلی گئی۔

"نہیں عاتکہ۔ میں نہیں مانتی۔ اس دنیا میں بھی آئیڈیل مل جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے اپنا آئیڈیل۔" وہ پر یقین لہجے میں بولی تو عاتکہ حیران رہ گئی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" وہ سرسراتے لہجے میں بولی

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر یہی بات تم چند دن پہلے سمجھانے کی کوشش کرتی تو ممکن ہے میں تمہاری بات مان لیتی مگر اب نہیں۔ میں نے اپنا آئیڈیل دیکھ لیا ہے اور بس۔! اب اسے پانا ہے۔" اس نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔ اس پر عاتکہ کتنی دیر خاموش رہی۔ پھر اجنبی سے لہجے میں بولی۔

"زاریہ۔! اتنی رفاقت کے باوجود، آج تم پہلی بار مجھے اجنبی سی لگی ہو۔ کہاں دیکھ لیا تم نے اپنا آئیڈیل؟"

"بس دیکھ لیا۔ اور جب اسے پالوں گی نا تو ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا۔ یہ وعدہ رہا عاتکہ، سب سے پہلے میں تمہیں بتاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے نارمل ہو گئی۔ تب عاتکہ کو یوں لگا جیسے زاریہ کی ذہنی صحت پر اسے شک ہو گیا ہو۔ اس نے رسان سے کہا۔

"زاریہ۔! تم مجھے بہنوں کی طرح پیاری ہو۔ میں اب بھی تمہیں سمجھاتی ہوں کہ تم خواب در خواب میں نہ گرو۔ ورنہ حقیقی دنیا کی طرف لوٹتے ہوئے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤ گی۔"

"پھر کیا ہوا۔ اگر میرے مقدر میں یہی لکھا ہے تو یونہی سہی۔ تم شاید اس تجربے سے نہیں گزری ہو۔ وہ خواب جو تم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے برسوں گذار دو۔ اپنے آئیڈیل کی محبت تمہاری رگوں میں خون کی مانند شامل ہو جائے۔ اور وہ خواب اچانک تمہارے سامنے مجسم ہو جائے تو کیا تم اس کی محبت اپنے وجود سے نوچ کر پھینک سکتی ہو۔" وہ خواب ناک لہجے میں کہتی چلی گئی۔ جس پر عاتکہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس لیے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا

"کون ہے وہ؟"

"کہا نا، ابھی نہیں۔ میں اسے اپنے خوابوں طرح چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے پراسرار لہجے میں کہا پھر چونکتے ہوئے بولی۔ "ناراض مت ہونا۔ ہم سب کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے خواب کسی کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان خوابوں میں ہماری پوری ذات عریاں ہو جاتی ہے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، سو جانے سے پہلے جو تم خواب دیکھتی ہو۔ وہ بتا سکتی ہو کسی کو؟"

"مم...... مجھے...... سمجھ نہیں۔ ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ لنچ ٹائم کب کا ختم ہو گیا ہے آؤ۔" عاتکہ نے پہلے ریسٹ واچ پر وقت دیکھا۔ پھر میز پر پڑی اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زاریہ بھی اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ الجھی ہوئی تھیں۔

❀❀❀

رضا کو اپنے پاپا کے بزنس کے بارے میں سمجھتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ وقت گذر گیا تھا۔ کس کو کیا دینا ہے اور کہاں سے کتنا لینا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیگر اسٹاف کے ساتھ فیض الدین نے اس کی بھرپور مدد اور رہنمائی کی تھی۔ جائداد کے معاملات چھیڑنے کے لیے اسے وقت ہی نہیں ملا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت آفس ہی میں گذر جاتا۔ لندن والے کاروبار کے بارے میں

وہ پوری طرح مطمئن تھا۔ وہ سب اس کے بزنس پارٹنر نے سنبھال لیا تھا۔ وہاں سے اچھی خبریں مل رہی تھیں، بظاہر وہ پرسکون تھا لیکن پاپا کے بارے میں انکشافات نے اس کے اندر ہلچل مچا دی تھی۔ وہ اسے جلد از جلد حل کر لینا چاہتا تھا۔ اس دن رضا کی سامنے والی نشست پر فیض الدین بیٹھا کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے کافی منگوائی اور آہستگی سے بولا۔

”فیض صاحب۔! چھوڑیں یہ کام۔ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی کہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فائل بند کی اور اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ رضا نے بلقیس خاتون سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا کر اس گواہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو فیض نے کہا۔ ”تو پھر مل لیں اس سے۔ آپ وہ ایڈریس مجھے دیں میں تلاش کروا لیتا ہوں۔“

”ہاں۔! آپ ایسا ہی کریں۔“ یہ کہ کر اس نے فیض الدین کو معلومات دے دیں۔

چوتھے دن رضا اور فیض الدین اس گواہ کے پاس تھے۔ وہ گواہ اسپتال میں اپنی زندگی کے آخری سانس گن رہا تھا۔ اس نے بڑے غور سے رضا کو دیکھا اور پھر ان کی آمد کا مقصد جان کر بولا۔

”اچھا تم ہو سلمان کے بیٹے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تمہارے باپ نے بلقیس سے شادی کی تھی۔ شادی کیا تھی۔ بس یار مجبوری میں نکاح کیا تھا دونوں نے۔ پسند کرتے تھے ایک دوسرے کو۔ تب سلمان ہمارے پاس ہی ادھر رہتا تھا۔ بس پھر وہ اپنی مجبوری میں پھنسا رہا اور وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ سلمان بے چارہ چلا گیا۔ ہم نے بھی چلے جانا ہے۔ وہ بہت پیار کرتی تھی تمہارے باپ سے۔ مگر ہے بڑی انا والی۔“ وہ اپنی رو میں پرانی یادیں کہتا چلا گیا تھا۔ شام تک وہ واپس اپنے شہر لوٹ آئے۔ اس گواہ نے بہت سی پرانی باتیں بھی بتائی تھیں۔ رضا تمام راستے وہی سوچتا رہا تھا۔ ائرپورٹ سے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کا دل بہت اداس تھا۔ وہ اپنے پاپا کے بارے میں یقین کرنا چاہتا تھا۔ وہ

لفظ لفظ موتی

✦ علم کی محنت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

✦ جو درخت پھل نہیں دیتا وہ کم از کم سایہ ضرور دیتا ہے۔

✦ وقت ایسا ترازو ہے جس کے ایک حصے میں زندگی اور دوسرے میں موت ہے۔

✦ ہنر انسان کا سب سے بڑا دوست ہے۔

✦ وقت کے لامحدود سمندر میں کتابیں روشنی کا مینار ہیں۔

✦ جاہل کی عاجزی عالم کے غرور سے بہتر ہے۔

✦ انسان کا انسان سے بڑا رشتہ دکھ بانٹنے کا ہے۔

✦ سب سے بے وقوف وہ آدمی ہے جو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار کسی اور کو ٹھہرائے۔

طیبہ افضل...... فیصل آباد

ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اب پل صراط کے جیسا مرحلہ درپیش تھا۔ اسے اب سارا کچھ اپنی ماما سے کہنا تھا۔ وقت آن پہنچا تھا، اب وہ اس وقت سے نگاہیں نہیں چرا سکتا تھا۔

ڈنر کے بعد وہ اپنی ماما کو ڈرائنگ روم میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بلقیس خاتون کا دیا ہوا بیگ تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے عام سے لہجے میں کہا

”ماما۔! اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ پاپا نے دوسری شادی بھی کر رکھی تھی تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا۔“

”کچھ بھی نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے، انہوں نے دوسری شادی نہیں کی ہوگی۔“ شبانہ بیگم نے اطمینان سے کہا۔

”وہ آپ سے چھپا بھی سکتے تھے؟“ رضا سوالیہ انداز میں بولا۔

"تم عورت کو نہیں سمجھتے بیٹا۔ اندازہ ہو جاتا ہے۔ خیر۔ معاملہ کیا ہے؟"

تب رضا نے قبرستان میں ہونے والا واقعہ پوری تفصیل سے بیان کر دیا۔ وہ ایک ایک لفظ غور سے سنتی رہیں۔ پھر بولیں۔

"اگر اس عورت نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے تو اس کے پاس ثبوت بھی ہوگا۔" شبانہ بیگم نے سکون سے پوچھا۔

"ہاں ہے۔" رضا نے کہا اور بیگ میں موجود ساری چیزیں اپنی ماما کے سامنے ڈھیر کریں۔ پھر اس کے ساتھ ہی بلقیس خاتون کے ساتھ ہونے والی ملاقات کا احوال سنا دیا۔ سب کچھ سن کر ماما نے گہرا سانس لیا اور پھر بولیں۔

"یہ سچ ہے بیٹا کہ تمہارے پاپا ان دنوں مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے۔ جب تمہیں پیدا ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ان پر غبن اور فراڈ کا الزام تھا جو ان کے بزنس پارٹنر نے ان پر لگا دیا تھا۔ وہ ادھر ادھر چھپتے پھرتے رہے تھے۔ بڑے سخت دن گذارے تھے انہوں نے۔ بعد میں تمہارے پاپا سچے ثابت ہوئے۔ جس شہر اور جگہ کا نام تم بتا رہے ہو۔ تمہارے پاپا نے وہاں بھی تھوڑا وقت گذارا ہے۔"

"اور یہ چیزیں؟" رضا کا دماغ انہی میں اٹکا ہوا تھا۔

"یہ خط تمہارے پاپا ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ خط تو میرا ہے جو میں نے تمہارے پاپا کو لکھا تھا۔ یہ کتابیں اور ان پر دستخط، یہ انہی کے ہیں۔ یہ شرٹ ان کی ہے جو میں نے بنوائی تھی۔ یہ ان کے نام والا سگریٹ کیس اور لائیٹر...... یہ فرانس سے لیا تھا۔ میں ساتھ تھی اس وقت۔ لیکن یہ تو بہت عرصے بعد خریدا گیا تھا۔ اور یہ تازہ تصویر......" وہ کہتے ہوئے رک گئیں۔

"یہ ادھیڑ عمر بلقیس خاتون ہے۔ یہ دائیں طرف زاریہ ہے اور درمیان میں پاپا۔ تصویر میں پس منظر تو ادھر ہمارے شہر ہی کا ہے۔ وہ بعد میں بھی ملتے رہے ہیں ان سے۔ یہ دونوں پچھلے دو برس سے ادھر ہیں۔ یہ تصویر یہی بتا رہی ہے۔" رضا نے تفصیل سے کہا تو شبانہ بیگم سوچتے ہوئے بولیں۔

"رضا۔! اس عورت کو جائیداد سے کوئی سروکار نہیں اور وہ اپنا تعلق بھی ثابت کر رہی ہے۔ تم اس گواہ سے ملے ہو۔"

"ہاں۔ آج ہی ملا تھا۔ اس نے بھی تصدیق کر دی ہے۔" رضا نے اپنی ماں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سکون تھا۔

"تو پھر کیا کہتے ہو تم؟" وہ دھیرے سے بولیں۔

"ماما۔! ثبوت اور شواہد تصدیق کر رہے ہیں کہ پاپا نے شادی کی، بلقیس خاتون ان کی دوسری بیوی اور زاریہ ان کی بیٹی یعنی میری بہن ہے۔ آج نہیں تو کل سب کو یہ معلوم ہو جائے گا اور......"

"دنیا کی فکر چھوڑو، اپنی کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" شبانہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ماما۔! دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ فرض کریں اگر وہ جائیداد وغیرہ کے مقدمہ وغیرہ بھی کرتی ہیں تو پاپا کے نام کا حوالہ آئے گا۔ جسے ہم تسلیم ہی نہیں کریں گے۔" رضا نے سمجھایا۔

"اور دوسرا راستہ؟" شبانہ بیگم نے پوچھا۔

"ہم انہیں تسلیم کر لیں اور اگر آپ کی اجازت ہو تو انہیں اس گھر میں لے آئیں۔ اور پھر جو ان کا حق بنتا ہے وہ انہیں دے دیں۔ زاریہ محض بلقیس خاتون کی بیٹی نہیں، سلمان اشرف کی بھی ہے۔ اور رضا سلمان کی بہن۔ اسے معاشرے میں وہی عزت اور مان ملنا چاہئے جو سلمان اشرف کی بیٹی اور رضا کی بہن کا ہو سکتا ہے۔" رضا نے پرجوش انداز میں اپنی بات ختم کی تو شبانہ بیگم چند لمحے خاموش رہیں اور پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولیں۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن، اگر میں کہوں کہ چند دن صبر کرو اور ان سارے معاملات کو اچھی طرح دیکھو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاپا نے یہ جائیداد کس طرح بنائی ہے۔ اگرچہ وہ وراثت میں کچھ حاصل نہیں کر سکتے لیکن آخرت میں ہماری جوابدہی ہے۔ جو ان کا حق بنتا ہے۔ وہ انہیں ضرور دو کیونکہ انہیں جو کچھ ملنا ہے۔ وہ

ملنے کا پتہ
021-35620771/2

تم اپنی ذاتی جائیداد میں سے دو گے جو تمہارا باپ تمہارے لیے چھوڑ گیا ہے۔ وہ یہاں آ کر رہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ جہاں تم رہو۔ میں بھی وہیں رہوں۔ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنا ہے۔ یہی میری خواہش ہے۔ زندگی کے یہ آخری پل میں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں میرے بیٹے۔" شبانہ بیگم نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ آخری لفظ کہتے ہوئے وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ رضا کا دل بھر آیا تھا۔

"ماما! کیا آپ نہیں سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے ساتھ رہنے کی کتنی بڑی خواہش اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خیر! میں نے یہی پلان کیا ہوا ہے میں آپ کو لے کر لندن چلے جانا ہے۔ یہاں بزنس چلتا رہے گا۔ یہ تو ہونا ہی ہے۔ فی الحال تو بلقیس خاتون کو منانا ہے۔ اس لیے جیسا آپ کہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

"زاریہ کیا کہتی ہے؟" ماما نے پوچھا۔

"میری ابھی تک اس کے ملاقات نہیں ہو سکی، بلکہ ایک لفظ تک کا تبادلہ ہمارے درمیان نہیں ہوا۔ وہ کیا سوچ رہی ہے مجھے قطعاً معلوم نہیں۔ میں ایک دو دن میں ہی اس سے ملوں گا۔" وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جو تمہارا دل چاہے کرو میرے بیٹے۔ یہ سارے معاملات جلد از جلد ختم کرو، تاکہ میں تمہاری دلہن لانے کا ارمان پورا کر سکوں۔" شبانہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ ممتا میں بھیگا ہوا تھا۔

"معاملات تو چلتے رہتے ہیں۔ آپ نے جو کرنا ہے کریں۔ جتنے ارمان نکالنے ہیں نکال لیں۔" اس نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ تو شبانہ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جس سے رضا کا دل خوشی سے بھر گیا۔

رضا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماما اتنی جلدی مان جائیں گی۔ لیکن جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بس اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش تھیں۔ سو ایک دن اس نے فیض الدین سے کہہ دیا۔

"فیض صاحب۔! میرے خیال میں اب ہمیں پاپا کی جائیداد والا معاملہ بھی حل کر لینا چاہیے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ میرا نہیں خیال کہ اس میں کوئی الجھن ہے۔ وراثت تو آپ اور بیگم صاحبہ کے نام منتقل ہونی ہے۔ اور بس، ہماری کمپنی کے وکیل چند دنوں میں یہ مکمل کر لیں گے۔" فیض نے عام سے انداز میں کہا

"ٹھیک ہے، لیکن بلقیس خاتون اور زاریہ کو اتنا ہی ملنا چاہیئے جتنا ان کا حق بنتا ہے۔ آپ فرض کر لو کہ وہ بھی وراثت میں حصے دار ہیں۔" رضا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"وہ قانونی یا وراثتی حقدار نہیں ہیں۔ اس لیے قانونی طور پر جائیداد آپ کے نام ہو گی۔ پھر آپ جو چاہیں انہیں دے دیں۔" فیض الدین نے وضاحت کی۔

"وہ صورت کوئی بھی ہو۔ اس جائیداد اور اثاثوں میں جو شرعی حق بنتا ہے۔ وہ انہیں پورا پورا ملنا چاہیے۔ آپ کاغذات تیار کروائیں۔ میں بلقیس خاتون سے بات کر لیتا ہوں۔" رضا نے حتمی انداز میں کہا۔

"جی۔ چند دن میں یہ سارے قانونی مراحل طے ہو جائیں گے۔ میں کاغذات تیار کروا دیتا ہوں۔" فیض نے کہا تو رضا بڑی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اب اسے فقط بلقیس خاتون کو منانا تھا کہ وہ ان کے ساتھ آ کر رہے۔ لیکن ایک چبھن اب بھی اس کے دماغ میں تھی کہ زاریہ اس سے بات کیوں نہیں کرتی۔ کبھی اس نے ملنے کی خواہش نہیں کی؟ وہ یہ سب سوچتا، پھر خود ہی اپنے آپ کو یہ جواب دے کر مطمئن کر لیتا کہ چند دن بعد جب میں انہیں ان کا حق دے دوں گا تو وہ سمجھ جائے گی۔ رضا اس کا بھائی ہے کوئی غیر نہیں۔ تب تک اگر وہ نہیں بھی بات کرتی تو کوئی مسئلہ نہیں۔

رضا چند دن تک اپنی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کے لیے پاپا کی شخصیت آئیڈیل رہی تھی۔ اگرچہ اس کا زیادہ وقت والدین سے دور رہتے ہوئے گزرا تھا اور وہ اپنے پاپا کو اتنے قریب سے بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن پاپا کے بارے میں انکشافات نے اس کے اندر ہلچل مچا دی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ

انہی کے بارے میں سوچنے لگتا۔اس کہانی میں موجود ایک ایک کردار کا تجزیہ کرنے بیٹھ جاتا۔کبھی کبھی تو اسے پاپا کی دوسری شادی محض اس لیے اچھی نہ لگتی کہ انہوں نے یہ سب راز میں رکھا۔اگر وہ اعلانیہ شادی کر لیتے تو اسے اتنا زیادہ دکھ نہ ہوتا۔اور پھر رضا کو کبھی کبھی اپنے پاپا پر ڈھیروں پیار آ جاتا کہ ہمیں دکھ نہ دینے کے باعث انہوں نے یہ سب چھپائے رکھا۔اسی جمع تفریق میں آخر کار اسے پاپا حق بجانب لگتے۔دوسری شادی کرنا کوئی جرم نہیں، انہوں نے ضرورت محسوس کی اور کر لی۔پھر بلقیس خاتون کا اطمینان اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔زندگی کے معاملات جیسے بھی رہے ہوں۔دنیاداری کی ضرورت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔ممکن ہے پاپا ان کے لیے اتنا کچھ کر گئے ہوں کہ اب وہ مزید ضرورت محسوس نہ کرتی ہو۔کیا یہ اطمینان اور قناعت پسندی حقیقت ہے، محض دکھاوا ہے یا پھر کوئی مجبوری؟ اس کے سامنے سوالیہ نشان تن جاتے اور اس کی سوچیں ٹھٹک جاتیں۔تب خیال نئے راستے بنا لیتا۔

وہ اکلوتا تھا۔اس نے بہن بھائی نہیں دیکھے تھے۔قدرت نے اگر اسے ایک بہن دے دی تھی تو اسے اپنی بہن کو پوری عزت اور مان دینا چاہیے۔اس کی ذاتی جذباتی خواہش اپنی جگہ، لیکن زاریہ کی رگوں میں اس کے باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔سلمان اشرف کی بیٹی کے بارے میں آج اگر چند لوگوں کو معلوم ہے تو کل جب بات پھیلے گی، تب کیا ہوگا؟ جس طرح وہ خود پاپا کی دوسری شادی کا سن کر ہل گیا تھا۔جذباتی وابستگی کے باوجود شک میں تھا۔جبکہ حالات کی کڑیاں بھی درمیان سے غائب تھیں۔ایسے میں بات پھیلی تو کتنے رنگین افسانے منظر عام پر آ کر پھیل جاتے تھے۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ پاپا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، ان کی ذات منفی تاثر کا محور بن جاتی۔لوگوں کو بحث کے لیے چٹخارے دار موضوع مل جاتا۔وہ اور اس کا خاندان بد گمانی سے لے کر جگ ہنسائی کے گرداب میں پھنس جاتا۔زاریہ جس کمپنی میں ملازمت کرتی تھی۔وہ ان کے پھیلے ہوئے بزنس کے مقابلے میں چھوٹی تھی۔جیسے ہی سلمان اشرف کا حوالہ زاریہ کی ذات کے ساتھ جڑتا تو اس کے تعارف کا حوالہ یہی بنتا۔زاریہ کی ذات پر شک کیا جا سکتا تھا۔اس شک کا مطلب اس کے باپ کی کردار کشی تھی۔رضا سلمان کی بہن کا شک زدہ وجود، وہ کس کھاتے میں رکھتا، ایک دم سے رضا کو اپنے اردگرد کا ماحول زہر آلود دکھائی دینے لگتا۔

زاریہ کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ متضاد خیالات میں گھر جاتا۔وہ ایک بار دکھائی دینے کے بعد پھر نظر نہیں آئی تھی۔کیا وہ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتی یا اس نے دل میں ایک بھائی کے لیے جذبات ہی نہیں ہیں؟ یہ سوال ایسی چبھن کی مانند تھے جو اس کے دماغ میں بے چینی بھر دیتے۔فطری وابستگی کا احساس اور جذباتی خواہش کے علاوہ جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے اس مسئلے کا سیدھا سادا حل یہی تھا کہ وہ بلقیس خاتون سمیت زاریہ کو اپنے گھر میں لے آئے۔انہیں وہ عزت اور مان دے جو ان کا حق ہے۔لیکن یہاں بھی وہ حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ان دونوں کے ذکر پر اس کی ماما خاموش ہو جایا کرتی تھی۔جیسے وہ انہیں پسند نہ کرتی ہو۔یہ ایک فطری ردعمل تھا۔دوسری جانب بلقیس خاتون کا رویہ بے پروائی والا تھا۔یہ معاملہ کیسے حل ہوگا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا۔وہ محض سوچ کر رہ جاتا۔

اس دن عاتکہ اپنی میز پر بڑی پریشان اور افسردہ بیٹھی ہوئی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔وہ کئی بار دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں موجود فیصل سے بات کرنے کے بارے میں سوچ چکی تھی۔مگر ہر بار فطری جھجک اسے روک لیتی۔اسی کشمکش میں لنچ ٹائم ہو گیا۔اس نے بے دلی سے اپنا لنچ بکس لیا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔دوسری طرف فیصل ہی تھا۔چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا

"کیا خیال ہے عاتکہ، آج لنچ سامنے والے ریستوران میں نہ لیں۔"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔میں زاریہ کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔" اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"تو پھر آؤ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ دونوں تقریباً ایک ساتھ ہی ریستوران میں پہنچے۔ وہ رش سے ہٹ کر اوپن ائیر میں چھتری تلے آ بیٹھے تو عاتکہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں آج صبح ہی سے ملنا چاہ رہی تھی...... وہ زاریہ......"

"ہاں آج تیسرا دن ہے وہ نہیں آئی، اس کا سیل فون بھی بند ہے۔ خیریت تو ہے نا۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"مجھے اس کے بارے میں معلوم نہیں لیکن میں پریشان ضرور ہوں۔" وہ بولی

"وہی تو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔" اس نے انتہائی بے تابی سے پوچھا۔ جس پر وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی

"پرسوں جب وہ نہیں آئی تو میں نے اسے فون کر کے نہ آنے کی وجہ پوچھی، اس نے کوئی خاص وجہ نہیں بتائی، لیکن وہ پریشان تھی۔ الجھی ہوئی تو وہ کئی دنوں سے تھی۔ عجیب اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی تھی وہ۔ پتہ نہیں کیا معاملہ چل رہا ہے اس کے ساتھ۔ خیر اس نے کوئی وجہ بتائے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس کا پیغام (ایس ایم ایس) میرے سیل فون پر آ گیا۔

"کیا تھا وہ پیغام۔" اس کی بے تابی حد درجہ بڑھ گئی تھی۔

"یہی کہ اگر میرے بارے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو فوراً اس نمبر پر بتا دینا۔ وہ کسی رضا سلمان نامی شخص کا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے یہ کون شخص ہے۔" اس نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

"نہیں، میں نہیں جانتی۔ اور نہ ہی پہلے کبھی اس کا ذکر کیا تھا۔" اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ پھر اپنا سیل فون نکال کر بولی۔ "وہ پیغام میں تمہیں فارورڈ کر رہی ہوں۔"

"کون ہو سکتا ہے وہ شخص؟" اس کی سوئی وہیں اٹک گئی

"میں نے اسی وقت زاریہ سے پوچھنا چاہا تھا مگر اس وقت میں مصروف تھی۔ میں نے سوچا، بعد میں معلوم کرتی ہوں پھر اس کے بعد اس کا سیل فون ہی آف جا رہا ہے۔"

"کیا خیال ہے پھر، اس سے زیادہ غیر معمولی بات کیا ہو گی۔ وہ تین دن سے غائب ہے، سیل فون بند ہے۔ کوئی رابطہ، کوئی اتا پتہ نہیں۔" اس نے تشویش سے کہا۔

"میں تم سے یہی تو مشورہ کرنا چاہ رہی تھی کہ کیا میں اس نمبر پر اطلاع دے دوں یا ہمیں کچھ اور کرنا چاہیے۔"

"تم اس نمبر پر اطلاع دو۔ ابھی اور اسی وقت۔ دوسرا، ہمیں خود اس کے بارے میں پتا کرنا چاہیے۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"میں ابھی اس نمبر پر کال کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کال ملانے لگی، چند لمحوں میں اس کا رابطہ ہو گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرا کے زاریہ کے بارے میں بتا دیا۔ فون بند ہوتے ہی فیصل نے پوچھا۔

"تمہیں اس کے گھر کا معلوم ہے نا' آؤ چلیں۔ اس کا پتہ کرتے ہیں۔"

"آفس ٹائم میں تو ممکن نہیں' بعد میں چلتے ہیں۔" اس نے بہانہ بنا کر ٹال دینا چاہا تو وہ فوراً بے چین ہوتے ہوئے بولا۔

"تم فکر نہ کرو' باس کو اعتماد میں لے کر باقی وقت کی چھٹی میں لے لیتا ہوں۔ یہ میری ذمے داری ہے اور پھر تجھے ڈراپ بھی کر دوں گا۔" اس پر عاتکہ نے چند لمحے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

دوپہر ڈھلنے والی تھی جب وہ زاریہ کے گھر کے سامنے پہنچے۔ عاتکہ نے گاڑی سے اتر کر بیل دی اور انتظار کرنے لگی، پھر کافی دیر تک بیل دینے کے باوجود کوئی جواب نہیں ملا، جیسے گھر میں کوئی مکین نہ ہو۔ فیصل بھی گیٹ تک آ گیا تھا تو عاتکہ بڑبڑاتے ہوئے بولی

"کہیں وہ اچانک چلے نہ گئے ہوں؟"

"میرے خیال میں کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔" وہ یوں بولا جیسے اسے کسی گڑبڑ کا یقین ہو۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"اب کیا کیا جائے۔" وہ گھبراتے ہوئے بولی۔
اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک قیمتی گاڑی ان کے پاس رکی، اس میں سے رضا باہر آیا۔ اس کے ساتھ دو لوگ اور بھی تھے۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑے رہے۔ جبکہ ان کے درمیان تعارف کا مرحلہ طے ہو گیا۔ اور صورت حال بھی واضح ہوگئی۔

"میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کررہا ہوں۔ زاریہ اور اس کی والدہ دونوں کا فون بند ہے۔" رضا نے کہا اور ساتھ آئے ہوئے آدمیوں سے کہا کہ وہ گیٹ کا لاک توڑ دیں۔

"ایسے کیسے ہم کسی کے گھر کا تالہ توڑ سکتے ہیں۔ یہ غیر قانونی ہے اور۔"

"میں سب سنبھال لوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہوئی ہے۔" رضا نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

تالا تڑوا کر رضا گھر کے اندر چلا گیا۔ فیصل بڑھا تو عاتکہ کو بھی ناچار اندر جانا پڑا۔ اندر پر ہول سناٹا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا مگر بکھرا ہوا سامان کچھ اور ہی سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک کمرہ دیکھتے ہوئے زاریہ کے کمرے میں جا پہنچے۔ جہاں کا منظر دیکھ کر وہ تینوں ہی دم بخود ہوگئے۔

زاریہ قالین پر دائیں کروٹ بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر نائیلون کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ سوجے ہوئے ہونٹ، چہرے پر خراشیں اور کنپٹی کے پاس سے خون بہہ کر سوکھ گیا تھا۔ ہلکے کاسنی رنگ کا لباس کہیں سے مسلا ہوا اور کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ پہلی نگاہ میں ہی اندازہ ہورہا تھا کہ اس پر اچھا خاصا تشدد کیا گیا ہے۔ اس وقت ان تینوں کے ذہن ایک جیسا سوچ رہے تھے کہ وہ زندہ بھی ہے یا سامنے بے جان جسم پڑا ہے۔ رضا ناقابل یقین انداز میں اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ شدید ترین دکھ کی کیفیت سے گذر رہا ہو۔ جبکہ فیصل لمحہ بھر دیکھنے کے بعد بے تابانہ اس کی طرف بڑھا اور نبض ٹٹولنے لگا۔ چند لمحوں میں کئی رنگ اس کے چہرے پر سے گذر گئے۔ پھر اچانک خوشی

بھرے لہجے میں تھرتھراتے ہوئے بولا۔

"زندہ ہے زاریہ زندہ ہے' عاتکہ پانی لاؤ۔"

اس کے یوں کہنے پر وہ دونوں جیسے ہوش میں آگئے۔رضا نے فوراً اس کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔عاتکہ پانی لے کر آئی اور چھینٹے اس کے منہ پر مارنے لگی۔زاریہ کے بدن میں ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور پھر بے ہوش ہوگئی۔اس نے کوشش جاری رکھی۔کچھ دیر بعد وہ ہونقوں کی طرح ان کی طرف دیکھنے تو لگی لیکن یوں جیسے اسے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا ہو۔وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر ہونٹوں سے سرسراہٹ ہی نکل رہی تھی۔وہ اسے پوری طرح ہوش میں لانا چاہ رہے تھے۔مگر انہیں کامیابی نہیں ہو پا رہی تھی۔اس دوران چند پولیس والے بھی آگئے لیکن وہ پوری طرح ہوش میں نہ آسکی۔البتہ اس کی سرگوشی ' بڑبڑاہٹ میں بدل گئی تھی۔تینوں نے بہت غور سے سنا تو سمجھ میں آیا' وہ کہہ رہی تھی۔

"میں رضا کو دھوکا نہیں دے سکتی۔"

رضا پر حیرت ٹوٹ پڑی۔یہ کیا ماجرا ہے؟ مگر وہ ایسا وقت تھا کہ اس سوال پر زیادہ سوچا نہیں جاسکتا تھا۔

"فیصل' میں زاریہ کو اسپتال لے کر جارہا ہوں' تم ان پولیس آفیسر کے ساتھ رہو۔میرے لوگ بھی یہیں ہیں۔آؤ عاتکہ۔" رضا نے کہا اور پھر زاریہ کو اٹھا کر گاڑی تک لے گیا۔

زاریہ کو انتہائی نگہداشت وارڈ میں پوری ایک رات گذر گئی تھی۔شام ہوتے ہی عاتکہ اپنے گھر چلی گئی اور فیصل پولیس کی کے بعد وہاں سے سیدھا اسپتال آ گیا تھا۔رضا اور فیصل کو جاگتے پوری رات ہوگئی تھی۔جبکہ ڈاکٹرز اسے پوری طرح ہوش میں لانے کی بھرپور کوشش کررہے تھے۔اگرچہ رضا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہوا؟ تاہم زاریہ کا گاہے بگاہے ایک ہی فقرہ بڑبڑانا اسے سرتاپا ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔زاریہ کس دھوکے کی بات کررہی ہے؟ اس کی یہ حالت کیسے ہوئی اور کس نے کی؟ بلقیس خاتون کہاں ہے؟ ان پر یہ افتاد کیا آن پڑی؟ کیا یہ زاریہ کے قتل کی کوشش تھی یا کوئی اور ہی معاملہ تھا؟ کیا بلقیس خاتون قتل ہوگئی ہے یا وہ اغواء ہوچکی ہے اس کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ پریشانی کی انتہا پر تو تھا ہی لیکن ان سوالوں پر وہ جتنا سوچتا' اتنا ہی الجھتا چلا جا رہا تھا۔کیونکہ اس کا اطمینان انہی سوالوں کے جواب میں تھا جو اس کے لیے اب راز کی مانند بن گئے تھے۔اس راز کو فقط زاریہ ہی کھول سکتی تھی اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں تھی۔اس وقت سورج طلوع ہونے کو تھا جب سینئر ڈاکٹر نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا۔وہ دونوں ہی چلے گئے۔

"رضا صاحب۔! مریضہ ہوش میں تو آجاتی ہے لیکن کوئی ایسی دماغی پیچیدگی ہے جس کے باعث وہ پوری طرح حواسوں میں نہیں آرہی۔میری اس بات کی تصدیق اس کی بڑبڑاہٹ ہے جس کے بعد وہ پھر سے ہوش میں نہیں رہتی۔معاملہ خاصا سنجیدہ ہوگیا ہے۔"

"تو پھر اب کیا تجویز ہے۔" رضا نے پوچھا

"میں نے اپنی ڈاکٹرز کی ٹیم کے ساتھ بھرپور کوشش کی ہے اور کر بھی رہا ہوں۔لیکن میں اس حق میں بھی نہیں ہوں کہ ایسے پیشنٹ کو زیادہ دیر رکھ کر رسک لوں۔اس پر تشدد بھی خاصا ہوا ہے۔ممکن ہے اس وجہ سے دماغی پیچیدگی ہوگئی ہو۔"

"آپ جو بہتر سمجھیں ہیں بتائیں۔میں انتظام کرلیتا ہوں۔" رضا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی مزید ایک دو دن دیکھتا ہوں۔مزید رپورٹس آجائیں تو ماہرین سے مشورہ کرتا ہوں۔ممکن ہے اس دوران کوئی بہتر صورت نکل آئے۔" ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔اگر آپ کہیں تو میں اسے لندن بھی لے جاسکتا ہوں۔" رضا نے ایک خیال کے تحت کہا تو ڈاکٹر بولا۔

"وہاں بہر حال سہولیات زیادہ ہیں۔ایسا ہوجائے تو زیادہ بہتر ہے۔لیکن دو دن تک مجھے کوشش کر لینے دو۔" پھر مزید تھوڑی باتوں کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ آئے۔وہ دونوں انتہائی نگہداشت کے وارڈ کی طرف آئے تو سامنے شبانہ بیگم اپنی گھریلو ملازمہ سے

ساتھ کھڑی ہوئی۔

"ماما آپ......! آپ کو کیسے پتا؟" رضا نے پوچھنا چاہا تو شبانہ بیگم نے ہاتھ سے اشارے کے روکتے ہوئے کہا۔

"مجھے کل شام ہی سے معلوم ہے۔ میں نے سوچا کہ رات بھر میں کسی وقت زاریہ ٹھیک ہوگئی تو اسے تم گھر لے آؤ گے' مگر لگتا ہے معاملہ خاصا سیریس ہے' خیر۔ !تم ایسا کرو۔ گھر جاؤ اور آرام کرو' میں ہوں یہاں پر۔"

"ماما! آپ یہاں کیسے' مطلب......" رضا نے جذباتی انداز میں کہا۔

"میں سنبھال لوں گی سب میرے ساتھ یہاں ڈرائیور ہے اور یہ رانی ہے۔ تم جاؤ۔ آرام کرو۔ ورنہ تمہاری طبیعت خراب ہوجائے گی۔" شبانہ بیگم نے اعتماد سے کہا تو وہ گھر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ فیصل بھی اپنے گھر چلا گیا۔

رضا اپنے بیڈ پر پڑا کئی ساری سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کل سہ پہر سے لے کر اب تک کی جو صورت حال تھی۔ اس کا کوئی بھی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ اسے سمجھ آرہی تھی تو فقط ایک بات کی کہ کسی بھی طرح زاریہ کا بچ جانا ضروری ہے۔ تب ہی ہر بات واضح ہوگی ورنہ ہر معاملہ ایسی تاریکی میں کھوجائے گا کہ پھر تلاش کرنے کے باوجود بھی ہاتھ نہیں لگنے والا تھا۔ کیونکہ باوجود انتہائی کوشش کے بلقیس خاتون کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔

اگلا پورا ہفتہ زاریہ کی حالت بتدریج بہتر ہوئی۔ اس کی بڑبڑاہٹ بند ہوگئی تھی اور وہ بے چینی بھی ختم ہوگئی تھی جو اس کے ساتھ مسلسل تھی۔ وہ خواب آور ادویات کے زیر اثر دنیا و مفیہا سے بے خبر پڑی رہتی تھی۔ ڈاکٹرز کو امید ہوگئی تھی کہ وہ صحت یاب ہوجائے گی۔ اگرچہ اس کی دماغی پیچیدگی کی وجہ سر پر لگنے والی چوٹ تھی تاہم وہ ایسے دکھ کی کیفیت سے بھی گزری تھی جس کا شاک وہ برداشت نہیں کر پائی تھی۔ اب وہ کب تک ٹھیک ہو پائے گی۔ یہ حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کبھی بھی اچانک وہ اپنے حواسوں میں آسکتی۔ تب کوشش کی جائے کہ اسے دوبارہ کوئی ذہنی شاک نہ لگے۔ رضا کے لیے یہ صبر آزما لمحات تھے۔ کیونکہ زاریہ کے علاج میں صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس دوران سب سے زیادہ خیال شبانہ بیگم ہی نے رکھا۔ فیصل اور عاتکہ برابر آتے تھے اور بہت وقت گزارتے۔ وہ خود آفس میں بیٹھا ماما سے رابطے میں رہتا تھا۔ رضا نے زاریہ کے اردگرد کئی لوگوں کا پہرا بٹھا دیا تھا کئی خواتین خدمت گار مقرر کردیں۔ وہ خود شام ڈھلے اس کے پاس جاتا اور پھر رات گئے لوٹ آتا۔

پولیس کی روایتی تفتیش جاری تھی۔ ان کے مطابق یہ ڈکیتی ہی کی واردات تھی۔ جبکہ بلقیس خاتون کی گم شدگی ایک معمہ بن گئی تھی۔ پولیس کی کارروائی چھوئے کی مانند تھی۔ رضا کی توجہ اس طرف بھی تھی کہ بلقیس خاتون کا جلد از جلد پتہ مل جائے۔ لیکن کامیابی نہیں ہو پا رہی تھی۔ انہی دنوں فیض الدین چھٹیاں لے کر چلا گیا۔ اس کے کچھ خاندانی مسائل ایسے آگئے تھے کہ جنہیں نپٹانا بہت ضروری تھا۔ وہ دوبئی چلا گیا۔ اگلے ہفتے میں اس نے واپس آجانا تھا۔ رضا کے پاس دوسرے بہت سارے لوگ تھے۔ اس نے پولیس تفتیش کے سارے معاملات وکلاء کے ذمے لگا دیئے اور اپنی توجہ زاریہ پر لگا دی۔

❀❀❀❀

زاریہ خواب ناک کیفیت میں تھی۔ سرمئی بادلوں سے بھرا آسمان اور سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اس کے سامنے تھے۔ بادل اس کے قریب سے یوں گزر رہے تھے جیسے وہ خود بادلوں میں تیر رہی ہو۔ وہ خود ایک پہاڑی کے سرے پر کھڑی تھی۔ اس کا سفید لبادہ تیز چلنے والی ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے سامنے وادی میں کچھ فاصلے پر کھپریل اور ٹین کی چھتوں والے مختلف رنگوں کے چھوٹے بڑے گھر تھے۔ پوری وادی پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی یوں جیسے سارے موسموں کے پھول یہیں اُگ آئے ہوں۔ وہ کھلی آنکھوں سے سرمئی بادلوں سے ڈھکے آسمان پر دھنک دیکھ رہی تھی۔ وہ انتظار والی کیفیت میں تھی، جیسے کوئی اچانک آنے والا ہے، جو اسے

دور افق میں موجود دھنک تک لے جا کر جھولا جھلانے والا ہے۔ اگرچہ انتظار کی یہ کیفیت انتہائی طویل اور کسک بھری تھی لیکن اس پر خمار بھی تھا جیسے یہی کسک بھرا انتظار اس کا حاصل ہو۔ تب اچانک سرمئی بادل اجنبی لگنے لگے۔ دھنک کے درمیان بجلی کڑکنے لگی۔ چکا چوند اتنی تھی کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ پائی۔ اچانک تیز ہوا نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وہ وادی میں گرتی چلی گئی۔ جیسے کوئی پیراشوٹ سے زمین پر آ رہا ہو۔ اسے لگا کہ وہ اپنے ہی بیڈ روم میں آن گری ہے۔ تبھی دروازہ کھلا اور بلقیس خاتون اندر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک طویل قامت ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جس سے وہ صرف ایک بار مل چکی تھی۔ اب اسے وہ دوسری بار دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر غصہ، کرختگی اور جھلاہٹ تھی۔ جبکہ وہ اپنے فیصلے کی وجہ سے مطمئن تھی۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ تب بلقیس خاتون کہتی چلی گئی۔

''دو دن ہو گئے مجھے اس لڑکی کو سمجھاتے ہوئے مگر یہ نہیں سمجھ رہی۔ ایسا تو گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم نے سوچا اور اسے حقیقت میں بدلنے کے لیے جتنی ہم نے تگ و دو کی، آخری لمحات میں آ کر وہ سب خوفناک حالات میں بدل دے گی یہ لڑکی۔''

''اسے ہوا کیا ہے، پاگل ہو گئی ہے؟'' وہ شخص بولا

''مجھے نہیں معلوم، میں تو دماغ کھپا کھپا کے تھک چکی ہوں، خود ہی پوچھ لو۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی تو اس شخص نے زاریہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تمہیں ہوا کیا ہے، دو دن پہلے تک تو تم ٹھیک تھیں۔ یہ اچانک کیا ہوا؟''

''میں اس معصوم رضا کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ تم لوگ بہت بڑے فراڈ ہو۔'' زاریہ نے اطمینان سے کہا۔

''یہ تب سوچنا تھا جب تم اس پلان میں شامل ہوئی تھیں۔ ایک عام لڑکی سے زاریہ سلمان بنانے میں مجھے بھاری رقم خرچ کرنا پڑی ہے۔ کاغذی ثبوت بنانے سے لے کر تمہارے رہن سہن تک، یہ تم جانتی ہو۔ اب جبکہ جائیداد تمہارے نام ہو رہی ہے۔ اس کے کاغذات تمہیں ملنے والے ہیں۔ عیش بھری زندگی تمہاری منتظر ہے تو پھر۔''

''اسے یہ بھی بتاؤ کہ رضا مستقبل میں چاہتا کیا ہے؟''

''وہ تم دونوں کو اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہے۔ گھر مطلب، کروڑوں کا بنگلہ اور خود وہ ماں بیٹا یہاں سے چلے جائیں گے۔ پھر کاروبار تیرا اور تو اس کے سیاہ و سفید کی مالک۔ اتنی دولت تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ نے جو کرنا ہے وہ کرو۔ مجھے وہی ایک عام سی لڑکی بنا کر میرے حال پر چھوڑ دو۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

''ایویں چھوڑ دیں۔ تم ہمارے پلان کا حصہ ہو۔ اگر تم نہ رہی تو سب ختم۔ تمہارا یہ ناٹک اگر ہمیں بلیک میل کرنے کے لیے ہے تو سن لو۔ تم بھی ہمارے ساتھ مجرم ہو۔ ہمارے ساتھ تم بھی گرفت میں آ جاؤ گی۔ کون اعتبار کرے گا تم پر۔'' وہ شخص غراتے ہوئے بولا تو بلقیس خاتون نے کہا۔

''دیکھو زاریہ! ایک طرف عیش کی زندگی ہے۔ سکون سے زندگی گزارو۔ دوسری طرف موت ہے۔ آج تم ہمیں دھوکا دے سکتی ہو تو کل ہمارے بارے میں سب بتا سکتی ہو۔ اب یہ رسک تو نہیں لیا جا سکتا۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''میں اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے مارنا ہے تو مار دو۔'' زاریہ نے سکون سے کہہ دیا۔

''یہ جو تم نے مرنے مرنے کی رٹ لگا رکھی ہے نا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہیں کتنی بھیانک موت دوں گا۔ سسکا سسکا کر ماروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے خود پر قابو پایا پھر کافی حد تک تحمل سے بولا۔ ''مجھے بتاؤ، آخر تمہارا دماغ کیوں خراب ہوا۔ میں اب بھی تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ میں تمہیں رضا کی جگہ بٹھا دوں گا۔ ورنہ وعدے کے مطابق چاہو تو ملک سے باہر جا سکتی ہو۔ جائیداد ہمارے نام کر کے۔''

''اسے یہ بھی سمجھا دو کہ اس کے مرنے سے ہمیں کوئی

فرق نہیں پڑنے والا۔ جائداد کے کاغذات تو ہمارے پاس آہی جائیں گے۔ اس کے نام کی جائداد بھی مجھے مل جائے گی۔ اس کا مرنا ہمارے لیے گھاٹے کا سودا نہیں۔'' بلقیس نے اجنبی لہجے میں کہا۔

''تم لوگ جو مرضی چاہے کرو۔ مگر میں رضا کو دھوکا نہیں دے سکتی۔'' وہ سکون سے بولی

''کیوں۔ یہ اچانک اس کے لیے تمہارے دل میں ہمدردی کیوں؟'' اس نے تڑپ کر غصے میں کہا۔

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے'' زاریہ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ شخص آپے سے باہر ہوگیا۔

''زاریہ۔! بہت ہو چکا تمہارا مرنا اب بہت ضروری ہوگیا ہے۔ دولت نے تمہارا دماغ خراب کردیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ زاریہ پلٹ کر بیڈ سے نیچے جا گری۔ اس کے ہونٹوں سے خون نکلنے لگا۔ اس شخص نے یہیں بس نہیں کی۔ زاریہ کو بے دردی سے پیٹنا شروع کر دیا۔ بلقیس نے آگے بڑھ کر زاریہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ اس کی آواز بھی نہ نکل سکے۔ کچھ دیر بعد زاریہ نیم بے ہوش ہوگئی۔ مگر وہ دونوں اس پر تشدد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ زاریہ کا سر بیڈ سے ٹکرایا۔ پھر اسے اتنا ہوش تھا کہ وہ قالین پر بے دم سی پڑی تھی۔ کنپٹی اور ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ وہ دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''اب اسے مر ہی جانا چاہئے۔ بعد میں بھی اسے زہر دے کر مارنا تھا۔ اب اسے وقت سے پہلے مارنا پڑ رہا ہے۔ جاؤ رسی لاؤ۔'' اس شخص نے غراتے ہوئے نفرت سے کہا۔ زاریہ نے ڈوبتی سانسوں سے دیکھا۔ بلقیس رسی لے آئی۔ وہ دونوں اسے باندھنے لگے۔ زاریہ مزاحمت نہ کرسکی۔ وہ باندھ چکے تو اس شخص نے کہا۔

''اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ اور تم یہاں سے سارا قیمتی سامان نکال لو۔ میں یہاں سب سنبھال لوں گا' تم مجھ سے رابطہ رکھنا۔ جب کہوں تب واپس آنا۔ میں کچھ دیر بعد گاڑی بھیجتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دونوں باہر چلے اور کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ زاریہ موت کے

قدموں کی چاپ سننے لگی۔ بے بسی کی موت' لاحاصل موت' وہ لحہ بہ لحہ موت کے سمندر میں ڈوبتی چلی جارہی تھی۔ وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی' ذرا سی قوت بھی اس میں نہیں تھی۔ زندگی کے ساحل پہنچنے کی شدید تمنا' سمندر میں تیرتی بادبانی کشتی کو آواز دینا چاہتی تھی' مگر نہ دے سکی اور پھر' آخری چیخ اس کے حلق سے بلند ہوئی۔

زاریہ کے سامنے کا منظر بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اسپتال میں تھی اور اس کے اردگرد اجنبی لوگ کھڑے تھے۔ وہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی کہ اس کی نگاہ رضا پر آن ٹکی۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔ اس نے رضا کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔ اور بے ساختہ کہا۔

"رضا...... تم......"

رضا نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ تب سینئر ڈاکٹر نے رضا کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہو' اب یہ نارمل حالت کی طرف لوٹ آئی ہے لیکن احتیاط بہرحال لازمی ہے۔ چند دن میں ہم اسے ڈسچارج کردیں گے۔"

وہ لوگ چلے گئے اور وہ دونوں وہاں تھے۔ زاریہ نے رضا کو خود سے الگ نہیں کیا تھا۔ اسے یوں تھامے بیٹھی تھی جیسے اگر اب اس نے رضا کو چھوڑ دیا تو پھر دوبارہ نہیں پاسکے گی۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔

"تم آرام کرو' میں یہیں ہوں تمہارے پاس۔" رضا نے خود کو الگ کرتے ہوئے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

"میں کہاں ہوں' اور تم' یہاں کیسے۔" زاریہ نے تجسس سے پوچھا۔

"سب بتا دوں گا' اس وقت تم اپنے دماغ پر بوجھ مت ڈالو۔ سکون سے رہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔" رضا نے اس کا ماتھا تھپتھپایا تو اس نے واقعتاً سکون سے آنکھیں موند لیں۔

❁❁❁

اگلے چند دن میں زاریہ بہت بہتر ہوگئی تھی۔ لیکن رضا ایک عجیب طرح کی الجھن میں پھنس گیا تھا۔ زاریہ کے لیے اس کے جذبات واحساسات ایک بھائی کے تھے۔ اس کی تمام تر کوشش ایک بھائی کا فرض تھی جو ایک بہن کے لیے ہونی چاہیں۔ اس کوشش میں ایک خواہش بھی گھلی ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ زاریہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ وہ اس نفرت کو اپنے لیے محبت میں بدلنا چاہتا تھا۔ جب وہ اس سے ملی تو ہوش وحواس سے بے بیگانہ تھی۔ اب وہ ہوش میں تھی۔ ایسے لمحات میں وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ماضی کی کوئی یاد اسے ڈسٹرب کرے یا ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور ہوجائے۔ اس لیے وہ بہت کم اس کے سامنے جاتا تھا۔ رضا کے لیے سب سے اہم بات اس کی بڑبڑاہٹ تھی کہ وہ کیسا دھوکا تھا جو وہ اسے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اس وقت تک صبر کرنا تھا جب تک وہ خود اپنے من کی بات نہ کہہ دیتی۔ اسی باعث وہ پولیس تفتیش میں اتنی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ نجانے اسے کیوں احساس تھا کہ بات یہیں سے نکلنے والی ہے۔ یہ ساری باتیں ایک طرف' اس کی اصل الجھن کا سبب کچھ اور تھا۔ زاریہ کا رویہ ایسا نہیں تھا جو ایک بہن کا اپنے بھائی کے لیے ہوسکتا تھا۔ کئی مواقع پر وہ ٹھٹک جاتا تھا کہ وہ اس رویے کو کیا سمجھے؟

پہلی بار اسے تب احساس ہوا تھا جب شام کے وقت وہ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں آبیٹھے تھے۔ زاریہ نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ وہ خاصی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی' جیسے خیالوں میں کہیں دور پہنچی ہوئی ہو۔ اسی خاموشی میں اس نے رضا کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھیں موند کر تادیر بیٹھی رہی جیسے کوئی سہارا مل جانے سے پرسکون ہوجائے۔ رضا نے جب مضبوط ہوتی گرفت کو محسوس کیا تو دھیرے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ تب وہ چونکتے ہوئے حواسوں میں آ گئی۔ اس نے شاکی نگاہوں سے رضا کی طرف دیکھا اور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"رضا! جانتے ہو خواہش اور حقیقت کے درمیان سفر کیسے طے ہوتا ہے؟" یہ کہہ کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی وہ خاموش رہا تو کہنے لگی۔ "صرف اور

صرف لگن سے، جتنی شدید لگن ہوگی۔ سفر اتنی جلدی طے ہو گا، خواہشیں ان کی پوری نہیں ہوتیں جو لگن نہیں رکھتے۔ میں مانتی ہوں زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، پھر اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آنا۔ لیکن بندہ کم از کم اس دنیا سے جائے تو اس میں کسی کو پالینے کی لگن ضرور ہونی چاہیے۔"

"تب پھر ان خواہشوں کا کیا ہوگا۔ جو ادھوری رہ جاتی ہیں؟" رضا نے یونہی بات بڑھانے کو پوچھا۔

"نہ پوری ہوں۔ خواہشیں تو پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن ایسی خواہشیں بے فائدہ اور لا حاصل ہوتی ہیں جن میں لگن نہیں ہوتی۔ میں صرف لگن کی سچائی کو مانتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھو گئی۔ پھر اچانک بولی۔ "خیر۔! میں کیا موضوع لے کر بیٹھ گئی ہوں۔"

تب رضا نے یونہی ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ موسم کی، ادویات کی اور اسپتال کی باتیں، جن کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

اگلی شام زاریہ نے خواہش کی کہ وہ کھلی فضا میں کچھ دیر گھومنا چاہتی ہے۔ رضا نے ڈاکٹر سے اجازت لی اور اسے لے کر نکل گیا۔ وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھی بہت خاموش تھی۔ اس شام زاریہ نے خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ہلکے پیازی رنگ کے شلوار سوٹ میں پیاری بھی لگ رہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور گلے میں بڑا آنچل بھی لہرا رہا تھا۔ وہ ایک پارک میں چلے گئے۔ دونوں خاموش تھے اور چہل قدمی کے انداز میں روش پر جا رہے تھے۔ تبھی زاریہ کی نگاہ ایک جوڑے پر پڑی۔ وہ قدرے نیم تاریک گوشے میں بینچ پر بیٹھے محو گفتگو تھے۔ وہ تو بیاہتا جوڑا تھا۔ وہ ایک دوسرے میں یوں گم تھے کہ انہیں آس پاس کی خبر ہی نہیں تھی۔

"کتنے خوش قسمت ہیں یہ دونوں، اردگرد کے منظر سے بے نیاز اپنی دنیا میں کیسے مست ہیں۔ ان دونوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش ہے نا جو انہیں اس قدر قریب کیئے ہوئے ہے۔ ورنہ تنہائی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔" زاریہ نے اداس لہجے میں کہا۔

"میرے خیال میں تنہائی بھی تو ایک رویہ ہے نا زاریہ۔ دیکھا جائے تو انسان ہر وقت تنہا ہے اور چاہے تو انسان اپنے اندر میلہ لگا سکتا ہے۔" رضا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو رضا۔ فطری ضرورت ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے، بعض اوقات تو یہ مجبوری بن جاتی ہے۔ لیکن وہ کون سی شے ہے جو انسانوں کو جوڑے رکھتی ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ میرے خیال میں وہ شے محبت سے بھی ماورا ہوتی ہے اور اس کا نام ابھی تک لفظ میں نہیں ڈھلا۔" اس نے کہا اور ایک خالی بینچ پر بیٹھ گئی۔ رضا بھی بیٹھ گیا تو وہ اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ وہ چونک اٹھا۔ اسے لگا جیسے تشنگی کی آنچ سمٹ کر اس تک آن پہنچی ہو۔ جیسے کوئی موی مجسمہ ہو اور زاریہ کے بدن کی آنچ اسے پگھلا دینے کے درپے ہو۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ رضا کے اندر بہن کے پیار کی ٹھنڈک پوری طرح موجود تھی۔

رضا کی نگاہوں میں ایک ایک منظر تھا۔ ہر بار کے لمس میں ایک ہی پکار تھی۔ جیسے وہ سمجھ رہا تھا، لیکن رشتے کا تقدس ایسی سوچ کو حیا کے بھاری پتھر سے کچل کر رکھ دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہی وہ چند رشتے ہوتے ہیں، جن کے باعث زندگی میں حرمت ہے۔ وہ اپنی اس الجھن کو کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر ایسا کر لیتا تو اس کی اپنی ذات انتہائی گھٹیا گڑھے میں گر کر چکنا چور ہی نہ ہو جاتی بلکہ گل سڑ جاتی۔ نجانے اسے کیوں لگ رہا تھا کہ زاریہ جذبات کے ایسے آبشار کی مانند ہو گئی ہے جیسے اپنے پر بھی اختیار نہیں رہا۔ اس کے دماغ کی ایسی کون سی گرہ ہے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کیا وہ ماضی بھول چکی ہے، یا اپنے طور پر کسی نئی دنیا میں بس رہی ہے؟ اسے ڈر تھا کہ کوئی ذہنی جھٹکا اسے پھر سے اسی مقام پر نہ لے جائے جہاں سے وہ اسے کھینچ کر لایا تھا۔ وہ ایک پل صراط تھی جس پر چلتے ہوئے وہ انتہائی مضطرب تھا۔ پھر ایک دن اس نے زاریہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تقدس کو آلودہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ سہ پہر کا وقت تھا جب وہ دونوں جھیل کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔آسمان پر گہرے سرمئی بادل تھے۔یوں جیسے ابھی برس پڑیں گے۔جس طرف وہ کرسیوں پر نیم دراز تھے،اس جانب درخت نہیں،پختہ سڑک تھی جس کے ساتھ ساتھ گہری سبز گھاس والا قطعہ دور تک چلا گیا تھا۔جھیل کے باقی اطراف میں دور دور تک درخت تھے جن پر سبز رنگ کے مختلف شیڈ والے پتے ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا میں لہرا رہے تھے۔اور انہی درختوں سے گرے آوارہ پتے ہوا کے دوش پر تھے۔زاریہ نے بھی گہرے سبز رنگ کی شلوار سوٹ پر آف وائٹ شال لی ہوئی تھی۔کھلے بالوں کے ساتھ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور وہ مسلسل رضا کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔وہ دونوں بھی جھیل کی مانند خاموش تھے۔جبکہ رضا اتنا ہی مضطرب تھا۔اب نجانے اس نے اس جھیل کی تہوں میں کیا تھا۔مگر اس نے خود پر قابو پائے رکھا۔وہ منتظر تھا کہ زاریہ کوئی بات کہے اور اسی کا سرا پکڑ کر اپنی بات کہہ دے۔کافی دیر بعد وہ بولی۔

”کتنا رومانوی ماحول ہے لیکن لوگ کتنے کم ہیں یہاں پر یوں لگ رہا ہے کہ مادی زندگی نے ہماری روح کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ہم اپنا سکون شور شرابے میں تلاش کرتے ہیں۔شاید ہم جسم اور روح کے تعلق کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔“

”اصل میں رشتوں کا تقدس ہی معاشرے کی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔یہ نہ ہو تو سب عشقہ کی بیل کی مانند ہو جائے۔جو اپنے جذبات کی تسکین کے لیے تقدس کے درخت کا رس چوس کر اسے سکھا دیتے ہیں۔“ رضا نے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گئی۔جیسے کسی نے اسے نیند سے جگا دیا ہو۔اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے اچانک اسے بہت کچھ یاد آ گیا ہو۔اس نے حیرت سے رضا کی جانب دیکھا اور پھر بولی۔

”مجھے اسپتال سے کب ڈسچارج کیا جا رہا ہے؟“

”جب میں سمجھوں گا کہ تم بالکل صحت یاب ہو گئی ہو۔کہیں ایسا نہ وہ تم۔“ رضا نے کہنا چاہا تو اس نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے چھوڑو۔میں ٹھیک ہوں۔مجھے اب تمہارے خلاف ہونے والی سازش کو بے نقاب کرنا ہے۔“

”کیسی سازش؟“ رضا نے بے تابانہ پوچھا تو زاریہ نے چند لمحے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی پجارن کسی مقدس مورتی کو دیکھتی ہے۔پھر یوں بولی جیسے اس کی آواز بکھر بکھر کر سمٹ رہی ہو۔

”میں سلمان اشرف کی بیٹی نہیں ہوں اور نہ ہی بلقیس خاتون تمہارے پاپا کی بیوی ہے۔یہ سب پلان تھا جو تمہاری جائداد ہتھیانے لے لیے کیا گیا تھا۔“ وہ اتنا کہہ کر رضا کے چہرے پر ردعمل دیکھنے لگی۔جہاں حیرتیں اتر آئی تھیں۔”میں ایک غریب گھر کی خواہشوں کی ماری لڑکی ہوں جو پڑھ لکھ کر اپنی دنیا آپ بنانا چاہتی ہے۔بلقیس میری رشتے دار ہے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئی تاکہ نہ صرف میرا خرچ بچ جایا کرے بلکہ بڑے شہر میں موجود وسائل سے اپنا حصہ سمیٹ لوں۔اس کی نوازشیں جاری رہیں۔یہاں تک کہ ایک دن اس نے مجھے اپنا پلان سنایا۔“

”کیا تھا پلان؟“ رضا نے بے ساختہ پوچھا تو زاریہ اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہتی چلی گئی۔

”اس کے ڈاکٹر کے پاس اسی شہر کا ایک معزز اور امیر شہری زیر علاج تھا۔بلقیس خاتون کو وہاں نرس اس شخص نے رکھوایا تھا۔کیونکہ کبھی ماضی میں ان دونوں کی شناسائی رہی تھی۔اس شخص کو کینسر تھا۔اور وہ تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔وہ شخص سلمان اشرف تھا۔“

”کیا!پاپا کو کینسر تھا؟“ رضا چیخ اٹھا۔

”ہاں۔!انہوں نے یہ بات سب سے چھپائی تھی۔صرف ڈاکٹر اور نرس بلقیس خاتون جانتی تھی۔تمہارے پاپا نے سختی سے منع کیا تھا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔اس کے گھر والوں کو تو قطعاً نہیں۔کیونکہ موت کا احساس،موت سے پہلے مار دیتا ہے۔وہ تو اس اذیت سے گذر ہی رہا ہے،دوسروں کو کیوں مبتلا کرے۔“

”اوہ۔!پاپا فقط ہماری خوشی کی خاطر اکیلے دکھ جھیلتے

رہے۔" رضا یوں بلک پڑا جیسے اس کے دل میں خنجر پیوست ہو گیا ہو۔
"پرانی شناسائی اور راز دار ہونے کا فائدہ بلقیس نے اٹھایا۔ لیکن ایک اور شخص بھی اس پلان میں شامل تھا۔ ان لوگوں نے مجھے راتوں رات امیر ہو جانے کا کہا اور میں مان گئی۔ دولت میری کمزوری ہی نہیں ضرورت بھی تھی۔ میں کاغذات میں زاریہ ریاض سے زاریہ سلمان بن گئی۔ اور پھر ہم سب تمہارے بابا کی موت کا انتظار کرنے لگے۔ جو طویل ہوتا گیا اور اس میں ڈیڑھ برس لگ گیا۔ تب بلقیس سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے تمہارے پاپا کو سلو پوائزن دینا شروع کر دیا۔ اس کا مجھے اس وقت پتہ چلا جب تمہارے پاپا اس دنیا میں نہیں رہے۔"
"تو میرے پاپا کی قاتل بلقیس ہے؟"
"شاید ہاں۔ یا شاید نہیں، کیونکہ اس سے سب کچھ وہی شخص کرواتا تھا جو اس پلان میں شامل تھا۔ جسے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہی سب کچھ بلقیس سے کہتا اور وہ کرتی جاتی۔ اس دن قبرستان میں ہماری ملاقات اتفاقیہ نہیں بلکہ وہ بھی پلان کا حصہ تھی۔ تب میں گئی اور تم پر نگاہ پڑنے سے پہلے تک میں پلان کا حصہ رہی لیکن جیسے ہی تمہیں دیکھا میری دنیا بدل گئی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں دھوکا نہیں دینا اور......"
"اور کیا؟" رضا نے اپنے اندر کے دکھ کو پوری طرح دباتے ہوئے کہا۔
"اور تمہیں پانا ہے۔ تم میرا آئیڈیل ہو رضا۔" زاریہ نے پاگلوں کی طرح اس کے چہرے پر یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے پوری دنیا وہیں سمٹ کر آ گئی ہو۔
"تمہارا آئیڈیل، تمہارے لیے اتنا اہم تھا کہ تم نے دولت اور جائداد چھوڑ دی؟" رضا نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔
"ہاں۔! میرے لیے اتنا ہی اہم ہے۔ میں تمہیں اپنی کھلی آنکھوں کے خواب میں تب سے دیکھ رہی ہوں۔ جب سے میرے اندر کی فصلیں پکنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہرن کے نافے سے پھیلنے والی مہک کو سبھی محسوس کرتے ہیں لیکن یہ مہک نافے میں پیدا کب ہوتی ہے؟ اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ حالانکہ یہ اس کے اندر کا اظہار ہوتی ہے۔ میں تمہاری معصومیت، وجاہت اور مردانہ پن پر قربان ہو گئی مجھے اس دن احساس ہوا کہ زنانِ مصر نے اپنی انگلیاں کیسے کاٹ لی ہوں گی۔ میں نے فیصلہ کہ چاہے میری جان چلی جائے، تمہیں دھوکا نہیں دوں گی۔" زاریہ اپنے جذبات کی رو میں بہتی ہوئی کہیں چلی گئی۔
"اور تمہیں اس حال تک کس نے پہنچایا۔"
"بلقیس اور اس شخص نے' کیونکہ میری وجہ سے ان کا پلان ختم ہو گیا۔ تم نے تو پورے خلوص سے جائداد ہمارے نام لگا دی۔ میں نے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا انکار میری موت ہے اور میں نے موت قبول کر لی، وہ تو مجھے مار کر پھینک گئے تھے۔ یہ میری زندگی تھی یا میری محبت کی سچائی کہ میں پھر سے زندگی کی طرف لوٹ آئی ہوں اور آج وہ میرے پاس ہے جس کی چاہ میں نے خود سے بڑھ کر کی ہے۔" زاریہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ سب کچھ کہہ کر یوں ہلکی پھلکی اور پرسکون ہو گئی تھی کہ جیسے خلاؤں میں تیر رہی ہو۔ یہ در پہ انکشافات نے رضا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ کئی سوالوں نے بھی جنم لے لیا۔ یہ موقعہ نہیں تھا کہ وہ زاریہ سے کہتا۔ اس لیے وہ بولا۔
"زاریہ۔! آؤ چلیں، باقی باتیں کل کریں گے۔ شام ڈھل گئی ہے" تب اسے احساس ہوا کہ جھیل، درختوں اور پورے منظر کو اندھیرا نگل رہا ہے۔ وہ واپس چل دیئے۔

❀❀❀

شبانہ بیگم کے لیے یہ انکشافات پاگل کر دینے والا تھا کہ سلمان اشرف نے انہیں دکھ نہ دینے کی خاطر اپنا روگ چھپائے رکھا۔ شاید اتنا درد اس نے سلمان اشرف کی موت پر محسوس نہیں کیا۔ جتنا وہ اب کر رہی تھی۔ وہ رضا سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شدتِ غم سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ اسے خود پر قابو پانے میں خاصا وقت لگ گیا

تھا۔ پھر اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"رضا۔! مجھے یہ احساس تو تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے اور وہ سچ ثابت ہوا لیکن اب بھی دیکھنا کوئی نیا جال تمہارا منتظر نہ ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فیض الدین جیسا بااعتماد ملازم یہ سب پلان کرے گا۔"

"شاید فیض الدین کے بارے میں پتہ نہ چلتا مگر بلقیس خاتون کی گرفتاری کے بعد یہ سارے انکشافات ہوئے اور زاریہ کی کہی ہوئی ہر بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے اعتراف جرم کر لیا اور فیض الدین کے بارے میں ساری تفصیل بتا دی۔ اصل میں سارا پلان اس نے بنایا تھا۔" رضا نے وضاحت کی۔

"فیض الدین نے پرانی رفاقت کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تمہارے پاپا کے سارے زوال و عروج سے واقف تھا۔ اس کے لیے یہ کہانی گھڑنا، پرانی چیزوں سے تصدیق کروانا اتنا مشکل نہیں تھا۔ وہ جعلی نکاح نامہ بھی بنوا سکتا تھا۔ جیسے اس نے زاریہ کے بارے میں کہا لیکن ایسا کر کے وہ بلقیس کو بیوی ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف وہ وراثت کی حصہ دار ہوتی اور دوسری طرف قانونی وارث، پھر اسے کیا ملتا؟

"ہاں۔ اس نے یہ بھی اعتراف کیا۔" رضا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"دراصل بیٹا۔! وہ ایک منافق شخص تھا اور منافق لوگ اس مادہ سانپ جیسے ہوتے ہیں جو اپنے ہی سنپولیوں کو نگل جاتی ہے۔ حسد کا زہر انہیں خود بے چین رکھتا ہے۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ لمحہ لمحہ اپنی ذات میں غلاظت بھر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے تو منافق دنیا کے غلیظ ترین انسان ہوتے ہیں۔" شبانہ بیگم نے قدرے تلخی سے کہا۔

"ماما! آپ فکر نہ کرو۔ میں اب محتاط ہوں۔" رضا نے یہ کہہ کر اپنی ماما کو اطمینان دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر خود مطمئن اب بھی نہ تھا۔ اس کے سامنے زاریہ کا رویہ تھا۔ وہ اپنے لفظوں میں سچی ثابت ہوئی تھی۔ ان چند دنوں میں اس نے زاریہ کے بارے میں بہت متضاد سوچا تھا۔ اسے نجانے یہ کیوں لگ رہا تھا کہ اس نے فیض الدین سے بھی بڑا پلان کیا ہوا ہے۔ تھوڑی سی جائداد اور دولت کے عوض وہ اپنا آپ نہیں گنوانا چاہتی بلکہ اس نے تو رضا ہی کو پانے کا سوچ لیا تھا۔ یہ آئیڈیل اور محبت کا فلسفہ اس کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ لیکن۔ ادوسری طرف اسی خیال کی تردید بھی ہو جاتی۔ وہ لڑکی جو بے ہوشی کی حالت میں بھی اسے دھوکا نہ دینے کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ یہاں تک کہ اس نے موت بھی قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ عمل ایسا نہیں تھا کہ اس پر سرے سے لکیر پھیری جا سکے۔ اسی تصدیق اور تردید سے ایک نئی کشمکش نے جنم لیا تھا۔ مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ ڈاکٹرز نے زاریہ کو ڈسچارج کرنے کے بارے میں کہہ دیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے حتمی بات کرنا تھی۔

وہ ایک خوشگوار صبح تھی سفید آسمان شفاف تھا۔ جس سے سورج کی روشنی نے ہر شے کو چمکا دیا تھا۔ زاریہ کو ڈسچارج کر دیا گیا ہوا تھا اور وہ جانے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ فیصل اور عاتکہ اس کے پاس موجود تھے، جب رضا ان کے پاس پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی کمرے کی فضا جیسے جاگ اٹھی تھی۔

"سوری ایوری باڈی۔! میں تھوڑا لیٹ ہو گیا۔ تو پھر چلیں؟" رضا نے خوش کن لہجے میں کہا۔

"کہاں؟ کہاں جانا ہے مجھے؟" زاریہ نے دکھ اور تجسس کے ملے جلے لہجے میں پوچھا تو رضا چند لمحے خاموش رہا پھر فیصل اور عاتکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا کیا تم نے یہ سوال کر دیا، تمہارے سوال کا سیدھا سا جواب تو یہی ہے کہ ہمارے گھر، لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ وہاں تمہاری حیثیت کیا ہو گی۔"

"ہاں، میں سمجھتی ہوں کہ یہ طے ہونا چاہئے۔ ایسا کیوں ہے یہ میں جانتی ہوں۔" عاتکہ نے تیزی سے کہا۔

"تو پھر سنو۔! زاریہ میرے گھر میں میری بہن کی حیثیت سے رہے گی۔ جو اس کا تعارف۔"

"نہیں رضا! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم نے کہہ دیا اور میں نے مان لیا۔" زاریہ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔

"کیا حرج ہے۔ میں نے تمہیں زبان سے بہن کہا تو دل سے بھی مان لیا ہے۔ میں تمہیں ایک بہن کی عزت اور مان دوں گا۔ ہر وہ۔" رضا نے آہستگی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔ میں نے نہیں کہا اور نہ میں نے مانا، میں نے جو مانا۔ وہ تم جانتے ہو۔ میں مر تو سکتی ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتی۔" زاریہ نے یوں کہا جیسے زندگی کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہی ہو۔ اس کا چہرہ ایک دم سے پیلا ہو گیا تھا۔ فیصل نے اس کی بدلتی ہوئی حالت کو محسوس کر لیا تھا۔

"زاریہ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ میں اس کے لیے ترس رہا ہوں۔ میں نے پہلی نظر سے لے کر اب تک تمہیں بہن ہی کے روپ میں دیکھا ہے۔ اسی رشتے سے تجھے سوچا ہے اور وہی مقام میں تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ خیال آیا تھا کہ تم نے فیض الدین سے بھی برا پلان کیا۔ جس کا سب کچھ ہے۔ اسی کو اپنا لو تو سب کچھ تمہارا ہوگا۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کیونکہ میں اب بھی تمہیں سب کچھ دینا چاہتا ہوں۔ یہاں کا سب کچھ تیرے حوالے، بس تم ایک بہن کا مان مجھے دے دو۔" آخری لفظ کہتے ہوئے رضا کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

"نہیں رضا! میں تمہاری زندگی سے بہت دور جا سکتی ہوں۔ لیکن میں اپنے آئیڈیل کو اپنے ہاتھوں پاش پاش نہیں کر سکتی۔"

"دیکھو میں نے تمہیں بہن سوچا، سمجھا اور تسلیم کیا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتی جو تم سوچ رہی ہو وہ میرے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔" رضا نے اسے کہا۔

"اور یہی جذبات میرے ہیں رضا۔" وہ سکون سے بولی۔

"تو پھر فیصلہ کیا ہوگا۔ تم دونوں دریا کے ان کناروں کی طرح ہو جو مل نہیں سکتے۔" تب اچانک فیصل نے کہا

"میں تم سے کچھ نہیں مانگتی رضا۔ اور نہ تمہاری دنیا میں آؤں گی۔ مجھے تمہاری دولت اور جائداد سے بھی کچھ نہیں چاہیے۔ اب اگر دینا بھی چاہو گے تو میں نہیں لوں گی۔ تم اپنی دنیا میں خوش رہو۔ بس ایک شے مانگتی ہوں اگر دے سکو تو؟" زاریہ نے عجیب سے لہجے میں یوں کہا جیسے کوئی اپنی آخری خواہش بیان کر رہا ہو۔

"بولو۔" رضا نے حیرت سے کہا۔

"تمہیں تمہارے لفظوں کا پاس مبارک ہو۔ لیکن مجھے وہ احساس دے دو جو محبت سے بھی ماورا ہوتا ہے۔ اور شاید اس کے لیے کوئی لفظ نہیں بنا۔ میں اسے حاصل ہی نہیں کرنا چاہتی جو میرا نہیں تھا مگر اسے تو بچا سکتی ہوں جو میرا اپنا ہے۔ کیا تم مجھے وہ احساس دے سکتے ہو۔" زاریہ نے یوں کہا جیسے کسی وادی میں کھڑے ہو کر زور سے آواز دے دی جائے۔ رضا کو بڑی دیر تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ تب زاریہ نے فیصل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آؤ فیصل۔ چلیں، ہم ایک نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی کمرے کی طرف نہیں دیکھا۔ فیصل نے بیگ اٹھائے اور اس کے پیچھے چل دیا۔ رضا نے شدتِ دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔ تبھی عاتکہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ تمہیں اپنے لفظوں کی حرمت پر فخر کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ انسان کو بھی اختیار ہے کہ وہ اپنا مقدر بنا سکتا ہے۔ اس نے اپنی قسمت خود چن لی ہے۔ وہ فیصلے جو آسمانوں پر ہو جاتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں ٹال سکتا۔ آؤ چلیں۔"

رضا نے عاتکہ کی طرف دیکھا اور اٹھ گیا۔ پھر دونوں چلتے ہوئے پارکنگ تک آ گئے۔ جہاں سے وہ فیصل اور زاریہ کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ رضا ایک دم سے پرسکون ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ انسان حرمت سے کیا کچھ پا لیتا ہے۔

اسمگلر

انجم فاروق ساحلی

ایک ذہین سراغرساں اور خوبرو اسمگلر کے درمیان کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد' ایک کے پاس ذہانت تھی تو دوسرے کے پاس حسن و شباب کا جال۔

مغرب سے انتخاب' نئے افق قارئین کے لیے بطور خاص

ایمسٹرڈم سے آئیڈیل ولا جاتے ہوئے' دوران پرواز میری آنکھیں ایک انتہائی حسین لڑکی پر جمی رہیں۔ پہلے پہل تو میں نے محض اس کے حسن کا اندازہ لگانے کے لیے اسے دیکھا لیکن پھر دیکھتا ہی چلا گیا۔ میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اس قیامت ادا حسینہ سے پہلے کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔

دوران پرواز ہم دونوں کی نظریں کئی دفعہ آپس میں ٹکرائیں لیکن میں نے لڑکی کی گہری نیلی آنکھوں میں اپنے لیے شناسائی کی کوئی حرارت محسوس نہیں کی وہ لاتعلقی سے مجھے دیکھتی پھر نظریں پھیر لیتی۔ وہ لڑکی اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ کسی مرد کا اسے بار بار دیکھنا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ مردوں کی گرم جوش نظروں کی عادی ہو چکی تھی۔

وہ سارے راستے نسوانی ادا کے ساتھ سگریٹ کے کش لیتی رہی۔ وہ ناک سے دھواں نکالتی تو میں بہت ہی لطف اندوز ہوتا۔ اس کا سراپا قیامت' جسم میں بلا کی سیکس اپیل تھی۔ یاقوتی ہونٹ' گلابی رنگت' سنہرے بال اور جھلک دار بازوؤں وری قمیص کے ساتھ جب اس نے انگڑائی لی تو جہاز میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ اس حسینہ کے نتھنے چوڑے اور پھیلے ہوئے تھے مگر میں اس سوچ میں گم تھا کہ اس حسینہ سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی۔!

ہوائی اڈے پر اترتے ہی میں نے فضائی میزبان کو بلایا پھر پوچھا۔

''کیا تم اس سنہرے بالوں والی لڑکی کا نام بتا سکتی ہو۔ جو سیٹ نمبر بارہ پر بیٹھی تھی؟'' میں اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔

''اوہ۔ یہ سوال پہلے بھی کئی لوگ مجھ سے کر چکے ہیں۔ وہ واقعی بے حد خوب صورت ہے۔'' فضائی میزبان نے ہنس کر کہا۔

''اس کا نام کیری آسوالڈ ہے۔ یہ ڈوچ فیشن ہاؤس کی سیلز آفیسر ہے۔'' فضائی میزبان قدرے حسد سے بولی۔

''لیکن میں نے اسے کہیں اور دیکھا ہے۔''

''شاید ایسی ہی کسی فلائٹ میں آمنا سامنا ہوا ہوگا۔'' فضائی میزبان نے قیاس کیا۔

''وہ عام طور پر اسی راستے پر سفر کرتی ہے۔''

''نہیں میں ایک سال پہلے آئیڈیل ولا سے باہر گیا ہوا تھا اور ایمسٹرڈم جاتے ہوئے بھی میں نے اسے نہیں دیکھا۔ بہرحال تمہارا شکریہ۔''

میں کیری آسوالڈ نامی لڑکی سے واقف نہیں تھا۔ یہ نام میرے لیے اجنبی تھا لیکن چہرہ شناسا تھا میں سوچنے لگا کہ شاید کیری آسوالڈ اس کا اصلی نام نہیں بلکہ یہ لڑکی

کسی جعلی نام سے سفر کر رہی ہے۔ مجھے یقین تھا اس لڑکی سے پہلے بھی کہیں آمنا سامنا ہو چکا ہے۔

کسٹم سے فارغ ہونے کے بعد وہ جونہی کاک ٹیل روم میں داخل ہوئی۔ میں بھی فوراً اس کے پیچھے چل دیا۔ اسے شاید میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ تبھی اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اپنے سامنے ایک ہم سفر کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دی۔ میں قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر ٹائی کی گرہ درست کرنے لگا۔

میں نے آئینے میں دیکھا کہ وہ ایک صوفے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے صوفے پر بیٹھ کر ایک سگریٹ نکالی اور پھر ہینڈ بیگ کھول کر لائٹر تلاش کرنے لگی۔ لائٹر شاید نیچے دب گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ہینڈ بیگ کی ہر چیز میز پر الٹ دی اور لائٹر تلاش کر کے اس نے سگریٹ سلگائی۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ سگریٹ کے دھوئیں سے کھیل رہی تھی۔

''ہیلو۔'' میں نے قریب پہنچ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے اجنبی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''شاید ہم پہلے بھی کبھی مل چکے ہیں؟'' میں نے مزید کہا۔

''طیارے میں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''نہیں اس سفر سے پہلے بھی کہیں ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔'' میں نے اصرار کیا۔

''شاید ایمسٹرڈم میں ملے ہوں گے۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں کہیں اور؟'' میں نے زور دیا۔

''سوری مسٹر۔'' وہ قدرے ناگواری سے بولی۔ ''مجھے اس سلسلے میں کچھ یاد نہیں۔''

میں نے ان اشیاء کی طرف دیکھا جو لڑکی نے ہینڈ بیگ سے نکال کر میز پر رکھ دی تھیں۔ سگریٹ، لائٹر، کنگھی، لپ اسٹک اور ایک خط۔ خط اس طرح رکھا ہوا تھا کہ لفافے پر لکھا ہوا نام میں نے با آسانی پڑھ لیا۔

''لیلسا۔'' میں نے دل ہی دل میں وہ نام دہرایا۔ میرے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ لیلسا پرمن تھی۔

لیلسا نے خط پر میری توجہ دیکھ کر سامان دوبارہ ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ لیکن شاید وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ اسے یہ کام اسی وقت کرنا چاہیے تھا جب میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

''بہر حال خاتون۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پہلے کبھی ہماری ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔ کیا میں آپ کو ایک کاک ٹیل گلاس پیش کر سکتا ہوں؟'' لڑکی نے قدرے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔

''ضرور۔'' وہ کچھ اور مسکرائی۔
''میں شہر تک جانے میں کسی کی رفاقت چاہتی تھی۔ لیکن کیا واقعی ہماری پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔''
''میں آپ کا تجسس ختم کیے دیتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔
''میرا نام بل لارنس ہے۔ میں انشورنس کے شعبے میں ہونے والی چوریوں اور بعض اوقات اسمگلنگ کا پتہ چلانے پر مامور ہوتا ہوں۔'' میں نے دیکھا کہ وہ چونک پڑی ہے لیکن اس نے اتنی ہی تیزی سے اپنے چہرے کے تاثرات کو معمول کے مطابق بنا لیا تھا۔
''گویا تم سراغ رساں ہو۔ یہ تو بہت دل چسپ پیشہ ہوگا۔'' اس نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔
''بہت دل چسپ' بہر حال خاتون۔'' میں نے جواب دیا۔
''بعض اوقات مجھے کسٹم انسپکٹر کے تعاون سے بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ میں اس لڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا وہ بہت تیزی کے ساتھ سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔
''کیا یہ کوئی قابل اعتراض بات ہے؟ سگریٹ نوشی میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میرا نام کیری آسوالڈ ہے اور میں ایک فیشن ہاؤس میں سیلز آفیسر ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔
''تو کیا آپ فیشن ہاؤس کے کام کے لیے ایمسٹرڈم سے آئیڈیل ورلڈ کا سفر طے کرتی ہیں۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''میں سمجھی نہیں؟'' وہ بوکھلائی۔
''آپ بہت جلد سمجھ جائیں گی۔ مس ایلسا پرمن۔'' میں نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی اور اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سپید پڑ گیا۔

⁂ ...... ⁂ ...... ⁂

کسٹم انسپکٹر مارٹن خوشی سے اچھل پڑا۔
''یار تمہاری یادداشت تو غضب کی ہے۔'' اس نے میرا کندھا تھپک کر کہا۔
''یہ لڑکی تو ایک عرصے سے سفر کر رہی تھی اور ہمیں کبھی شک بھی نہیں ہوا کہ یہ ایلسا پرمن بھی ہو سکتی ہے۔ ہیروں کی اسمگلر۔''
''ہاں لیکن میں اس کے غیر معمولی حسن کی وجہ سے اسے پہچان گیا۔'' میں نے کہا۔
''مجھے حیرت ہے کہ پچھلے سال یہ کس طرح میرے بچھائے ہوئے جال سے بچ نکلی بہر حال اب تو قصہ ختم ہو گیا۔''
مارٹن نے اپنی ہتھیلی میں رکھے ہوئے روئی کے چھوٹے سے پھائے کو دیکھا۔ جس میں ایک انتہائی قیمتی ہیرا جگ مگا رہا تھا۔
''ویسے یہ لڑکی بڑی شاطر نکلی۔ اسے یقین تھا کہ کسٹم والے جامہ تلاشی لیں گے لیکن اس نے روئی کے اس ٹکڑے میں ہیرا چھپا کر نتھنے میں رکھ لیا۔ واہ کیا شاندار ترکیب نکالی اس نے مگر تمہیں اس پر شک کس طرح ہوا بل!'' اس نے تجسس سے بے قابو ہوتے پوچھا۔
''وہ سگریٹ پیتے ہوئے ناک سے دھواں نکال رہی تھی۔ لیکن اگر سگریٹ پینے والا شخص ایک نتھنے سے دھواں خارج کرے تو یہ بات بہت عجیب لگتی ہے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ ایلسا کے ایک نتھنے سے دھواں نہیں نکل رہا تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔''
''تمہاری قوت مشاہدہ بہت تیز ہے بل۔'' انسپکٹر نے کہا۔ کچھ دیر بعد ہم ہیروں کی اسمگلر ایلسا کو گرفتار کر کے شہر لے جا رہے تھے۔

⁂

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

بھائی جان	امین الدین صدر بھایانی
نمکین محبت	صائمہ قریشی
بدلاؤ	مریم مرتضیٰ
شب قدر	فاطمہ اے خان
غلط فہمی	یاسین صدیق

بھائی جان

امین صدر الدین بھایانی

میں نے اسٹڈی میں داخل ہوتے ہی کمرے کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔
کمرے کی تین دیواروں پر لگی الماریوں میں نفاست اور سلیقے سے بے شمار کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ چوتھی دیوار کے وسط میں گھر کے عقبی احاطے میں لگے مختصر سے باغیچہ میں کھلتی کھڑکی سے شام کے دھندلے سائے اور اُفق پر دور تک پھیلی نارنجی شفق عجب سا سماں باندھ رہی تھی۔ کمرا ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی اور وہاں پھیلی خاموشی کے سبب ایک نامعلوم سی پُر اسراریت میں لپٹا محسوس ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے عین ساتھ لکھنے والی میز پر چند کتابیں اور ایک ٹیبل لیمپ دھرا تھا۔ دوسری طرف مطالعے کے لیے چرمی آرام کرسی لگی تھی۔ ایک لمبا سا ریڈنگ لیمپ کرسی کے پیچھے سے ہوتا ہوا عین اوپر یوں چھایا ہوا تھا کہ اُس کا اجالا صرف کرسی تک ہی محدود تھا۔ میز کے اوپر دیوار گیر پینٹنگ میں ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں گھرے ساحل کے آسمان پر چند پرندے اُڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ پینٹنگ سے ذرا نیچے دیوار کی خالی جگہ پر تین چار چھوٹی چھوٹی تصاویر سے مزین ایک پرانا سا فریم نصب تھا۔ فریم پر نظر پڑتے ہی ایک بیساختہ مسکراہٹ یک لخت میرے لبوں پر پھیل گئی۔ مگر جتنی تیزی کے ساتھ وہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اُسی تیزی کے ساتھ معدوم بھی ہو گئی۔ فریم میں کل چار تصاویر لگائے جانے کی گنجائش تھی اور وہاں صرف تین تصاویر آویزاں تھیں۔ چوتھی تصویر والی جگہ خالی پڑی تھی۔

"بھائی جان کی تصویر کہاں گئی؟" میں نے سوچتے ہوئے اپنا چہرہ محمود کی طرف پھیرا۔ شاید وہ میرے چہرے پر ثبت حیرت کے ساتھ میری آنکھوں سے ٹپکتے سوال کو بھانپ گیا اور نظریں چرالیں۔ اُس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ کمرے کے عین وسط میں لگی کرسیوں اور کافی ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یار شفقت! تم ذرا بیٹھو میں تمھاری بھابی کو چائے بھجوانے کا کہہ کر ابھی آیا۔" اُس سے پہلے کہ میں اُسے روکتا وہ تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں دھیرے دھیرے چلتا کرسی تک گیا۔ دھم سے ڈھیر ہو کر اپنا سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔ میری نگاہیں فریم کے اُسی خالی حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں آج سے کوئی پینتیس چھتیس برس قبل اُن دیگر تصاویر کے ہمراہ بھائی جان کی تصویر خود میں نے اور محمود نے مل کر لگائی تھی۔

یہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اواخر کا ذکر ہے۔
میں اور محمود نچلے متوسط طبقہ کی آبادی کے ایک محلے میں رہا کرتے تھے۔ مقامی اسکول میں میٹرک کی کلاس میں ہم جماعت ہونے کے علاوہ گھر آمنے سامنے ہونے کے سبب گہرا یارانہ تھا۔ ہمارے گھر والوں نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے ہمیں محلے ہی کے ایک گھر میں قائم ٹیوشن سینٹر میں داخل کروا دیا۔ گو کہ ہم تعلیم میں کچھ ایسے بُرے بھی نہ تھے مگر چونکہ بہتر نمبروں ہی کے سبب آگے اچھے کالج میں داخلہ ملنے کی امید تھی۔ لہذا دسویں جماعت کے پہلے روز سے ہی ہمارے والدین ہمیں محلے کے سب سے پڑھاکو اور نیک نام لڑکے کے گھر لے گئے اور پھر ہم دونوں نے باقاعدگی کے ساتھ ہر شام کو پانچ سے سات بجے تک وہاں جانا شروع کر دیا۔
نام تو اُن کا شرافت علی تھا۔ مگر سارا محلہ اُنھیں بھائی جان، بھائی جان کہہ کر پکارتا۔ وہ اپنے والدین کی نرینہ اولاد تھے۔ گھر میں دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ ساتھ اُن کے والدین تک اُنھیں بھائی جان ہی کہہ کر پکارتے۔ یوں وہ محلے

بھر کے بھائی جان ٹھہرے۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا، کیا جوان، کیا بوڑھا۔ مرد ہو یا عورت سب اُنہیں بھائی جان ہی کہہ کر پکارتے۔ تیس بتیس سال کے باوجود چوبیس پچیس سے زیادہ کے دکھائی نہ دیتے۔ بھائی جان کو دیکھنے والا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ لامبا قد، کھلتی رنگت پر گہرے سیاہ گھنے بال، چوڑی پیشانی کے ساتھ قدرے پتلی سی ناک۔ ہمہ وقت صاف ستھرے اور کلین شیو رہا کرتے۔ وہ اپنے دور کے کسی فلمی ہیرو سے کیا ہی کچھ کم رہے ہوں گے۔

سارے محلے میں اُن کا گھرانہ بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اُن کے والدین نے تمام عمر اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے نہ صرف اپنے تمام بچوں کی عمدہ پرورش کی بلکہ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے زیور سے بھی آراستہ کیا۔ اب بھائی جان ہی کو لے لیجیے۔ انہوں نے انگریزی ادب میں گولڈ میڈل کے ساتھ ماسٹرز کیا۔ پھر بناء کسی سفارش کے محض اپنی اعلیٰ تعلیمی قابلیت کے بل بوتے پر اہم سرکاری محکمے میں بہت اچھی پوسٹ پر اُن کا تقرر بھی ہو گیا۔

بھائی جان ایسی کلیدی سرکاری پوسٹ پر متعین تھے کہ جہاں ہر وقت مَن برستا تھا۔ مگر کیا کیجیے کہ والدین کی تربیت ہی کچھ ایسی تھی، اُوپر کی آمدنی سے اُنہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ والد کے ریٹائرڈ ہو جانے کے بعد اب وہ ہی گھر کے واحد کفیل تھے۔ اپنے سے چھوٹے دو بھائیوں اور دو بہنوں کی تعلیم اور گھر کے اِخراجات کی مکمل ذمہ داری، جو کہ ظاہر ہے والد کی قلیل سی پنشن میں تو کسی طور پر پورے نہ ہو سکتے تھے، اُن ہی کے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔

سہ پہر چار بجے وہ اپنے دفتر سے فارغ ہو کر گھر پہنچتے۔ نہا دھو کر شام پانچ بجے اُن کے کمرے میں، جو کمرا کم اور لائبریری زیادہ معلوم ہوتا، جمع ہونے والے محلے کے دس بارہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ہی کو اگر اُن کی بالائی آمدنی کہہ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

بھائی جان کے اُس لائبریری نما کمرے میں لگی دو بڑی بڑی الماریاں کتابوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ایک الماری میں انگریزی اور دوسری میں اُردو ادب کی کتابیں۔ انگریزی ادب سے تو مجھے اور محمود کو اُس وقت تک کوئی خاص شغف نہ تھا۔ بلکہ سچ پوچھیں تو اُردو ادب و شاعری سے بھی ہمیں متعارف کروانے کا سہرا اگر میں کہوں کہ بھائی جان کے سر جاتا ہے تو ہر گز بیجا نہ ہوگا۔ اُس سے قبل ہم بچوں کے ناول، رسالوں اور دیگر فلمی نوعیت کے جرائد سے ہی دل بہلا لیا کرتے۔ بھائی جان کی الماری میں اُردو ادب کی اتنی ڈھیر ساری کتابیں دیکھ دیکھ کر انہیں پڑھنے کی چاہ ہمارے دلوں میں بھی پنپنے لگی۔ جب بھی موقعہ ملتا ہم الماری سے کوئی نہ کوئی کتاب اُٹھا کر اُس کے صفحات پلٹنا شروع کر دیتے۔ بھائی جان نے اس حوالے سے ہماری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ وہ اپنی پسندیدہ کتابوں کے بارے میں بتاتے اور من پسند کتابیں گھر لے جانے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔

بھائی جان کی ایک اور عادت جو آگے چل کر ہم دونوں میں بھی سرایت کر گئی وہ تھی اُن کا گیت و غزلوں کا شوق۔ ہمیں پڑھاتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں اپنا ریڈیو بھی لگا دیتے اور سرِ شام مقامی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے گیت و غزل کا پروگرام سر دھنتے ہوئے سنتے اور ہمیں پڑھاتے جاتے۔

ادب و موسیقی سے ہمارے شوق کو مہمیز کرنے میں بھائی جان کے دوستوں نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہوتا کچھ یوں کہ اکثر شام کے اوقات میں بھائی جان کے چند ہم ذوق دوست بھی آ جاتے۔ ادب، شاعری، موسیقی حتیٰ کہ تازہ ترین شائع شدہ ادبی کتب اور نئی ریلیز شدہ فلموں پر اُن کے مابین ہونے والی گفتگو اس قدر دلچسپ ہوتی کہ ہماری آنکھیں تو سبق پر ہوتیں مگر کان اُن کی گفتگو پر لگے رہتے۔

اکثر جمعرات کو رات گئے یا پھر جمعہ کی شام کو کہ اُن دنوں جمعہ کی تعطیل ہوا کرتی تھی۔ اُن کے گھر پر ہم خیال و ہم ذوق دوستوں کی ادبی بیٹھک بھی ہوا کرتی۔ بھائی جان نے ہم دونوں کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن بیٹھکوں میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

علاوہ ازیں وہ ریڈیو سے نشر ہونے والے ادبی پروگراموں میں بھی گاہے بہ گاہے حصہ لیتے۔ جس روز اُن کا

پروگرام نشر ہوتا، میں اور محمود وہ پروگرام شوق سنتے۔
اِن تمام باتوں کا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہماری ادبی معلومات میں کما حقہ اضافہ ہوا وہیں اسکول کے ساتھیوں میں بلعموم اور اُردو کے استادوں میں بالخصوص ہماری ادبی معلومات کی دھاک بیٹھ گئی۔ اکثر اساتذہ تک کسی نو آمدہ ناول، افسانوی یا شاعری مجموعے کے بارے میں ہماری رائے جاننے کی کوشش کرتے۔ بھائی جان کی گھریلو لائبریری، اُن ادبی بیٹھکوں اور ادبی ریڈیو پروگراموں کی مہربانی کے سبب ہم سے بہتر ان سوالات کے جواب بھلا اور کون دے سکتا تھا؟

ایک روز ہمیں بھائی جان کے حوالے سے ایک اور بات کا پتہ چلا۔
ہم دوستوں کے ساتھ محلے کے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہاں موجود لڑکوں میں سے اکثریت بھائی جان کے سابقہ و حالیہ شاگردوں کی تھی۔ باتوں باتوں میں اُن کا ذکر نکل آیا۔ ہم سے عمر میں چند بڑے لڑکوں نے انکشاف کیا کہ بھائی جان ناکام محبت کے تیر سے گھائل ہوئے ہیں اِسی لیے تو وہ شادی نہیں کرتے۔ مجھے اور محمود کو اس بات پر بالکل یقین نہ آیا۔ بھائی جان کے چہرے کا نور اور مسکراہٹ، اُن کا رکھ رکھاؤ، اُن کی چال ڈھال، باوقار نشست و برخاست اور ہر موسم کے لحاظ سے اُن کا پُر تکلف پہناوا۔ بھلا کون کافر کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص اپنے سینے میں ناکام محبت کا داغ چھپائے پھرتا ہے۔
مگر معمولی سی تحقیق سے بات سامنے آئی کہ کہنے والے نے کہا تو سچ ہی تھا۔
یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب بھائی جان کالج کے طالبعلم تھے۔ اپنی ایک کلاس فیلو نائلہ سے انہیں محبت.......جی نہیں محبت نہیں بلکہ عشق ہو گیا۔
دونوں ہی طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ مگر جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، بھائی جان کے ساتھ بھی کم و بیش ویسا ہی ہوا۔ ایک کرائے کے چھوٹے سے گھر میں رہنے والے معمولی سے سرکاری افسر کے بڑے بیٹے کا رشتہ جس کے کاندھوں پر ابھی اپنی تعلیم کے ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ بھی تھا۔ نائلہ کے اونچے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے والدین نے نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے ہم پلہ لوگوں میں کر دی۔ یوں بھائی جان کی مختصر سی لو اسٹوری اپنے دردناک انجام کو پہنچی۔
اس بات کا علم ہونے کے بعد ہماری نظروں میں بھائی جان کی قدر و منزلت اور عزت و احترام مزید بلند ہو گیا۔ بڑی خاموشی، متانت اور وقار کے ساتھ وہ اُس دکھ کو جھیل رہے تھے۔ نہ معلوم کب اپنے اندر غیر اعلانیہ کسی اور سے شادی نہ کرنے کا مستحکم فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ محلے بھر کی کنواری لڑکیوں کے والدین تو منتظر تھے کہ کب بھائی جان کے والدین اشارہ کریں اور وہ اپنی دختر نیک اختر کا پلہ انہیں تھما دیں۔ خود اُن کے امی ابو کی بھی شدید خواہش تھی کہ وہ کسی طرح شادی کے لیے رضامند ہو جائیں۔ مگر جب بھی اس حوالے سے کوئی بات چلتی، بھائی جان چپ چاپ وہاں سے اُٹھ جاتے۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر کتابوں کی الماری سے فراز کا شعری مجموعہ "جاناں جاناں" نکال گھنٹے پلٹ کر جسے وہ کبھی جاناں کہا کرتے تھے کو اُس کا پیاں یاد دلاتے۔ مگر افسوس کہ اُس کی تجدید کا اب کوئی امکاں دور دور تک باقی نہ رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ دونوں جہاں محبت میں ہارنے کے باوجود بھی کسی طور شبِ غم گزار کر جانے والوں میں سے دکھائی نہ دیتے تھے۔
اِن سارے معاملات میں پتہ ہی نہ چلا کہ کب سال بیت گیا۔ ہمارے امتحانات ہو گئے۔ پھر نتائج کا اعلان ہوا جو کہ ہمارے گھر والوں کی امیدوں کے عین مطابق رہا۔ ہمیں شہر کے ایک بہت اچھے کالج میں اعلیٰ تعلیمی کارکردگی کے سبب با آسانی داخلے مل گئے۔
جس روز ہمارا نتیجہ نکلا، میں اور محمود مٹھائی کا ڈبہ اور بھائی جان کے پسندیدہ ادیب کے تازہ ترین ناول کا تحفہ لے کر

اُن کے گھر پہنچے۔

رات کا وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بکھری کتابوں کے درمیان غلطاں و پیچاں تھے۔ ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ گلے لگا کر خوب شاباش دی۔ کچھ دیر بڑے ہی خوشگوار ماحول میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک میرے ایک سوال نے سارے ماحول پر ایک بوجھل سی سنجیدگی طاری کر دی۔

''بھائی جان یہ آپ کی لکھنے والی میز کے اُوپر دیوار پر لگے فریم میں قائدِ اعظم، فیض صاحب اور آپ کے والدِ محترم کی تصاویر کے ساتھ میں نے ہمیشہ سے دیکھا ہے کہ چوتھی جگہ خالی ہی رہتی ہے۔ ایسا کیوں؟''

کچھ دیر بھائی جان آنکھیں سکیڑے، بے تاثر چہرے کے ساتھ خلا میں گھورتے رہے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بھینچے ہوئے ہونٹ پر ایک ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ ناک سے سانس خارج کی اور بولے۔ ''میں تو یہ توقع کر رہا تھا کہ تم لوگ بہت پہلے مجھ سے یہ سوال کرو گے۔ مگر خالی جگہ کے بارے میں نہیں بلکہ اِن تین تصاویر کے بارے میں کہ اُن کے ایک ساتھ ہونے کے بھلا کیا معنیٰ ہو سکتے ہیں؟''

''جی بھائی جان! میں اکثر انہی تین تصاویر کے بارے میں سوچتا رہتا تھا کہ کبھی نہ کبھی آپ سے ضرور پوچھوں گا۔ مگر یہ جو شفقت ہے نا، جب سے اِس نے محلے کے لڑکوں کی زبان سے۔'' اس سے پہلے کہ محمود کچھ کہتا میں نے اُسے اپنی آنکھوں کے اشارے سے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ بھائی جان نے دیکھ لیا اور اُن کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ''یہی کہتا ہے نا کہ یہاں بھی نائلہ کی تصویر ہوتی ہو گی۔'' میں نے اپنے خجالت آمیز چہرے کو کھسیانی سی مسکراہٹ سے سجاتے ہوئے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

اپنی شہادت کی انگلی ترچھی کر کے ٹھوڑی پر رکھی۔ انگوٹھے سے ٹھوڑی کو نیچے سے کھجاتے ہوئے ایک سرد آہ بھر کر اُوپری ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے ڈوبتی آواز میں فقط اتنا بولے۔ ''اب یہ جگہ ہمیشہ یونہی خالی رہے گی۔''

میں نے ماحول کو اس قدر بوجھل اور گمبھیر ہوتے دیکھ بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ ان تین تصاویر کا کیا قصہ ہے؟'' میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ بھائی جان کے چہرے پر ایک بھرپور اور گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''یہ تینوں میری آئیڈیل شخصیات ہیں۔''

''خیر قائدِ اعظم اور فیض صاحب تو بہت سے لوگوں کی آئیڈیل شخصیات میں شامل ہیں۔ مگر اُن کی تصاویر اپنے والد صاحب کی تصویر کے ہمراہ ایک فریم میں لگانے کی وجہ سمجھ نہ آسکی؟'' محمود حیران ہوتا ہوا بولا۔

''چلو میں تمھیں آج ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔'' وہ دھیرے سے مگر بڑے ہی مستحکم لہجے میں بولے۔ ''راز۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''تم لوگ اسے میرا راز ہی سمجھ لو۔'' اُن کے چہرے پر ایک ہلکی شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔

''دیکھو تم لوگ، تمھارے والدین اور سارے محلے والے میری بہت عزت کرتے ہیں، کرتے ہیں نا؟''

''جی بھائی جان۔'' ہم ایک ساتھ بولے۔

''تو بتاؤ وہ کیوں بھلا؟'' کچھ دیر ہم صم بکم کی سی کیفیت کا شکار رہے پھر محمود نے یک لخت خاموشی کو توڑا۔

''آپ کے اعلیٰ کردار کے سبب......'' اتنا کہہ کر وہ بھائی جان کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''تو تمھیں لگتا ہے کہ میرا کردار بہت اعلیٰ ہے؟''

''بھلا یہ بھی پوچھنے والی بات ہے، بھائی جان۔'' اب ہم دونوں بول اُٹھے۔

''بات یہ ہے محمود اور شفقت! زندگی میں جب بھی میں نے خود کو کمزور پایا۔ جب جب کسی درست فیصلے پر پہنچنے میں مشکل محسوس کی، تب تب میں نے ان تصاویر سے مدد لی۔

''مدد اور وہ بھی تصویروں سے؟'' میرا لہجہ حیرت سے پُر تھا۔

''ہاں...... وہ ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''میں نے سوچا کہ اگر یہی معاملہ اُن لوگوں کے ساتھ پیش

آتا تو وہ کیا کرتے اور پھر جو جواب آیا میں نے ویسا ہی کیا۔ ایک لمحے کو رکے اور بولے۔
”قائد اور ابو سے میں نے کردار و نظم پایا۔ فیض صاحب کی شاعری سے ضبط۔
اُس روز ہم نے ضد کر کے بھائی جان سے اُن کی دو تصاویر حاصل کیں اگلے ہی دن بازار جا کر اُسی طرح کے دو فریم لے کر انہیں اپنی دیگر تین آئیڈیل شخصیات کی تصاویر کے ہمراہ لگا کر اپنے اپنے کمروں میں سجا دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہم دونوں کی زندگی میں جب جب کمزور لمحات آئے اور صحیح و غلط کا فیصلہ کرنا مشکل محسوس ہوا، تب تب ہم نے بھی وہی کیا جیسا بھائی جان نے بتایا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ اللہ کے کرم سے ہم ہمیشہ سُرخ رو رہے۔
وقت کا پنچھی پر لگا کر اُڑتا رہا اور ہم نے تعلیمی مراحل سے گزر کر عملی زندگیوں میں قدم رکھ دیا۔ پہلے مجھے بیرون ملک جا کر حصولِ رزق کا موقعہ میسر آ گیا اور پھر میری شادی ہو گئی گو کہ شروع کے آٹھ دس سال تک تو ہم ایک دوسرے کی اور میں محمود کے توسط سے بھائی جان کی خبر رکھتا رہا۔ پھر اپنی زندگی اور گھر گرہستی میں کچھ یوں مگن ہو گیا کہ دھیرے دھیرے محمود سے بھی رابطہ ختم ہوتا چلا گیا۔ اب کوئی پینتیس چھتیس سال بعد مجھے اچانک محمود کی یاد آئی۔ دراصل مدتوں بعد میں ایک ماہ کے لیے وطن جانے کا سوچ رہا تھا تو خیال آیا کہ محمود سے ضرور ملاقات کرنی چاہیے۔ بھلا ہو فیس بک کا کہ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میں نے محمود کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ بتائے بنا کہ اگلے ماہ میں اُس سے ملنے آنے والا ہوں اُس کا پتہ لے لیا۔ دل ہی دل میں یہ سوچ کر محظوظ ہوتا رہا کہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اُسے اور بھائی جان کو کتنا زبردست شاک لگے گا۔
”ارے بھئی شفقت۔! معاف کرنا یار“ شفقت کی آواز نے مجھے چونکا دیا وہ کافی ٹیبل پر ایک بڑی سی ٹرے رکھ رہا تھا جو چائے اور فواکہات سے لدی ہوئی تھی۔ میں چونک اُٹھا۔ سورج مکمل غروب ہو چکا تھا۔ کھڑکی سے نظر آتے آسمان پر چہار سو سیاہی پھیل چکی تھی اور کمرے میں بھی ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ٹرے رکھ کر محمود نے دیوار پر نصب سوئچ دبا کر بتیاں روشن کر دیں۔ اچانک کمرہ روشن ہو کر جگمگانے لگا۔ اُن تیز روشنیوں میں نہ جانے کیوں محمود کا چہرہ بے حد اجنبی سا لگا۔
”میں نے سوچا کہ تمہارے لیے چائے وغیرہ اپنے سامنے ہی تیار کروا کر لے آؤں۔ بور تو نہیں ہو رہے تھے نا۔“ مجھے گھورتے دیکھ کر محمود نے وضاحت پیش کی۔
”ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ بھائی جان کیسے ہیں؟“ میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”چائے سے فارغ ہو کر بس ابھی سیدھا اُن کے ہاں ہی چلتے ہیں۔“
محمود کے چہرے پر ایک کے بعد دوسرا رنگ آ جا رہا تھا۔ ساتھ رکھی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ کر اپنا سر جھکا لیا۔ کچھ دیر یونہی خاموشی چھائی رہی پھر اُس نے دھیرے دھیرے اپنا سر اُٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں سرخ اور اشکبار تھیں۔ پھر اپنی آنکھیں جھکا کر میرے جوتوں پر مرکوز کرتے ہوئے انتہائی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یار! ش...... ش...... شش...... شف...... قت...... کوئی تین چار ماہ قبل بھائی جان کا انتقال ہو گیا۔“
”کیا...... کیا کہہ رہے ہو محمود۔“ میں زور سے چیخ پڑا۔ کئی ساعتوں تک کمرے میں ماسوائے ہماری سانس کے کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ”یہ کیسے ہوا؟ اور یہ تم نے فریم میں سے اُن کی تصویر کیوں نکال دی ہے؟“ میں نے محمود کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یار شفقت! کیا بتاؤں“ تم تو جانتے ہی ہو کہ انہوں نے شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی سو تمام عمر خود تو شادی نہ کی مگر اپنے چاروں بہن بھائیوں کو نہ صرف خوب لکھایا، پڑھایا، اُن کی شادیاں کروائیں اور انہیں اپنی اپنی زندگیوں میں سیٹ کرواتے کرواتے خود اپ سیٹ ہو گئے۔“
”کیا مطلب؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
”ساری زندگی سرکاری نوکری کرتے رہے اور جب تک صحت نے ساتھ دیا اُس وقت تک ٹیوشنز بھی پڑھاتے

رہے۔ گذشتہ سات آٹھ برس سے اُن کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اپنے علاج معالجے کی طرف بھی دھیان نہ دیتے تھے۔ پھر کوئی دو برس قبل ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ تب معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ سے لون لے لے کر اپنے بھائی بہنوں کی تعلیم اور شادیوں کے اخراجات پورے کیے تھے۔ سو وہاں بھی کچھ بچا نہ تھا۔ ساری زندگی اصول پسندی اور ایمانداری سے گزار دی۔ وہی سب اُن کے آڑے آیا۔ ریٹائر ہونے کے بعد ایک سال ڈیڑھ سال تک تو اپنی پنشن کے کاغذات منظور کروانے کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے مگر کچھ نہ ہو سکا۔ اُس وقت تک جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ نہیں معلوم کیسے گزرا کرتے تھے۔"

"اور اُن کے بہن بھائی......؟"

"وہ اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گئے۔ بھائی جان اپنے اُسی پرانے محلے والے کرائے کے گھر میں ہی رہے۔ ایک بھائی اور دو بہن بیرون ملک جا بسے جبکہ دوسرے چھوٹے بھائی نے اپنا ذاتی گھر بنوالیا مگر انہیں کبھی بھولے منہ سے بھی اپنے ساتھ آ کر رہنے کی دعوت نہ دی۔"

"یہ سب باتیں تمھیں کیسے معلوم ہوئیں؟" میرے سوال کرنے پر محمود اُٹھا اور لکھنے والی میز کی دراز سے اخبار کا تراشہ لے کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

یہ کسی مقامی اخبار کی مختصر سی دو کالمی خبر تھی۔ لکھا تھا۔

ریٹائرڈ سرکاری افسر شرافت علی انتقال کر گئے۔

"ہمارے نمائندے کے مطابق ڈیڑھ سال سے وہ اپنی پنشن منظور کروانے کی کوشش کرتے رہے مگر اُن کا کیس مسلسل سرخ فیتے کا شکار رہا۔ آخر کار اپنی بیماری کے سبب تھک ہار کر ہار مان لی۔ وہ شہر کے مضافاتی علاقے میں اپنے کرائے کے گھر میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ اُن کی کوئی اولاد نہ تھی۔ گذشتہ روز گھر سے تعفن اُٹھنے کے سبب جب پڑوسیوں نے گھر کا دروازہ توڑا تو انہیں بستر پر مردہ حالت میں پایا۔ بتایا جاتا ہے کہ غالباً اُن کی موت کو پانچ چھے روز گزر چکے تھے۔ گھر کی صورت حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کئی روز کے فاقے سے تھے۔ اہلِ محلہ کے مطابق چند برسوں قبل وہ اُن کے بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ خرابی صحت کے باعث یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ لہٰذا اُن کے ہاں کسی کی آمد و رفت بھی نہ تھی۔ مرحوم نے سوگوران میں دو بھائی اور دو بہنوں کو چھوڑا۔"

میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ اُس اخباری تراشے پر گر رہے تھے۔ محمود اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے میرے ہاتھ سے اخبار کا تراشہ لے لیا اور مجھے بھینچ کر اپنے گلے سے لگا لیا۔

کچھ دیر ہم یونہی ایک دوسرے سے لپٹے سسکتے رہے۔ پھر وہ دھیرے سے روہانسی آواز میں بولا۔

"بھائی جان کی تصویر دیکھ کر میرا روز یہی حال ہوتا تھا۔ سو میں نے اُن کی تصویر فریم سے نکال دی۔

پھر ہچکیاں لے کر رو پڑا۔ چند لمحوں بعد خود پر ضبط کرتا ہوا ایک گہری سانس لینے کو رکا اور بولا۔

یار شفقت! بھائی جان بہت اچھے انسان تھے مگر یار! انسان کو اتنا اچھا بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

......☆☆......

نمکین محبت

صائمہ قریشی

بچپن میں نیند نہیں آتی تھی تو ایک کہانی سن کر اکثر کچھ سوچتے سوچتے نجانے کب، کیسے نیند آنکھوں میں آسماتی تھی اور اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی تھی۔

''ایک بادشاہ تھا۔اس کی پانچ بیٹیاں تھیں، سب ہی بہت لائق فائق ایک سے بڑھ کر ایک سلیقہ مند، ذہین اور حسین تھیں بادشاہ کو سب بیٹیاں بہت عزیز تھیں لیکن سب سے چھوٹی بیٹی سے ایک خاص لگاؤ اور اس سے سب سے زیادہ پیار تھا۔وہ تھی بھی بہت پیاری۔ بڑی بڑی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، لمبے گھنگرالے بال۔

ہر کسی سے محبت سے پیش آنے والی شہزادی بادشاہ سلامت کی آنکھوں کا تارہ اور دل کی ٹھنڈک تھی۔

ایک دن بادشاہ سلامت نے شہزادیوں کو آزمانے کا سوچا کہ پتہ چلے کہ ان میں سے بادشاہ سلامت سے سب سے زیادہ پیار کس بیٹی کو ہے۔

دوسرے دن بادشاہ سلامت اپنے کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھے تو بیٹیوں کو آزمانے کا خیال پھر سے آیا۔

بادشاہ سلامت نے گھر کے کاموں میں مصروف بیٹیوں میں سے سب سے بڑی بیٹی کو آواز دی (یہ خیال اب آتا ہے کہ شہزادیاں بھی جھاڑو پونچھا کرسکتی تھیں) بڑی شہزادی ہاتھ صاف کرتی حاضر ہوئی۔

''جی اباجی آپ نے یاد کیا؟'' شہزادی بولی تو چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بادشاہ سلامت نے شہزادی کو شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور بولے۔

''میں تمہیں کتنا اچھا لگتا ہوں؟'' باپ کا سوال سن کر شہزادی بولی۔

''چینی جتنے'' بادشاہ سلامت بہت خوش ہوئے ڈھیروں دعائیں دیں تو فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ شہزادی واپس چلی گئی۔باری باری سب کو بلا کر ایک ہی سوال کیا گیا

''میں کتنا اچھا لگتا ہوں؟''

باقی تینوں شہزادیوں میں سے کسی نے گڑ کہا، کسی نے برفی کہا، کسی نے شکر کہا اب رہ گئی چھوٹی اور سب سے لاڈلی شہزادی۔

بادشاہ سلامت تو پھولے نہ سما رہے تھے کہ جن بیٹیوں سے میں زیادہ پیار نہیں کرتا ان کے لیے میں گڑ، چینی، شکر اور برفی جیسی اہمیت رکھتا ہوں تو جو میری زیادہ لاڈلی ہے اس کے لیے کیا اہمیت ہوگی۔

پانچویں شہزادی آچکی تھی اور بادشاہ سلامت کے ساتھ ساتھ چاروں شہزادیوں کو بھی اس کے جواب کا انتظار تھا تنے سر کے ساتھ بادشاہ سلامت نے اپنا سوال دہرایا۔شہزادی نے باری باری سب کو دیکھا چہرے پر مسکراہٹ سجا کر دو قدم بادشاہ سلامت کی طرف بڑھی اور بولی۔

''اباحضور آپ مجھے ''نمک'' کے جتنے اچھے لگتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت آگ بگولا ہو گئے۔باقی چاروں شہزادیوں نے ''اونہہ'' کہہ کر رخ موڑ لیا لیکن شہزادی کے چہرے کی مسکراہٹ مدھم نہ ہوئی۔

اس کا اطمینان دیکھ کر بادشاہ سلامت مزید بھڑک اٹھے۔انتہائی غصہ آیا اور افسوس ہوا کہ جس سے سب سے زیادہ پیار تھا اس نے کیا صلہ دیا ہے، ان کی محبت کو ایک کڑوی کسیلی چیز سے تشبیہ دے رہی ہے، نمک کا بھلا محبت سے کیا تعلق؟

سوچے سمجھے بغیر اپنی سب سے لاڈلی شہزادی کو محل سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

شہزادی نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن کوئی سننے کو تیار نہ تھا۔ بادشاہ سلامت دل برداشتہ ہو چکے تھے، باقی شہزادیوں کو اپنی چھوٹی اور لاڈلی بہن سے باپ کے لیے ایسا سوچنے پر نفرت ہونے لگی تھی تو چار و نا چار شہزادی نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور دو جوڑے بیگ میں ڈال کر محل سے رخصت ہو گئی (کیا بادشاہت تھی، نہ کوئی نوکر، نہ پیسوں کی ریل پیل اور نہ جانے ملکہ کہاں تھی کہ کہانی میں کہیں کسی ملکہ کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا) شہزادی چلی گئی اور چلتے چلتے ایک جھونپڑی نظر آئی اور وہاں رہنے لگی۔

وقت گزرنے لگا، کئی سال بیت گے۔ نہ شہزادی نے واپس محل میں قدم رکھا نہ بادشاہ سلامت نے اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

ایک دن بادشاہ سلامت کو دور دراز کے کسی ملک کی شہزادی کا پیغام ملا کے وہ بادشاہ سلامت کو کھانے پر مدعو کرنا چاہتی ہے۔ بادشاہ سلامت نے دعوت قبول کی اور مقررہ وقت پر کسی انجان ملک میں انجان ریاست کی انجان شہزادی کی دعوت میں چلے گے۔

عالیشان محل، نوکروں کی ریل پیل، اعلیٰ انتظامات۔ بادشاہ سلامت جوں جوں آگے بڑھتے جاتے محل کی شان دیکھتے اور رشک کرتے جاتے۔

دربار سجا تھا، محفل لگی تھی، خوش گپیاں عروج پر تھیں۔

بادشاہ سلامت واقعی متاثر ہو رہے تھے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تو بادشاہ سلامت کھانے کی ٹیبل پر آ بیٹھے، طرح طرح کے کھانوں نے ٹیبل کی شان بڑھادی تھی تو بادشاہ سلامت کا جی بھی للچانے لگا تھا۔ کھانا سرو ہونے لگا تھا۔ ایک نقاب پوش ملازمہ (جو اپنے لباس سے کسی طرح بھی ملازمہ سے میل نہ کھاتی تھی) نے کھانا سرو کرنا شروع کیا۔

مرغ مسلم، کوفتے، کباب، بریانی، سبزی، اسی طرح میٹھے کی بھی ڈشیز۔

مرغ مسلم نوش کیا۔ "یہ تو میٹھا ہے" بادشاہ سلامت نے دل ہی دل میں کہا۔ کوفتے لیے وہ بھی میٹھے۔ کباب، بریانی، سبزی غرض کہ ہر وہ کھانا جس کو نمکین ہونا چاہیے تھا وہ اپنے اندر ڈھیروں ڈھیر مٹھاس سمائے بادشاہ سلامت کے سامنے ان کی بھوک کا مذاق اڑا رہا تھا۔ بادشاہ سلامت کی پیشانی پر اب غصہ ابھر رہا تھا۔ سرو کرنے والی ملازمہ نے اب میٹھا پیش کیا تو بادشاہ سلامت نے سوچا کہ شاید اس ریاست کا اپنا الگ مزاج ہے۔ میٹھا اس امید پر لیا کہ اس میں مصالحے ہوں گے۔ لیکن بادشاہ سلامت کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور اب بادشاہ سلامت کی برداشت بھی ختم ہو چکی تھی۔

"مجھے یہاں پر بے عزت کرنے کے لیے بلایا گیا تھا؟" بادشاہ سلامت اٹھ کھڑے ہوئے اور آگ بگولا لب و لہجے کے ساتھ وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ کھانا سرو کرتی ملازمہ کے ہاتھ رکے، کھانا کھاتے لوگوں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ایک منٹ بادشاہ سلامت" بادشاہ سلامت عالم طیش میں وہاں سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھا رہے تھے کہ آواز پر رک گے

"کیا ہوا؟ آپ کو کھانا پسند نہیں آیا کیا؟" وہی ملازمہ بادشاہ سلامت کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"یہ کھانا ہے؟ ہر ڈش میں میٹھا۔"

"لیکن اپ کو تو صرف میٹھا ہی پسند ہے ناں" سوال کیا گیا بادشاہ سلامت اس قدر غصے میں تھے کہ فقط نفی میں سر ہلایا

"تو پھر نمک کے جیسے اچھا کہنے پر اپنی لاڈلی شہزادی کو در بدر کیوں کر دیا تھا؟" اس کے ساتھ ہی ملازمہ نے چہرے

کا نقاب الٹ دیا بادشاہ سلامت نے حیرت سے اسے دیکھا، من ہی من چونکے بھی۔ ماتھے پر تیوری چڑھائے ملازمہ کو گھورا۔

''میں ہی وہ شہزادی ہوں، آپ کی لاڈلی بیٹی جس کو آپ نے صرف اس لیے اپنی زندگی سے نکالا تھا کیونکہ آپ کی اہمیت اس کی زندگی میں ''نمک'' کے جیسی تھی۔'' شہزادی بول رہی تھی اور بادشاہ سلامت کے چہرے پر ندامت اُمڈ رہی تھی۔

''ابا حضور میں نے بہت لمبے عرصے تک انتظار کیا ہے آپ کو یہ بتانے کے لیے کہ نمک کو ہماری زندگی میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہاں تک کہ میٹھے کا مزہ بھی نمک کے بغیر ادھورا ہے۔'' شہزادی نے مضبوط لہجے میں بادشاہ سلامت کو بتایا کہ انہوں نے جو اس سے پیار کیا تھا وہ کئی گناہ زیادہ ان سے محبت کرتی تھی اور کرتی ہے۔ بادشاہ سلامت کی انکھوں میں آنسو آگئے اور شہزادی کو گلے لگالیا۔

بچپن کی کہانی یہاں ختم ہوگئی ہے! لیکن اس کہانی کے اختتام نے ایک ''نمکین محبت'' (جو لبالب محبت کی شیرینی سے بھری ہے) کی بنیاد رکھ دی تھی۔

کھانے کی طرح رشتوں میں بھی نمک کو چینی، شکر، گڑ اور برفی جتنی ہی اہمیت حاصل ہے لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہم نمک کو زہر سمجھ کر اگل دیتے ہیں۔ لیکن بھول جاتے ہیں میٹھے میں جب تک ایک چٹکی نمک نہ شامل کیا جائے وہ بدذائقہ ہی ہوتا ہے۔

شہزادی نے برسوں انتظار کیا بادشاہ سلامت کو اپنی ''نمکین محبت'' کی گہرائی کا ادراک کروانے میں لیکن آج کون ہے جو رشتوں میں ''نمک'' کی اہمیت کا احساس دلائے؟ کون ہے جو عملی طور پر اس چیز کا احساس دلا کر رشتوں میں پھیلی کدورتیں اور ناچاقیوں کا خاتمہ کرکے ''نمک'' کو زہر نہیں بلکہ ''بہترین ذائقہ'' کا خطاب دے سکے؟

کاش کوئی ایسا ہو! کوئی شہزادی آئے!!

لیکن اب ہمیں سمجھانے کے لیے کوئی شہزادی نہیں آئے گی۔

ہمیں خود ہی ''نمک'' کی اہمیت کو کسی غلط فہمی کی بھینٹ چڑھنے سے روکنا ہوگا!

ہمیں خود ہی اپنے آپ کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ رشتوں کی محبت بھی اس نمک کے بغیر ادھوری ہے اور باہمی تعلقات کے لیے ''نمک'' اتنا ہی ضروری ہے جتنا کھانے میں۔

☆☆

بدلاؤ

مریم مرتضیٰ

''آج تو بہت دیر ہوگئی ہے مما۔'' اس نے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا تھا۔

''ریلیکس بیٹا! میں پرنسپل سے بات کرلوں گی۔'' شائستہ بیگم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں مما آپ آفس جائیں اینڈ یو نو مجھے اپنے پرابلمز خود ہینڈل کرنے کی عادت ہے۔'' اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے سے پہلے ماں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔'' شائستہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''او کے ماما اللہ حافظ۔'' عنایہ نے گاڑی کا گیٹ بند کیا تھا اور گاڑی چلاتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔

''خدا حافظ بیٹا۔'' شائستہ بیگم نہایت پیار سے بولی تھی اور فوراً کلائی کی جانب دیکھا تو گھڑی پر نو بج چکے تھے۔انہوں نے سر کو جھنجوڑا اور تیزی سے اندر کی جانب لپکی کیونکہ وہ دفتر سے لیٹ ہو رہی تھیں۔

......☆☆☆......

''واٹ ہیپنڈ ود یو مس عنایہ، ہر دن کی طرح آج پھر آپ دیر سے آئی جبکہ آپ جانتی ہیں کہ کالج ٹائمنگ ساڑھے آٹھ ہے اس کے بعد آنا آپ کا میری سمجھ میں نہیں آتا۔چلیں دیر سویر ہوتی ہے مگر ایک دن دو دن یہ کیا ایک ہفتے سے لگاتار......'' پروفیسر صاحب سامنے کھڑی عنایہ پر برس رہے تھے اور وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

''کچھ بتانا پسند کریں گی آپ۔'' پروفیسر صاحب نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''سر! امیر زادی ہے۔ان کے لیے تو کچھ مسئلہ ہی نہیں۔'' خضر نے ہنستے ہوئے کہا تھا تو ساری کلاس نے اس کی جانب حیرانگی سے دیکھا تھا۔

''آپ سے پوچھا گیا ہے؟'' پروفیسر صاحب نے آگ بھری نظروں سے خضر کی جانب دیکھا تھا۔

''سوری سر۔'' خضر نے نظریں جھکا لی تھیں۔

''جی مس عنایہ تو کیا خیال ہے آپ کا؟ آپ کو پڑھنا ہے یا کالج سے نکلنا ہے۔'' پروفیسر صاحب عنایہ کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

''سوری! سر اب ایسا کل سے نہیں ہوگا۔'' اس نے ندامت بھرے انداز میں کہا تھا اور خضر کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی مگر اس نے بمشکل روک لی تھی۔

''ٹھیک ہے کل بھی آ جائے گا وہ بھی دیکھ لیں گے۔'' پروفیسر صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

......☆☆☆......

''آئی وہ لیٹ اور پروفیسر صاحب نے مجھے ڈانٹ دیا حد ہو گئی یار۔'' دوستوں کے گھیرے میں بیٹھا خضر سگریٹ کا کش لے کر بولا تھا۔

''ویسے اس کی خوب ہوئی ہے۔'' دائیں طرف کھڑا دوست فہد بولا تھا۔

''کچھ ایسا کرو کہ کل وہ جلدی پہنچ نہ پائے۔'' اس نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''خضر! پروفیسر صاحب، سگریٹ پھینک۔'' بائیں طرف کھڑا اس کا دوست علی اس کے کان میں آ کر آہستگی سے بولا تو اس نے سگریٹ پھینک کر اوپر پاؤں رکھ لیا تھا۔

''یار یہ پروفیسر بھی ناں جان لے کر چھوڑے گا ہر وقت باہر کی طرف جھانکتا رہتا ہے۔یار فری ہیں ابھی۔کیا ایڈیٹ کالج کا نظام ہے۔'' وہ بولے جا رہا تھا۔

عنایہ اپنی چند دوستوں کے ساتھ ان کے قریب سے گزرنے والی تھی۔

''ڈیسینٹ ہو جاؤ لڑکیاں۔'' فہد نے کہنی مار کر اسے ہوشیار ہونے کو کہا تھا۔

''ایسے لگ رہا ہے کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔'' عنایہ نے اپنی دوست ندا سے بات کرتے ہوئے اچانک منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔خضر نے مسکرا کر علی کی جانب دیکھا تھا۔

''ہاں یار! ہو سکتا ہے واچ مین نے پیا ہو۔'' اس کی دوست ندا بولی تھی۔

''ہونہوں۔'' وہ گزر گئی تھیں۔

''ایسے لگتا ہے کسی اسپتال کی نرسیں جا رہی ہیں۔'' خضر نے طنزیہ ہنس کر کہا تھا۔

''نرسیں۔'' علی کے ہنسنے کے بعد سارے دوست قہقہے مارنے لگے تھے۔

......☆☆☆......

''یار کچھ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں جس کی وجہ سے میں صبح جلدی اٹھ جایا کروں اور میرے کام بھی سکون سے ہو جایا کریں۔'' عنایہ نے درخت کے سائے تلے بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آلارم لگایا کرو ناں۔'' ندا نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''لگاتی ہوں یار مگر پھر سو جاتی ہوں اور اگر نہ بھی سوؤں پھر بھی مجھے سکون نہیں ہوتا کبھی کوئی چیز ادھر کبھی ادھر پھر بھی دیر ہو جاتی ہے۔'' وہ یکدم بولی تھی۔

''آنٹی نہیں ساتھ دیتیں کیا؟'' ندا نے پوچھا۔

''مما کو اپنے کام سے فرصت ہی نہیں ملتی، ہمارے پاں مدد کے لیے نوکر ہوتے ہیں والدین نہیں یہی تو ہم اپر سٹیٹس والوں کا مسئلہ ہے۔'' عنایہ کے چہرے پر سنجیدگی ابھر آئی تھی۔

''ارے بھئی پھر تو ہم نچلے درجے کے لوگ اچھے کم از کم ایک دوسرے کی قدر تو ہے۔'' ندا ہلکی سی مسکرائی تھی

''آہاں۔'' اس نے لمبا سانس لیا تھا۔

''خیر تمہاری پرابلم کا حل سوچتے ہیں تم ٹینشن نہ لو۔'' ندا اسے تھپکاتے ہوئے ہنس کر بولی تھی۔

''کچھ ایسا سوچو جو مجھے سکون دے دے۔'' اس نے آنکھیں موند کر کہا تھا۔

''سکون صرف ایک جگہ ہے۔'' ندا کی آواز پر اس نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں۔

''کہاں؟'' وہ بے اختیار بول اٹھی تھی۔

''اللہ۔'' ندا نے آنکھیں موند کر دل کی گہرائی سے کہا تھا۔

''اللہ.......؟'' وہ قدرے حیرانی سے اسے دیکھ کر بولی تھی۔

''ہاں اللہ ہی وہ واحد ہے جس کے پاس سکوں کی دولت ہے اور اسی کا ذکر باعثِ سکون ہے، تم اسے پکار کے تو دیکھو۔ پھر دیکھنا تمہاری زندگی کیسے پرسکون ہوتی ہے۔'' ندا نے کہا۔

''میں اسے کیسے پکاروں؟'' اس نے قدرے وقفے کے بعد پوچھا تھا۔

''اسے جب چاہو پکار لو کیونکہ وہ تو شہ رگ سے زیادہ نزدیک ہے۔'' ندا کی آنکھوں میں ابھرنے والی محبت کو وہ بغور دیکھ رہی تھی جو آنسو بن کر ابھری تھی۔

''میں نے تو کبھی نماز تک نہیں پڑھی۔ وہ مجھے بھی سنے گا کیا؟'' اس نے سوال کیا تھا۔

''وہ سب کی سنتا ہے کیونکہ وہ مالک الملک ہے سب کا خدا ہے۔'' ندا نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تو وہ مجھے سنے گا کیا؟'' وہ حیرانگی سے سوال کیے جا رہی تھی۔

''ایک بار اسے دل کی گہرائی سے یاد کر کے تو دیکھ۔ پھر دیکھ کہ کیا ہوتا ہے۔'' ندا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

عنایہ نے گہرا سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

.......☆☆☆.......

ٹیرس میں کھڑی رات کے وقت عنایہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی ملازمہ اس کے پاس آئی اسے خبر نہ ہوئی تھی۔

''بی بی جی۔'' ملازمہ کے آواز دینے پر وہ چونک گئی تھی۔

''آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔'' ملازمہ نے بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے گہرا سانس لے کر ایک بار پھر آسمان کو دیکھا تھا۔

......☆☆☆......

''آج کالج کیسا رہا؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی جو صبح تم دیر سے گئیں۔'' شائستہ بیگم نے چائے کا گھونٹ لے کر سامنے صوفے پر بیٹھی عنایہ سے پوچھا تھا۔

''جی ٹھیک رہا۔'' وہ گم صم سی تھی اور آہستگی سے بولی تھی۔

''کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے؟'' انہوں نے بغور بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے قدرے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''نہیں......نہیں پریشانی کیا ہونی؟'' اس نے اپنے ہوش وحواس جگانے کی کوشش کی تھی۔

''مجھے تم کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔'' شائستہ بیگم بھانپ گئی تھیں کہ عنایہ کے من میں کچھ چل رہا ہے۔

''ایسے ہی صبح پروفیسر صاحب نے کہا جلدی آنا ہے تو سوچ رہی ہوں کہ کل کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں کالج سے ہی نہ نکالی جاؤں۔'' اس نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''نکال کے تو دیکھیں ان کی مجال نہیں۔'' شائستہ بیگم نے تکبرانہ انداز میں کہا تھا۔

''مما پلیز میں کل ویسے بھی جلدی جانا چاہتی ہوں اور آپ خدارا ان سے کوئی بات نہ کیجیے گا۔'' وہ جھٹ پٹ بولی اسے خوف تھا کہ شائستہ بیگم پرنسپل سے بات نہ کرلیں کیونکہ کالج میں وہ اس بات پر بہت چڑتی تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ امیرزادی ہے کچھ بھی کرلے گی۔ اسے اپنے مسائل خود حل کرنے کی عادت تھی۔

''گڈو'' شائستہ بیگم نے غصے سے ملازمہ کو آواز لگائی تھی۔

''جی بیگم صاحبہ۔'' ملازمہ بھاگی بھاگی آئی تھی۔

''صبح اگر وقت پر عنایہ کو نہ اٹھایا تو پھر تم مجھے اچھے سے جانتی ہو۔ صبح عنایہ وقت پر کالج جانی چاہیے ورنہ تمہارے ساتھ بہت برا سلوک ہوگا۔'' شائستہ بیگم نے حکم دیا تھا۔

''جی بیگم صاحبہ۔'' ملازمہ نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔

''صرف جی سے کام نہیں چلے گا کام ہونا چاہیے۔ اور اب جاؤ جا کر کام نمٹاؤ۔'' وہ بولیں تھیں اور ملازمہ مثبت میں سر ہلا کر سہمی سہمی چلی گئی تھی۔

''مما آپ اس بے چاری کو کیوں ڈانٹ رہی ہیں میں اپنی وجہ سے لیٹ ہوتی ہوں اس کی وجہ سے تو نہیں۔'' عنایہ رحم بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''بیٹا وہ تمہیں جگائے گی تو تم جاؤ گی ناں اور ویسے بھی ملازموں کو پاؤں تلے دبا کے رکھنا چاہیے سر پر نہیں بٹھانا چاہیے، انہیں اپنی اوقات کا بتاتے رہنا چاہیے تاکہ انہیں احساس رہے کہ ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے۔'' شائستہ بیگم نے کپ میز پر رکھتے ہوئے مغرورانہ انداز میں بتایا تھا۔

''اللہ کو برا نہیں لگتا ہوگا؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی کیونکہ وہ مما کے ڈر سے صاف بول نہ پائی تھی مگر شائستہ بیگم کے کانوں میں اس کی آواز پڑی تھی۔

''کیا کہا تم نے؟'' انہوں نے حیرانی بھرے انداز میں عنایہ کو دیکھا تھا، وہ ڈر گئی تھی۔

''کچھ نہیں مما کچھ نہیں میں اب جاؤں مجھے نیند آرہی ہے۔'' اس نے بات گھمانے کی کوشش کی تھی۔

''ٹھیک ہے مگر ایک بات یاد رکھنا عنایہ اگر کچھ بننا ہے تو دنیا کی طرح چلنا ہوگا خود کو بدلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور ہاں دوست ایسے بناؤ جو اپر کلاس کے ہوں گھسے پٹے لوگوں کو دوست نہیں بنانا نیچے والے لوگوں کو نیچے کا ہی سمجھو اور برابری کے لوگوں سے دوستی رکھو۔ انڈرسٹینڈ۔'' انہوں نے نصیحتیں سنا دیں تھیں۔

''اوکے گڈ نائٹ مجھے نیند آئی ہے۔'' عنایہ اٹھتے ہوئے بولی تھی اور چلی گئی تھی۔

شائستہ بیگم گہری سوچ میں چلی گئی تھیں کہ ان کی بیٹی نے ان کے اصولوں پر سوال کیوں اٹھانے کی کوشش کی گو کہ وہ

صاف بول نہ پائی تھی مگر اس کے دل میں تو سوالوں کا طوفان تھا جو انہوں نے پڑھ لیا تھا اور یہی بات انہیں چبھنے لگی تھی۔

......☆☆☆......

عنایہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی، دروازہ اچھے سے بند کیا کنڈی چڑھائی اور دروازے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے لمبا سا سانس لیا تھا چند سیکنڈ بعد اس نے ماتھے کا پسینہ صاف کیا اور واش روم کی جانب بڑھی، وضو کرنے کے بعد جب وہ واپس کمرے میں آئی تو اس نے سامنے آئینے میں دیکھا تو اسے چادر میں ڈھکا سر، اسے اپنا یہ روپ بے حد پسند آیا وہ دھیمی سی مسکرا دی تھی۔ جائے نماز بچھا کر جب کھڑی ہوئی تو اس پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے نماز تے دو رکعت نفل ادا کیے اور سجدے میں گر گر ٹوٹ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی اتنی روئی اتنی روئی کہ دل کا سارا کفر نکال کر باہر رکھ کر صرف اللہ کو پکار رہی تھی، اسے دنیا کی کوئی شے نہیں یاد رہی تھی سوائے اللہ نے اسی سجدے میں صبح کی اذان ہو گئی تھی یعنی رات سجدے میں ہی گزر گئی اور روتے روتے معافی مانگتے ہی کٹ گئی تھی۔

......☆☆☆......

''آج یقیناً پھر لیٹ ہو گی۔'' خضر نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''یقیناً یار۔'' ساتھ بیٹھے فہد نے اقراراً کہا تھا

''آج تو پروفیسر صاحب نے تو دھمکی بھی دی تھی دیکھتے ہیں کیا تیر مار لیتے ہیں اس امیر زادی پر۔'' خضر نے امیر زادی دانتوں تلے دبا کر کہا تھا۔

''اس کی ماں کے بڑے لمبے ہاتھ ہیں یار پروفیسر بے چارے کی اوقات کیا۔'' فہد نے ٹائی کھول کر سیٹ پر ڈالنے کے بعد کہا تھا۔

''چلو دیکھتے ہیں آج وہ کتنی جلدی پہنچتی ہے۔'' خضر طنزیہ مسکرایا تھا۔

......☆☆☆......

خضر اور فہد کلاس روم میں داخل ہوئے تو عنایہ کو اپنی جگہ پر پا کر حیران ہوئے تھے، عنایہ ہنستے ہوئے ندا سے محو گفتگو تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ جا کر بیٹھے تھے۔ کلاس روم میں باقی طالب علم بھی باتوں میں مصروف تھے کیونکہ ابھی تک پروفیسر صاحب نہیں آئے تھے۔

''کمال ہو گیا یار۔ آج تو چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔'' خضر نے فہد کو کہنی مار کر حیرانگی سے کہا تھا۔

''ہاں یار۔ میں خود حیران ہوں۔'' فہد بھی حیرانگی میں مبتلا تھا۔

''ارے دوستو! آج کچھ کلاس روم بدلی بدلی سی ہے لوگ پورے پورے سے دکھائی دے رہے ہیں۔'' خضر نے اونچی آواز میں طنز کرنے کی کوشش کی تھی، ندا اور عنایہ نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''لگتا ہے آج رات لوگوں نے جاگتے جاگتے کاٹی ہے۔'' عنایہ کو غصہ آیا مگر وہ لبوں کو دبا کر چپ رہی تھی۔ ابھی خضر کچھ اور کہتا پروفیسر صاحب کلاس میں داخل ہوئے تو سب ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

......☆☆☆......

''یار ندا ہمارے ہاں جو زیادہ نماز روزہ کرنے لگتے ہیں لوگ ان سے بات کرنا چھوڑ دیتے ہیں، انہیں بدنام کرتے ہیں کہ مولوی ہو گئے یہ وہ۔'' عنایہ لائبریری میں بیٹھی سامنے کرسی پر بیٹھی ندا سے مخاطب تھی۔ دونوں اسلامی کتب کا مطالعہ کرنے کے لیے لائبریری آئی تھی۔

''ڈیئر دنیا نے کب اچھے لوگوں کو قبول کیا یو تو نبیوں پیغمبروں کے مخالفیں بھی رہے۔'' ندا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اور مما کا کیا کروں جو مجھے دن رات دنیا کا ہی مشورہ دیتی ہیں میں ان کے سامنے اللہ کا نام لینے سے پہلے ہی

کانپ جاتی ہوں۔" وہ بےزار سی تھی۔

"او مائی ڈیئر عنایہ! اللہ کا نام لیتے ہوئے کبھی مت ڈرو۔ نڈر ہو کر لو کیونکہ اللہ ہی رب ہے ڈرنا صرف اسی سے چاہیے، ماں باپ کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے اُن کی خدمت بجالاؤ لیکن ایسا مت کرو کہ ان کے سامنے انہی کے خوف کی وجہ سے تم اللہ کو بھول بیٹھیں۔" عنایہ ندا کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی۔

"ہمت کہاں سے لاؤں۔" وہ آہ بھر کر بولی تھی۔

"اللہ ہے ناں، وہ محرم راز اگر تمہارے دل میں اپنی محبت ڈالی ہے تو یقیناً وہ اس ڈر کو بھی ختم کر دے گا لیکن تمہیں جب بھی ڈر لگے تم آنکھیں بند کر دل ہی دل میں اللہ کہہ دیا کرو۔" ندا نے محبانہ لہجے میں اسے بتایا تھا، عنایہ چپ چاپ کھوئی کھوئی تھی۔

☆☆☆

"آپ کو لیٹر ٹائپ نہیں کرنا آتا۔" دفتر میں کرسی پر بیٹھی شائستہ بیگم سامنے کھڑے ولید کو کہہ رہی تھی۔

"معاف کر دیجیے میم نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہوگا۔" وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"معافی شائستہ بیگم کے قانون کا حصہ نہیں ہے۔" انہوں نے تکبرانہ انداز میں کہا تھا۔

"پلیز میم رحم۔" ولید نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"رحم میرا اصول نہیں۔" انہوں نے جھٹ پٹ کہا تھا۔

"میری ماں بہت بیمار ہے مجھے نوکری سے نہ نکالیے گا پلیز۔" وہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

"ٹھیک ہے زیادہ ٹسوے نہ بہاؤ ہم تمہیں نوکری سے نہیں نکالیں گے مگر سزا ضرور دیں گے۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم ایک ہفتے تک سارا دن کھڑے ہو کر کام کرو گے اور کوئی بریک نہیں ملے گا۔" انہوں نے حاکمانہ انداز میں کہا تھا۔

"اوکے میم جیسے آپ کی مرضی۔" وہ نظریں جھکا کر بولا تھا۔

"اب جاؤ جا کر کھڑے ہو کر لیٹر دوبارہ ٹائپ کرو۔" انہوں نے حکم دیا تھا۔

ولید میز سے فائل اٹھا کر چلا گیا تھا اور اپنی جگہ پر جا کر کھڑا ہو کر کام کرنے لگا تھا، شائستہ بیگم نے شیشے کے اس پار اسٹاف میں کھڑے ہو کر کام کرتے ولید پر نظر ڈالی اور سفاکی ہنس دی تھی۔

☆☆☆

"آج صبح تم جلدی چلی گئی تھیں۔" شائستہ بیگم نے کھانے کی میز پر بیٹھے عنایہ سے کہا تھا

"جی چلی گئی تھی۔" عنایہ نے چاولوں میں چمچ مارتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔

"آج کل کیا بات ہے تم اتنی چپ چپ کیوں ہو؟" انہوں نے اگلے ہی لمحے سوال کیا اور اس نے قدرے حیرانگی سے انہیں دیکھا تھا۔

"بس یونہی۔"

"آج صبح جلدی کیسے اٹھ گئیں تم؟" اس نے چاولوں کی چمچ بھری تو رک گئی کیونکہ شائستہ بیگم نے سوال ہی ایسا کیا تھا۔

"اللہ" اسے ندا کی بات یاد آئی اور اس نے آنکھیں موند کر دل ہی دل میں کہا تھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔؟" ان کے لہجے میں گرمی آ گئی تھی۔

"بس اللہ نے جگا دیا مجھے۔" اس نے یکدم کہا تھا اور شائستہ بیگم نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا تھا کیونکہ انہوں نے کبھی اس کی یہ گفتگو نہیں سنی تھی اور نہ اس کی تربیت ایسی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب اللہ نے جگا دیا کوئی فرشتہ تو نہیں آیا ہو گا خود جاگی ہو یا ملازمہ نے جگایا۔" انہوں نے کہا تھا۔

''ہاں مما! آپ نے ٹھیک کہا ہم جیسے گناہگاروں کے پاس اللہ کیوں فرشتہ بھیجے گا ہمارے پاس تو شیطان بسیرہ کرتے ہیں۔'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''عنایہ! آج تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ غصے میں بولیں تھیں۔

''کیوں مما اللہ کا نام لینے کے لیے طبیعت کا خراب ہونا ضروری ہے کیا؟'' اس نے جواباً سوال ایسا کیا تھا جس پر شائستہ بیگم آگ بگولہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا مما؟ ڈنر کیجیے ناں۔'' عنایہ نے محبانہ لہجے میں کہا تھا۔

''گڈو......گڈو۔'' انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔

''جی بیگم صاحبہ۔'' ملازمہ بھاگتی بھاگتی پاس آکر رکی تھی۔

''ہمارا کھانا روم میں بھجوا دو، اس وقت ہمارا دماغ گرم ہو رہا ہے ہمارے ہاتھ سے کچھ اور نہ ہو بیٹھے۔'' انہوں نے حکم سنایا اور کمرے کی طرف چلی گئیں، ملازمہ ان کا کھانا لے کے ان کے پیچھے ہو لی تھی۔

''یا اللہ تیرا شکر مجھے ہمت دینے کا اور مجھے بچا بھی لینے کا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور کھانا کھانے لگی تھی۔

''کوئی ہے جو اللہ کے نام پر اس فقیر کو کھانا دے دے۔'' سڑک سے کسی فقیر کی آواز آئی تو اس کے منہ کی طرف جاتا چمچ رک گیا۔ وہ بھاگ کر کچن میں گئی تھی شاپر لائی ایک میں سالن ڈالا تھا دوسرے میں روٹی اور چاول ڈالے اور باہر کی جانب چل پڑی تھی۔

''فقیر بابا میرے لیے دعا کرنا کہ مجھ سے اللہ خوش ہو جائے۔'' اس نے شاپر فقیر کو پکڑاتے ہوئے کہا تھا

''جا بچے تجھے دعا دی۔ اللہ تجھ سے راضی ہو جائے۔'' فقیر نے شاپر لے کر کہا اور چلا گیا تھا۔

......☆☆☆......

''ہیلو مس عنایہ! کیوں اکیلے اکیلے بیٹھی ہیں؟ کہاں ہے آپ کی وہ دوست مس ندا۔'' خضر نے درخت کے سائے تلے بینچ پر بیٹھی عنایہ کے قریب آکر پوچھا تھا۔

''اسے پروفیسر صاحب نے بلایا ہے۔'' وہ دھیمے سے لہجے میں نظریں نیچی کیے بولی تھی۔

''وہ گئی ہے تو ہم آپ کے پاس بیٹھتے ہیں۔ آپ کو بور نہیں ہونے دیں گے۔'' خضر اس کے پاس بیٹھا تو وہ ہچکچائی تھی۔

''نہیں ضرورت نہیں میں بور نہیں ہوتی۔'' اس نے اٹھ کر کھڑے ہو کر آہستگی سے کہا تھا۔

''کیوں آپ انسان نہیں؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''جب باتیں کرنے کے لیے وہ ذات ساتھ ہو تو پھر بوریت کیسی؟'' اس نے دھیما سا مسکرا کر آسماں کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ قدرے حیرانی سے بول اٹھا تھا۔

''اللہ ہر جگہ، ہر وقت ہمارے ساتھ ہوتا ہے اگر ہر لمحے انسان اس سے باتیں کرنے لگے تو پھر بوریت اور تھکاوٹ کے الفاظ بے معنی سے لگنے لگتے ہیں۔'' عنایہ نے کہا تھا۔

''آپ امیر زادی ہو کر ایسی باتیں کر رہی ہو جی۔'' وہ حیرانگی میں ڈوبا کھڑا ہوا تھا۔

''کیوں اللہ امیروں کا نہیں ہوتا؟'' اس کے یکدم سوال پر خضر لرز گیا تھا۔

''نہیں مگر۔'' وہ رک گیا تھا۔

''جانتی ہوں امیر بھٹک جاتے ہیں مگر یہاں غریب بھی دیکھو کتنے بھٹکے ہوئے ہیں لیکن اللہ جسے چاہے راہ دکھائے اور جسے چاہے دھتکار دے۔ اس کے نزدیک امیر وہ ہے جو اسے، یاد رکھے قدم بقدم اسے پکارے اسے اپنا مانے اور

غریب وہ ہے جو اسی کی دی ہوئی دنیا کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے اور اسے یاد کرنا گوارا نہ سمجھتا ہو۔" وہ بولے جا رہی تھی اور خضر حیرت میں ڈوبا اسے دیکھے جا رہا تھا کہ وہ اب تک اسے کیا سمجھتا رہا اور وہ کیا نکلی تھی۔

"آئی ایم سوری مس میں نے آپ کے بارے میں غلط اندازہ لگایا میں نے آج تک آپ کو جو بھی کہا مجھے معاف کر دیجیے گا۔" وہ نظریں جھکا کر ندامت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"نہیں۔ پلیز ایسے مت کہیے۔ معاف کرنے والی اللہ کی ذات ہے میں بندہ ناچیز۔ خیر مجھے کلاس میں جانا چاہیے وقت ہوا چاہتا ہے۔" وہ کہہ کر چلی گئی تھی اور خضر مارے حیرت کے کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔

......☆☆☆......

"یہ سر پر چادر کیوں لپیٹ رکھی ہے تم نے۔" شائستہ بیگم نے قدرے غصے سے عنایہ کو دیکھا تھا جو لان میں کھڑی تھی

"اللہ کو پسند ہے اس لیے سوچا کرلوں۔" اس نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا تھا۔

"تم ابھی بوڑھی تو نہیں ہوئی ہو جوان ہو خوبصورت ہو تمہارے دن ہیں دنیا دیکھنے کے۔ یہ کیا بوڑھیوں کی طرح چادر لپیٹنا شروع کردی۔" انہوں نے کہا تھا۔

"مما اللہ کی پسند کو بڑھاپے میں ہی کیوں اپنایا جاتا ہے جب برائی بس کا کام نہیں ہوتا اس لیے یا موت کا خوف آنے لگتا ہے۔ مجھے کیا پتا میں کل بھی دیکھ سکوں یا نہیں کل تو دور اگلے سانس کا بھی علم نہیں مجھے اور آپ عمر کی بات کر رہی ہیں۔" اس نے دکھ بھرے انداز میں کہا تھا۔

"یہ تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو؟" وہ چونک گئی تھی

"وہی باتیں جو کڑوی ضرور ہیں مگر سچی ہیں حقیقی ہیں۔" اس نے کہا تھا۔

"اس کا مطلب تم ایسے ہی عمر گزارو گی۔" وہ قدرے حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی

"میرے اللہ کو جو پسند ہوتا گیا وہ میں اپناتی جاؤں گی۔" اس نے خشوع خضوع کے ساتھ کہا تھا۔

"یہ بزنس یہ مال دولت تمہارا ہے بیٹا ایسے تو تمہارے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔" انہوں نے کہا تھا۔

"کیوں چھوٹ جائے گا مما! اللہ یہ تو نہیں کہتا دنیا چھوڑ دو وہ کہتا ہے دنیا میں وہ کام کرو جو مجھے پسند ہیں، بزنس کرنا تو بہت اچھی بات ہے مگر اس کے کچھ طریقے ہوتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سکھائے ہیں اور دولت ہو تو صحیح طور اسے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے مما آپ اگر اللہ کے دیے ہوئے اصولوں پر چلیں ناں تو آپ کا کاروبار رات دن میں بلندیوں تک پہنچ جائے، بس ذرا اسے یاد کرنے کی دیر ہے پھر دیکھیں آپ کی زندگی میں تبدیلی مگر ایک شرط ہے۔" وہ رکی تھی۔

"کون سی شرط؟" وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اسے جب یاد کریں تو اس لالچ سے نہ یاد کریں کہ دنیا مل جائے گی، مال مل جائے گا بلکہ میں تو کہتی ہوں اسے اس لیے بھی نہ یاد کرو کہ دوزخ سے نجات ملے یا جنت میں اعلیٰ مقام۔ اسے خود غرضی نہیں پسند اسے خود غرضی سے نہ یاد کرو، یاد کرو تو اس لیے یاد کرو اس کی رضا ملے، وہ خوش ہو جائے اور بس۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور شائستہ بیگم کے بھی اشک رواں تھے۔

"ولیکن مما! اللہ رحم کرنے کو پسند کرتا ہے بے رحمی اسے پسند نہیں، وہ معاف کرنا پسند کرتا ہے اور جو معافی مانگے اسے وہ محبوب ہوتا ہے۔" اس کی ان باتوں نے شائستہ بیگم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آج انہیں محسوس ہوا تھا کہ انہوں نے کیا کیا ظلم کر ڈالے، آج انہیں محسوس ہوا تھا کہ حقیقی بادشاہ تو اوپر بیٹھا ہے جو ہم زمین والوں کی جب چاہے رسی کھینچ لے۔

"جو باتیں، جو سبق ماں کو دینا چاہیے تھا وہ بیٹی دے رہی ہے۔" وہ رو پڑی تھی۔

"آپ کی تربیت میں کہیں ایسا گر ضرور تھا مما جو مجھے اس راہ پر لے گیا جانے وہ گر کیا تھا۔" اس نے ماں کو گلے لگا

لیا تھا اور شائستہ بیگم آج پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رو ئی تھی۔

......☆☆☆......

اسی دن ہی انہوں نے گھر اور دفتر کے ملازموں سے اپنے سخت لہجے کی معافی مانگ لی تھی اور پھر کبھی ایسا رویہ نہ اپنانے کی قسم اٹھالی تھی۔ عنایہ کے بدلاؤ نے سب کو بدل کر رکھ دیا تھا، خضر اور اس کے دوست بھی راہِ راست پر چل پڑے تھے، خضر کو تو عنایہ سے عشق ہوا اور پھر شادی بھی کر ڈالی تھی اور دونوں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی زندگی کو نسی خوشی گزارنے لگے۔

......☆☆......

شب قدر

فاطمہ اے خان

''ماما! پلیز بھائی سے کہیں کہ......'' وہ غصہ میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی مگر وہاں دانیال کو ناشتہ کرتا دیکھ کر اس کی زبان کو بریک لگ گیا۔

''او گاڈ بھائی! تم نے تو صبح سحری کی تھی۔''

''تو کیا ہوا، اب ناشتہ کر رہا ہوں۔ دانیال کی بے نیازی قابل دید تھی۔''

''ماما؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

''میں کیا کروں۔ وہ میری سنے تب نا۔'' انہوں نے بے چارگی سے جواب دیا۔

''آپ کھانا ہی نہ پکایا کریں۔''

''تمہارے ڈیڈ کے لیے پکانا پڑتا ہے نا۔''

''ماما! وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں، انہیں بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے، وہ پچاس سال کے ہیں اور بھائی صرف ایکس کا اور اسے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے پھر بھی وہ روزہ نہیں رکھتا؟''

''میرے روزہ نہ رکھنے سے تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ میں جب بوڑھا ہو جاؤں گا تب روزہ بھی رکھوں گا اور اعتکاف بھی کروں گا۔ ابھی تو میرے کھانے پینے کے دن ہیں، میری مانو تو تم بھی ابھی سے اتنی پرہیزگاری نہ کیا کرو۔'' دانیال نے حد درجہ بے شرمی سے جواب دیا۔

''مجھے تمہارے مشوروں پر عمل کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ جلدی سے ناشتہ کرلو اور مجھے کالج لے چلو۔'' وہ وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کس سے ملنے جانا ہے؟'' دانیال نے شرارت سے پوچھا۔

''ماما......!'' رخسانہ بیگم درخشاں کی احتجاجی چیخ پر پیچھے مڑیں۔ ''دانیال......''

''میں نے کیا کیا ہے؟ میں تو پوچھ رہا ہوں کہ کالج کی چھٹیاں شروع ہو گئی ہیں پھر اس نے کون سے کالج جانا ہے؟''

''لائبریری میں بکس واپس کرنی ہیں۔ چلو جلدی۔'' درخشاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی سے کھینچا۔

''اچھا چلو تم، میں بائیک کی چابی لے کر آتا ہوں۔'' دانیال کی اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔

''خدا کی پناہ! تم بائیک چلاتے ہو۔ میں تو آئندہ کبھی تمہارے ساتھ نہیں آؤں گی۔'' اس نے اعلانیہ کہا۔

''کیا ہوگیا؟'' رضا احمد نے فائل بند کر کے ٹیبل پر رکھی اور اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہوئے۔
''ماما! ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔'' دانیال صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا۔
''دیکھیں ڈیڈ! آج چوبیس روزے ہو گئے ہیں اور بھائی نے ایک بھی روزہ نہیں رکھا۔'' درخشاں نے باپ سے بھائی کی شکایت لگائی۔
''تو تم اس بات پر ناراض ہو؟''
''اوہو ڈیڈ! آپ میری بات سنیں، اس کی شکایتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ رضا صاحب کو بھائی کی کرتب بازی کے بارے میں بتاتی، دانیال نے اپنی بات شروع کر دی۔
''ڈیڈ! میرا برتھ ڈے ہے پرسوں اور آپ نے ابھی تک میرا گفٹ بھی پلان نہیں کیا۔'' دانیال نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔
''تم نے جو ماڈل بتایا تھا، میں نے وہ بائیک بک کر دی ہے۔'' درخشاں نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔
''ابھی چھ ماہ پہلے ہی تم نے ایک نئی بائیک خریدی ہے۔''
''تو؟'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
''خدا کے لیے ماما۔ اسے خریدے پورے چھ ماہ ہو گئے ہیں، وہ پرانی ہو گئی ہے، میں اکتا گیا ہوں ایک ہی بائیک چلا چلا کر۔''
''تم ہر چھ ماہ بعد یہی کہہ کر ایک نئی بائیک خرید لیتے ہو۔'' اب کی درخشاں نے مداخلت کی تھی۔
''تو تمہیں کیا مسئلہ ہے۔ تم بھی خرید لیا کرو۔ ڈیڈ اتنا کماتے ہیں کس کے لیے، ہمارے لیے ہی نا۔''
''مگر دانیال......''
''درخشاں، رخسانہ خاموش ہو جاؤ۔'' رضا احمد نے انہیں ٹوک دیا۔
''مگر ڈیڈ! بھائی کی ڈرائیونگ آپ نے دیکھی نہیں ہے۔ وہ بائیک نہیں چلاتا ہوائی جہاز اڑاتا ہے اور پھر آپ بائیک کی قیمت بھی تو دیکھیں۔'' درخشاں نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔
''میں افورڈ کر سکتا ہوں۔ کل جا کر ہم بائیک لے آئیں گے۔'' رضا احمد نے بیٹے کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلے گئے۔
''ماما! آپ کچھ نہیں کہیں گی؟''
''کیا کہوں۔ اس کا برتھ ڈے ہے، ڈیڈ اسے گفٹ دے رہے ہیں۔ اس میں غلط کیا ہے۔''
''مگر ماما......''
''ویسے تمہیں کیا مسئلہ ہے؟'' دانیال اس کے قریب ہوا۔
''میں جانتی ہوں کہ تم اتنے اتاؤلے کیوں ہو رہے ہو۔ شب قدر پر بائیک ریس کرنی ہے نا؟''
''ہاں اور میں چاہتا ہوں کہ میری بائیک سب سے زیادہ عمدہ ہو۔ ہر لحاظ سے عمدہ حتیٰ کہ قیمت کے لحاظ سے بھی۔''
''بھائی وہ بہت وزنی بائیک ہوتی ہے اور شب قدر مبارک رات ہے، عبادت کے لیے نہ کہ بائیک ریس کے لیے۔'' اس نے دانیال کو سمجھانے کی کوشش کی۔
''تم تو ملانی ہی رہنا۔'' دانیال نے ایک چپت اس کے سر پر لگائی تو وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔
مغرب کی اذان میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ ماما کے ساتھ کچن میں افطاری کی تیاریوں میں مصروف تھی تبھی وہ بھی آ دھمکا۔ ''اوہ مائی گاڈ ماما! یہ کیا کیا آپ نے؟'' وہ حیرت سے چیخا۔
رخسانہ بیگم ایک جھٹکے سے پیچھے مڑیں۔ ''کیا کیا میں نے؟'' درخشاں بھی سارے کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ

ہوئی۔

"ماما آپ لکھ لیں آج کی افطاری سب سے بدمزہ ہوگی۔" اس نے درخشاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ماما! اب میں یہ کھولتا ہوا تیل اِس کے سر پر انڈیل دوں گی۔" وہ احتجاجاً چیخی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" دانیال نے آگے بڑھ کر پلیٹ میں سے ایک سموسہ اٹھالیا۔

"بھائی! آج چھبیسواں روزہ ہے، ستائیسویں شب ہے۔ اتنا مبارک دن، اتنی مبارک رات ہے اور تم نے آج بھی روزہ نہیں رکھا۔" درخشاں نے افسوس سے پہلے بھائی اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔

"نہیں اٹھ سکا نا سحری میں، تم کل مجھے جگا دینا۔ میں کل روزہ رکھ لوں گا۔" اس نے سموسے سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔

"کل کبھی نہیں آتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم چلو میرے کپڑے آئرن کردو میں نے آج تراویح پڑھنے جانا ہے۔"

"آرہی ہوں، چلو تم۔" وہ سنک کی طرف ہاتھ دھونے کے لیے بڑھ گئی۔

"سنو۔ تم نے میری بائیک دیکھی؟" وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔

"ہاں، دیکھی ہے، اچھی ہے۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا اور دانیال کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"صرف اچھی! یہ تو جھوٹ ہے۔ یوں کہو کہ بہت بہت بہت زیادہ اچھی ہے۔"

"کون سے کپڑے استری کرنے ہیں؟" وہ اس کا وارڈروب کھولے کھڑی تھی۔

"عید کا جو جوڑا سلوایا ہے وہ کردو، میں کوئی نیا عید کے لیے خرید لوں گا۔" وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تلاوتِ کلام پاک میں مشغول تھی، تبھی کمرے کے دروازہ پر دستک ہوئی...... ایک...... دو...... تین...... اس نے قرآن مجید بند کرکے رحل پر رکھا اور دروازہ کی سمت بڑھی۔

"ماما! آپ! آئیں نا...... اندر آئیں۔" وہ دروازہ کے سامنے سے ہٹ گئی تاکہ رخسانہ بیگم اندر آسکیں۔

"نہیں جان! بہت تھک گئی ہوں۔ تم جاگو گی کیا ابھی اور؟"

"ہاں میں تلاوت کررہی ہوں۔"

"ماما! کیا ہوا؟ آپ ٹھیک ہے نا؟"

"ارے ہاں بیٹا! بس طبیعت عجیب ہورہی ہے، گھبراہٹ ہورہی ہے۔ شاید بی پی کا مسئلہ ہو۔" وہ مسکرادی۔ "تم جاگ رہی ہو تو بھائی کے آنے پر دروازہ کھول دینا، وہ ڈپلیکیٹ چابی نہیں لے گیا۔"

"ٹھیک ہے ماما! آپ جائیں آرام کریں۔" وہ جو رخسانہ بیگم کو دانیال کے ریس پلان کے بارے میں بتانے کا سوچ رہی تھی، ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کھڑکی کے پٹ کھول کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ چاند اتنا اداس کیوں ہے اور آسمان میں ستارے کیوں نہیں ہیں۔ یہ رات اتنی گہری کیوں ہے۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہ جھینگر کیوں اتنا شور مچا رہے ہیں۔ اوہ اللہ پاک یہ رات اتنی خاموش اور ڈراؤنی کیوں ہے۔" وہ بہت دیر تک کھڑکی کے پٹ کھولے دور آسمان کی طرف دیکھتی رہی اور عجیب عجیب سوالات اس کے ذہن میں آرہے تھے کہ اچانک کہیں دور سے کتوں کے رونے کی آواز سن کر وہ ڈر گئی۔ جھٹ سے پٹ بند کیے اور اپنے بیڈ پر آبیٹھی۔

گھڑی ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔ "یا اللہ میں پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی!" اس نے ایک نظر رحل کی طرف دیکھا، قرآن رحل پر رکھا تھا۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ "ماما صرف آپ کی نہیں آج میری

بھی طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔ مجھے بھی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ یہ بی پی کا مسئلہ نہیں ہے۔" وہ خود سے مخاطب ہوئی اور اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی بیٹھی رہی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے اپنا موبائل اٹھایا، وہ کوئی انجان نمبر سے کال تھی۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پھر موبائل کا ہرا بٹن دبا دیا۔ "ہیلو۔"

......☆☆☆......

دروازے پر ہوتی مسلسل دستک اور درخشاں کی چیخوں کی آواز پر رخسانہ بیگم اور رضا احمد کی آنکھ کھل گئی۔

چھ گھنٹے ہو گئے تھے اس حادثے کو ہوئے، مگر درخشاں اب بھی اسی تسلسل کے ساتھ روئے جا رہی تھی۔

دانیال کی لاش اسپتال میں تھی۔ اس کے دونوں پیر گھٹنوں سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے، اس کی بائیک ایک لاری کے نیچے آ گئی تھی۔ ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ ہیلمٹ لگانے کے باوجود اس کا سر پھٹ گیا تھا، حتیٰ کہ اس کی گردن تن سے جدا ہو گئی تھی۔

"انکل میں نے دانیال سے بہت کہا تھا کہ وہ اتنی ہیوی بائیک ابھی نہ خریدے مگر وہ نہیں مانا۔ وہ کہتا تھا کہ تم بھی درخشاں کی طرح ڈرپوک ہو۔ میں نے اسے ریس میں بھی جانے سے منع کیا تھا اور اس نے شاید مجھے ٹالنے کے لیے کہا تھا کہ وہ ریس میں نہیں جائے گا۔ اس کے دوست بتا رہے تھے کہ اس کی بائیک فل اسپیڈ میں تھی، وہ بائیک کا اسٹینڈ نیچے گرائے بائیک کو ایک طرف جھکائے بائیک چلا رہا تھا اور سامنے سے اچانک لاری آ گئی۔ وہ بائیک پر کنٹرول نہیں رکھ پایا اور وہ بائیک سمیت لاری کے نیچے آ گیا۔" وہ عاشر تھا، دانیال کا پڑوسی، دوست اور اس کا کلاس فیلو جو رضا احمد کے بھائی کو ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"ہاں یار، ڈیڈ مان گئے ہیں۔ شب قدر کی ریس میں دیکھنا سب سے بہترین بائیک میری ہو گی اور ریس بھی میں ہی جیتوں گا۔" وہ مسکراتے ہوئے فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھنا جب میں بائیک کا اسٹینڈ نیچے کیے، بائیک کو ایک طرف جھکائے، فل اسپیڈ میں بائیک دوڑاؤں گا تو کیسی چنگاریاں نکلیں گی۔" درخشاں کی آنکھوں کے سامنے گویا ایک فلم چل رہی تھی۔

"تو وہ اتنے دنوں سے اپنی موت کی تیاری کر رہا تھا۔" درخشاں پھر ایک بار رونے لگی، وہ دانیال کی تصویر سینے سے لگائے چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔

"اپنے آپ کو سنبھالو بیٹا! اگر تم یوں کرو گی تو تمہاری ماما کا خیال کون رکھے گا۔ انہیں کون حوصلہ دے گا۔" عاشر کی والدہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

"آنٹی! میں نے بھی اسے منع کیا تھا مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اسے تھوڑا بھی خیال نہیں آیا کہ ماما، ڈیڈ کا اس کے بغیر کیسے جئیں گے۔" وہ بین کر کے رو رہی تھی۔

"آنٹی! ماما کو دیکھیں، وہ کچھ نہیں کہہ رہیں، نہ ہی رو رہی ہیں۔ اس نے ہم سب کو مار ڈالا آنٹی! ہم سب کو وہ ایسا ہی تھا، صرف اپنی کہنے والا، اپنی سننے والا، اپنی ہی منوانے والا۔ اس نے ماما اور ڈیڈ تک کا نہیں سوچا۔ بہت خود غرض تھا وہ۔ بہت ہی زیادہ۔" درخشاں ان کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی تھی۔ عاشر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ صرف اٹھارہ سال کی تھی اور اتنی سمجھدار تھی۔ عاشر اب بھی حیران سا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ "ہمارے نوجوان، جوانی کے نشے میں چور موت کا کھیل کھیلتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو ان کے بوڑھے والدین کا کیا ہو گا۔ جنہوں نے خون پسینہ بہا کر، فاقہ کشی کر کے اسے پالا پوسا تھا وہ کیسے جئیں گے۔ وہ یہ تک بھول جاتے ہیں کہ وہ ماں جوان کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اس کی بھی ایک خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کا آخری سفر اپنے بیٹوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر پورا کرے نہ کہ اپنے ہاتھوں سے

بیٹوں کی میت سجائے۔ وہ یہ تک نہیں سوچتے کہ ان کے بوڑھے باپ کے دل پر کیا گذرے گی جب وہ اپنے ناتواں کندھوں پر اپنے جوان بیٹے کا جنازہ اٹھائے گا۔"

غلط فہمی

یاسین صدیق

گھر آ کر سلمیٰ نے قیامت اٹھادی۔ ایک قیامت شازیہ کے گھر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ ایک طرف میں سلمیٰ کو اور اپنے گھر والوں کو اپنی پاک دامنی کی اور دوسری طرف شازیہ اپنے سسرال میں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے قسمیں اٹھا رہی تھی۔ مجھے سلمیٰ سے یہ امید نہ تھی کہ وہ ایسا رویہ رکھے گی۔ شام ہونے تک سلمیٰ نے گھر میں لڑائی جھگڑے کا طوفان اٹھادیا۔ میں اس کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکا اسے مطمئن نہیں کر سکا کہ ندیم کے بیٹے کی شکل وصورت مجھ پر کیوں گئی ہے؟ ایک رتی برابر فرق کیوں نہیں ہے؟ وہی چہرے پر نشان، وہی ناک پر تل کا نشان، وہی بائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے شادی کے بعد سلمیٰ کو شازیہ سے اپنی خاموش محبت کا راز بتا دیا تھا۔ سلمیٰ نے اتنی بکواس کی، اتنی زبان درازی کی کہ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو ذلیل عورت۔ اب بولی تو گلا دبا دوں گا۔"

"ہاں۔ ہاں دبا دو میرا گلا۔ اس حرافہ کا نہ دبانا۔ جس نے چاند چڑھایا ہے" اس نے مجھ سے بھی بلند آواز سے کہا۔

اس کی یہ بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اٹھا اور دو تین تھپڑ اس کے جڑ دیئے۔ ہمارا شور سن کر سارا گھر جمع ہو گیا۔ سب مجھ سے خفا ہونے لگے۔ سلمیٰ کی ضد دیکھ کر میں نے اپنے بھائی سلیمان کو اس کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ اسے میکے چھوڑ آئے۔ آج اس نے میری والدہ کی بھی نہ سنی تھی۔ اس پر دکھ یہ کہ وہ بضد تھی کہ جو اس نے کہا ہے وہ سچ ہے۔

شازیہ کی شادی کے دو ماہ بعد میں ایک مرتبہ ان کے گھر گیا تھا اور تین چار گھنٹوں کے بعد واپس آ گیا تھا۔ ندیم گھر میں نہیں تھا۔ شازیہ کی ساس صرف ایک مرتبہ کمرے میں ظہر کی نماز پڑھنے گئی تھی۔ یہ سب باتیں سلمیٰ نے غصے کے عالم میں مجھے بتائی تھیں۔ وہ عورتوں میں رہی تھی۔ شازیہ کے گھر اور اس نے شازیہ کی ساس وغیرہ کو باتیں کرتے دیکھا تھا۔ سنا تھا اور نتیجہ اخذ کیا تھا کہ "ہم گناہ گار ہیں"

سلمیٰ کو گھر گئے ہوئے چوتھا دن تھا۔ جب مجھے خبر ملی کہ شازیہ کو طلاق ہو گئی ہے۔ مجھے یہ خالہ رشیدہ نے ٹیلی فون کر کے بتائی۔ ساتھ ہی وہ روتی جاتی تھی۔ ان دنوں پی ٹی سی ایل کا فون ہوتا تھا۔ ابھی تک موبائل کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ خالہ کے گھر ٹیلی فون تھا اور میری دکان پر تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ہر ہفتے خالہ سے مختصر بات کر لیا کرتا تھا۔ آج خالہ کا فون آیا تھا وہ بتا رہی تھیں "شازیہ اپنے بیٹے سکندر کو میرا ہم شکل ہونے کی وجہ نہ بتا سکی تھی۔"

ہم دونوں گناہ گار نہ تھے مگر بنا دیئے گئے تھے۔ خالہ نے بتایا "جب شازیہ پر یہ الزام لگایا گیا تو وہ چیخی تھی، چلائی تھی، پاگل ہو گئی تھی اسی حالت میں ندیم نے اسے طلاق دے دی۔" مرد اپنی عورت کی بے حیائی کو برداشت نہیں کر سکتا ہے اور یہاں تم سب ہی ہمارے خلاف تھے ہم نے جو وقت ایک ساتھ گزارہ تھا وہ اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی تھا

۔پھر نسیم اختر نے بھی کہا تھا کہ رخسانہ اور امجد کی شادی والے دن ہم سارا دن ایک کمرے میں رہے تھے۔حتیٰ کہ میری بہن بھی میرے خلاف تھی اور شازیہ کے بھائی بھی شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔اس طرح ہماری سچائی کا یقین صرف اور صرف مجھے تھا اور شازیہ کو تھا۔امی جان، ابو جان، شازیہ کی والدہ، والد، اکمل اس معاملے میں بالکل خاموش تھے۔

ایک غلط فہمی نے چار گھر برباد کر دیئے تھے۔کہتے ہیں شک شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔یہ شک غلط فہمی سے جنم لیتا ہے۔

......☆☆......

میرا نام سکندر علی ہے۔میٹرک کا امتحان میں نے 1986 میں دیا تھا۔اس سے ایک سال قبل میری سب سے چھوٹی خالہ رشیدہ کی شادی ہوئی تھی۔خالہ رشیدہ مجھ سے عمر میں چھ سات سال بڑی تھی۔میں والدین کا پہلوٹھی کا بیٹا تھا۔جب میں پیدا ہوا تو ان دنوں خالہ ہمارے ہی گھر میں رہتی تھیں۔میں نے جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو شاید انہیں ہی سب سے پہلے دیکھا تھا۔یوں میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے سب سے پہلے پیار کرنے والی خالہ رشیدہ ہی تھیں۔بچپن میں وہ مجھے اٹھائے اٹھائے پھرتی تھیں۔سارا سارا دن مجھ سے کھیلتی رہتی۔انہیں مجھ سے اور مجھے بھی ان سے بہت محبت تھی۔ان کی گود میں جا کر چپ ہو جاتا۔بڑے بتاتے ہیں کہ خالہ مجھ سے باتیں کرتی تو میں بھی ''ہوں ہاں'' کیا کرتا تھا۔جیسے ان کی بات سمجھ رہا ہوں۔جب میں چھ سال کا ہوا تو خالہ اپنے گھر چلی گئیں۔انہوں نے پانچ جماعتیں ہمارے گھر میں ہی پڑھی تھیں۔قرآن پڑھا تھا۔وہ ہمارے گھر چھ سال رہی تھیں۔جب میں دو سال کا ہوا تو انہوں نے مجھے کلمہ پڑھایا تھا۔تین سال کا ہوا تو وہ اپنے ساتھ اسکول لے جاتیں۔خود کم پڑھتی مجھے زیادہ پڑھاتیں۔میں جب چھ سال کا ہوا تو ابو مجھے اسکول لے گئے۔

میں آج بھی سوچتا ہوں تو میری زندگی کا سب سے پہلا غم خالہ کی جدائی کا تھا۔دو ظلم میرے ساتھ ایک ساتھ ہوئے۔اول خالہ کا واپس اپنے گھر چلے جانا دوسرا میرا اسکول میں داخلہ ہونا۔

جب خالہ کی شادی ہوئی میں کلاس نہم کا طالب علم تھا۔ان کی شادی خالو اکمل سے ہوئی۔جو بہت نفیس انسان تھے۔لاہور میں انار کلی میں ان کی کپڑے کی دکان تھی اور بلال گنج میں ان کا مکان تھا۔میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں فری تھا۔رزلٹ آنے میں دیر تھی۔میں اپنی نانی سے ملنے ان کے گاؤں چک 92 چلا گیا۔میری خوش قسمتی تھی کہ خالہ وہاں آئی ہوئی تھیں۔مجھے بہت خوشی ہوئی۔

مجھے وہاں گئے ہوئے تیسرا دن تھا جب اللہ تعالیٰ نے خالہ کو چاند سی بیٹی دی۔اسی شام خالو اکمل لاہور سے اپنی بیٹی دیکھنے گاؤں آئے۔

اور ایک دن رہ کر واپس لاہور چلے گئے تھے۔جاتے ہوئے خالہ سے کہہ گئے کہ ''سکندر کو اپنے ساتھ ہی لے آنا لاہور اس کو چھٹیاں ہیں اسکول سے، لاہور دیکھ لے گا'' میں نے اپنے گھر امی، ابو کو پیغام بھیج دیا کہ میں خالہ کے ساتھ لاہور جا رہا ہوں۔دو ماہ بعد واپس آجاؤں گا۔تب تک میرا رزلٹ بھی آجائے گا۔ایک ماہ دس دن ہم نانی جان کے گاؤں رہے۔اس کے بعد لاہور جانے کی تیاری شروع کر دی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ میں اپنے گاؤں سے اپنے شہر پیر محل سے نانی کے گاؤں چک 92 جہلم اور وہاں سے لاہور گیا تھا۔

......☆☆......

میں اور خالہ ننھی آمنہ کو لیے تقریباً دن کے دو بجے بلال گنج پہنچے۔موسم بڑا خوشگوار تھا۔میرے اندر کا موسم بھی بڑا سہانا تھا۔خالہ کا گھر کیا تھا ایک کوٹھی تھی۔گھنٹی بجانے پر ایک بارہ سالہ لڑکے نے گیٹ کھولا ہم اندر داخل ہوئے تو

ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی سامنے بنے کمروں میں سے ایک سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ پہلے خالہ سے لپٹی، اس کے انگ انگ سے خوشیاں ٹپک رہی تھیں، ننھی آمنہ کو مجھ سے زبردستی پکڑا اور لگی چومنے۔ جس وقت وہ آمنہ کو مجھ سے پکڑ رہی تھی تو میرے ہاتھ کی پشت اس کے جسم سے ایسے ٹکرائی کہ میرے جسم میں ایک کرنٹ کی لہر سرایت کر گئی۔ پورے بدن میں ایک سرسراہٹ پھیل گئی، میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس حادثے کا اس کو احساس ہوا۔ اس کا سانولا چہرہ مزید سانولا ہو گیا تھا اور آنکھوں میں شرم کے رنگ بکھر گئے تھے۔

کمروں کی طرف بڑھتے ہوئے خالہ نے میرا تعارف اس سے کروایا۔ ”سکندر میری بہن کا بڑا بیٹا“ اور خالہ مجھ سے مخاطب ہوئیں ”شازیہ میرے جیٹھ مجید کی بیٹی“ پھر خالہ ہم دونوں سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ دونوں ہم جماعت ہیں“ اس وقت شازیہ نے اپنے بائیں ہاتھ سے ننھی آمنہ کو اٹھائے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملانے کے لیے میرے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ میں حیران، پریشان، شرمایا سا کافی دیر تک اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس سے قبل میں نے کبھی کسی لڑکی سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ جب وہ چہرے پر حیرت سمیٹے اپنا ہاتھ واپس کرنے ہی والی تھی میں نے اس کی مسکراتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس لمس کو میں اس نرمی گرمی کو اس نازکی کو میں آج تک نہیں بھول پایا ہوں۔ یہ لمس کیا ہے؟ ہم سب کے جسم کے اندر ایک برقی رو کام کرتی ہے۔ جب دو اجسام جو مثبت اور منفی ایک دوسرے سے مس ہوں تو اسپارکنگ ہوتی ہے۔ یہ اسپارکنگ لمس کہلاتی ہے۔ بعض اوقات یہ باعث لذت و تسکین بھی ہوتی ہے جس کا تعلق جنس مخالف سے ہوتا ہے۔ مجھے اس کے ہاتھ کے لمس سے ملنے والی راحت و تسکین نے ایک نشہ کی کیفیت طاری کر دی۔ اس دوران خالہ ہم سے آگے بڑھ گئی تھی۔ میں لان میں اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ ایک دو لمحے ایسے گزر گئے میں نے اس کا ہاتھ تھامے رہا۔ اس نے ہلکا سا زور لگا کر میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔

یہ بیس مرلے کا کوٹھی نما دو منزلہ مکان تھا۔ دو کمرے ایک طرف اور دو کمرے دوسری طرف بنے تھے۔ درمیان میں برآمدہ تھا۔ کمروں کے سامنے گھاس لگا کر لان بنایا گیا تھا۔ گیٹ کے دونوں طرف دو ڈرائنگ روم تھے۔ گیٹ سے برآمدے تک سولنگ کی سڑک بنی ہوئی تھی۔۔۔ دوسری منزل پر صرف دو کمرے تھے اور کھلی چھت تھی۔ یہاں دو گھر تھے ایک میں انکل مجید اور دوسرے میں انکل اکمل۔ بے شک وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن الگ الگ رہائش تھی۔ انکل مجید کی بیوی کا نام زبیدہ تھا۔ ان کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی شازیہ۔ اس سے چھوٹا جاوید چودہ سال کا تھا، بارہ سال کی لبنیٰ اور ساجد کی عمر پانچ سال ہوگی۔ شام تک یہ سب میرے دوست بن گئے۔ شازیہ میری نہ صرف میری ہم کلاس تھی بلکہ ہم قد، ہم عمر، ہم رنگ بھی تھی۔ چند دن بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میری ہم خیال بھی ہے۔ وہ میری طرح مطالعہ، موسیقی، اور کھیل کی شوقین تو تھی ہی مذہبی کتابیں پڑھنا ان پر غور و فکر کرنا ایک اضافی خوبی تھی۔ مطالعہ کے شوقین انکل اکمل بھی تھے۔ ہر ماہ تین ماہنامے خریدا کرتے۔ گھر میں ان کا کمرہ الگ تھا جس میں کتابیں زیادہ سامان کم تھا۔ شازیہ انہی کے کمرے سے رسائل چرا کر پڑھا کرتی تھی۔ اب ہم دو چور ہو گئے تھے۔ دوسرے دن صبح آٹھ بجے انکل اکمل مجھے اپنے ساتھ بائیک پر بٹھا کر داتا دربار لے گئے۔ وہاں سے ہم انارکلی گئے جہاں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ملازم ہمارے بعد آئے۔ گیارہ بجے میں نے انکل سے اجازت لی اور انارکلی کو گھوم کر دیکھا۔ چلتا ہوا اردو بازار، بھاٹی گیٹ، داتا دربار آ گیا۔ وہاں سے تانگے پر بیٹھ کر واپس انارکلی گیا۔ ان دنوں رکشوں کی اتنی بھرمار نہیں ہوئی تھی ابھی۔ زیادہ تانگہ گھوڑا سواری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ 1988 کی بات ہے۔ ان دنوں ایک دوسرے کو خط لکھے جاتے تھے۔ ٹیلی فون کا بھی اتنا رواج نہیں تھا۔ میں نے اردو بازار سے خط کے لیے ایک درجن لفافے خرید لیے تھے۔ ڈاک خانہ میں نے صبح ہی دیکھ لیا تھا بلال گنج میں۔ اس شام شازیہ اور میں نے مل کر گھر خط لکھا۔ وہ مجھ سے میرے بہن بھائیوں کا پوچھتی رہی۔ یہ ایسا دور نہیں تھا بچوں پر شک نہیں کیا جاتا تھا۔ اب تو جوان اولاد کا ایک دوسرے سے یوں کھلے عام ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ ہمارے ذرائع ابلاغ بھی ہیں۔ پرائیویٹ اور غیر ملکی

چینل ہیں۔اب بچے بہت جلد عشق ومحبت کو سمجھ جاتے ہیں۔عورت ومرد کے تعلق کو جان جاتے ہیں۔اظہار کرنے میں بھی شرم وجھجک محسوس نہیں کرتے۔بلکہ گرل فرینڈ بنانے اور بننے کو فیشن کے طور پر لیتے ہیں لیکن ہمارا دور ایسا نہیں تھا۔بڑے اعتبار کرتے تھے تو بچے بہت کم اعتماد کو ٹھیس پہنچاتے تھے۔

مجھے لاہور میں آئے ہوئے چھ دن گزر گئے تھے۔اس دوران میں شازیہ کی والدہ،والد،بہن بھائیوں کا دل جیت چکا تھا لیکن ابھی تک لاہور کی سیر نہ کر سکا تھا۔جیسے خواب دیکھ کے آیا تھا۔یہاں سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔آخر میں نے خالہ سے بات کی انہوں نے انکل سے یوں جمعۃ المبارک کو سیر پر جانے کا پروگرام بنا۔انکل اکمل نے مجھے انارکلی داتا دربار دکھایا تھا۔یہ چھ دن میں نے،آمنہ سے کھیلتے،عمران سیریز،رسائل پڑھتے ہوئے گزارے تھے۔

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔میں ڈرائنگ روم میں ٹیپ ریکارڈ پر لتا کا سدا بہار گانا ''جانا نہ دل سے دور آنکھوں سے دور جا کے'' سن رہا تھا۔میں جب سے آیا تھا ڈرائنگ روم کو مسکن بنالیا تھا۔شازیہ کمرے میں داخل ہوئی۔مجھے سلام کیا۔گانے کے آخری بول چل رہے تھے۔کہنے لگی ''اس گانے کو دوبارہ لگائیں''

میں نے اس گانے کو دوبارہ لگا دیا۔وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ہم نے خاموشی سے مکمل گانا سنا۔گانے کے اختتام پر اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔اس کے لہجے میں کپکپاہٹ واضح طور پر میں نے محسوس کی ''سکندر ایک بات کہوں۔''

''جی روبا تیں کہیں۔''میں نے خوش دلی سے کہا۔

''نہیں صرف ایک بات''اس کے لہجے میں جانے کیا تھا میں نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔اس نے ایک لمحہ میری آنکھوں میں دیکھا۔دونوں کی نظریں ملیں۔اس نے نظروں کو جھکا کر کہا۔

۔میرے دوست بن جاؤ،پکے دوست''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔اس کی آنکھوں میں دوستی کی چمک اور التجا کے رنگ تھے۔میں نے گرم جوشی سے اس کا نرم وگرم ہاتھ تھام لیا۔اس کے ہاتھ میں پسینہ آیا ہوا تھا۔سانس ایسے پھولی ہوئی تھی جیسے بھاگ کر آئی ہو۔میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔آج اس نے بڑی دیر تک اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے دیا۔ہم نے زبان ہلائے بنا ڈھیروں باتیں کیں۔کچھ بھی نہ کہا اور سب کچھ کہہ بھی گئے۔کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے۔شازیہ عام سے نک سک کی عام سی لڑکی تھی۔موٹاپے کی جانب مائل جسم،سانولی رنگت۔میں کون سا گلفام تھا،جو نخرہ کرتا۔میرے ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔جو بچپن کی چوٹ کی یادگار تھا۔جس نے پورے چہرے کو کسی حد تک بدنما بنا دیا تھا۔رنگت میری بھی سانولی ہی تھی۔ہماری دوستی بھی کند ہم جنس با ہم پرواز کے اصول کے عین مطابق ہوئی تھی۔دوستی ہوئی تو ہم نے مقابلے میں تیز ترین کہانیاں پڑھنے،شعر یاد کرنے،سنانے کے مقابلے کرنے لگے۔خالہ،آنٹی زبیدہ،جاوید وغیرہ اس میں شامل ہوتے ہم لڈو کھیلتے،رسی کودتے،مل کر موسیقی سنتے۔ایک بات ہم میں مختلف تھی شازیہ کی آواز بہت اچھی تھی۔شام کو ان کے گھر کے لان میں ہم بیٹھ جاتے۔وہ کوئی نغمہ کوئی غزل سناتی گھر میں پرانی موسیقی کے ہی کیسٹ تھے اس لیے ایسے ہی نغمے اسے یاد تھے۔''میں دور چلا جاواں گا جدوں۔۔اپنے بیگانے ڈھونڈن گے۔اج مینوں دیوانے کہندے نے۔کل ایسے دیوانے ڈھونڈن گے''۔

شازیہ کبھی کراٹے کی تعلیم بھی حاصل کرتی رہی تھی۔گرین بیلٹ تھی۔کبھی کبھی وہ مجھ سے جنگ بھی کیا کرتی تھی اور ہمیشہ ایک دو ککس لگا دیا کرتی تھی۔وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ساجد،جاوید،لبنیٰ،خالہ رشیدہ،آنٹی زبیدہ تماشائی تھے اور ہم ''تماشا'' یہ مناظر چھت پر ہو رہے تھے۔شام کے سات بجے کا وقت تھا یعنی مغرب کے بعد کا کہ شازیہ اور میری جنگ ہو رہی تھی۔اب تک وہ چھ گھونسے اور اتنی ہی ککس بندہ ناچیز کے رسید کر چکی تھی۔میں غصے سے بھرا ہوا تھا۔مگر وہ ہاتھ نہ آ رہی تھی۔اب یوں ہی اس نے کک ماری میرے ہاتھ میں پاؤں آ گیا۔پھر کیا تھا میں اس کے اوپر چڑھ گیا۔

ساری کسر پوری کردی۔ میرا ایک گھونسا تو کچھ زیادہ ہی جان لیوا تھا۔ پھر آنٹی جمیلہ اور رشیدہ نے اسے میرے نیچے سے نکالا تھا۔ وہ تھی تو نرم نازک مگر پھرتیلی بہت تھی۔ اب جو اٹھی تو اتنی مار کھانے کے باوجود مسکرا رہی تھی۔ دراصل میں سچ مچ غصے میں آ گیا تھا۔ مجھ سے توہین برداشت نہ ہو رہی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ دل ہی دل میں اس کی ہمت، برداشت کو داد دی۔ ''وی آر فرینڈ'' اس نے کہا۔

مجھے شرمندگی ہوئی کھیل میں مجھے اتنا غصے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے معذرت کی تو وہ ناراض ہو گئی۔

''سکندر ایسا ہو جاتا ہے۔ اب شرمندہ ہو کر مجھے شرمندہ نہ کریں'' اس واقعے نے میرے دل میں اس کی مزید قدر بڑھا دی۔ رات خالہ رشیدہ نے مجھے اچھی خاصی جھاڑ بھی پلائی تھی۔ ''کچھ خیال کر لیتے آخر لڑکی ہے وہ۔ وہ تو خیر اس کی ماں برداشت کر گئی۔ جیسے تم اس کے اوپر چڑھ بیٹھے تھے۔ تم کو شرم نہیں آئی۔ اور جو مکا تم نے اس کے مارا۔ ایک لمحہ کو تو وہ بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔'' میں سر جھکا کر سب سنتا رہا۔ اب میرے اندر دکھ کی ایک لہر اٹھی۔ خالہ سچ کہہ رہی تھی مجھے لڑائی کے وہ مناظر یاد آئے تو میں شازیہ سے زیادہ اس کی ماں کی برداشت پر حیران ہوا۔ جب میں نے اس کا پاؤں پکڑ کر اسے گھمایا تھا، جب اسے پیچھے سے پکڑ کر کلٹی دی تھی، جب اوندھے منہ لٹا کر میں اس کی رانوں پر چڑھ بیٹھا تھا۔ یہ سب سوچ کر میں بہت شرمندہ ہوا۔ بے چینی بڑھ گئی۔ غلطی کی تلافی کیسے ممکن ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کافی دیر سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بڑی دیر تک میں لیٹا خود سے جنگ کرتا رہا تصور میں شازیہ سے معذرت کرتا رہا میں نے سوچا صبح بیدار ہو کر شازیہ سے معافی مانگ لوں گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں سو گیا۔ پہلے میں سویا ہی پڑا ہوتا تھا جب شازیہ آ جایا کرتی تھی۔ اس دن وہ نہیں آئی۔ جب انکل مجید اور انکل اکمل کام پر چلے گئے، بچے اسکول چلے گئے تو میں شازیہ کے گھر چلا گیا۔ آنٹی ملی میں نے سلام کیا ''اسلام علیکم آنٹی۔ شازیہ کہاں ہے'' آنٹی نے مسکراتے ہوئے کہا ''کل تم نے جو پھینٹی لگائی ہے اس کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے اسے۔'' آنٹی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لہجے میں شوخی میں نے حیران ہو کے انہیں دیکھا تو وہ دوبارہ گویا ہوئیں ''کوئی بات نہیں سکندر تم اتنے پریشان نہ ہو۔ ایسا ہو جاتا ہے'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت وہ کہاں ہے۔'' آنٹی نے بتایا۔

''اندر کمرے میں ہے'' میں جلدی سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شازیہ بستر میں لیٹی سو رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ اچھا خاصا بخار تھا اسے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ میں نے یک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''کیسی ہو شازی'' میں نے لہجے میں زمانے بھر کی ہمدردی سموتے ہوئے پوچھا۔

''بس ہلکا سا بخار ہے۔ جسم درد کر رہا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''چلو پھر ہو جائے ایک فائٹ'' میں نے چھیڑا۔

''وہ تو میں آپ کے ہاتھ آ گئی تھی تو......''

''شازیہ'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''ہوں'' اس نے مجھے دیکھا۔

''میں سوری کرنے آیا تھا'' میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''بکواس نہ کرو۔ کس چیز کی سوری'' وہ چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ شیر مارکہ گولی، چائے کا کپ اور گرم پانی سے نہانے کے بعد دو گھنٹے بعد وہ پہلے جیسی تھی۔

صبح انکل مجید شازیہ سے کہہ گیا تھا کہ سکندر کو اپنے ساتھ لے آنا 2 بجے کے قریب کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ جاوید، شازیہ اور میں گیارہ بجے ہی چل پڑے تھے۔ میں نے اپنا سب سے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا۔ گھر سے تھوڑی دور آ کے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے قلعہ میں ایک لڑکے اور لڑکی کو ایسا چلتا ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے بہت

اچھے لگے تھے۔ آج میں خود کو دنیا کا امیر ترین فرد شمار کر رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ مجھے دیکھا تھا مسکرائی تھی اور بس۔ ہم باتیں کرتے داتا صاحب آ گئے۔ ہم نے الگ الگ فاتحہ پڑھی۔ دعائیں مانگیں اور ایک ساتھ تہہ خانے میں آ گئے۔ وہاں فرش پر بیٹھ کر ہم داتا علی ہجویری کی حیات زندگی اور دیگر بزرگوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ شازیہ نے کشف المحجوب نامی کتاب کے بارے میں بتایا۔ ابھی وہ ان کی کتاب کے بارے میں بتا رہی تھی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا "چلو سب سے پہلے یہ کتاب خریدتے ہیں" باہر آ کر ہم نے سڑک پار کی اور وہاں بنی کتابوں کی دکانوں میں سے ایک دکان پر کتاب خریدی۔ ایک بجے ہم انکل مجید کی دکان پر تھے۔ انکل مجید نے ہم کو پیسے دے دیے اور ہم نے خریداری کی تھی۔ شام چار بجے ہم واپس آ گئے تھے۔ شازیہ نے مجھے ایک رومال خرید کر دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا ہمارا ایک ساتھ باہر نکلنے کا اس کے بعد ہم روز ہی سیر کرنے نکل جاتے نہ کبھی انکل مجید نے کچھ کہا نہ ہی آنٹی زبیدہ نے بلکہ ان کو ہم دونوں پر اعتماد سا تھا۔ اور یہ اعتماد بھی سچا تھا کیونکہ ہم نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی تھی۔ جو ذومعنی ہو۔ دنیا جہاں کی باتیں کرتے ہمارے موضوع، کائنات، سائنس، اسلام، نفسیات، روحانیت، دوستی کے موضوع پر ہوتے، سب سے زیادہ مزہ چڑیا گھر اور شالیمار باغ کی سیر میں آتا تھا۔ یا داتا صاحب کے تہہ خانے میں فرش پر بیٹھ کر باتیں کرنے کا۔ ہم اس دوران ایک دوسرے کے تمام حالات، تمام خیالات اور پسند و ناپسند سے واقف ہو چکے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ وہ جب کوئی بات شروع کرنے لگتی تو وہی بات میں کہہ دیتا تھا۔ ایسی بات کبھی وہ کہہ دیتی اور میں کہنا چاہتا تھا زبردست ذہنی انڈر اسٹینڈنگ تھی ہماری۔

جب سے ہم دوست بنے تھے۔ زندگی بدل گئی تھی۔ معمولات زندگی بدل گئے تھے۔ صبح بیدار ہونے سے لے کر سونے تک ہم ایک ساتھ رہتے۔ گھر کی صفائی سے لے کر بازار سے سودا سلف لانے تک ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوتے ۔ ڈیڑھ ماہ گزر گیا اس دوران انکل مجید، انکل اکمل، خالہ رشیدہ، آنٹی زبیدہ (شازیہ کی امی) اور سب بچوں نے مل کر مجھے ہر جمعۃ المبارک کو چڑیا گھر، شالیمار، بادشاہی مسجد، ریس کورس پارک، قلعہ، یادگار کی سیر کروائی۔ میں ہر ہفتے گھر خط لکھتا رہا۔

بہت دھیرے دھیرے دوستی محبت میں بدلی اس کا ہم کو پتہ ہی نہ چلا ایسا کب ہوا کیسے ہوا۔ ہم نے تو اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں کی تھی۔ اس کا علم اس دن ہوا جس دن میں نے وہاں سے جانے کا پروگرام بنایا۔ گھر کی فضا سوگوار ہو گئی۔ سب اتنے اداس اور خاموش ہو گئے جیسے کوئی فوتگی ہو گئی ہو۔

میٹرک کے رزلٹ آنے میں ابھی ایک ماہ باقی تھا۔ شازیہ، خالہ اور دیگر سب کہہ رہے تھے کہ مزید رک جاؤں۔ لیکن یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ دوسرے دن گھر آنے کی تیاری کر رہا تھا اس نے اس شام مجھے "سفید پھول" دیا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ انتظار کی علامت ہے اور سفید پھول پاکیزہ محبت اور انتظار کی علامت ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے وہ پھول لے لیا تھا اور ڈکشنری میں رکھ لیا تھا۔ جو بازار سے خریدی تھی۔ وہ آج تک اس کتاب میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے انکل اکمل بس تک چھوڑ گیا تھا۔

......☆☆......

میں نے 597 نمبر لئے تھے میٹرک میں۔ تمام گھر والوں کے کہنے کے باوجود میں نے الیکٹریشن کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ وجہ یہ کہ والدین غریب تھے ابو مریض تھے "دمے" کے اور میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شازیہ نے فرسٹ ائیر میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایک سال گزر گیا اب میں اچھا خاصا کام کرنے لگا تھا اقبال صاحب دکان کے مالک تھے۔ وہ مجھ پر اعتماد کرتے تھے۔ یوں ان کی غیر حاضری میں دکان کے تمام امور میں ہی نپٹاتا تھا۔ ایک سال بعد وہ مجھے 2000 روپے ماہوار تنخواہ دینے لگے تھے۔ جو اس زمانے میں بہت ہوتے تھے۔ اس دوران شازیہ کے مجھے بہت سے خطوط ملے تھے۔ میں نے ایک دو خط خالہ کو لکھے تھے جن میں شازیہ کو سلام ہی لکھا تھا۔ ویسے ان دونوں خطوط میں

،میں نے ایسے اشعار لکھے تھے۔جن میں جدائی ومحبت کا اظہار ہوتا تھا۔
شازیہ نے اپنے خطوط میں دوستی کے رشتے کو محبت میں بدل دیا تھا۔وہ اپنے ہر خط میں مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی، بلکہ اکساتی رہی۔اسے میرا کام کرنا پسند نہیں آیا تھا۔وہ چاہتی تھی میں پڑھ لکھ کر کوئی بڑا افسر بنوں۔وہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی یادداشت بڑھانے کے آزمودہ طریقے لکھتی، حافظہ تیز کرنے کی مشقیں اور تیز ترین رفتار سے مطالعہ کرنے کے گر بتاتی۔وہ اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ میں اس کی محبت میں اس کے کہنے پر تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کردوں گا۔میں نے سوچا اسے جا کر سمجھاؤں گا۔"گھر کے حالات صحیح نہیں ہیں۔ان دنوں ابو کو دمہ کا دورہ پڑا تھا۔تو میں نے کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

ڈیڑھ سال بعد جب میں ان کے گھر گیا اسے بتایا تو وہ ہکا بکا رہ گئی تھی، ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی تھی مگر کچھ نہ کہا تھا۔اسے دیکھ کر میں بھی حیران رہ گیا تھا وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی۔بھرے بھرے جسم کی مالک اب اس سے میں متاثر ہوا۔میں اس کے ساتھ بیٹھ کر احساس کمتری محسوس کرتا تھا۔اس کا ناز زیادہ تھا، تعلیم مجھ سے زیادہ تھی، خوبصورت مجھ سے زیادہ تھی، امیر بھی زیادہ تھی۔وہ اونچے خواب رکھتی تھی۔میں دو دن وہاں رہا تھا۔ایک مرتبہ ہم سب داتا صاحب گئے تھے تو رات گئے واپس آئے تھے۔اس نے کہا تھا۔

"سکندر میں سمجھی آپ مجھے بھول گئے ہوں گے۔"

"میں بھلا آپ کو بھول سکتا ہوں میری ہر سانس سے وابستہ ہیں یادیں تیری" وہ خاموش ہوگئی۔اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ویسے تو جاتے آتے ہم باتیں ہی کرتے رہے تھے۔میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میرے کام کی وجہ سے یا میرے تعلیم کو جاری نہ رکھنے کی وجہ سے وہ مجھ سے دور دور رہی۔کوئی خاص باتیں نہیں کیں اس نے مجھ سے۔جس کی وجہ سے میں افسردہ سا ہو گیا تھا۔ایسے ہی الجھا الجھا سا میں واپس آ گیا تھا۔صرف ڈیڑھ سال میں وہ اتنا بدل گئی تھی۔میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

......☆☆......

میں لاہور سے واپس تو آ گیا تھا لیکن اب وہاں ہی رہنے لگا تھا۔گاؤں سے شہر دکان پر میں بائی سائیکل پر جایا کرتا سارا رستہ اس کی یادوں میں کٹ جاتا۔دکان پر مصروف ہوتا۔دن گزر جاتا۔شام کو واپسی پر بھی اس کی یادوں میں کھویا رہتا۔رفتہ رفتہ میں خود سے باتیں کرنے لگا۔یہ خود سے باتیں شازیہ سے گلے شکوے ہوتے تھے۔ایک عجیب سی بے چینی تھی، اضطراب سا، کوئی کام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔میں سوچتا چلا جاتا تھا۔اس کا بے ساختہ مسکرانا میرا ہاتھ دبانا اور ہمارا مل کر سیر کرنا الابلا کھاتے رہنا ایک عادت ہم میں اور بھی تھی کہ جب بھی ہم کوئی کھانے کی چیز خریدتے تو ففٹی ففٹی خرچ کرتے تھے یعنی اگر ہم نے آئس کریم خریدی تو دس دس روپے دونوں ڈال لیا کرتے میں کہا کرتا تھا اس طرح ہم نقصان میں نصف کے حصہ دار ہیں۔اس طرح ہم فائدے میں بھی شریک ہوا کرتے۔اب کے یہ سب باتیں مجھے یاد آنے لگی تھیں میرا حال یہ تھا کہ

بیٹھا بیٹھا اکثر گم ہو جاتا ہوں
اب میں میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

وقت گزرتا چلا گیا چھ ماہ مزید گزر گئے۔

موسم بدلا۔جولائی کا کوئی دن تھا۔جب میں شام کو گھر آیا تو مہمانوں کو دیکھ کر خوشی اور حیرانی ہوئی۔خالہ رشیدہ ،انکل اکمل، شازیہ، جاوید ہمارے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔انکل اکمل تو صرف ایک رات رہے اور دوسری صبح چلے گئے۔خالہ، جاوید اور شازیہ چار دن رہے۔میرے بھائی علی، عثمان اور عائشہ، میں اور شازیہ مل کر لڈو کھیلتے رہے۔ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتی۔میں نے کام سے چھٹیاں کر لیں۔تیسرے دن بارش ہو رہی تھی، شازیہ نے کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-
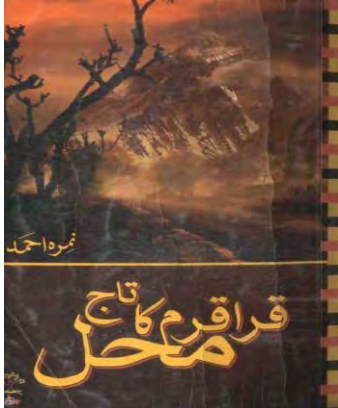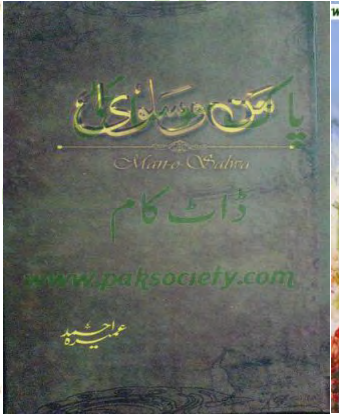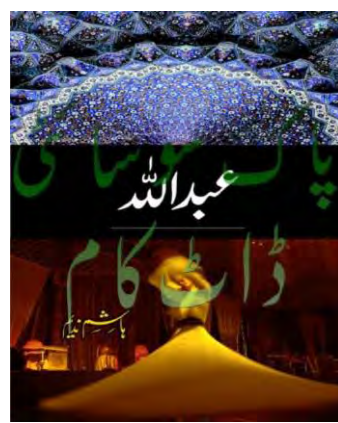
"سکندر چلو بارش میں نہاتے ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں امی، ابو اور بہن بھائی کیا سوچیں گے؟" کہنے لگی

"سوچنے دو جو سوچتے ہیں" میں نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ لاہور میں بارش ہوئی تھی۔ ہم نے چھت پر بیٹھ کر خود پر بارش برسائی تھی اور بے سری آواز میں وہ نغمات گائے تھے کہ اللہ پناہ۔ پہلے ہم صحن میں نہا رہے تھے۔ آنٹی زبیدہ کی طبیعت خراب تھی۔ ہمارے نغمات پسند نہ آئے تھے انہیں۔ شاید موسیقی کا ذوق نہیں تھا۔ مجبوراً ہمیں چھت پر جانا پڑا تھا۔ اب وہ ہماری مہمان تھی مجھے کہہ رہی تھی چلو چلیں نہاتے ہیں میں نے انکار کر دیا تھا اس کا منہ سوج گیا تھا۔ انکار کی وجہ ایک تو والدہ تھی اور میں نے سوچا تھا وہ کیا سوچیں گی۔ دوسری بات یہ کہ اب شازیہ بھی بدل گئی تھی مطلب اس کا لباس ایسا تھا کہ "اگر بھیگ جاتی تو" پھر اب ہم میں بچپنا نہ تھا۔ عمر کے ساتھ خیالات بدل گئے تھے۔ شائد میرے دل میں چور بھی تھا۔ اظہار محبت کے سیکڑوں مواقع لاہور میں تھے اور بیسیوں یہاں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ہنس ہنس کر لطیفے سناتے رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں ایک بار اس نے کہا تھا۔

"تم بہت اچھے ہو۔ میرے ہم خیال ہو۔ میں جو تم سے اتنی انسیت سے پیش آتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم سے پیار کرتی ہوں یا تم سے شادی کروں گی" یہ کہتے ہوئے وہ برابر مسکرا رہی تھی۔ میں جو اس کو سمجھنے کا دعویدار تھا۔ ہم خیال تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بات کہے بھی نہ تو میں سمجھ جاتا ہوں۔ مگر صد افسوس اس کی اس بات کو نہ سمجھ سکا۔ اس کی اس بات کے اندر جو بات تھی اسے نہ سمجھ سکا۔ غلط فہمی یا کم فہمی مجھے مار گئی۔ وہ جو بین السطور کہہ رہی تھی اس کی بجائے میں نے اس کے کہے الفاظ کو اہمیت دی۔ جو اس کے انداز تھے بات کہنے کے اسے نا سمجھ سکا تھا۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"اچھا، ویسے میں اس غلط فہمی کا میں شکار نہیں ہوں۔" حقیقت یہ تھی کہ میں نے یہ جھوٹ کہا تھا۔ کس دل سے کہا تھا اسے دل ہی جانتا تھا۔ اس کے اندر یہ خواہش تھی کہ میں اس سے کہہ دوں۔

"میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" تبھی اس نے ایسی بات کی تھی۔ مگر میں سمجھا تھا کہ چونکہ وہ مجھ سے امیر ہے۔ زیادہ خوبصورت ہے، زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ اس کا اور میرا معیار نہیں ملتا۔ یہ بات اس نے اس لیے کہی تھی۔ یعنی میری غلط فہمی دور کرنے کے لیے۔ مگر اس بات کا مجھے ایک عرصہ تک پتہ نہ چلا تھا۔ میں اس سے ناراض بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر ناراض ہو جاتا تو وہ پوچھتی۔

"کیا بات ہے ناراض کیوں ہو۔" میں کہتا "کچھ نہیں" یا کہتا "تم نے بات ہی ایسی کی ہے" تو وہ کہہ دیتی کہ "میں نے مذاق کیا تھا" یا کہتی "میں نے تصدیق کے لیے پوچھا تھا" مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ میرا جواب سن کر میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بجھ سی گئی ہے۔

کاش میں اس کے ہونے کا سبب پوچھ لیتا میں لیکن میں نے چپ کی چادر تان لی تھی۔ شاید میں احساس کمتری کا شکار تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے اس نے ایک مرتبہ مجھے پوچھا تھا۔

"تم نے کبھی پیار کیا ہے؟" میں نے کہا تھا۔

"نہیں" تو اس نے جواب دیا تھا کہ "میری زندگی میں بھی آنے والے تم پہلے لڑکے ہو"۔ یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا۔ میں نے کہا تھا۔

"میری زندگی میں بھی تم پہلی ہو جس سے دوستی ہوئی ہے" اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا رنگ تھا جس کی مجھے سمجھ نہ آسکی تھی۔ وہ کچھ مزید مجھ سے سننا چاہتی تھی۔ میں جو اس کے تصور سے ڈھیروں باتیں کیا کرتا تھا۔ اب وہ پاس تھی تو کھل نہ سکے تھے لب۔ دل کی باتیں دل میں رہ گئیں ساری۔ جب

میں چھ ماہ پہلے لاہور گیا تھا تو اس میں وہ پہلے والی شوخیاں نہ تھیں۔ وہ قہقہے نہ تھے۔ تب ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے مجھ سے راستے جدا ہیں۔ یہ میں نے خود ہی سمجھ لیا تھا۔ اس لیے بھی اب جب وہ ہمارے گھر چار دن رہ کر گئی تو میں نے اپنے اوپر ایک خول چڑھا لیا تھا۔ اصل ہم نے اس سارے عرصے میں کبھی اظہار محبت نہیں کیا تھا بس کچھ الفاظ کو یہ معنی پہنا دیئے تھے۔ بالکل ایسے ہی الگ راستے کرتے ہوئے بھی ہم نے کچھ نہیں کہا تھا ایک دوسرے سے۔ چوتھے دن خالہ، جاوید اور شازیہ میرے ساتھ ہی شہر آئیں تانگے پر اور وہاں سے نانا کے گاؤں چلی گئی تھیں۔

......☆☆......

میں ایک ہفتے بعد دکان پر آیا۔ اب مجھے اس دکان پر کام کرتے ہوئے دو سال سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔ اقبال صاحب نے ایک نئی دکان ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کھول لی تھی۔ مجھے اس دکان پر بھیج دیا گیا اور تنخواہ چار ہزار کر دی گئی۔ خرچہ الگ۔ میرے ساتھ اقبال کا چھوٹا بھائی نذیر احمد کام کرنے لگا تھا۔ وہ میرا ہم عمر ہی تھا۔ وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ "تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد" تو یہی حال میرا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ مجھے کم از کم شازیہ سے اظہار محبت تو کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے اب تک ایسا کیوں نہ کیا تھا۔ اس کی وجہ تھی پہلے تو یہ تھی کہ میں سوچا کرتا اگر میں نے اس سے ایسا کہہ دیا تو شاید کہہ دے "سکندر مجھے تم سے یہ امید نہ تھی" اب میں سوچا کرتا کہ اس نے خود ہی انکار کر دیا ہے۔ یوں دل کٹ سا جاتا۔ مگر پھر خود کو مصروف کر لیتا تھا۔ تین سال گزر گئے۔ میں شازیہ سے ملنا چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر نہ جاتا کہ اس نے مجھ کو ٹھکرا دیا ہے۔ مزے کی بات یہ ان تین سال میں اس نے مجھے تین خط لکھے تھے۔ اب میں 24 برس کا ہو چکا تھا۔

شازیہ بھی اتنے برس کی ہو گی۔ میری منگنی اپنی پھوپھی زاد سلمٰی سے ہو گئی۔ سلمٰی مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی۔ مڈل پاس تھی۔ قبول صورت تھی۔ ہماری جوڑی بقول لوگوں کے بہت اچھی اور خوبصورت تھی۔ دو ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ شازیہ کی منگنی ہو گئی ہے۔ اس کے خالہ زاد ندیم سے۔ شازیہ نے بی اے کیا تھا۔ شازیہ کی منگنی کے بعد اس کا منگیتر سعودیہ چلا گیا۔ دو سال کے لیے۔ یہ 1993ء کی بات ہے جب شازیہ کی بھی منگنی ہو چکی تھی اور میری بھی۔ جب میری شازیہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ کم از کم تین سال کے بعد، وہ ایک شادی تھی میں صرف اس شادی میں اس لئے گیا تھا کہ وہاں سلمٰی بھی جا رہی تھی۔ میں نے سلمٰی کو دیکھا تھا وہ جب سات آٹھ سال ہو گی اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ مگر یہ پرانی بات تھی۔ اب ہم منگیتر تھے۔ اس کے بعد اب تک اس سے کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ میں امی اور میری چھوٹی بہن عائشہ شادی میں گئے تھے۔

......☆☆......

رزاق کی بیوی آنٹی جمیلہ (شازیہ کی ماں) زبیدہ بی بی کی سگی بہن تھی۔ دوسری طرف رزاق کے بیٹے امجد اور بیٹی رخسانہ کی ان کی ایک اور بھی بیٹی تھی نسیم اختر جو کہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہو گی۔ جب ہم دونوں میں اور میری بہن ان کے گھر گئے تو سب سے علیک سلیک کے بعد نسیما اختر آ گئی اور کہنے لگی۔

"سکندر آپ نے سلمٰی سے منگنی بھی کر لی اور ہم کو پوچھا بھی نہیں"

میں نے حیران ہو کے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے آپ سے شادی کرنا تھی"

"اچھا......"

عائشہ کہنے لگی "تم پہلے بتا دیتی اب تو بھائی کسی اور کے ہو چکے ہیں"

موسم بڑا خوبصورت تھا رات گئے تک تو میں امجد اور رخسانہ کو چھیڑتا رہا۔ انکل، آنٹی سے باتیں کرتا رہا اور پھر ڈرائنگ روم میں آ کر سو گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں میں اکیلا نہیں تھا۔ ایک بزرگ ابو کے چچا بھی تھے۔ رات گئے تک

وہ مجھے اپنا ماضی سناتے رہے۔

ان کی وجہ سے ہی مجھے ڈرائنگ روم میں سونا پڑا تھا کہ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ باقی تمام افراد صحن میں سو ئے تھے۔ رات کے چار بج رہے ہوں میں سو گیا تھا۔ خواب میں شازیہ کو دیکھا، ہرے بھرے کھیت اور وہ آسمان سے اتر رہی تھی۔ اس لمحے مجھے خواب میں احساس بھی نہ تھا کہ کوئی میرے پاس آگیا ہے اور پھر شازیہ آسمان سے اتر آئی۔ اسی لمحے میں بیدار ہو گیا میری بانہوں میں کوئی سمایا ہوا تھا پہلے میں خواب سمجھا اور پھر۔۔۔ وہ تو پروین تھی۔۔۔ میں نے بڑی نرمی سے اسے خود سے الگ کیا۔ میں اتنا گھبرایا کہ میری سانس بھی مشکل سے نکل رہی تھی۔ اسی وقت صبح کی اذان ہونے لگی۔ وہ میرے ساتھ بستر میں گھسی ہوئی تھی۔ میں نے اسے خود سے دور کیا تو وہ مزید لپٹ گئی۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ ہماری دھینگا مشتی کا اچھا خاصا شور ہو رہا تھا۔ میں اسے چارپائی سے نیچے دھکا دے رہا تھا۔

خدا کا شکر ہے اس وقت دادا جان بیدار ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کون ہے“ کمرے میں اندھیرا تھا اس لیے میں اسے نظر تو نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دادا کو بتایا کہ ”میں سکندر ہوں پیشاب کرنے گیا تھا“ وہ خاموش ہو گئے۔ اس کے دو منٹ بعد نسیم اختر خاموشی سے اتر گئی۔

شادی سے ایک دن قبل میرے ابو اور امی بھی آ گئے سلمٰی اور اس کے ماں باپ بھی تب سلمٰی کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا، اس نے مجھے دیکھ کر منہ چڑایا میں نے بھی جواب میں منہ چڑایا تھا۔ ہمارا خیال تھا کی کوئی دیکھ نہیں رہا مگر سب دیکھ رہے تھے اور سب ہنسنے لگے۔ سلمٰی شرم کے مارے اندر بھاگ گئی۔ اب پتہ چلا کہ وہ اتنی صحت مند کیوں تھی۔ وہ ہنس مکھ بہت تھی۔ اس شادی پر میری اور سلمٰی کی کوئی بات نہ ہوئی مگر ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ اسی شام شازیہ آ گئی تھی اس کی والدہ اور جاوید ہمراہ تھے مجھے ساری رات نیند نہ آئی تھی شازیہ اور میں نے صرف ہاتھ ملایا تھا نا کچھ اس نے کہا اور نا ہی میں نے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو سلام بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ دوسرے دن جب بارات آئی ہوئی تھی۔ سب دلہا اور دلہن کے ادھر ادھر پھر رہے تھے میں اور شازیہ دو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک میز تھا میز پر کتاب تھی اردو کا ٹیسٹ پیپر جماعت ہشتم۔ میں پہلے ہی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ اکیلے کو بیٹھا دیکھا تو میرے پاس آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

میں نے ہی خاموشی توڑی۔ ”مبارک ہو منگنی کی“ مجھے اپنی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھی اور باوقار چلتی ہوئی میز کے پاس گئی اور کتاب کو ایک ایک ورق کر کے پھاڑنے لگی میں اسے دیکھتا رہا۔ کافی ورق پھاڑنے کے بعد اس کی آواز سنائی دی

”آپ کو بھی مبارک ہو“

کیا بات ہے شازیہ؟ مجھ سے ناراض ہو“

”بس کچھ نہیں“۔

”کتاب کیوں پھاڑ رہی ہو؟“

ان نے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

بولی تو آواز میں کرب شامل تھا۔ ”میں تم سے پیار کرتی ہوں، سکندر میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ رونے لگی۔ تم نے خاموشی سے منگنی کر لی مجھ سے پوچھا بھی نہیں“ اس کی یہ بات سن کر جو میرا حال ہوا اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ میں اپنا حال کیا لکھوں۔ ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میں اٹھا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں بہت محبت کرتا ہوں۔“

اسی لمحہ میری بہن اندر آئی اور دوسرے لمحے وہ باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئی اور مجھے بتایا کہ ابو بلا رہے ہیں۔ ہم دونوں رو رہے تھے۔ عائشہ کہنے لگی۔

"اب رونے کا کیا فائدہ" ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں کمرے سے باہر نکل گیا۔شادی گزر گئی۔ سلمٰی اپنے گھر چلی گئی دوسرے دن شازیہ بھی چلی گئی اور ہم بھی واپس آ گئے گھر۔ اب کی ملاقات بڑی کرب آمیز تھی، میری بہن نے مجھ سے پوچھا۔

"بھیا آپ شازیہ سے پیار کرتے تھے تو سلمٰی سے منگنی کیوں کی۔" میں نے اسے بتایا۔

"بس غلطی ہم دونوں کی ہے مگر میری زیادہ ہے"

"کیا...... یہی بات تو شازیہ کہہ رہی تھی" وہ حیرانی سے بولی۔ میں مسکرا دیا۔ میں اور شازیہ ایک جیسا ذہن رکھتے تھے۔خیالات ایک جیسے تھے تو کیسے کرتے اظہار محبت۔ ندیم (شازیہ کا منگیتر) کا وہاں کام نہ چل سکا اور ایک سال بعد واپس آ گیا۔ جبکہ اس دوران میری اور سلمٰی کی شادی ہو گی۔ کچھ اس لئے شادی کرنا پڑی کہ عائشہ کے سسرالی جلدی شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہم بہن بھائی کی شادی ایک ہی دن ہوئی۔ ہماری شادی بڑی سادگی سے ہوئی تھی۔شازیہ نے شرکت نہیں کی تھی۔ بقول اس کی والدہ کے وہ بیمار تھی۔ سلمٰی کیا گھر میں آ گئی خوشیاں آ گئیں۔

......☆☆......

شادی کے بعد میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ والی دکان چھوڑ دی اور واپس اسی دکان پر استاد کے ساتھ کام کرنے لگا۔ میں صبح جاتا اور شام کو واپس آ جاتا تھا۔ سلمٰی بھی خوش تھی اور میں بھی۔ کچھ سلمٰی نے خود کو بدل لیا اور کچھ میں نے خود کو۔ وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی رفتہ رفتہ اسے امور خانہ داری بھی آ گئے اور وہ گھر کی طرف بھی توجہ دینے لگی۔ میں نے سلمٰی کو پہلی رات ہی کہہ دیا تھا کہ اگر تم میرے والدین سے محبت نہ کرو گی تو مجھ سے محبت کی امید نہ رکھنا اس نے کہا تھا۔

"آپ مجھے دیگر تمام لڑکیوں سے مختلف پائیں گے۔" اور اس نے یہ بات ثابت کر دی تھی انہی دنوں اقبال صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ آخری وقت میں تو ان کے ساتھ نہ تھا مگر انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹے نذیر احمد سے کہا تھا۔

"اگر میں مر جاؤں تو سکندر کی چھٹی نہ کروانا۔ اس کے ساتھ حصہ داری کر لینا"

"میں نے اقبال صاحب کی وفات کے پندرہ دن کے بعد وہ دکان کھولی۔ اب وہاں میرے سمیت تین لڑکے کام کرتے تھے اور میں سب سے سینئر تھا۔

شام کو ان کے گھر جا کر شکیلہ آنٹی کو کہا کہ 'رشتے خون کے نہیں جذبات کے ہوتا ہے۔ خون کے تو گروپ ہوتے ہیں۔ مجھے استاد اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ میں اپنے شاگرد ہونے کا حق ادا کروں گا۔" آنٹی نے کہا تھا۔ آپ کے استاد نے کہا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والی دکان بیچ دینا۔ سکندر کو کاروبار میں شریک کر لینا۔ آج سے تم دکان پر کام کرو منافع میں سے آدھا حصہ تمہارا ہو گا میں نے ایسا ہی کیا ٹوبہ ٹیک سنگھ والی شاپ بیچ دی اس کا تمام سامان اٹھا کر اسی دکان میں لے آیا۔ اس طرح دکان میں سامان ڈبل ہو گیا۔ میں منافع میں سے آدھا حصہ استاد کے گھر ہر ماہ خود جا کر دے آتا۔ زندگی کی گاڑی ایسے چلتی رہی۔ سلمٰی اور میں خوش تھے۔ روز شام کو میں گھر چلا جاتا۔ سلمٰی ایک شوہر پرست عورت ثابت ہوئی ۔اسے علم تھا کہ میرے والدین میری جنت ہیں وہ جی جان سے خوش ہو کر ان کی خدمت کرتی۔ اللہ نے شادی کے دو سال بعد ایک بیٹی کی رحمت سے نوازا تو گھر میں رونق لگ گئی۔ ایسے ہی خوشی خوشی زندگی کا سفر طے ہو رہا تھا۔ لیکن زندگی کے سفر میں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں۔

شازیہ کی شادی میری شادی کے دو سال بعد ہوئی ندیم سعودیہ سے واپس آ گیا تھا۔ اور اس نے ملتان میں ہی کام شروع کر دیا تھا۔ جی جان سے محنت کرنے لگا۔ اس نے گولی ٹافی بنانے کی مشینیں لگائی تھیں مال شہر بھر کی دکانوں پر سپلائی کے لیے سیلز مین رکھے۔ ایک سال میں ہی کام نے عروج پکڑ لیا۔ سال بعد اللہ نے شازیہ کو بیٹا دیا تھا۔

ایک شام میں گھر واپس آیا تو سلمٰی نے دعوتی کارڈ مجھ کو دیا۔ بچے کی خوشی میں ندیم نے ساری برادری اکٹھی کی تھی۔ ایک بات بتا دوں کہ ندیم نہ صرف اپنے والدین کا اکلوتا تھا بلکہ اس کا والد بھی اکلوتا تھا۔ برسوں بعد ان کے خاندان میں

ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس بات کو سب جانتے تھے اس لیے اچھی خاصی برادری اکٹھی ہوئی تھی۔ ہمارا وہاں جانا ہی قیامت ثابت ہوا تھا مقررہ تاریخ پر میں اور سلمیٰ ملتان گئے۔

شازیہ کا بیٹا 40 دن کا ہو چکا تھا۔ ندیم اور شازیہ ہم سے مسکرا کر ملے۔ شازیہ نے اپنے بیٹے کا نام سکندر رکھا تھا۔ سکندر کو سلمیٰ نے اٹھایا۔ اس لمحے شازیہ کی ساس مجھے اور ننھے سکندر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت سلمیٰ نے حیرت سے کہا تھا۔ "شازیہ آپ کے بیٹے سکندر کی شکل سکندر سے کتنی ملتی ہے۔ جاوید شازیہ کا بھائی، اس کی بیوی، ندیم کی ماں بھی وہاں موجود تھے۔ سب ننھے سکندر کو غور سے دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر حیرت تھی۔ تب میں نے غور سے دیکھا ہو بہو میری کاپی تھا، میرے ماتھے پر ایک زخم کا نشان تھا جس طرح چاند ہوتا ہے وہ نشان اس کے ماتھے پر پیدائشی تھا۔ آنکھیں، ناک، کان ہونٹ حتیٰ کہ رنگ روپ بھی میرا ہی تھا۔ ناک پر عین اس جگہ تل کا نشان تھا جیسے میرے تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے بائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں تھیں۔ میرے بھی بائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں تھیں۔

پھر وہ ہوا جس کا خیال بھی نہ تھا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ شازیہ کا بیٹا، میرا ہم شکل کیوں ہے؟ شازیہ نے اپنے بیٹے کا نام سکندر کیوں رکھا تھا سب خواتین اس کی اپنے علم کے مطابق وضاحت کرنے لگیں سب کے چہروں پر سوالات اور حیرت کھنڈ گئی تھی۔ سب سوالیہ نظروں سے مجھے اور شازیہ کو دیکھنے لگے۔ ان کا اس طرح مجھے دیکھنا مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ ان کی نظروں میں شک کے سانپ اپنی زبانیں نکالے ہمیں ڈسنے کو تیار تھے۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں مردانہ حصہ میں آ گیا۔ اب سب کی زبانوں پر ایک ہی بات تھی۔ میں نے دیکھا جاوید، شازیہ کے بھائی کی نظروں میں بھی میرے لیے نفرت تھی۔ رات گئے ہماری واپسی ہوئی۔ سب اس گھر سے ایسے وداع ہوئے جیسے میت کو دفنا کر آئے ہوں۔ ہم گھر واپس آ رہے تھے میں نے محسوس کیا کہ سلمیٰ ضرورت سے زیادہ خاموش ہے۔ میں نے دو تین بار پوچھا۔

"سلمیٰ کیا بات ہے؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا۔

......☆☆......

گھر آ کر سلمیٰ نے قیامت اٹھا دی۔ ہماری اچھی خاصی لڑائی ہوئی آخر میں نے سلمیٰ کو اپنے بھائی کے ساتھ اس کے میکے بھیج دیا۔

وقت ہر زخم کا علاج ہے۔ شازیہ اپنے میکے جا بیٹھی سلمیٰ اپنے ماں باپ کے گھر۔ میری زندگی میں یہ چھ ماہ اتنے اذیت ناک تھے کہ صبح سے شام رات گئے تک میں انہی سوچوں میں گم رہتا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ ہوا کیا ہے۔ مجھ سے زیادہ کرب انگیز زندگی شازیہ کی تھی۔

سلمیٰ کو خدا نے بیٹی دی تھی۔ یعنی شازیہ کی طلاق کے چھ ماہ کے بعد تو میں اور میرا بھائی سلمان سلمیٰ کے ہاں گئے۔ اس نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ میں نے بچی کو اٹھایا چھ ماہ وہ میرے جسم کا حصہ تھی، میں نے اس کا نام بدیعہ رکھا اس کی شکل سلمان سے ملتی تھی میں نے صرف سلمیٰ سے اتنا کہا "سلمیٰ ہماری بچی کی شکل سلمان سے (اپنے چچا) سے ملتی ہے" اس نے ایک لحہ کو بدیعہ دیکھا دوسرے لمحے میرے ساتھ کھڑے سلمان کو اور حیران رہ گئی۔ اس پورے ایک سال میں خالہ سے اکثر بات ہوتی رہی۔ وہ مجھے شازیہ کے حالات سے آگاہ رکھتی تھیں۔ میں نے خالہ سے کہا میری شازیہ سے بات کروا دیں۔ کہنے لگی۔

"وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیوں۔" خالہ نے بتایا۔

"وہ کہتی ہے سکندر اگر مجھ سے شادی کر لیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اس نے غلط فہمی سے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

مجھے وہ دن یاد آئے جب وہ ہمارے گھر آئی تھی اور ہماری ذو معنی باتیں ہوئی تھیں۔ خالہ نے مجھے کہا۔

"اگر تم کہو تو میں شازیہ کی امی سے بات کروں تمہاری شادی کی۔" میں نے ایک لمحہ سوچا اور کہا۔

"ہاں آپ کریں بات" اس سے تین دن بعد خالہ نے خوشخبری سنائی کہ "شازیہ کی امی مان گئی ہیں اس کے باپ بھی راضی ہیں لیکن شازیہ نہیں مان رہی" میں نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"خالہ وہ کیوں نہیں مان رہی۔۔۔اب کیوں نہیں مان رہی وہ" خالہ نے بتایا۔

"وہ کہتی ہے کہ اس طرح لوگ کیا کہیں گے۔ مجھ پر جو جھوٹا الزام لگا ہے۔ وہ سچ ثابت ہو جائے گا" میں نے خالہ کی منت کی۔

"آپ اسے سمجھائیں اس سے بڑھ کر اور کیا لوگ کہیں گے۔ طلاق تو ہو گئی اسے۔ آخر انہیں اپنی غلط فہمی پر اتنا یقین تھا تو ندیم نے طلاق دی ہے۔" خالہ نے مجھے یقین دلایا۔

"میں اس سے کرتی ہوں بات شاید مان جائے" قصہ مختصر چھ ماہ مزید گزر گئے۔ آخر وہ مان گئی۔ میں نے اپنی امی کو بھیج دیا۔ یہاں بھی خالہ ہی کام آئیں کیوں کہ امی جان اب میرا رشتہ پوچھنے وہاں جانا نہیں چاہتی تھیں انہیں بھی خالہ نے راضی کیا تھا۔ ابھی امی لاہور نہیں گئی تھیں کہ انہی دنوں شازیہ کے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں ایک واقعہ لکھا ہوا تھا کہ ماحول ہم پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی دن شازیہ نے مجھے کال کی میں دکان پر نہیں تھا۔ ایک ملازم نے کال اٹینڈ کی۔ جب میں واپس آیا تو اس نے مجھے بتایا۔ شام ہو چکی تھی جب میں نے خالہ کو کال کی اس دن انکل اکمل نے کال اٹینڈ کی۔ حال چال پوچھنے کے بعد انہوں نے بتایا "سکندر میں پہلے بھی شازیہ اور تمہیں گناہ گار نہیں سمجھتا تھا لیکن اب تو اس کا یقین ہو گیا ہے کہ تم سچے ہو" ان کی یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے

"مجھے آج شازیہ نے خواجہ شمس الدین عظیمی کی کتاب اسم اعظم دکھائی ہے۔ ابھی رکو میں اسے لے کر آتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد انہوں نے دوبارہ ریسیور اٹھایا اور کہنے لگے۔

"اس کتاب میں نفسیات کی دنیا کا ایک بہت بڑا مشہور واقعہ لکھا ہے۔ وہ یہ کہ ایک انگریز ماں کے بطن سے ایک ایسا بچہ تولد ہوا جس کے سارے نقش ونگار اور رنگ حبشی نژاد بچوں کی طرح تھا۔ ناک نقشہ موٹا، بال گھونگریالے اور رنگ سیاہ، ویسے ہی چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط اعصاب۔ بچے کی پیدائش کے بعد باپ نے اس حقیقت کو کہ بچہ اس کا اپنا ہے قبول نہیں کیا۔ جب معاملہ بہت زیادہ الجھ گیا اور تحقیق وتفتیش اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو راز یہ کھلا کہ ماں حمل کے زمانے میں جس کمرے میں رہتی تھی وہاں دیوار پر ایک حبشی بچے کا فوٹو آویزاں تھا۔ بڑے بڑے نفسیات داں، دانشوروں اور ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا اور باہمی صلاح مشورے اور افہام وتفہیم سے یہ بات طے پائی کہ چونکہ اس کمرے میں ایک حبشی بچے کا فوٹو لگا ہوا ہے اور عورت حمل کے زمانے میں بچے سے فطری اور طبعی طور پر قریب رہی ہے اور بار بار حبشی بچے کو دیکھتی رہی، دیکھنے میں اتنی گہرائی پیدا ہو گئی کہ اس کی سوچ (Feeling) پیٹ میں موجود بچے کو منتقل ہو گئی۔ کہنا یہ ہے کہ شکم مادر میں ایک طرف نوعی تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماں کے یا باپ کے تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔"

انکل کی بات سن کر مجھے بڑی خوشی ہو۔ میں نے انہیں کہا۔ "انکل یہ آپ جاوید کو بتا دیتے"

انکل نے کہا۔ "یہاں سب کے دماغ سے شک نکل گیا ہے جاوید نے اپنی بہن سے معافی مانگ لی ہے۔ یہ لو اپنی خالہ سے بات کرو" اسی وقت خالہ کی محبت بھری آواز سنائی دی۔ "اللہ کا شکر ہے۔ میں بہت خوش ہوں" میں نے ان کی قطع کلامی کی "اور شازیہ" "وہ بھی بہت خوش ہے" اب اپنی امی کو بھیج دو۔ ہاں میں جا کر امی سے بات کرتا ہوں۔ اس سے چند دن بعد امی، ابو، میرا بھائی سلمان، میری بہن اور بہنوئی شازیہ کا رشتہ پوچھنے لاہور چلے گئے۔

اس دن میں نے سلمی سے فون پر بات کی۔ میں دکان پر بیٹھا تھا۔ میں نے سلمی کے پڑوسیوں کو فون کیا۔ وہاں پیغام چھوڑا۔ آدھے گھنٹے بعد میری سلمی سے بات ہوئی میں نے اسے کہا

"مسنو سلمی (اس وقت سلمی کی ماں اور بھائی بھی اس کے ساتھ تھے) سلمی عورت دوران حمل جس ہر وقت دیکھتی ہے یا جس کے متعلق زیادہ سوچے یا جس سے محبت کرتی ہو اس کا بچہ اس مرد یا عورت کا ہم شکل ہو جاتا ہے۔ بعض بچے اپنے ماموں پر جاتے ہے۔ بعض کی شکل نانا سے ملتی ہے۔ بعض کی باپ سے اور بعض کی ماں سے کسی کی چچا یا ماما سے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سب گناہ گار ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو" سلمی تنگ کر بولی۔ میں نے کہا اپنے بھائی کو فون دو۔ سلیم نے فون پکڑا تو میں نے اسے کتاب کا نام اور مصنف کا نام بتایا اور کہا اپنی بہن کو یہ کتاب لازمی پڑھا دو۔ اگر اس کے باوجود اسے میری بات سمجھ نہیں آتی تو میں فیصلہ بھیج دوں گا۔

دوسرے دن امی وغیرہ رشتے کا دن مقرر کر کے آ گئے۔ سادگی سے شادی کا فیصلہ ہوا تھا۔ دوسری طرف سلمی کی طرف سے چند دن بعد فون آیا کہ مجھے آ کر لے جاو۔ میں اسی وقت سسرال روانہ ہو گیا۔ ڈیڑھ سال بعد ہمارے گھر میں خوشیوں نے قدم رکھا تھا۔ اپنے گھر میں لا کر میں نے اپنی بیوی سے تفصیلی بات کی۔ شازیہ کے رشتے کا بھی بتایا۔ تو وہ کہنے لگی۔

"آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ ایسے حالات میں اسے تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔" سلمی نے مجھے بتایا کہ اس نے اس بارے میں کافی تحقیق کی ہے کہ بچے کی شکل وصورت پر ماحول کا کتنا اثر پڑتا ہے۔ تاریخ میں ذکر ہے کہ روم کا ایک حبشی وزیر اس بات کا خواہاں ہوا کہ اس کے ہاں ایک حسین وجمیل لڑکا پیدا ہو۔ اس غرض کیلئے اس نے حکیم جالینوس سے جو اس زمانے میں حکماء فضلاء کا استاد مانا جاتا تھا، مشورہ کیا۔ حکیم موصوف نے ہدایت فرمائی کہ تین خوبصورت مناظر کی تصاویر بنائی جائیں اور بستر عروسی کے تین طرف لگائیں جائیں اور وقت مقاربت نیز ایام حمل میں زوجہ ان کی طرف دیکھے۔ وزیر مذکور نے اس نصیحت پر عمل کیا۔ چنانچہ اس وجہ سے اس کے ہاں ایک نہایت حسین و جمیل بچہ پیدا ہوا۔"

اب سلمی میرے گھر میں ہے۔ شازیہ سے میں نے شادی اسی برس کر لی تھی۔ شازیہ کو خدا نے ایک بیٹا دیا۔ جس کا نام علی رضا رکھا ہے اور سلمی کو بھی بیٹا دیا ہے ہم گھر میں خوش ہیں۔ سلمی کے بیٹے کا نام ارشاد رکھا ہے۔ گزشتہ سال میری والدہ فوت ہو چکی ہیں۔ میں نے والد کو حج کروا دیا ہے۔ میں اسی الیکٹریشن کی دکان پر کام کرتا ہوں۔

ذوقِ آگہی

سباس گل

(اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس)

باتوں سے خوشبو آئے

❁ ایمان اس کا نام ہے کہ خدائے واحد کو دل سے پہچانے اور زبان سے اس کا اقرار کرے اور حکم شرع پر عمل کرے۔

❁ خشوع و خضوع کا تعلق دل سے ہے نا کہ ظاہری حرکات سے۔

❁ بدخو کی دوستی سے احتراز لازم ہے کیونکہ وہ اگر بھلائی بھی کرنا چاہتا ہے تو بھی اس سے برائی سرزد ہو جاتی ہے۔

❁ خدا تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو میرے عیوب پر مجھے مطلع فرماتا ہے۔

❁ جب ایک عالم سے لغزش ہو جاتی ہے تو اس سے ایک عالم لغزش میں پڑ جاتا ہے۔

❁ طالب دنیا کو علم پڑھانا، ان کے ہاتھ میں تلوار فروخت کرنا ہے۔

❁ کسی کے خلق پر اس وقت تک اعتبار نہ کرنا جب تک اس کو غصہ میں نا دیکھ لو۔

❁ جو عیبوں سے آگاہ کرے وہ دوست ہے منہ پر تعریف کرنا گویا ذبح کرنا ہے۔

❁ ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم کرنا ہے۔

❁ جب حلال و حرام جمع ہو جائے تو حرام غالب ہو جاتا ہے چاہے وہ تھوڑا سا ہی ہو۔

❁ اگر میں ایسی حالت میں مر جاؤں کہ اپنی محنت اور سعی سے روزی کی تلاش کرتا ہوں تو مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ خدا کی راہ میں غازی ہو کر مروں۔

❁ دوزخ سے بچو اگر چہ کے آدھے چھوارے کی بدولت ہو اگر یہ بھی نا ہو تو میٹھی بات ہی سہی۔

سمیر التعبیر...... سرگودھا

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نام

☆ قرآن مجید میں محمد ﷺ اور احمد ﷺ

☆ زبور میں عاقب ﷺ

☆ تورات میں ماذ ﷺ

☆ انجیل میں فرقلیط ﷺ

☆ جنت میں عبدالکریم ﷺ

☆ آسمان میں مجتبیٰ ﷺ

☆ زمین میں معظم ﷺ

☆ انبیاء میں عبدالوہاب ﷺ

☆ ملائکہ میں عبدالمجید ﷺ

☆ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰسین

روبی علی...... سیدوالا

اذان

دنیا میں ہر وقت گونجنے والی آواز اذان ہے جو ہر وقت کانوں میں رس گھولتی ہے، انڈونیشیا کے مشرقی جزائر سے فجر کی اذان کا آغاز ہوتا ہے اور بیک وقت ہزاروں موذن اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اعلان کرتے ہیں مشرقی جزائر سے یہ سلسلہ مغربی جزائر تک چلا جاتا ہے پھر سماٹرا کے دیہات اور قصبات میں اذانیں شروع ہوتی ہیں، بنگلہ دیش میں ابھی اذانوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا کہ کلکتہ اور سری لنکا میں اذانیں گونجنے لگتی ہیں ہندوستان کے سری نگر اور سیالکوٹ (پاکستان) کا ایک ہی وقت ہے اسی دوران افغانستان اور مسقط میں فجر کی اذان کا وقت ہو چکا ہوتا ہے پھر مسقط سے بغداد ایک گھنٹے کا فرق ہے اس عرصہ میں سعودی عرب یمن متحدہ عرب امارات، کویت اور عراق میں اذانیں شروع ہو جاتی ہیں پھر گھنٹہ بعد شام، مصر، سوڈان اور صومالیہ میں یہ سلسلہ جاری ہو جاتا ہے پھر مشرقی ترکی اور لیبیا، تیونس میں اذان کا وقت ہو جاتا ہے غرضیکہ یوں فجر کی اذان جس کا آغاز انڈونیشیا کے مشرقی جزائر سے شروع ہوا تھا ساڑھے نو گھنٹے کا سفر طے کر کے بحر اوقیانوس تک پہنچنے سے پہلے مشرقی انڈونیشیا میں ظہر کی اذان کا وقت ہو جاتا ہے، اس طرح کرہ ارض پر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جب سیکڑوں، ہزاروں موذن اللہ کی واحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اعلان نہ کر رہے ہوں، سرکار دو عالم جناب محمد مصطفیٰ ﷺ نے عورتوں کو

خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے عورتو! جب تم بلال (حبشیؓ) کی اذان سنو تو جس طرح وہ کہتا ہے تم بھی کہا کرو، اس لیے کہ اللہ پاک ہر کلمے کے بدلے ایک لاکھ نیکی عطا کرے گا اور مردوں کے لیے دوگنا ہے، اذان میں پندرہ کلمے ہیں اور فجر کی اذان میں سترہ اور یوں اذان کا جواب دینے پر جو اللہ ایک دن میں 77 نیکیاں عطا فرما دے وہ کیسا کریم ہوگا؟ گویا اذان ہی وہ نغمہ ہے جو کائنات کی ابتدا سے انتہا تک گونجتا رہے گا ہمیں بھی اس میٹھے نغمے سے تمسک کرکے اپنی نجات یقینی بنانی چاہیے۔

محمد کاشف......رحیم یار خان

پیا

پیا رنگ میں، میں رنگی جاؤ
اپنے اندر میں، میں پیا پاؤ
اپنے پیا بنا تو میں مر بھی جاؤ
میں پیا دیکھو تو کھو ہی جاؤ
پیا دیس رنگ نرالا ہے
میرا پیا بھولا ہے
میرے من کو بس پیا بھائے
اگر مجھ سے پیا روٹھ جائے
خدایا سانس میری رک جائے

امیر حمزہ......سیو پورہ

ایک آدمی کی بات

لوٹ جاتا ہوں واپس گھر کی طرف ہر روز تھکا ہارا، آج تک سمجھ نہیں آئی کہ کام کرنے کے لیے جیتا ہوں یا جینے کے لیے کام کرتا ہوں، بچپن میں بس اک بار پوچھا گیا سوال تھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے۔ جواب اب سمجھ میں آیا کہ پھر سے بچہ بننا ہے۔ بھری جیب نے دنیا کی پہچان کرائی اور خالی جیب نے اپنوں کی، جب لگے پیسے کمانے تو سمجھ آیا کہ شوق تو ماں باپ کے پیسوں سے پورے ہوتے تھے اپنے پیسوں سے تو بس ضرورتیں پوری ہوتی ہے۔

عائشہ اے بی......جھڈو، سندھ

علم و فن

○ کتب خانے خدا کا گھر ہیں کہ خدا حق و صداقت کا دوسرا نام ہے اور حق و صداقت تک رسائی علم کے بغیر ممکن نہیں۔

○ اگر لکھنے والے نہ ہوتے تو آج انسانیت کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔

○ کتب خانے مستقبل کے معبد ہیں۔

○ علم و ادب کی سچی لگن دلوں کو ملاتی ہے انہیں جدا نہیں کرسکتی۔

○ ادھورا علم اس کند تلوار کی مانند ہے جو سینے میں گھونپ کر چھوڑ دی جاتی ہے۔

○ بے کار ہے وہ علم جس پر عمل نہ ہو۔

○ دین خزانہ ہے اور علم اس کا راستہ۔

○ علم پیغمبروں کی میراث ہے اور مال فرعون، قارون اور کفار کی۔

○ علم دریا کی مثال ہے اس میں جتنا خرچ کرو گے یہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔

ریاض بٹ......حسن ابدال

دستی دوستی

❁ سچی محبت ایک نایاب شے ہے لیکن سچی دوستی اس سے بھی نایاب ہے۔

❁ کمزور ہے وہ شخص جس کا کوئی دوست نہ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمزور ہے وہ شخص جو اپنا بنا ہوا دوست کھو دے۔

❁ دوستی کرنے میں جلدی نہ کرو لیکن جب ایک مرتبہ کرلو تو اسے نبھاؤ۔

❁ دوستی کا نازک سا رشتہ کچے دھاگے کی طرح ہے دھاگہ ٹوٹ کر جڑ جاتا ہے مگر اس میں گرہ پڑ جاتی ہے۔

❁ جو اپنے دوست کو برے کاموں سے نہیں روک سکتا وہ دوستی کے قابل ہی نہیں۔

❁ جو ذرا سی بات پر دوست نہ رہے وہ دوست تھا ہی نہیں۔

❁ اپنے دوست سے غصے میں بات مت کرو، اپنے دوست کی غصے میں کہی ہوئی بات دل پر مت لو۔

محمد احمد رضا انصاری......کوٹ ادو

عدل و انصاف کی اہمیت

جس قوم سے عدل مٹ جاتا ہے اس قوم کو سونے چاندی کی بارش بھی سرسبز نہیں کرسکتی اور جس قوم میں

انصاف زندہ ہوجاتا ہے وہ جھونپڑوں میں رہ کر بھی سنگ مرمر کے مزے لوٹتے ہیں، تندوتیز طوفانی ہواؤں میں رہ کر صبا اور نسیم کا لطف اٹھاتے ہیں، عدل جس معاشرے سے نکلتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک دن کا عدل ساٹھ سال کی بندگی سے بہتر ہے، ایک دفعہ آپ ﷺ نے شیطان سے پوچھا تیرے دوستوں اور دشمنوں کی فہرست میں سب سے پہلے نمبر پر کون ہے وہ بولا۔ وہ حاکم جو انصاف کے ساتھ حکومت کررہا ہے میرا سب سے بڑا دشمن اور ظالم حکمران میرا دوست ہے۔ ظلم پر معاشرے مٹ جاتے لیکن عدل کافر کو بھی نفع دے جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا یارب کریم، تونے فرعون کو اتنی مہلت کیوں دی؟ وہ تو کہتا تھا میں خدا ہوں میرے رب نے فرمایا۔ وہ عادل تھا اپنی رعایا میں عدل کرتا تھا اس وجہ سے مجھ سے مہلت لیتا رہا، اگر مسلمان عدل کرے تو عرش کا سایہ ملے گا، روز محشر جب کوئی اور سایہ نہیں ہوگا، سورج ایک میل کے فاصلہ پر ہوگا سات قسم کے لوگوں کو عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی سب سے پہلے عدل والے کو پکارا جائے گا ولی، غوث، قطب، ابدال، شہید آئیں گے یہ لوگ بھی مگر عادل کے بعد تو اے قلم والو اپنے قلم کو اتنا سستا نہ بناؤ کہ چند پلاٹوں اور چند سکوں پہ بک جائے اگر یہ صحیح چلا تو عرش کا سایہ غلط چلا تو جہنم کی آگ۔

عائشہ اعوان...... رحیم یار خان

یاد رکھو

اگر موت کے بعد اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو موت سے پہلے اپنے رب کی مرضی کی زندگی گزار لو۔

بدگمانی و بد زبانی

اچھا سوچیے اور اچھا بولیے، کیونکہ بدگمانی اور بدزبانی دو ایسے عیب ہیں جو انسان کے ہر کمال کو زوال میں بدل دیتے ہیں۔

سوچنا اور غور و فکر کرنا

سوچنا اور غور وفکر کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ یہ زحمت گوارا کرتے ہیں۔

پھسلنا

لوگ پہاڑوں پر سے نہیں بلکہ اکثر کنکروں سے پھسلتے ہیں۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

آنکھیں

آنکھیں ہونٹوں سے زیادہ بولتی ہیں ان دریچوں سے شخصیت کا سارا حسن جھلکتا ہے سارے جذبے ان سے عیاں ہوتے ہیں ساری کیفیتیں ان سے جھلکتی ہیں یہ دل کے راز تک کہہ دیتی ہیں سو یہ جب سجتی سنورتی ہیں تو پوری شخصیت دل کش ہوجاتی ہے اور نینوں کی سجاوٹ کا جو سامان کاجل کرتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔ کاجل آنکھوں کے حسن کو دوبالا ہی نہیں کرتا انہیں نمایاں بھی کرتا ہے کاجل لگی آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے آنکھوں کی منڈیروں پر رات سوگئی ہے۔ جیسے روشنی کے سارے سائے میں اندھیرا بسیرا کیے ہوئے ہے جیسے پلکوں کی چھاؤں گہری ہوگئی ہے اور جب نیند اور آنسو کاجل کو پھیلا دیں تو حسن کچھ اور نکھر جاتا ہے روپ کچھ اور ہی سنور جاتا ہے۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

امام غزالیؒ فرماتے ہیں

نفس وہ بھوکا کتا ہے جو انسان سے غلط کام کرانے کے لیے اس وقت تک بھونکتا رہتا ہے جب تک انسان وہ غلط کام کرنہ لے اور جب انسان وہ کام کرلے تو یہ کتا سو جاتا ہے مگر سونے سے پہلے انسان کے ضمیر کو جگا جاتا ہے۔

ایم فاطمہ سیال...... محمود پور

سسرال نامہ

ساس: جسے دیکھ کر سانس آنی شروع ہوجائے۔
سسر: جورو کا غلام۔
جیٹھ: چھوٹے اپنی بیوی کو بہنوں کے چنگل سے بچانا مشکل ہے اور تو......
شوہر: ہر کسی کے لیے شوہر بیوی کے لیے بس "شو" ہی رہ جاتا ہے۔
دیور: ماں بہنیں اپنی شادی سے پہلے مظلوم لگتی ہیں۔
نندیں: اصل میں نہیں یعنی تو ڈسٹرب کی علامت ہیں۔

کرن شہزادی...... مانسہرہ

میری زندگی کا سچ

◆ زندگی کے ہر موڑ پر ہم سے وہی لوگ بچھڑ جاتے ہیں جنہیں ہم اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔

◆ جان سے زیادہ پیارے لوگوں کے بچھڑ جانے سے زندگی رک نہیں جاتی اور نہ ہی سانسیں تھمتی ہیں بلکہ انسان کا دل اور اس کی روح مر جاتی ہے۔

◆ زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ زندہ نہیں ہوتے۔

◆ وہ ہماری طرح روزمرہ کے کام کاج کرتے ہیں مگر ان کی آنکھیں ویران ہوتی ہیں۔

◆ ان کے لب مسکرانا تک بھول جاتے ہیں' محفلوں سے وہ دور بھاگتے ہیں۔

◆ تنہائیوں کو وہ اپنی بانہوں میں لیے پھرتے ہیں۔

◆ اب کوئی بھی رشتہ دل کو بھاتا نہیں ایمان

◆ کچھ اس طرح ٹوٹا ہے دل اپنوں کی بے رخی سے

◆ ایسے لوگ بنیادی طور پر بہت حساس ہوتے ہیں جو دوسروں کی ذرا سی چوٹ لگنے پر ہی تڑپ جاتے ہیں۔

◆ ٹوٹے ہوئے لوگ ہی دوسروں کا دکھ درد سمجھ سکتے ہیں' خوشحال لوگوں کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

پاکیزہ ایمان...... کہروڑ پکا

اقوال زریں

❁ اچھے کے ساتھ اچھے رہو' مگر برے کے ساتھ برا مت بنو کیونکہ تم پانی سے خون دھو سکتے ہو' مگر خون سے خون نہیں دھو سکتے۔

❁ انسان کو اچھی سوچ پر وہ انعام ملتا ہے جو اسے اچھے اعمال پر بھی نہیں ملتا۔

❁ خوب صورتی کی کمی اخلاق پورا کر سکتا ہے مگر اخلاق کی کمی کو خوب صورتی پورا نہیں کر سکتی۔

❁ زبان کا وزن بہت ہی ہلکا ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ اسے سنبھال پاتے ہیں۔

عروسہ شہوار رفیع...... کالا گوجراں' جہلم

دل کی باتیں

◄ لفظ کبھی واپس نہیں پلٹتے اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کھو دیتے ہیں جو ہمیں پھر کبھی نہیں ملتا۔ اس لیے رویوں میں حد درجہ احتیاط زندگی کے ہر بندھن میں کامیابی کی ضمانت ہے۔

◄ امید کے پودے کو پانی دیتے رہنا چاہیے اور اسے اتنا تناور کر دینا چاہیے کہ مایوسی کا جنگل دور دور تک اگنے نہ پائے۔

◄ جن کے دل کے آئینے اجلے ہوں ان کے مقدر کبھی دھندلے نہیں ہوتے جو ہم کھو دیتے ہیں قدرت پہلے سے ہمارے لیے بہترین چن کر رکھتی ہے۔

وجیہہ خان...... بہاولپور

ان باتوں کو اپنایئے اور خوش ہوجایئے

☆ اپنی زندگی میں ہر کسی کو اہمیت دو جو اچھا ہوگا وہ خوشی دے گا اور جو برا ہوگا وہ سبق سکھائے گا۔

☆ ہمیشہ خوش رہیں اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کریں۔

☆ غلطی معاف کر دیں بدلہ نہ لیں کیونکہ بدلہ لینے والا اور بددعا دینے والا کمزور ہوتا ہے۔

☆ صرف اللہ سے مانگیں دوسروں سے کوئی امید نہ رکھیں' دینے والا اللہ ہی ہے۔

☆ ہمیشہ کم کی خواہش کرو' زیادہ کی خواہش ہوس پیدا کرتی ہے۔

سمیہ کنول...... مانسہرہ

جواہرات سے قیمتی

❖ دنیا کی تھکن اتارنے کا سب سے بہترین ذریعہ ذکر ہے۔

❖ سکون سے رہنا چاہتے ہو تو لوگوں سے وعدے کم کرو۔

❖ خود پسندی سب سے بڑی تنہائی ہے۔

❖ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔

❖ وقت ہر ایک کو آواز دیتا ہے جو شخص یہ آواز نہیں سنتا وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔

❖ زبان کو شکوے سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

بتول مسرت...... گاؤں عالی

نوشین اقبال نوشی

(اس ماہ کا انعام یافتہ کلام)

عشق جب عینِ ذات ہو جائے
خالق معجزات ہو جائے
عمر بھر چپ رہو تو ممکن ہے
کن کہو کائنات ہو جائے
سجدۂ عشق میں "فرشتہ" بھی
عقل برتے تو مات ہو جائے
عقل کا زن مرید عشق بنے
کس قدر واہیات ہو جائے
دل کی پاتال سے اگر پھوٹے
اشک آب حیات ہو جائے
عشق جو شرط کے بغیر کرے
ساتی شش جہات ہو جائے
حادثوں پر ہوں راضی رب کریم
وسوسوں سے نجات ہو جائے
جھیل آنکھوں میں ڈوبنے نکلوں
نیم رستے میں رات ہو جائے
حسن کو مامتا نہ نرم کرے
لات، عزیٰ، منات ہو جائے
ریت پر گر نہ لکھے مجنوں نام
قلت کاغذات ہو جائے
قیس پر ہنسنے والوں رب نہ کرے
آپ کے ساتھ ہاتھ ہو جائے

شاعر: شہزاد قیس

انتخاب: عروہ سکندر حیات...... اسلام آباد

غزل

یہی معمہ مرے پیش و پس پڑا ہوا ہے
مرا بدن ہے کہ مٹی میں خس پڑا ہوا ہے
میں ایک نقش بناتا ہوں اک نگلتا ہوں
مرا ہنر پسِ حرص و ہوس پڑا ہوا ہے
کوئی بھی پیڑ جو دیکھوں تو ایسا لگتا ہے
پرندگی کے لئے اک قفس پڑا ہوا ہے
خدائے ارض اسے اب تو شکل دے کوئی
مرا وجود تہہِ خاک و خس پڑا ہوا ہے
جو ہو سکے تو انہیں بھی اٹھا کے لے جانا
ہماری میز پہ ایک اک برس پڑا ہوا ہے
ہوا کی سازشیں اپنی جگہ مگر فاخر
شجر کی شاخوں میں اب کے بھی رس پڑا ہوا ہے

شاعر: سید فاخر رضوی...... جرمنی

غزل

آئینے کو جو جانتا ہو گا
وہ کہیں اور جھانکتا ہو گا
خواب پچھلے پہر کا مت پوچھو
وہ کہیں دن میں ہانپتا ہو گا
پھر محبت کی داستاں چھیڑو
ہو گا جنگل میں راستہ ہو گا
ہم فقط دیکھتے ہیں چہرے کو
آئینہ قد بھی ناپتا ہو گا
دیکھ کر چاکلیٹ کی قیمت
تو بھی بچوں کو ڈانٹتا ہو گا
کتنے کم ہیں غریب کے کپڑے
سرد موسم بھی کانپتا ہو گا
تیز برسات میں کہیں صاحب
وہ کھلے زخم ڈھانپتا ہو گا

فیصل صاحب...... بہاولپور

سرکار مدینہ ﷺ سے پیار

غزل

آج موسم بھی رنگین ہے تیرے پیار میں
اور بہاریں جھوم رہی ہیں تیرے پیار میں
مثل مجنوں میں تیرے گلیوں میں پھروں
یہ حالت ہو ہمیشہ میری تیرے پیار میں
رعنائیاں، شناسائیاں اور شہنائیاں
یہ سب کچھ ہے تیرے پیار میں
میرے پاس تیرا پیار نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہے
میرا کل اثاثہ چھپا ہے تیرے پیار میں

تجھ سے بچھڑنا، تجھے بھولنا مجھے گوارا نہیں
اک عجب سا سرور ہے تیرے پیار میں
مجھے اس مال و دولت سے کیا رغبت
میں نے دنیا ٹھکرا دی تیرے پیار میں

محمد یاسر اعوان...... رحیم یار خان

غزل

ہجر کا موسم اور ہوئی رم جھم برسات
تنہائی کے عالم میں جاگے ساری رات
کون سنے تیرے درد کے قصے
کون سنے تیرے من کی بات
سب اپنی اپنی الجھن میں الجھے
نظر نہ آئے کسی کو تیری ذات
ہاں بڑھ چڑھ کر سب بولے جائیں
پر کوئی نہ کھائے کسی سے مات
نفسا نفسی کے عالم میں درد ہی بڑھتے جائیں
اس عالم میں لائیں کہاں سے خوشیوں کی سوغات
اتنے نہ رنجور ہو رومی وقت بدلتا جائے
خوشیوں کی تو سحر بھی ہوگی کٹ جائے گی رات

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

امر کردوان لمحوں کو

برسوں بعد تمہاری الفت میں جاناں
زیست نے آہ آتش کا مزہ یہ دیا
رخسار ہیں آنسو کا مسکن وہ دیا
فرط یاس میں جو ہیں بہتے
مورد الزام مجھے جو ہیں ٹھہراتے
ملن تیرے کور ہیں وہ بے قرار
مہر و وفا کا کریں یہ اقرار
کیسے سمجھوں ان نمکین کیروں کو
صرف وفا کی ان سلگتی زنجیروں کو
ہوائے سیر گل بھی ہم کو
خندہ گل نے بھی ستائم کو
تشنہ کافی بن جاؤ میرے
ارقام میں بس جاؤ میرے
امر کردوان لمحوں کو
ہاں جاناں بس

امر کردوان لمحوں کو

عنبرین اختر...... لاہور

غزل

وہ جو ایک ورق سادہ تھا
چھا گیا مجھ پر کتاب کی طرح
یوں تو لفظ لفظ آئینہ تھا
بچھڑا مجھ سے سراب کی طرح
جھرمٹ میں ستاروں کے رہتا تھا
تنہا تھا لیکن پورے ماہتاب کی طرح
آنکھوں میں اس کی چاہت کا دریا تھا
رہتا تھا مگر پیاسا کسی سحاب کی طرح

ریحانہ سعیدہ...... گڑھی شاہو لاہور

غزل

زندگی کے ہر موڑ پر کچھ آزمایا گیا مجھے
زندگی دے کر پھر زندگی کو ترسایا گیا مجھے
پہلے عنایت کیا محبتوں کا سایہ مجھ کو
پھر خوشی کے اک اک لمحے کو ترسایا گیا مجھے
لوگوں کے لیے رکھتے تھے وہ پیار کا سمندر
مگر اک اک بوند کو ترسایا گیا مجھے
کیسے نہ کرتی اس محبت سے میں نفرت اے برکی
چراغ کی طرح دہلیز پر جلایا گیا مجھے

عائشہ اے بی...... جھڈو سندھ

نظم

جب میرا بستہ مجھ سے بڑا تھا
اور تختی لکھتا پڑتی تھی
اک قطار میں کھڑے ہو کر
سبق دہرایا کرتے تھے
تب سبق وہ بچپن کا
کتنا مشکل لگتا تھا
مگر اب سبق وہ بچپن کا
کتنا آساں لگتا ہے
جب بن دیوار کے مکتب میں
پیپل اور شیشم کے پیڑ تلے
پھٹے پرانے ٹاٹ کے اوپر
ہاتھ میں پکڑے قاعدے پر

جو کچھ لکھا ہوتا تھا
تب سبق وہ بچپن کا
کتنا مشکل لگتا تھا
مگر اب سبق وہ بچپن کا
کتنا آساں لگتا ہے
جب لوگوں کے دہرے چہرے نہ تھے
جب اپنے گونگے بہرے نہ تھے
بچے ہونے کے ناطے
سب دل سے ہنس کر ملتے تھے
کوئی سازش تھی نہ نفرت تھی
جب سپنے سچ کے ملتے تھے
اب سبق جو دیا ہے دنیا نے
یہ سبق تو مجھ سے بھاری ہے
وہ سبق جو بچپن سے ملتا تھا
تب کتنا مشکل لگتا تھا
مگر اب سبق وہ بچپن کا
کتنا آساں لگتا ہے

عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس

غزل

وہ بھی میں تھا اور تارے ہوا کرتے تھے
کبھی وقت ہم پہ بھی پیارے ہوا کرتے تھے
وہ دیتی تھی تسلی اور دلاسے میرے دل کو
مجھ کو بھی اسی کے سہارے ہوا کرتے تھے
وہ دن بھی کیا خوب تھے امیدیں تھیں جوان
اک ساتھ جینے مرنے کے اشارے ہوا کرتے تھے
جب تک دنیا نہ تھی میری محبت کی دشمن
تب محبت میں بہت کم خسارے ہوا کرتے تھے
اپنے ہی بنے ہیں میری تباہی کا سبب
وہی اپنے جو بہت مخلص ہمارے ہوا کرتے تھے
میرے محبوب جدا ہونے میں رسموں رواجوں کا ہاتھ ہے
ورنہ ہم بھی ہمیشہ تمہارے ہوا کرتے تھے
اے خدا تجھ کو بھی میری حالت پہ رحم نہ آیا
آخر کبھی ہم بھی تیرے راج دلارے ہوا کرتے تھے
خوشیوں سے بھرپور تھی یہ زندگی صائم
جب تیری قربت کے نظارے ہوا کرتے تھے

ظہور احمد صائم..... مانگا منڈی لاہور

غزل

ہر خوشی اپنی پنکچر ہوگئی
آتی جاتی سانس خنجر ہوگئی
کیا کریں ہیرو کے ایکشن دیکھ کر
باقی ساری فلم سنسر ہوگئی
مسکرا کے کیا اسے دیکھا کہ بس
چھوڑ کے سب کو مرے سر ہوگئی
لوڈشیڈنگ کا مزہ آنے لگا
مہرباں کلو کی دختر ہوگئی
نہ کیا جس نے کبھی واپس ادھار
بس وہی لڑکی مقدر ہوگئی
ایک میں اور بارہ بچے اور تو
کیا کروں کہ ساس بے گھر ہوگئی
اس نے مرا ہاتھ کیا پکڑا کہ بس
زندگی دشوار نیر ہوگئی

نیر رضوی..... لیاقت آباد، کراچی

غزل

ابھی تم بیٹھ جاؤ نا بہت سی باتیں باقی ہیں
میرے حالات باقی میرے جذبات باقی ہیں
تم کیوں ستاتے ہو مجھے کیوں رلاتے ہو
مجھے تم سے محبت ہے مجھے کیوں آزماتے ہو
تمہی کو یاد کرتے ہیں تمہی کو پیار کرتے ہیں
میری تو زندگی تم ہو سمجھ تم کیوں نہیں پاتے
میری تو ہر خوشی تم سے میری تو زندگی تم سے
میری ہر آرزو تم سے مجھے تم کیوں ستاتے ہو
سنو! اے بھولنے والے مجھے تم یاد آتے ہو

محمد کاشف..... رحیم یار خان

غزل

چاند تاروں سے حسیں ذات میرے نام کرو
اپنی زلفوں کی سیاہ رات میرے نام کرو
اپنی آنکھوں میں مچلتے ہوئے دریا سارے
اپنی آنکھوں کی یہ برسات میرے نام کرو
تتلیاں پھول محبت کے یہ گلابی لمحے
اپنی یادوں کی یہ بارات میرے نام کرو

میری غزلیں میری نظمیں تو تیرے نام ہوئیں
اپنے ہونٹوں کے یہ نغمات میرے نام کرو
اپنے جیون کے سبھی درد مجھے دے دو فری
اپنے جذبات کی ہر بات میرے نام کرو

شاعرہ: فریدہ جاوید فری

انتخاب: پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

موت

موت آئے گی جس روز مرجائیں گے
زندگی لیکن اس طور کر جائیں گے
جب بھی جانا پڑا سوئے ملک عدم
اس طرح جائیں گے جیسے گھر جائیں گے

انتخاب: جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

غزل

یہ سوچ کر رنج و غم سہہ لیتے ہیں
کہ ہم تیرے دل میں رہتے ہیں
اندھیروں میں ڈوبی ستم نگری میں
ہم اشکوں کو جلائے پھرتے ہیں
شیشے کے محل میں جیسے منجمد ہیں
وفا میں تو دریا کی طرح بہتے ہیں
کہاؤں سا ہے تیری چاہتوں کا سفر
پیروں میں پھر بھی چھالے لیے پھرتے ہیں
تیری ذات خود پر اوڑھنے کے بعد
اپنی ذات کے نشاں مٹائے پھرتے ہیں
ہمارا حال نہ پوچھو بس اپنی کہو
مٹھی میں ہم انگارے دبائے بیٹھے ہیں
محبت طلب چاہتوں کے امیں سحر
زخمی دلوں کے مکیں بنے پھرتے ہیں

شاعرہ: وجیہہ سحر...... جوہر آباد

بارشیں لوٹ آئی ہیں

سنو......
بیتے لمحوں کی
یادیں لے کہ
تیری میری
باتیں لے کہ
اور......
آنسوؤں سے تر
آخری ملاقاتیں لے کہ
بارشیں لوٹ آئی ہیں

کنول خان...... ہری پور ہزارہ

غزل

دل وحشی کو حیرانی بہت تھی
ہمیں کل تک پریشانی بہت تھی
تمہیں خود ہی گنوا ڈالا ہے ورنہ
تمہیں پانے میں آسانی بہت تھی
ہمارے عشق کے دریا کے اندر
ترے اشکوں کی طغیانی بہت تھی
تمہیں دل میں کہیں رکھا گیا تھا
تری ہر بات بھی مانی بہت تھی
ادھر خوابوں پر جب پہرے لگے تھے
تو ان آنکھوں پر نگرانی بہت تھی
محبت آبلہ پائی تھی لیکن
محبت کی یہ قربانی بہت تھی
تمہارا پیار بھی سچا تھا راشد
مری چاہت میں ارزانی بہت تھی

راشد ترین...... مظفر گڑھ

ریاض حسین شاہد

الیکٹرونک میڈیا کے ناجائز استعمال سے جنم لینے والے واقعات کا شاخسانہ۔

اس ماں کی کہانی جس نے اپنی محبت کے کھو جانے کا انتقام اپنی بیٹی کی محبت چھین کر لیا۔

اس نوجوان کی داستان الم جس نے محبت کے حصول کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

معروف ادیب ریاض حسین شاہد کے قلم سے سسپنس سے بھرپور سلسلے وار کہانی۔

کیا اتصالِ محبت کے بعد بھی محبت برقرار رہ سکتی ہے؟

ایک نوجوان عبدالقادر کی محبت کا قصہ جو حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی ہے اور اس کے تمام کردار باحیات ہیں۔ عبدالقادر ماں باپ کا اکلوتا اور بے حد لاڈلہ بیٹا تھا۔ اس سے چھوٹی اس کی ایک بہن بھی تھی شہناز۔ دونوں بہن بھائی والدین کی آنکھوں کا نور تھے۔ عبدالقادر کا باپ نیاز احمد دریا پر کشتی میں مسافروں کو پار اتارتا تھا۔ اس کا یہ آبائی پیشہ تھا۔ جبکہ قادر کی والدہ بینگل فروش عورت تھی۔ چوڑیوں کا ٹوکرا اٹھائے بستی بستی اور میلہ میلہ گھوم کر خوب دولت کمائی گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ دونوں بہن بھائی نوابوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور نہ ہی ان کی بستی میں اسکول اور مدرسے کی کوئی سہولت موجود تھی۔ قادر دس سال کی عمر میں پہنچا تو اپنی ماں کے ساتھ ساہیوال کے علاقے میں اپنی خالہ سے ملنے آیا۔ دو تین دن ادھر قیام کیا۔ فائزہ اس کی خالہ زاد کزن تھی۔ جو بہت سمارٹ اور ہینڈسم تھی۔ وہ قادر سے گھل مل سی گئی۔ پھر ہر دوسرے تیسرے ماہ قادر اکیلا ہی خالہ کی بستی 80 کلومیٹر کا سفر طے کر کے پہنچ جاتا اور کئی کئی دن اپنی خالہ کے گھر قیام کرتا۔

فائزہ اور قادر کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ دونوں جوانی کی حدوں کو جا پہنچے۔ تب دونوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور پل کی جدائی ان پر بہت گراں گزرنے لگی۔ عبدالقادر نے اپنے امی ابو سے کہہ دیا کہ میں نے فائزہ کے سوا کسی سے شادی نہیں کرنی۔ اس کی ماما نے اپنی بہن سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو بہن نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنے چچا کے بیٹے سے فائزہ کا رشتہ طے کر چکی ہوں۔ اب یہ بہت مشکل کام ہے۔ بہن نے بہت مجبور کیا کہ میرا بیٹا بہت حساس ہے۔ میں نے زندگی میں اس کی ہر خواہش پوری کی ہے۔ وہ فائزہ سے عشق کرتا ہے۔ وہ ہر حال میں اسے پانا چاہتا ہے۔ تمہاری بیٹی بھی اس کے سوا کسی کو قبول نہیں کرے گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اس معصوم سے جوڑے کو ایک دوسرے سے الگ نہ کیا جائے۔ مگر بہن نے یہ کہہ کر اسے لاجواب کر دیا کہ ہم بات پکی کر چکے ہیں۔ یہ فیصلہ میرے شوہر نے کیا ہے۔ لہٰذا اب اسے کسی صورت بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اپنے بیٹے کو سمجھا دیں کہ وہ فائزہ کا خیال دل سے نکال دے اور آج کے بعد وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے۔ اپنی بیٹی کو بھی میں سمجھا لوں گی۔ بہن نے اس کی بہت منت سماجت کی۔ مگر اسے مایوسی کی حالت میں لوٹ جانا پڑا۔

اس نے بیٹے کو بتایا کہ تمہاری خالہ نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ فائزہ کا رشتہ اس کے چچا کے بیٹے سے طے کر دیا گیا ہے۔ بیٹا اب تم نے وہاں ہرگز نہیں جانا اور نہ ہی فائزہ سے ملنے کی کوشش کرنی ہے۔ تمہاری خالہ نے صاف کہہ دیا ہے کہ اب قادر کو کبھی ہمارے گھر نہ آنے دینا۔

عبدالقادر یہ سن کر کچھ دیر کیلئے سناٹے میں آ گیا۔ آج تک اس کی معمولی سے معمولی اور بڑی سے بڑی خواہش کو کبھی رد نہیں کیا گیا تھا اور آج اس کی ماں اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل پر معذرت کر رہی تھی۔ قادر کیلئے یہ ناممکن بات تھی۔ وہ اگلے ہی دن ماما سے چوری چوری فائزہ کی بستی پہنچا اور اپنے ایک دوسرے رشتے دار کے گھر جا کر ان کی لڑکی کو فائزہ کے پاس بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ فائزہ پیغام ملتے ہی اس سے ملنے چلی آئی اور روتے ہوئے اسے بتایا۔

"میری ماما نے مجھے سختی سے منع کر دیا ہے کہ اب میں تم سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ عنقریب میری شادی میرے چچا کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟ عبدالقادر میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی"۔

"تم فکر نہ کرو فائزہ۔ ہم عدالت میں جا کر نکاح کر لیں گے۔ پھر یہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ بس میں یہاں آ جایا کروں گا اور تم میرا پیغام ملتے ہی مجھے ملنے آ جایا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

فائزہ نے اس کی بات مان لی اور وعدہ کیا کہ جہاں تم کہو گے میں کانٹوں پر چل کر بھی وہاں آ جایا کروں گی بس تم مجھے چھوڑ کے نہ جانا۔ پھر عبدالقادر اور فائزہ کی چوری چھپے کی ملاقاتیں ایک ہفتے میں دو بار ہونے لگی۔

ایک دن فائزہ جب گھر سے نکل رہی تھی۔ اس کی ماما نے اسے روک لیا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ آخر تم دوسرے چوتھے روز کہاں جاتی ہو اور اتنی دیر لگا دیتی ہو۔ فائزہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اسے روک لیا گیا۔ عبدالقادر کو مایوس واپس لوٹنا پڑا۔ پھر تیسرے روز وہ ادھر پہنچا تو اس کے

میزبان نے اس سے معذرت کر لی کہ فائزہ سے ملنے ہمارے گھر نہ آیا کرو۔ ہم بدنام ہو رہے ہیں۔ عبدالقادر بہت پریشان ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے ایک دوست سے مدد مانگی۔ اس کے دوست نے اپنی ایک شناسا عورت کو قادر کا پیغام دے کر فائزہ کے پاس بھیجا۔ فائزہ نے واپسی پیغام میں عبدالقادر کو رات گئے بستی کے باہر پرانے پیپل والے کھوہ (کنواں) کے پاس آنے کو کہا کہ اب میں دن کے اجالے میں کسی طرح بھی تم سے نہیں مل سکتی۔ رات کو جب سب گھر والے سو جائیں گے تو میں آپ سے ملنے وہاں پہنچ جاؤں گی۔

عبدالقادر ہر سو گہری تاریکی چھا جانے پر مطلوبہ جگہ پر پہنچا اور بے چینی سے فائزہ کا انتظار کرنے لگا اور کئی راتوں کا چاند ڈوب گیا تھا۔ ہر سو گہری تاریکی اور مکمل سناٹا تھا۔ جھینگروں کا شور سناٹے کے اس ارتعاش کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات کو بستی کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تو قادر چونک کر ادھر متوجہ ہوا۔ پھر وہ کماد کی فصل کے کنارے کنارے بستی کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک فائزہ تنگ سی پگڈنڈی پر اس سے آ ٹکرائی۔ دونوں ہی اچانک ایک دوسرے سے ٹکرائے تو فائزہ کی چیخ سی نکل گئی اور عبدالقادر بھی دہل سا گیا۔ پھر دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ فائزہ ایک ہی ضد کر رہی تھی کہ اب میں نے واپس نہیں جانا۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ مگر عبدالقادر اسے رات کے اندھیرے میں نہیں دن کے اجالے میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے طے پایا کہ اب میں ہر چوتھی رات یہاں آپ کا انتظار کیا کروں گی۔ چند دن بعد ہم نکاح کر لیں گے۔ پھر کچھ عرصہ گزار کر ہم نکاح نامہ ماں باپ کے سامنے پیش کر دیں گے۔ تب میرے ساتھ تمہاری رخصتی کرنا ان کی مجبوری بن جائے گی۔ پھر میں تمہیں پوری سج دھج سے دلہن بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ فائزہ دولہن بننے کا خواب آنکھوں میں سجائے واپس لوٹ گئی۔ عبدالقادر نے رات مسجد میں گزاری اور صبح منہ اندھیرے اپنے شہر روانہ ہو گیا۔

اب ہر چوتھی رات وہ شام کو وہاں جاتا اور فائزہ ہر خطرہ مول لئے اس سے ملنے چلی آتی۔ ایک بار جب فائزہ قادر سے مل کر واپس گھر لوٹ رہی تھی۔ قادر بھی اسے گلی تک چھوڑنے اس کے ساتھ آیا تھا کہ چوکیدار نے ان پر ٹارچ کی روشنی پھینکی اور چور چور کا شور مچا۔ انہیں گھیرے میں لے کر پکڑ لیا۔ فائزہ نے ان کی بہت منتیں کیں کہ خدا کے لئے مجھے گھر جانے دو۔ میری بستی میں رسوائی ہو گی۔ میرے گھر والے مجھے جان سے مار دیں گے۔ مگر تب تک بستی کے لوگ بھی شور سن کر وہاں پہنچ گئے۔ فائزہ کا بھائی اپنی بہن کو مار پیٹ کر گھر لے آیا۔ عبدالقادر کو بھی اس نے نہایت گندی گالیاں دیں اور دھمکی دی کہ میں اپنی بہن کی رسوائی کا بدلہ تمہاری بہن کو بے عزت کر کے لوں گا۔

حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بستی والوں نے عبدالقادر کو چھوڑ دیا کہ تم گھر چلے جاؤ۔ یہاں تمہاری جان کو خطرہ ہے اور آئندہ بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ پھر ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ یوں کوچۂ صنم سے بے آبرو ہو کر عبدالقادر زخم خوردہ سا واپس گھر لوٹ گیا۔ مگر اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین لٹ گیا۔ شہر میں وہ اپنی چکن شاپ کرتا تھا۔ وہ دن رات سوچتا رہتا کہ اب کیا کروں؟ بالآخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے فائزہ کی بستی جانے کا ارادہ کر لیا۔

ادھر اس رات فائزہ کو گھر لے جا کر اس کے بھائی اور باپ نے شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور اگلے ہی دن اس کی شادی کی تاریخ طے کرنے کی بات چل نکلی۔ مگر فائزہ اور عبدالقادر کے عشق کا قصہ تو پوری بستی میں پھیل چکا تھا۔ فائزہ کے منگیتر نے یہ بات سنی تو اپنے والدین سے صاف کہہ دیا کہ میں نے فائزہ سے شادی نہیں کرنی۔ وہ میرے قابل نہیں رہی۔ اس کے باپ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

ادھر فائزہ نے گھر سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگی۔ پھر اس نے عبدالقادر کی پھوپھی کے بیٹے سے جو عبدالقادر کا دوست بھی تھا کی منت سماجت کر کے اسے اپنا پیغام رساں بنا کر عبدالقادر کے شہر روانہ کیا کہ "پرسوں رات میں گھر سے فرار ہو کر بستی سے باہر پل پر آ جاؤں گی۔ وہاں سے ہم دونوں ایک ساتھ ساہیوال کیلئے روانہ ہو جائیں گے۔ خدا کیلئے ہر حال میں آ جانا۔ اگر تم نہ آئے تو میں پل سے نہر میں کود کر اپنی زندگی ختم کر لوں گی۔ مگر واپس لوٹ کر نہیں جاؤں گی"۔

عبدالقادر یہ پیغام سنتے ہی دیوانہ وار جانے کیلئے تیار ہو گیا اور وعدے کی رات سرشام ہی پل پر جا پہنچا۔ یہاں سے ساہیوال کا سفر پانچ کلومیٹر تھا اور شہر تک جانے کیلئے بستی سے تانگے چلا کرتے تھے۔ رات کو کسی سواری کے ملنے کا کوئی چانس نہ تھا۔ لہذا ان کو یہ سفر رات کی تاریکی میں پیدل چل کر ہی طے کرنا تھا۔ جس کیلئے وہ تیار تھا اور فائزہ نے بھی پیغام میں کہا تھا کہ ہم ساہیوال کیلئے رات کو ہی سفر کریں گے۔

انتظار کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ طرح طرح کے خدشے اور وسوسے دماغ میں الجھن ڈال رہے تھے۔ اگر فائزہ کو کسی مجبوری کے باعث گھر سے نکلنے میں اگر کوئی دشواری پیش آ گئی تو کیا ہو گا؟ چوکیدار کی آواز جاگتے رہنا کی بازگشت اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر بستی کے کتوں کی بھونک نے عبدالقادر کے وجود میں سنسنی سی بھر دی اور وہ بے قرار ہو کر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بستی کی طرف دیکھنے لگا۔ کتے بھونکتے ہوئے جیسے کسی کے تعاقب میں ادھر ہی آ رہے تھے۔ عبدالقادر پل سے آگے بستی کی طرف لپک پڑا۔ پھر اسے ایک گہرا سا سایہ قریب آتا دکھائی دیا۔ وہ فائزہ ہی تو تھی۔ جس کے پاس چھوٹا سا بیگ تھا اور وہ بڑی سی چادر اوڑھے ہانپتی اور کانپتی ہوئی پہنچی تھی۔

”جلدی کرو قادر۔ دیر نہ کرو۔ کتے بھونک رہے ہیں۔ ہمارا پیچھا کیا جا سکتا ہے۔“

فائزہ نے آتے ہی عبدالقادر کو بانہوں میں لے لیا اور فوری چلنے کو کہا۔ عبدالقادر نے اس سے بیگ تھام لیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جانب منزل روانہ ہوئے۔ چپ چاپ تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے اکتوبر کی ہلکی ہلکی ٹھنڈک بھری رات میں سفر کرتے رہے۔ سامنے سے ایک ٹریکٹر آ رہا تھا۔ اس کی تیز شعاعوں سے بچنے کیلئے انہیں ایک درخت کے تنے کی اوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ پھر گھوڑے کی ٹاپوں نے انہیں سڑک چھوڑ کر درختوں کی آڑ لینے پر مجبور کیا۔ دو گھوڑ سوار انہیں کراس کر کے آگے نکل گئے۔ پانچ کلومیٹر کا سفر انہوں نے کوئی دو گھنٹوں میں طے کیا۔

ساہیوال کے مضافاتی علاقوں میں پہنچے تو شب کے تین بج رہے تھے۔ فائزہ کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ بہت نازک سی لڑکی تھی۔ کبھی دن کو بھی اتنا سفر پیدل طے نا کیا تھا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ مگر ڈر اور خوف کے باعث وہ چلنے پر مجبور تھی۔ اب انہوں نے سوچا کہ کہیں ہم یہاں آوارہ گردی میں نا پکڑ لئے جائیں۔ رات کے اس پہر میں ان کی حالت ویسے ہی مشکوک نظر آ رہی تھی۔ لہذا انہیں وہاں سڑک کے کنارے واقع ایک لکڑیوں کا ٹال نظر آیا۔ جس کے پاس جھونپڑی موجود تھی۔ جو اس وقت خالی پڑی تھی۔ انہوں نے اسے ہی اپنا مسکن بنایا۔ نیچے گھاس بچھی تھی۔ وہ اسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ فائزہ عبدالقادر کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ عبدالقادر دیوار سے ٹیک لگائے اپنے چار سو گہری نگاہ رکھے جاگتا رہا۔ جبکہ فائزہ ذرا دیر بعد ہی اونگھنے لگی۔ پھر صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔ ہر سو اجالے نے بیدار ہو کر صبح ہونے کی نوید دی تو وہ سڑک پر آ گئے اور مسافر کی حیثیت سے شہر میں داخل ہونے لگے۔

ایک ہوٹل پر پہنچ کر انہوں نے ناشتے کا آرڈر دیا۔ عبدالقادر تو رات سے بھوکا تھا۔ فائزہ بھی رات بھر کے سفر سے بہت بھوک محسوس کر رہی تھی۔ دونوں نے سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ چائے پی اور تازہ دم ہو کر آگے بڑھے تو رکشا نظر آیا۔ انہوں نے رکشے والے سے کچہری جانے کو کہا اور اس میں سوار ہو گئے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ ہر طرف زندگی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد دکھائی دے رہی تھی۔ مگر ابھی کچہری کا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ انہوں نے پھر ایک ہوٹل میں وقت گزارنے کیلئے پناہ لی۔ ایک بار پھر چائے پی اور پھر کچہری میں داخل ہو گئے۔ ایک معروف ایڈووکیٹ کی خدمات حاصل کیں۔ ضروری ڈاکومنٹس پر کئے گئے۔ کچہری ہی کی مسجد کے امام صاحب جو نکاح رجسٹرار بھی تھے۔ وکیل منشی بھی بطور گواہ نکاح کے اندارج کئے گئے۔ پھر کورٹ میں پیش ہو کر دونوں کی رضامندی سے نکاح کرنے کے بیان درج کئے گئے اور یوں شام کو عبدالقادر فائزہ کو بیوی کی حیثیت سے لے کر گھر پہنچا۔

فائزہ کے والد کی ڈیتھ ہو چکی تھی۔ اس کے بھائی فورا عبدالقادر کے گھر پہنچے۔ تب انہیں نکاح نامہ دکھا کر بتا دیا

گیا کہ اب وہ میری بیوی ہے۔ اگر تمہاری بہن تمہارے ساتھ جانے کیلئے رضا مند ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر فائزہ نے بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ یوں وقتی طور پر تو وہ لوگ خاموشی سے واپس چلے گئے۔ پھر انہوں نے اپنی برادری کے قریبی بزرگ بطور پنچائیت عبدالقادر کے گھر لائے کہ فائزہ کو فرار کر کے لانے اور اس سے نکاح کرنے سے جو فائزہ کے گھر والوں کی زمانے بھر میں رسوائی ہوئی ہے۔ اس کے بدلے میں اب عبدالقادر کی بہن کا رشتہ فائزہ کے بھائی ظفر علی کو دیا جائے۔ یوں دونوں گھرانوں میں تعلقات بھی باقی رہ سکتے ہیں اور تمام تر قانونی کارروائیوں سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ تب عبدالقادر نے اپنے امی ابو کو مجبور کر دیا کہ میری بہن کا رشتہ ان کو دے دیں۔ یوں اس کی بات مان کر یہ رشتہ طے کر دیا گیا۔ جس کی دو سال بعد رخصتی کی گئی۔

اس عرصے میں عبدالقادر دو بچوں کا باپ بن گیا۔ مگر اس عرصے میں ان دونوں میاں بیوی کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا رہنے لگا۔ عبدالقادر بہت جفاکش اور خوددار انسان تھا۔ دن رات مشقت کر کے ساری کمائی بیوی کی ہتھیلی پر لا رکھتا کہ اس نے میرے ساتھ بہت وفاداری کی ہے۔ مگر فائزہ کا دماغ خراب رہنے لگا۔ گو وہ کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ مگر گھر میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ فائزہ دن بھر زرق برق لباس پہن کر میک اپ سجائے عبدالقادر کے پاس دکان پر چلی جاتی اور کھلے بندوں گھر کی ساری باتیں کرتی۔

عبدالقادر کو اس کی یہ حرکات پسند نہ تھیں۔ وہ اسے پیار سے منع کرتا رہا۔ مگر فائزہ کی عقل میں بات نہ آئی۔ سارا دن اڑوس پڑوس اور مارکیٹ میں گھومتے رہنا۔ بے مقصد خریداری کرنا، فضول خرچی کرنا اس کی عادت بن گئی۔ عبدالقادر کے والدین اور اس کی بہن فائزہ کی ان حرکات سے بہت بیزار تھیں۔ پھر وہ کھلم کھلا عبدالقادر کی نافرمانی کرنے لگی۔ وہ اسے جس بات سے روکتا۔ جہاں جانے سے منع کرتا۔ فائزہ ضد کر کے وہی کام کرتی اور ہر حال میں ادھر چلی جاتی۔ جہاں اسے جانے سے منع کیا جاتا تھا۔ تیسرا بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ پھر بھی حرکات جوں کی توں۔

پھر عبدالقادر نے اس پر ہاتھ اٹھانا شروع کر دیا۔ گھر میں مار پٹائی اور روز کا جھگڑا پورے محلے میں ان کی رسوائی ہونے لگی اور انہیں عزت کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا۔ تنگ آ کر عبدالقادر نے خود اپنے امی ابو کے ساتھ علیحدہ مکان لے کر رہنا شروع کر دیا۔ اپنی بیوی کو گھر کا خرچ دے دیتا۔ لیکن اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور چپکے سے اپنے والدین کو اپنی پھوپھی کے پاس بھیج دیا کہ میں ان کی بیٹی سائرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ فائزہ کو میں طلاق دینے لگا ہوں۔ ایک بھائی نے جب اپنی بہن سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو وہ سوچ میں پڑ گئی کہ عبدالقادر کے تین بچے ہیں۔ ہاں اگر وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو ہم آپ کو یہ رشتہ دے دیں گے۔ اسے بتایا گیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ پہلے عبدالقادر اپنی بیوی کو طلاق دے گا۔ بعد میں آپ کی بیٹی سے شادی کرے گا۔

پھر جب ماں نے اپنی بیٹی سائرہ سے بات کی تو اس نے پہلے خود ایک بار عبدالقادر سے ملنے کی خواہش کی۔ عبدالقادر کو پھوپھی نے پیغام بھیج کر اپنے گھر بلایا اور سائرہ سے بات کرنے کا موقع دیا۔ سائرہ نے بڑے عجیب سے انداز میں عبدالقادر سے کہا۔

''میں تم سے اس شرط پر شادی کروں گی کہ تم اپنی بیوی فائزہ کو ساری زندگی طلاق نہیں دو گے۔ میں اس کی اور اسکے بچوں کی خدمت کروں گی۔ اگر آپ نے اسے طلاق دے دی تو میں بھی آپ سے شادی نہیں کروں گی''۔

بھلا کوئی عورت یہ برداشت کر سکتی ہے کہ کوئی دوسری عورت میری سوتن بن کر میرے گھر میں رہے۔ یہ عجیب لڑکی ہے۔

''مگر سائرہ یہ تم کیوں شرط عائد کر رہی ہو؟ وہ تمہاری سوتن بنے گی۔ بہت مشکل ہوگا تمہیں اس کی قربت میں رہنا۔ آخر اس شرط میں تمہاری حکمت کیا چھپی ہے؟''

عبدالقادر نے حیرت سے پوچھا تو سائرہ نے بتایا۔

''میں تم سے بہت عرصے سے محبت کرتی ہوں۔ مگر تمہاری ساری توجہ فائزہ کی طرف تھی۔ اب چونکہ وہ تمہاری محبت رہی ہے اور تمہارے بچے اس کے پاس ہیں۔ میں اس لئے ان کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں کہ وہ تمہاری محبت ہے اور تم میری محبت ہو اور میں اپنی محبت سے کوئی چیز بھی چھیننا نہیں چاہتی۔ جو تمہاری محبت ہو۔''

سائرہ نے ایک ہی بات میں عبدالقادر کا دل موہ لیا اور اس نے اس کی یہ بات ماننے کا اس سے عہد کیا۔ جب اس کے گھر والوں نے یہ بات سنی کہ ہماری بیٹی نے عبدالقادر کو منع کر دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دے ورنہ تم سے شادی نہیں کروں گی۔ تو وہ بہت حیران ہوئے۔ مگر بیٹی کی خوشی کی خاطر انہوں نے باقاعدہ شادی کی رسم ادا کر کے اسے عبدالقادر کے ساتھ روانہ کر دیا۔

عبدالقادر فائزہ کو مکان کا ہر ماہ کرایہ اور گھر کا خرچ بدستور آج بھی اسے بھیج رہا ہے۔ اس کے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ فائزہ نے کئی بار طلاق کا مطالبہ کیا۔ مگر اس نے انکار کر دیا کہ تم عدالت سے رجوع کر کے مجھ سے خلع کا دعویٰ کر کے تو طلاق لے سکتی ہو۔ میں اپنی طرف سے تمہیں کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ فائزہ اپنے بچوں کے ساتھ آج بھی اسی شہر میں کرائے کے مکان میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

سائرہ نے عبدالقادر کو کبھی منع نہیں کیا کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں سے نفرت کرے۔ بلکہ عبدالقادر کے بچے ان کے گھر جب کبھی بھی آتے ہیں۔ وہ ان سے بے پناہ پیار کرتی ہے۔ انہیں کپڑے اور کھانے کی چیزیں دے کر رخصت کرتی ہیں۔ مگر فائزہ اپنے بچوں کو ادھر کم ہی جانے کا موقع دیتی ہے۔ دوسری بیوی سے بھی عبدالقادر کے چار بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ جو ابھی زیر تعلیم ہیں۔ سائرہ عبدالقادر کی ملک شاپ کے تمام کاموں میں اس کا بھرپور ساتھ دیتی ہے اور ابھی ان کے درمیان تلخ کلامی نہیں ہوئی۔ محبت کرنے والے جوڑوں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

بات چل رہی تھی کہ شادی کے بعد بھی کیا دونوں کی محبت برقرار رہتی ہے؟ عبدالقادر اور فائزہ کی محبت کتنے کڑے امتحانوں سے گزر کر اتصال و وصال تک پہنچی بچے بھی ہو گئے۔ مگر محبت شدید نفرت میں بدل گئی اور آج تک وہ پاس رہ کر بھی ایک دوسرے سے گریزاں ہیں۔ جبکہ سائرہ نے جانتے ہوئے بھی کہ عبدالقادر شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے۔ اس سے شادی کی اور اپنی محبت کو نبھاتے ہوئے قدم قدم پر اس کی غم گسار بھی ہے وفا شعار بھی۔ حالانکہ اس کی محبت یک طرفہ رہی تھی۔

یہ سائرہ کی محبت کا تقاضا تھا کہ ہر حال میں اپنے محبوب کو پالیا جائے اور زندگی محبت کے نام وقف کر دی جائے۔ جب کہ فائزہ نے اپنی محبت پا کر اس کا صلہ پانے اور اپنی قربانی دینے کا حق وصول کرنے کی کوشش میں بے راہ روی اختیار کی اور بالآخر اپنے انجام سے ہمکنار ہوئی۔ اس نے اپنی محبت کی قیمت وصول کرنے کی کوشش کی تھی جو اس کے لیے عبرت کا باعث بن گئی۔ جبکہ سائرہ کی محبت بے لوث تھی۔ جو تا حال اپنی چاہت کا خراج وصول کر رہی تھی۔

اب جہاں فریال اور مہک کی محبت سچے جذبوں کی بدولت کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ وہاں معیز اور نایاب کے درمیان تمام دوریاں ختم ہونے کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ مگر اس دورانیہ میں پنڈی کی مدیحہ جس کو خالد ملک ڈائیورس دے چکا تھا اور مدیحہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں جاب کرتے ہوئے اپنا وقت گزار رہی تھی۔ خالد ملک نے نئی شادی رچالی تھی اور نایاب کو معیز سے دور کرنے کی سازش کے تحت اس نے روا نامی لڑکی کے ساتھ معیز کی تصویریں بنا کر نایاب کو سینڈ کی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر نایاب کو ہارٹ اٹیک ہوا اور لندن سے بائی پاس کروانے پر مجبور ہوئی۔ مگر معیز نے نایاب کو خالد ملک کی ساری سازش کی تفصیلات بتا کر اسے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور نایاب پر خالد ملک کی حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ وہ کس قدر سفاک اور گھٹیا سوچ کا مالک ہے۔ اسے مدیحہ سے بے حد ہمدردی تھی کہ اس بیچاری کی زندگی کو ناحق برباد کیا گیا۔

انگلینڈ سے علاج کے بعد کوئی دو ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ مدیحہ نے معیز سے رابطہ کیا تھا۔ مگر جب معیز نے اسے بتایا کہ خالد نے نایاب اور میرے درمیان نفرت پیدا کرنے کے لئے کس قدر گھناؤنی سازش کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ مدیحہ کو بے حد دکھ پہنچا تھا۔ پھر اس نے نایاب کو کال کر کے خالد کو تکلیف وہ اذیت دینے پر معذرت کی تھی اور نایاب کی صحت اور سلامتی کی دعا کی تھی۔

پھر جن دنوں نایاب اور معیز کی شادی کا فیصلہ ہو گیا تو مدیحہ نے ایک روز پھر نایاب کو کال کر کے اس کی تیمارداری کی تو نایاب نے اسے بتایا کہ میں بہت بہتر حالت میں ہوں اور اب جلد ہی معیز مجھے اپنا بنا کر اپنے پاس بلانے والا

قرآنی آیات کی عام فہم تفاسیر جنھیں

مشتاق احمد قریشی

نے مستند تفاسیر اور حوالوں سے آراستہ کیا ھے

کتاب کا نام	
تفسیر سورۃ اخلاص	تفسیر آیات ربنا اتنا
تفسیر معاذ اللہ	تفسیر سورۃ النصر
تفسیر سورۃ العصر	تفسیر سورۃ الھب
تفسیر سورۃ الکفرون	تفسیر آیات اللہ ذوالجلال
تفسیر سورۃ الفاتحہ	تفسیر سورۃ الشمس
تفسیر سورۃ کلمہ طیبہ	تفسیر سورۃ القریش
تفسیر سورۃ معوذتین	لقد خلقنا الانسان
تفسیر سورۃ الکوثر	تفسیر سورۃ القدر
تفسیر آیات السلام علیکم	آسمانی صحیفے اور قرآن
تفسیر آیات یایھا الذین امنو	تفسیر سورۃ الماعون
امام اعظم حیات وفقہی کارنامے	

ملنے کا پتا تنے انق گروپ آف پبلی کیشنز۔ 7 فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ کراچی

اسلامی کتب خانہ۔ فضل الٰہی مارکیٹ چوک اردو بازار لاہور

ہے تو مدیحہ نے نایاب سے پرزور درخواست کی کہ مجھے ہر حال میں اپنی شادی کی تاریخ سے آگاہ کرنا۔ میں آپ کی خوشیوں میں شریک ہو کر دلی خوشی محسوس کروں گی۔ نایاب نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں ضرور تمہیں انفارم کروں گی اور تمہیں انویٹیشن کارڈ ارسال کروں گی۔

......☆☆☆......

موسم دھلا دھلا سا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ اکتوبر کی نکھری نکھری دھوپ ہر طرف کھلی تھی۔ معیز اور نایاب پارک کے اس گوشے آرکے۔ جہاں سات رنگوں کے خوبصورت پھول کھلے تھے۔ ان کے ارد گرد اور بھی بہت سے لوگ ٹہل رہے تھے۔ خوش گپیاں لگا رہے تھے۔ قہقہوں کی جلترنگ ہر سو بکھری تھی۔ موبائل اور کیمرے سے تصاویریں لی جا رہی تھیں۔ مووی بنا رہے تھے۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مست تھے۔ نایاب بلیو کلر کے ہلکی سی کڑھائی والے سوٹ میں بہت سج رہی تھی۔ شانوں پر بال بکھرے تھے۔ نایاب گلاب کے کھلے ہوئے پھولوں کے پاس جھکی اور ادھ کھلے غنچے کو انگلیوں سے پھیلانے لگی۔ ایسے میں کہیں سے ایک ادھیڑ عمر شخص کچھ لڑکھڑاتا ہوا سفید بارلیش چہرہ، ملگجے سے کپڑے، ایک ہاتھ کی کلائی پر سفید سا کڑا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نگینے والی انگوٹھی۔ وہ شاید خود سے باتیں کرتا ہوا آ رہا تھا مگر پھر معیز کے پاس آکر ٹھہر گیا اور سر کو جنبش دے کر اسے کہنے لگا۔

"تیرا مالک تجھ میں اس طرح سمایا ہے جیسے پھولوں میں خوشبو۔ پھر تو کستوری کے ہرن کی طرح گھوم گھوم کر گھاس میں خوشبو تلاش کرتا ہے"۔

یہ بات اس نے نایاب کی طرف اشارہ کر کے کہی تھی۔ معیز اس کی بات پر چونک سا گیا۔ نایاب بھی پوری طرح ادھر متوجہ ہو گئی۔

"میں سمجھا نہیں بابا جی۔ آپ نے کیا کہا ہے؟" معیز نے بابا جی کو روک کر پوچھا۔

"یہاں سب رنگوں کے شیدائی ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں کے عاشق ہیں۔ سب پھول کی خوشبو اور اس کے حسن کے متمنی ہیں۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ خوشبو پھول میں چھپ کر کہاں بیٹھی ہے۔ محبوب کی آنکھیں سب کو خوبصورت نظر آتی ہیں۔ مگر آنکھ کی پتلی کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا کہ اس پتلی کے آئینے میں کون بستا ہے۔ سب مٹ جائے گا۔ سب فانی ہے۔ یہ خوبصورت شکلیں، یہ رنگین نظارے، یہ دلربا چہرے۔ بس جس نے پھول کی خوشبو اور آنکھ کی پتلی کے راز کو جان لیا وہ سلامتی کو پہنچا اور جو ان دکھائی دینے والی صورتوں اور رنگوں میں الجھ گئے۔ وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ چلے جائیں گے۔ خالی ہاتھ۔ کیونکہ یہ سارے رنگ ساری صورتیں اس کی ہیں۔ جو خود بے رنگ اور بے صورت۔ تم نہیں سمجھو گے بابا۔ تم نہیں سمجھو گے"۔

بابا چلتے ہوئے پلٹ پلٹ کر معیز اور نایاب کو جھانکتا بھی گیا اور بڑبڑاتا بھی گیا۔ معیز اور نایاب ہرنیوں کی طرح اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اس کی باتیں اتنی پراثر تھیں کہ وہ کچھ دیر کے لئے بھول گئے تھے کہ وہ کون ہیں اور کیوں ہیں؟

"کیا بات ہے یار؟ کتنی گہری باتیں کر کے گیا ہے یہ بابا۔ سائیں لوگ ہے۔ مگر ایسی باتیں میں نے تو کبھی کسی فکر دین کی زبان سے نہیں سنیں۔ کتنی پر اثر باتیں تھیں جو دل میں اترتی چلی گئیں"۔

"ہاں معیز اس نے جو کہا سچ کہا۔ آج یہ جو پھول کھلے ہیں۔ کل تک نہیں ہوں گے۔ ٹوٹ جائیں گے یا خزاں کی نذر ہو جائیں گے۔ یہ چار سو بکھرے درخت یہ بلند و بالا عمارتیں سب نے ایک دن مسمار ہو جانا ہے۔ ہر خوبصورت چہرہ ایک دن بڑھاپے کی زد میں آتا ہے"۔

نایاب گلاب کا پھول انگلیوں میں دبوچے اسے لہراتے ہوئے بولی۔

"اس میں خوشبو ہے۔ ذرا بیٹھو نہ یہاں۔ ہم خوشبو کی تلاش تو کریں کہ وہ پھول کی پتیوں میں کیسے چھپی ہے؟"

نایاب نے معیز سے کہا اور نیچے بیٹھ کر بڑے سے گلاب کی پتیوں کو پھیلا پھیلا کر بغور جھانکنے لگی۔ معیز بھی پاس بیٹھ گیا۔

"ایسے کہاں دکھائی دے گی وہ بھلا ہمیں؟"

"دیکھتے تو ہیں"۔

نایاب نے چند پتیاں اکھاڑیں، انہیں ناخنوں سے کاٹا، سونگھا۔ خوشبو تو موجود تھی مگر دکھائی نہ دے رہی تھی۔ "بہت مشکل ہے یہ کھوج لگانا۔ پتہ نہیں وہ سائیں بابا نے کیسے خوشبو کو دیکھا ہوگا؟" نایاب نے مایوسی سے کہا۔

"اچھا مجھے ذرا اپنی آنکھوں میں تو جھانکنے دو۔ میں دیکھوں تو پتلی والی بات کہاں تک سچ ہے؟" نایاب نے معیز سے کہا اور اپنا چہرہ اس کے قریب کر کے اس کی آنکھوں میں بغور جھانکنے لگی۔ وہ یہ سب کچھ تفریح سمجھ کر نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ سنجیدگی سے مطالعہ کرنا چاہتی تھی۔ معیز آنکھیں کھولے اس کے سامنے تصویر بنا بیٹھا تھا اور وہ آنکھوں میں پتلی پر نظریں جمائے بغور کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک وہ اچھل سی پڑی۔

"او مائی گاڈ۔ او معیز یہ تو میری تصویر ہے۔ قسم سے تمہاری آنکھ میں جو نقطے کی مانند ہلکا سا نشان ہے۔ وہ آئینے کی طرح شفاف ہے اور مجھے اس میں اپنی تصویر صاف نظر آ رہی ہے۔ یعنی تمہاری آنکھ کی پتلی میں میری تصویر ہے" نایاب حیرت سے دیوانی ہو کر بولی۔

"ہاں نایاب مجھے بھی تمہاری آنکھوں میں بھی پتلی میں اپنی تصویر کا عکس نظر آ رہا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔"

"ہاں معیز ویری انٹرسٹنگ یار"۔ نایاب بدستور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں اپنے گردو پیش کی خبر بھی نہ رہی تھی۔

"بس معیز میں تو آج خود سے بھی بیگانی ہو گئی ہوں۔ کبھی ہم نے ادھر غور ہی نہیں کیا۔ کتنا کرشمہ لئے پھرتے ہیں ہم اپنی آنکھوں میں۔ کتنا راز چھپا ہے آنکھ کی پتلی میں اور پھول کی خوشبو میں۔"

"ہاں نایاب یہ باتیں ہمارے نالج میں آج پہلی بار آئی ہیں اور یہ بڑی غور طلب ہیں۔ حیرت ہے ہمارے پاس دولت ہے اور دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ ہم گریجویٹ ہیں۔ بہت تعلیم ہے ہمارے پاس اور یہ ایک عام سا شخص، غریب اور نادار سا کوئی شخصی پرسنلٹی نہیں کوئی پڑھے لکھے ہونے کی نشانی موجود نہیں۔ مگر جو باتیں وہ جانتا ہے۔ وہ تو خال خال ہی کوئی جان پاتا ہوگا" معیز نے شدید حیرانگی سے کہا۔

"میں خود دنگ ہوں معیز۔ وہ شخص بڑا پر اسرار اور بڑی پر اثر گفتگو کا مالک تھا۔ میں تو اب اسے ضرور ڈھونڈوں گی۔ ایسے لوگ درباروں اور مزاروں پر اکثر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ لیکن میں تو زندگی میں کبھی وہاں نہیں گئی۔ کیا کروں گی اسے ڈھونڈ کر؟ کیا دے گا وہ تمہیں؟ ہاں"۔

"میں اسے بتاؤں گی معیز کہ ہم نے آنکھ کی پتلی کا راز جان لیا ہے کہ اس میں جھانکنے والے کو اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ بس تو مجھے یہ بتا دے کہ گلاب میں خوشبو کہاں رہتی ہے؟ بس اس سے زیادہ میں نے اس سے کچھ نہیں کہنا"۔

نایاب نے معیز کے ساتھ پارک کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ جہاں ان کی گاڑی پارک تھی۔ رات بھر اس سائیں بابا کی باتیں نایاب کے دماغ میں بازگشت کرتی رہیں۔ کتنی دیر تک وہ اپنے سنگھار ٹیبل کے دراز قد آئینے کے بہت چہرہ قریب کر کے خود اپنی آنکھوں میں جھانکتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے اپنی آنکھ کی پتلی میں اپنا عکس دکھائی دینے لگا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اپنی صورت کو اپنی ہی آنکھ میں چھپا دیکھتی رہی تھی۔ یوں تو اس کا عکس پورے آئینے پر سجا تھا۔ مگر اس قد آور آئینے کے اندر اس کے جھانکتے عکس کی آنکھ کے آئینے پر بھی اس کی تصویر کا عکس بہت دلفریب اور بامعنی سا تھا۔ جب تک اسے اپنی تھکن کا احساس نہ ہوا وہ آئینہ کے سامنے موجود رہی۔ جیسے اپنی ہی صورت کی عاشق ہو گئی ہو۔

پھر جب بیڈ پر لیٹی تو کھلی آنکھیں چھت پر مرکوز اور دماغ کسی گہری سوچ میں متفکر ڈوبا ہوا تھا۔ کمرے کی خاموش فضا در و دیوار اور چھت کا گہرا سناٹا۔ جیسے سب کچھ اس کے ساتھ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہو۔ آج نہ تو اس نے ٹی وی کو آن کیا تھا۔ نا فیس بک آن کرنے کا خیال آیا تھا۔ نا کسی کو کوئی کال نہ میسج۔ بس اپنی ہی کسی سوچ میں گم۔ جیسے خود کو کہیں کھو دیا ہو۔ پھول میں خوشبو، پتلی میں تصویر اور اپنی سوچ میں اپنے آپ کو کہیں گم کر دیا ہو۔ حیرت ہی حیرت۔ اسی حالت میں جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح نیند سے بیدار ہوئی تو پہلا خیال پتلی میں تصویر، پھول میں خوشبو۔ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔ پہلے ہر روز اٹھ کر اس کو اپنی بیماری اور اپنی صحت کا خیال آتا تھا۔ آج پتلی اور خوشبو کا خیال۔ اس کے پورے حواس پر چھا گیا تھا۔ آخر کیوں؟ وہ جتنا اس خیال کو دماغ سے ہٹانے کی کوشش کرتی۔ یہ سوا چند ہو جاتا۔

"اف خدایا! یہ سب کیا ہے؟ یہ رات کا اندھیرا اور گہری نیند اور یہ دن کا اجالا اور دن کے ہنگامے، یہ

اندھیرے اجالے کا کھیل، یہ آنکھ اور پتلی کا کھیل، یہ پھول اور خوشبو کا کھیل۔ یہ کیا کھیلوں سے بھرا جہاں ہے؟ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس سارے ناٹک کے پیچھے کوئی حکمت تو مخفی ہے۔ بس میں یہ حکمت جاننا چاہتی ہوں اور یہ باتیں مجھے وہی سادہ سا میلا کچیلا لباس رکھنے والا، کڑے اور انگوٹھی والا سائیں بابا ہی بتا سکتا ہے"۔

اس نے جلدی سے واش لیا۔ ہلکا سا ڈریس پہنا اور بال سنوارتے ہوئے اپنی آنکھوں کی گہرائی میں چھپی اپنے عکس کو بھی دیکھتی رہی اور اس عکس کی حقیقت کا راز جاننے کا تصور بھی اس کے ذہن میں پیدا ہوتا گیا۔ آج وہ یہ ساری باتیں جاننے کیلئے اس سائیں بابا کی تلاش میں جانا چاہتی تھی اور یہ اس حالت میں اسے تلاش کر کے اس سے بہت ساری باتیں حاصل کرنا چاہتی تھی۔

گیارہ بج رہے تھے۔ جب وہ ہلکا سا ناشتہ کئے خود ہی گاڑی لئے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ جب سے وہ ہارٹ کی مریضہ بنی تھی۔ ایک دن بھی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر نہ بیٹھی تھی۔ آج بھی وہ ڈرائیور کو ساتھ لے جاسکتی تھی۔ مگر وہ اکیلی جانا چاہتی تھی۔ اپنی مما کو اس نے بس یہ بتایا۔

"میں ذرا آؤٹنگ پر جارہی ہوں۔ مجھے آنے میں دیر ہوجائے گی تو پریشان نہیں ہونا"۔

"تو بیٹا ڈرائیور کو لیتی جاؤ نا اکیلی جاؤ گی کیا؟"

"ہاں مما۔ میں اکیلے ہی جانا چاہوں گی"۔

"خیال سے جانا بیٹا۔ ابھی تمہیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے نا"۔

"کچھ نہیں ہوتا مما۔ کہہ دیا نہ کہ پریشان نہ ہوں"۔

نایاب کی گاڑی گلشن اقبال پارک کی طرف گامزن تھی۔ مگر وہ یہاں کہیں دکھائی نہ دیا۔ جس کی اسے تلاش تھی۔ پھر وہ مادھولال حسین کے دربار پہ گاڑی پارک کر کے ادھر بڑھی۔ جدھر زائرین سلام کرنے جا رہے تھے۔ یہاں ایک طرف ملنگ، فقیر اور مجذوب طرز کے لوگ بھی دکھائی دیئے۔ نایاب کو اپنے مطلوبہ چہرے کی تلاش تھی۔ مگر وہ یہاں بھی نہ موجود تھا۔

پھر وہ دربار کے اندر چلی گئی اور پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ لوگ مزار کے اندر مادھولال حسین کی قبر پہ بچھی سبز چادر پر پھول نچھاور کر رہے ہیں۔ قبر کو جھک کر چومتے ہیں اور پاس کھڑے ہو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ایک طرف عورتیں جمع تھیں اور دعائیں بھی مانگ رہی تھیں۔ نایاب کیلئے یہ سب نیا تھا۔ وہ بڑے تجسس سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ میں بھی ایسا کر کے دیکھوں تو۔ آخر یہ سب لوگ کیونکر اس قبر سے اتنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ دھیمے قدموں سے آگے بڑھی اور مزار کے سرہانے سنگ مرمر کی جھروکوں والی جالی سے چمٹی عورتوں کے جمگھٹے میں گھس کر جالی سے سر ٹیک کر اندر جھانکا۔ اندر مردوں کا ہجوم تھا۔ عورتوں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اندر سے اٹھنے والی مشک وعنبر کی بھینی بھینی خوشبو نتھنوں میں گھس کر دماغ کو معطر کئے دے رہی تھی۔ مدہوشی کا اک عجیب عالم تھا۔ اچانک نایاب کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ جالیوں کے جھروکوں میں سے نہیں جالیوں کی آنکھوں میں جھانک کر اس پار کا منظر دیکھ رہی ہو۔

اس نے لمحے بھر کو پلکیں موند لیں تو دو پانی کے قطرے اس کی بند پلکوں کے کونوں سے ڈھلکے اور گالوں پر بہہ نکلے۔ یہ اس کے دل کے دروازے پر عشق حقیقی کی پہلی دستک تھی۔ نایاب نے آنکھیں کھولیں تو اس پر ایک عجیب سی رقت کا عالم طاری تھی۔ اس کا دل پھر بھر آیا اور وہ شدت غم سے دیوانہ وار روتے ہوئے جالیوں سے سر ٹکرانے لگی۔ اشک بہتے گئے اور دل کے بند کواڑ کھلتے گئے۔ وہ عورتوں کے جھرمٹ میں دھکم پیل میں اپنی مستی میں گم تھی۔ عام حالت وہ یہ منظر دیکھنے کیلئے بھی اتنی دیر نہیں رک سکتی تھی۔ اب جتنی دیر سے وہ یہ سب کچھ برداشت کئے جا رہی تھی۔ پھر جب اس انوکھے سے درد کا طوفان تھم گیا تو اس کی نگاہیں دربار پر جم گئیں۔ اسے لگا جیسے بابا جی سبز چادر اوڑھے بس سو رہے ہیں۔ سب کی باتیں سن رہے ہیں۔ دو تین عورتیں کورس کی شکل میں گا رہی تھیں۔

"میں بابا کی دیوانی ------ میں مادھو جی کی مستانی"۔

نایاب کا سارا بوجھل پن جیسے اس کے اشکوں کے ساتھ ہی کہیں بہہ گیا ہو۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ جب جالیوں سے اس نے سر اٹھایا تو بے اختیار ہو کر جالی کو چوم ڈالا اور پلٹ پڑی۔ اشکوں سے نم گالوں کو

پوچھا۔ پھر جہاں مرد اور عورتیں ایک بڑے لوہے کے بکس جو مقفل تھا۔ اس میں نوٹ ڈال رہے تھے۔ نایاب نے بھی اپنا پرس کھولا اور تین چار بڑے بڑے نوٹ نکال کر ایک زائر کو تھما دیئے۔ جس نے وہ رقم بکس میں ڈال دی۔ اپنی گاڑی کی طرف واپس لوٹتے ہوئے وہ پھر ان سادھوؤں ان سائیں بابا ملنگ لوگوں کو بغور دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر ایک سادھو کے پاس ٹھہر گئی۔ جو زمین پر بوریا ڈالے دوزانوں بیٹھا تھا۔ سادھو نے اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر پرے تکنے لگا۔

''سائیں بابا۔ کچھ پوچھوں تو بتاؤ گے؟'' اس نے قدرے جھک کر سائیں بابا سے پوچھا۔

''ہاں پوچھو!'' نایاب اس کے قریب ہی قدموں کے بل بیٹھ گئی۔

''سائیں بابا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنکھ کی پتلی میں کون رہتا ہے اور پھول کی خوشبو اس میں کہاں سمائی ہے؟''

سائیں بابا اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔

''یہ تو بڑے گیان کی باتیں ہیں بابا۔ آپ بنگلوں کوٹھیوں میں رہنے والے دولت مندوں کو ایسی باتوں سے کیا لینا دینا۔ یہ تو بوریا نشیں لوگوں کا کام ہے۔ جو گیانی کہلاتے ہیں۔''

''تو کیا آپ گیانی نہیں ہیں؟''

سائیں بابا نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''نہیں بابا! ہم تو ان کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ نابابانا''۔

''تو پھر مجھے کسی مہان گیانی کا پتہ بتا دو۔ میں اس ملنا چاہتی ہوں''۔

''بی بی لگتا ہے تو کسی لگن کی ماری ہے۔ جب ہی تو، تو بانوری (پگلی) ہوئی جاتی ہے۔ یہ لگن آگ کا شعلہ ہے جو جلا دیتا ہے انسان کے من کو۔ من کی لگن چوٹ سے ملتی ہے۔ لگتا ہے تو ابھی مجاز کی منزل میں ہے۔ جب تو اس مقام کو یاد کرے گی تو ایک اندھا کنواں تمہاری راہ میں حائل ہوگا۔ وہ ہے جذبات کا کنواں۔ جہاں مجاز کے مارے گر جاتے ہیں۔ بس کوئی کوئی مقدر والا اس کنویں کو چھلانگ لگا کر پار کر جاتا ہے۔ وہی حقیقت کے مقام سے آشنا ہوتا ہے۔ وہی گیانی کہلاتا ہے''۔

''تو کیا میرا عشق مجاز خام ہے اور کیا میں بھی اس کنویں میں گر جاؤں گی؟ مگر میں وہاں گرنا نہیں چاہتی۔ میں خوشبو بن کر پھول میں سما جانا چاہتی ہوں۔ جو ہمیشہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ میں امر ہونا چاہتی ہوں''۔

''یہ کام کسی مہان گیانی کے بغیر نہیں ہو سکتا بی بی اور اس کو پانے کے لئے دنیا کی رنگینیاں تیاگ دینا پڑتی ہیں۔ بہت کٹھن راہ ہے پر خار راستوں کا سفر ہے۔ خود سے بیگانہ ہونا پڑتا ہے۔ پھر جا کر منزل ملتی ہے''۔

''تو کیا کسی گیانی کی صحبت اختیار کرنے سے بھی یہ راستے طے نہیں ہو سکیں گے؟''

''ہاں پھر تو بہت آسان ہے۔ ایک پل میں بھی سب منزلیں آسان ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ سب مقدر سے ملتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کی زندگیاں گزر جاتی ہیں۔ مگر منزل سے محروم رہتے ہیں اور کچھ گیانی کی نگاہ پڑتے ہی ارتقاء کے مقام کو چھو لیتے ہیں''۔

''تو پھر میں کیا کروں۔ کہاں جا کر ڈھونڈوں وہ گیانی..........؟''

''اس گیانی کی تلاش کا ایک آسان سا راستہ آپ کو بتا دیتا ہوں۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی لکھی ہوئی کتاب ''کشف المحجوب'' کا ہر روز مطالعہ کرتی رہا کرو۔ آپ کو خواب میں یا جاگتی آنکھوں سے اس گیانی کی صورت دکھا کر اس کا نام بھی بتایا جائے گا اور یہ عمل کئی بار دہرایا جائے گا۔ آپ نے اس نیت سے کتاب کا مطالعہ کرنا ہے کہ میں اپنا ہادی ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔ اپنا رہبر۔ اپنا مرشد۔ بس تمہیں اشارہ مل جائے گا۔ بس وہی آپ کی منزل کا درخشاں ستارہ ہوگا۔ لیکن پہلے بیٹا تم کو خود کو بدلنا پڑے گا۔ پردہ داری عورت کا سرمایہ ہوتا ہے اور جس دنیا میں جانے کی آپ بات کر رہی ہیں۔ یہاں تو آپ چہرہ بھی برہنہ نہیں رکھ سکتیں۔ سر کھلا رکھنا تو بہت معیوب بات ہے۔ پہلے خود کو شریعت کے قابل بناؤ۔ پھر کسی گیانی کی تلاش میں نکلنا''۔۔۔

سائیں بابا نے بتایا۔ تو نایاب نے پرس کھول کر اسے نیاز سمجھ کر کچھ رقم دی۔ اب اس کا رخ داتا دربار جانے والی سڑک پر ٹرن کر گیا تھا۔

صدر دروازے کے قریب ہی ایک بک سٹال سے یہ

کتاب دستیاب ہو گئی اور وہ وہیں سے ہی گھر کی طرف ہو لی۔ دربار پر نا جاسکی۔ شاید اس لئے کہ وہ پردے سے آزاد تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ ابھی تک اس کے حواس پر حضرت بادھولال کے دربار کی خوشبو اور سائیں بابا کی باتیں مسلط تھیں اور واپس گھر آتے ہوئے ٹریفک کا سیلاب، بلند و بالا عمارتیں، ہنگامہ خیز زندگی وہ ان تمام چیزوں سے بے خبر اپنی سوچوں کے سمندر میں گم رہی تھی۔ گھر کی ساری فضا گم صم اور چپ چاپ سی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی چیز میں کوئی کشش نہ رہی تھی۔ معیز کی یاد نے بھی کوئی شدت نہیں پکڑی تھی۔ پھر جب معیز کی کال آئی۔

"کیا بات ہے جان؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ آج نہ کوئی صبح بخیر کا میسج اور نہ کوئی کال۔ سو رہی تھی کیا؟"

"نہیں معیز میں گیارہ بجے جاگ گئی تھی اور ابھی ابھی آدھا شہر گھوم کر آئی ہوں۔ اکیلی ہی ڈرائیونگ کرتی رہی۔"

"اوہو خیریت تھی مجھے بلا لیا ہوتا"۔

"نہیں میں تنہا رہنا چاہتی تھی۔ اب اگر آسکو تو چلے آؤ"۔

"ٹھیک ہے میں دو گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔ اوکے بائے"۔

نایاب نے ملازمہ کو چائے لانے کے لئے کہا اور اسے یہ بھی کہہ دیا کہ ماما کو میرے آنے کا بتا دو۔ پھر وہ واش روم سے تازہ دم ہو کر اپنے کمرے میں آئی۔ آئینے کے روبرو جھک کر اپنی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا اور پھر بیڈ پر تکیہ کھڑا کر کے اس سے ٹیک لگائی اور کتاب کشف المحجوب کی ورق گردانی کرنے لگی۔ مضامین کی لسٹ دیکھی۔ پھر شروع کی سطور کا مطالعہ شروع کیا۔ کتاب کا سارا میٹر ہی اس کے لئے نیا نیا اور عجیب سا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ کیا لکھا ہے۔ پھر بھی اس نے آگے اور آگے صفحات اُلٹے۔ کئی جگہ سے چند سطریں پڑھیں۔ پھر ایک جگہ جب اس نے پڑھا۔

اپنے مقصد کی تلاش کرتے کرتے تو خود ہی گم ہو گیا
جو بوند سمندر میں مل گئی تو اب اسے تلاش کون کرے

......☆☆☆......

قطرہ ملا جو موج تو سمندر ہو گیا
عاشق ملا جو موت سے تو قلندر ہو گیا

......☆☆☆......

پانی کا ایک قطرہ الگ کر لیا جائے تو اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ قطرہ سمندر میں پھینک دیا جائے تو پھر وہ قطرہ نہیں رہتا سمندر ہو جاتا ہے۔ نایاب کے دماغ کا ایک اور ورق پھڑ پھڑایا۔ جس پر درج تھا کہ اگر قطرہ سمندر بن سکتا ہے تو آنکھ کی پتلی سارے جہاں کا عکس بھی تو بن سکتی ہے۔ وہ جدھر اُٹھے گی سامنے کا سارا منظر اس میں سما جائے گا۔ پھر یہ پتلی تو نہ ہوئی۔ یہ سارا جہاں سمیٹ کر گود میں لئے بیٹھی ہے۔ یہ آنکھ کے اندر سمایا ہوا ایک معمولی سا ذرا ایک باریک سا نقطہ کتنا پُراسرار اور قابل توجہ چیز ہے! یہ پتلی تماشا بڑا غیر معمولی ہے۔ ذرا سی پتلی سارے جہاں کو دیکھ رہی ہے مگر خود چھپ کر بیٹھی ہے۔ کسی کو دکھائی ہی نہیں دیتی۔ سائیں بابا نے کہا تھا۔

"جس نے پھول کی خوشبو اور آنکھ کی پتلی کے راز کو جان لیا۔ وہ سلامتی کو پہنچا اور جو نا جان سکا۔ وہ محروم و محکوم رہا۔ وہ کتنے خوش قسمت لوگ ہیں۔ جو غیر معمولی رازوں کا کھوج نکال کر ان کا حصول کرتے ہیں اور گیانی بن جاتے ہیں۔ داتا علی ہجویری بہت بڑے گیانی گزرے ہیں۔ بڑے گر کی بات کرتے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ نہیں آتا۔ یہ کسی گیانی نے کتنے راز کی بات بتائی ہے کہ علم کتابوں میں نہیں ہوتا۔ تعلیم کتابوں میں قید ہے۔ علم سینوں میں رہتا ہے اور سینہ بہ سینہ اوروں کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ تعلیم جتنی بھی ہو یہ زندگی گزارنے کا فن سکھاتی ہے اور علم زندگی کا مفہوم بتاتا ہے۔ اسی لئے تعلیم اور علم میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔ نایاب معیز سے اسی بات پر بحث کر رہی تھی۔

"تعلیم کے بغیر انسان ایک جانور کی طرح ہے نایاب۔ جاہل، گنوار اور بے معنی۔ جو تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ تعلیم اور علم ایک ہی چیز کا نام ہے"۔

"نہیں معیز میں اس بات کو نہیں مانتی۔ معروف شاعر وارث شاہ کے عہد میں نا کوئی سکول تھا نا کالج، نا کوئی یونیورسٹی، نہ ہی اس نے کہیں سے کوئی ڈگری حاصل

کی۔ پھر بھی اس نے ہیر وارث شاہ جیسی شاہکار کتاب لکھی۔ جو صرف اور صرف علم کا وسیع خزانہ اپنے اندر موجود رکھتی ہے۔ آج پنجابی میں ایم اے کرنے والا طالب علم جب تک وارث شاہ کو نہیں پڑھتا۔ تب تک اسے ایم اے کی ڈگری نہیں ملتی۔

علم اسکولوں اور یونیورسٹیوں سے باہر آزاد فضاؤں میں رہتا ہے۔ تعلیم کتابوں اور تعلیمی اداروں میں مقید رہتی ہے۔ جس طرح تعلیم حاصل کرنے کیلئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح علم حاصل کرنے کیلئے کسی گیانی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کتاب ایک گیانی کی تخلیق ہے۔ ہم کل وہاں جائیں گے۔ میں تمہیں دکھاؤں گی کہ وہاں کیا دنیا بچی ہے؟ ہم کس جہاں میں آباد ہیں؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ بس کار، کوٹھی، بنگلے، سونا، چاندی، کھانا، پینا، گھومنا، انجوائے کرنا۔ بس یہ زندگی ہے۔ مگر نہیں معیز اصل زندگی تو وہ ہے۔ جہاں انسان کو اپنی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے اندر چھپے خزانوں کا ادراک ہوتا ہے۔ جہاں روح کو نئی زندگی ملتی ہے۔ ہم تو ایک مصنوعی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پالش زدہ زندگی۔ حقیقت بھری زندگی ہے۔ جیسے پیتل پر سونے کا رنگ چڑھا ہو۔ وہ زندگی خالص سونے جیسی۔ حقیقت بھری زندگی ہے، جو سادگی میں چھپی ہے جو کٹیا میں رہتی ہے۔ آنکھ میں بچی پتلی کی طرح۔ پھول میں بسی خوشبو جیسی"۔

پھر جب اگلے روز نایاب معیز کو ساتھ لئے حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پر حاضری دینے پہنچی۔ تو معیز کیلئے یہاں کی ساری دنیا ہی نئی تھی۔ نایاب کو لیڈیز گیٹ پر چھوڑ کر معیز مردانہ گیٹ سے دربار کی عمارت میں داخل ہوا۔ وہاں چار سو زائرین کی بھیڑ تھی۔ ایک میلے کا سماں تھا۔ وضو کے بعد مزار کے برآمدے میں رکھی الماری سے سر پہ ٹوپی پہنی اور پھر قطار میں اسے مزار تک جانا پڑا۔

وہ یہاں کے تمام تر طریقہ کار سے اجنبی تھا۔ بس وہ تو دوسروں کو کاپی کر رہا تھا۔ اگر اسے نایاب یہاں نا لے کر آتی تو وہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ اسے یہ سب عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ پھر جب اس سے اگلے شخص نے مزار کے سرہانے جھک کر ہاتھ بڑھائے اور مزار کو چھو کر ادب سے

دل کی بات

منزل کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ دراصل جو ہماری خواہش ہے ہم اسے منزل سمجھ لیتے ہیں۔ جب ہماری خواہشات پوری ہوتی رہتی ہیں ہم مطمئن اور آسودہ رہتے ہیں اور جب خواہش ادھوری رہ جائے تو ہم بے چین ہو جاتے ہیں۔

بہت سی چیزیں یا کام ایسے ہیں جو ہو رہے ہوتے ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتے مثلاً جیسے وقت کا گزرنا۔ وقت گزرتا ہے، وقت گزرتا رہتا ہے، ہمیں بہت کچھ دیتا رہتا ہے، ہم سے بہت کچھ لیتا رہتا ہے اور وقت کے توسط سے ہی ماضی، حال اور مستقبل وجود میں آتے ہیں اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور مستقبل کی کسی کو خبر نہیں۔

یوں حال ہی ہے جس میں ہم رہ رہے ہوتے ہیں اور اگر ہمارا حال اچھا ہے تو ہمیں سب کچھ اچھا لگتا ہے ہم اپنے ماضی کو یاد نہیں کرتے اور اگر حال اچھا نہیں تو ہم ماضی میں جھانکتے ہیں اور اپنے ماضی کو اپنے حال سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی ہو نہیں سکتا۔

ماضی اور مستقبل ہم ان سے دور ہوتے ہیں اور حال ہی ہماری دسترس میں ہوتا ہے یا ہم حال کی دسترس میں ہوتے ہیں۔

سیف الاسلام...... کراچی

بوسہ دیا تو وہاں چار سو بکھری معطر سی خوشبو نے معیز کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کے دماغ میں جیسے ایک بہار کا جھونکا سا ٹکرایا ہو۔ وہ بھی آگے جھکا۔ مزار پر بچی، ریشمی چادر اور اس پر بکھری تازہ گلابوں کی پتیاں سی سرک کر اس کے ہاتھوں پر آئیں۔ پھر جب وہ مزار پر مرقد کا بوسہ لے رہا تھا۔ تو اس پر ایک وجدانی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

مزار کا مشرقی حصہ جو عورتوں کیلئے مخصوص تھا۔ نایاب وہاں ادب سے سر جھکائے موجود تھی۔ یہاں آتے ہی اس پر ایک جنونی سی کیفیت کا احساس، ایک عجیب سی خوشی، ایک انجانی سی راحت اور روح کو سرشار کر دینے والی

طمانیت کی پھوار سی دل و دماغ پر برستی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے جھک کر مزار کو بوسہ دیا۔ کچھ ثانیے آنکھیں موندے جھکی سی رہی۔ پھر گلابوں سے بھرا پیکٹ مزار پر اچھال سا دیا۔

رات اسے خواب میں کسی سبز پوشاک والے بزرگ کی زیارت ہوئی تھی۔ جو اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ بس ایک ہلکی سی جھلک اسے دکھائی دی تھی۔ اسی لئے وہ آج یہاں چلی آئی کہ جس کتاب کی چند سطور پڑھ کر خواب میں کوئی ہستی آسکتی ہے۔ تو اس کے دربار میں حاضری دینے سے ممکن ہے۔ مجھے وہ ہستی مل جائے جو مکمل گیانی ہو اور مجھے اپنی محبت میں قبول کرلے۔ اب وہ ستون سے لگ کر مزار پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔ لوگ دیوانہ وار مزار پر گل پاشی کر رہے تھے، بوسے لے رہے تھے، دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے سارا زمانہ یہاں چلا آیا ہو۔ پورے شہر کی عورتیں اور مرد یہاں جمع ہو گئے ہوں۔

کیا یہ سارے لوگ بابا جی سے اپنا اپنا گیانی ڈھونڈنے کی سفارش کیلئے آئے ہوئے ہیں۔

"بابا جی مجھے بھی میرے گیانی کا پتہ بتا دو کہ میں اس کی داسی بن کر اس سے گیان حاصل کروں۔ آنکھ کے پردے میں رہنے والے کا پتہ پوچھ سکوں اور خوشبو کی کھوج کر سکوں"۔

نایاب ایک بار پھر سر جھکائے مزار کا بوسہ لے کر فریاد کرنے کے انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔ اس پر ایک رقت کا عالم طاری تھا اور وہ کچھ دیر کیلئے بھول گئی تھی کہ معیز نے اسے جلد لوٹ آنے کو کہا تھا۔ جانے کیوں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی انسان کی آخری آرام گاہ سے نہیں۔ بلکہ میں تو کسی حاضر ناظر ہستی سے مخاطب ہوں اور میری بات کو بغور سنا جا رہا ہے۔ جتنے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ سبھی اپنی اپنی فریاد عرض کر رہے تھے۔ بے شک یہ وہ برگزیدہ ہستیوں کا آستانہ ہے۔ جن کو قرآن پاک میں خوشخبری سنا دی گئی کہ انہیں روز محشر بھی نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ غم۔

معیز کی بار بار کال آ رہی تھی۔ تب نایاب نے اسے اپنے آنے کی اطلاع دی اور واپس لوٹنے سے قبل اس نے پھر سے بابا جی کے چرنوں کو چھونے کے انداز میں ہاتھ پھیلا کر سر جھکایا۔ جھروکے کی جالی کو چوما اور نہ چاہتے ہوئے بھی واپس چل دی۔

کس قدر سکون تھا یہاں!۔ اندر کا سارا غبار کہیں کافور ہو گیا تھا اور روح کی گہرائی میں اک عجیب سے سرور کی لذت سرائیت کر چکی تھی۔

پھر تو نایاب کا یہاں آنا معمول بن گیا۔ کتاب کا مطالعہ بھی جاری تھا اور کبھی داتا دربار، کبھی مادھو لال، کبھی میاں میر اور پھر بی بی پاکدامن کا مزار تو اس کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا کہ وہ ایک عورت ہو کر گیانی بن چکی تھی۔ اس لئے نایاب جب بھی وہاں جاتی۔ مزار کے سرہانے بیٹھ کر پلکیں موندے مراقبے کی صورت میں بیٹھی رہتی اور روحانی تسکین کا سامان مہیا کرتی۔ یہ مراقبہ کرنا بھی اس نے زیر مطالعہ کتاب سے سیکھا تھا۔

اسے بزرگان دین سے بڑی رغبت ہو گئی۔ تصوف کا شوق، مہان گیانی لوگوں کا تذکرہ ان کے ایمان افروز واقعات سن کر اس کے ذوق میں اور اضافہ ہو جاتا۔ معیز نایاب کی اس سرگرمیوں سے نالاں تو نہ تھا۔ اسے یہ سب کچھ اچھا بھی لگتا تھا۔ مگر اس کے شوق میں شدت نہ تھی۔ بس رسمی سا لگاؤ تھا۔ جبکہ نایاب تو پوری طرح اس رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔

پھر جب تیسری بار بھی اسے ایک بزرگ جن کا نام نبی احمد ناز قلندر تھا اور ضلع فیصل آباد کے نزدیک چنیوٹ روڈ پر برنالہ شریف میں ان کے مسکن کی نشاندہی کی گئی۔ نایاب نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا اور معیز کو اپنے ساتھ جانے کی دعوت دی۔ معیز نے بخوشی ساتھ جانے کی ہامی بھری۔ پھر وہ دونوں برنالہ شریف کیلئے عازم سفر ہوئے۔ اجنبی سفر تھا۔ پھر بھی چار گھنٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد منزل تک پہنچ سکے۔ سڑک کے بائیں کنارے مزار حضرت نبی عبداللہ قلندر قادری موجود ہے۔ جو حضرت علامہ اقبال کے بھی پیر و مرشد ہیں۔ ان کے بیٹے حضرت نبی احمد ناز قلندر کا بھی اب وہیں مزار ہے۔ ان کے مزاروں پر بڑے بڑے ببر شیر، مور اور بطخ کے مجسمے موجود ہیں۔ بڑا سا کھجور کا درخت ایک بڑا سا پیپل کا پیڑ زائرین کیلئے کھلی چار دیواری میں کمروں کی قطار جن کے ساتھ برآمدہ موجود ہے۔ مزار اور زائرین کی حویلی کے پیچھے آپ سرکار کی رہائشی حویلی موجود ہے۔ کافی کشادہ جگہ باہر لان کی صورت موجود ہے۔ جو

آنے والے مہمانوں اور زائرین کی گاڑیاں پارک کرنے کے کام آتی ہے۔ معیز نے بھی اسی لان میں پیپل کے پیڑ تلے گاڑی پارک کی۔ دوپہر ایک بجے کا وقت تھا۔ یہاں ہر سو گہری خاموشی برس رہی تھی۔ تین چار افراد زائرین کی حویلی کے دروازے پر چارپائیاں ڈالے موجود تھے۔ معیز ان سے جا کر ملا اور حضرت نبی احمد ناز سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہیں حویلی کے شمالی کونے میں خصوصی گیسٹ روم میں پہنچایا گیا۔ اٹیچ واش روم سے دونوں نے خود کو فریش کیا۔ ان کیلئے پانی کے ساتھ ساتھ چائے اور بسکٹ پیش کیے گئے۔ دونوں نے یہ چیزیں ایک بزرگ کا لنگر سمجھ کر بڑے شوق سے نوش کیں۔ پھر اس ہستی کی آمد ہوئی۔ جس سے ملنے کا نایاب کو تین بار اشارہ بھی ہوا تھا اور اس ہستی کی خواب میں زیارت بھی کروائی گئی تھی۔

نایاب نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ یہ وہی ہستی ہے۔ جہاں مجھے بھیجا گیا ہے۔ دونوں نے آگے بڑھ کر پاؤں چھو کر بڑے ادب سے سلام عرض کیا۔ آپ سرکار نے دونوں کے سر پہ دستِ شفقت رکھا اور بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ نایاب جو سر سے پاؤں تک خود کو چادر میں لپیٹے ہوئے تھی سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"آپ لوگوں کا سفر کیسا رہا؟ کوئی تکلیف تو درپیش نہیں آئی آپ کو آنے میں۔" پوچھا گیا۔

"نہیں حضور ہم بہت ایزی پہنچ گئے۔ بابا جی! ہم لاہور سے آئے ہیں۔ میں نایاب اور یہ معیز میرے منگیتر ہیں۔ جلد ہی ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے ہیں۔ ہمارا تعلق ایک اعلیٰ طبقہ کے خاندان سے ہے۔ ہم دونوں عرصہ دراز سے مجاز کی منزلیں عبور کر رہے ہیں۔ اب جا کر وصال کی امید بندھی ہے۔ ہم پچھلے چند ہفتوں سے ایک سائیں بابا کے توسط سے ایک نئی لذت سے آشنا ہوئے ہیں۔ بس اسی کی طلب کھینچ کر آپ کے پاس لے آئی ہے ہمیں۔ بابا جی ہم آپ کی صحبت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ہم اپنا گیانی تسلیم کرنے آئے ہیں۔ اپنا رہبر اور ہادی بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بس بابا جی ہمیں اپنے دستِ شفقت میں جگہ عنایت فرما دیں۔ بہت امیدیں لے کر آئے ہیں اور یہاں سے مایوس لوٹ کر نہیں جانا چاہتے۔ کیا آپ ہمیں گیان کی بھیک دیں گے اور اپنی غلامی میں رکھنے کا شرف بخشیں گے؟" نایاب نے ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں اور معیز ساتھ ساتھ گردن کو اقرار میں جنبش دے کر اس کی تائید کرتا رہا۔

"آپ کی آمد سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ویسے ہمیں آپ کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ ہم بطورِ خاص معیز صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے کہ انہوں نے آپ کے ساتھ یہاں آنے کی تکلیف گوارا کی۔ یہ بڑے مقدر اور نصیب کی بات ہے یہ سعادت کسی کسی کو نصیب ہوا کرتی ہے بیٹا۔ آپ کا تعلق جس اعلیٰ سوسائٹی سے ہے۔ وہاں تو ایسی باتوں کو بہت کم نگاہی سے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ پردہ داری سے آزاد معاشرے کے طبقے کو مذہب اور شریعت کے نام سے ہی الرجی ہونے لگتی ہے۔ مگر سب اللہ کی مخلوق ہے۔ یہ بزرگانِ دین سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہندو، سکھ، مسلم، عیسائی سب اشرف المخلوقات کے زمرے میں آتے ہیں اور یوں سمجھو کہ اللہ نے آپ کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے کا اہل سمجھا ہے اور تمہیں مقامِ ارتقاء جو بہت خوش نصیب لوگوں کا مقدر بنتا ہے۔ اس ڈگر پر آپ کو آنے کا شعور بخشا ہے۔ سب سے پہلے حرام اور حلال کی تمیز کا جاننا ضروری ہے۔ پاک اور ناپاک۔ جائز اور ناجائز کا جاننا تو ہر انسان پر ویسے بھی فرض ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ کے حضور سجدہ کرنا۔ جو راحت جو سکون اور اطمینان سجدے میں سر رکھنے سے ملتا ہے۔ وہ کسی میڈیسن کسی ایکسرسائز سے نہیں ملتا۔ عاجزی اور انکساری سے سجدہ کرنا ہی بندگی ہے اور اس بندگی میں دو جہاں کی زندگی ہے۔

جب آپ کو بندگی میں لذت ملنے لگے گی تو آپ کی روح کو قرار آئے گا۔ تب آپ پر یہ سب راز عیاں ہونے لگیں گے۔ بابا حضور پھر کیا ہم آنکھ کی پتلی کا راز جان سکیں گے اور گلاب میں خوشبو کہاں پوشیدہ ہے؟" نایاب نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ ساری رمز کی باتیں ہیں۔ بس ان کو کشید کرنا پڑتا ہے۔ جیسے آپ کو یہ تو معلوم ہے نا کہ دہی، لسی، مکھن اور گھی یہ سب چیزیں دودھ سے برآمد ہوتی ہیں۔ مگر یہ تمام حاصل کرنے کا ایک پراسس ہوتا ہے۔ اگر کوئی آپ کے سامنے دودھ کا پیالہ رکھ کر خواہش کرے کہ یہ دودھ ہے۔ آپ اس

سے مکھن، گھی، دہی اور لسی نکال کر مجھے دو۔ تو کیا آپ نکال کر دے سکیں گے۔ نہیں نا۔ جب تک اس دودھ کو گرم کر کے اس میں دودھ کی بلوئی ہوئی لسی کی کھٹاس کا چمچ بھر کر نہیں ڈالیں گے۔ تب تک وہ دودھ ہی پڑا رہے گا۔ مگر جب اسے کھٹاس کی صحبت حاصل ہوگی تو وہ فوراً جم جائے گا اور صبح تک دہی کی شکل اختیار کر لے گا۔ پھر دہی کو بلو کر مکھن اور مکھن سے گھی برآمد ہو جائے گا۔ اسی طرح جب آپ نفسانی خواہشات کو ترک کر کے سجدے میں لذت حاصل کر لیں گی تو پھر کسی کی صحبت آپ کو حقیقت سے آشنا کرنے کا گیان عطا کرے گی۔ مگر اس کے بعد آپ کو دودھ کی طرح جم کر رہنا ہوگا۔ تب ہی آپ کی حالت بدلے گی اور آپ کچھ اور رنگ اختیار کر سکو گے۔"

یہ ایک مہان گیانی کے الفاظ تھے۔ جو معیز اور نایاب کو سمجھائے جا رہے تھے۔

"آپ ہمیں اپنی شفقت سے نوازیں۔ ہم انشاء اللہ ضرور آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔" نایاب نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ تب ان دونوں کو دربار قلندر پر حضرت سخی عبداللہ پر حاضری دینے کا حکم ملا اور کچھ دیر وہاں مزار کے قریب مراقبے میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ معیز اور نایاب کمرے سے برآمدے ہوئے اور دربار کی چند سیڑھیاں عبور کر کے اندر پہنچے۔ مزار سبز غلاف سے ڈھکی تھی۔

نہایت ادب سے جھک کر بوسہ دیا گیا۔ فاتحہ خوانی کی گئی اور پھر معیز بھی نایاب کو کاپی کرتے ہوئے نیچے بچھی چٹائی پر مراقبے کی حالت میں بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ مگر معیز کو یہ بڑا عجیب سا لگا۔ چند ثانیے بعد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ یہاں ہر سو گہری پر اسرار سی خاموشی برس رہی تھی۔ معیز کی نظریں کچھ دیر تک اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ اس نے ایک بار پھر پلکیں بند کر کے [illegible] اس کی سماعت میں کہیں دور روڈ سے گزرتی ٹریفک کی آواز گونجتی۔ پھر اسے باہر کسی پیڑ پہ کاں کاں کرتے کوے کی آواز سنائی دیتی۔ پھر سناٹا پھر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز۔ پھر گہری خاموشی۔۔۔ سناٹا۔۔۔ کوے کی آواز اور بلند ہوتی ہوئی جیسے اس کی خاموشی کے تسلسل کو جھنجوڑتی ہوئی مخل ہو رہی ہو۔ مگر وہ بدستور ساکت بیٹھا رہا۔ دل کی دھڑکن اس کے کانوں میں دھک دھک ابھرنے لگی۔

پھر بدن کے اندر سے ابھرنے والی دھڑکنیں اس کی سماعتوں کو متاثر کرتی ہوئی گزرنے لگیں۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم میں کئی مشینیں ایک ساتھ ورک کر رہی ہوں۔ وہ ان آوازوں کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی سانسیں ان آوازوں پر حاوی ہونے کی کوشش میں تھیں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ان دیکھی آوازوں کے ماحول میں ڈوبتا گیا۔ وہ ساری آوازیں، وہ ساری دھڑکنیں مل کر اپنی اپنی زبان میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ جیسے کسی مدرسے سے آنے والی بچوں کے پڑھنے کی آوازیں ابھر رہی ہوں۔ اندر کی آوازوں کا شور برپا تھا۔ پندرہ منٹ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ دو انسان ایک دوسرے کے پاس موجود تھے۔ مگر دونوں ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر تھے۔ ان کے اندر برپا ہونے والا شور کسی ایک ہی لفظ کی تکرار کر رہا تھا اور پھر ان بے ربط صداؤں نے کورس کی شکل میں پہلے ہا ہو...... لی ہو...... لی ہو...... لا ہالی...... لی ہاو...... جیسی شور نما آوازوں کی صورت اختیار کر لی۔ معیز کافی ڈسٹرب ہونے لگا۔ یکایک اس نے بوکھلاہٹ میں آنکھیں کھول دیں۔ پل بھر میں سارا منظر ہی بدل گیا۔ باہر کی آوازوں نے اندر کے شور کو ختم کر ڈالا۔ نایاب اپنی جگہ جوں کی توں ساکت حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔ اب اس کی تھوڑی اس کی چھاتی سے جا لگی تھی۔ معیز نے دائیں بائیں گردن کو حرکت دی اور بیٹھنے کا زاویہ تبدیل کیا۔ اسے ایک عجیب سی بے چینی اور اکتاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔

جبکہ نایاب اپنے اندر کی دنیا میں کھو چکی تھی۔ اس سے قبل وہ بی بی پاکدامن کے دربار پر کافی دیر تک مراقبے کی پریکٹس کر چکی تھی۔ مگر آج یہاں اس کی کیفیت ہی اور تھی۔ وہ جیسے ہی مراقبے کی حالت میں بیٹھی۔ مختلف آوازوں نے اس کی قوت سماعت اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

کافی دیر تک ان گمنام سی صداؤں کا شور برپا تھا۔ پھر یہ آوازیں بٹنے لگیں۔ بیس منٹ کا دورانیہ گزر چکا تھا۔ جب ان صداؤں نے لفظوں کی صورت اختیار کی۔ ہا۔۔۔ ہو۔۔۔ دھک۔۔۔ لی ہو۔۔۔ لی ہو۔۔۔ پھر لا ہو۔۔۔ لا ہو۔۔۔ پھو لا۔۔۔ ہو۔۔۔ لہو

۔۔۔لہو۔۔۔لہا۔۔۔لہا۔۔۔لا ہو۔۔۔لا ہو۔۔۔لا۔۔۔ہو۔۔۔لا۔۔۔ہو۔۔۔پھر اللہ ہو۔۔۔اللہ ہواور پھر اللہ ہو۔۔۔اللہ ہو۔۔۔اللہ ہو۔۔۔میں صاف آواز سنائی دینے لگی۔نایاب مکمل طور پر اس استغراق میں ڈوب گئی اور لذت اسم اعظم سے مدہوش ہونے لگی۔

ادھر معیز کی قوت برداشت مفلوج ہونے لگی۔تو اس نے نایاب کو جھنجوڑا۔

”نایاب پلیز بس کرو نا۔بہت ہو گئی یار۔نایاب پلیز“۔

”آں۔۔۔“ وہ جیسے کسی گہری غنودگی میں تھی۔مگر معیز نے اس کی کلائی دو انگلیوں میں تھام کر اسے جھنجوڑ سا دیا۔نایاب کے پورے بدن میں ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔اس نے گردن اٹھا کر چھپاک سے آنکھیں کھولیں۔حیرت سے معیز کو جھانکا۔

”کیا؟اف مائی گاڈ۔یہ تم نے کیا کر دیا معیز۔یہ تم نے کیا کر دیا“ وہ اپنے گھٹنے کھڑے کر کے اس پر سر ٹکرانے لگی۔

”کیا ہوا نایاب پلیز؟“معیز حیرت سے پوچھ رہا تھا۔مگر وہ نہایت بے بسی کی حالت میں سسک رہی تھی۔اس کے سارے بدن پر لرزہ طاری تھا۔پھر وہ آگے بڑھ کر مرقد مبارک پر جھکی اور شدت جذبات سے بوسہ دے کر سر ٹیک دیا۔وہ بہت نروس دکھائی دے رہی تھی۔معیز پریشانی کی حالت میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”نایاب پلیز یار کیا ہو گیا ہے تمہیں؟سنبھالو اپنے آپ کو۔تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے“معیز اسے یاد دلا رہا تھا کہ تم ہارٹ کی پیشنٹ ہو۔“

”او معیز“نایاب نے مرقد سے سر اٹھایا اور معیز کی طرف جھانکا۔اس کی آنکھیں مدہوش تھیں اور ہونٹوں پر کپکپی سی امڈ رہی تھی۔

”معیز آپ نے بھی اپنے اندر سے کچھ سنا۔میں نے۔۔میں نے سنا ہے۔وہ اللہ ہو۔۔۔اللہ ہو کی صدا میرے دل سے برآمد ہو رہی تھی۔وہ دل کی دھڑکن نہیں تھی۔وہ تو اللہ ہو کا ذکر ہو رہا تھا۔آپ نے بھی تو یہ آواز سنی ہو گی“۔

”نہیں۔۔“معیز حیرت سے انکار میں سر ہلا رہا تھا۔

”تو سنو نا۔پہلی بار ایسا نہیں ہوا۔میں یہ عمل کئی بار کر چکی ہوں۔مگر آج یہ ثمر آور ثابت ہوا ہے اور معیز یہ بابا جی کا فیض نظر ہے۔میں نے پڑھا ہے معیز کہ دنیا کی بھیڑ میں جاؤ تو اپنی پاکٹ کا خیال رکھنا۔کیونکہ وہاں پاکٹ تراش ہوتے ہیں اور جب کسی گیانی اور مرشد کے پاس جاؤ تو دل کا خیال رکھنا۔کیونکہ ان اللہ والوں کی نگاہ تمہارے قلب پر ہوتی ہے۔آج مجھ پر تو میرے بابا کی نگاہ فیض نے کرم کر دیا ہے۔میرا دل چاہتا ہے معیز۔میں آنکھوں کی کوٹھری بنا لوں اور اس میں پتلی کا پلنگ سجا لوں۔پھر اپنے دل کی صدا سے بننے والی تصویر کو یہاں بٹھا کر پلکوں کی چک ڈال دوں اور اس بے گھر کو صدا کیلئے آنکھوں میں رکھ لوں۔کاش آپ مجھے نا جھنجوڑتے۔صدیاں گزر جاتیں اور میں اسی حالت میں بیٹھی رہتی۔آہ معیز آپ نے مجھے لذت دوام سے محروم کر دیا“۔

بھئی یہ تمہاری ساری باتیں میری سمجھ سے بالا تر ہیں۔مجھے یہ سب بڑا عجیب دکھائی دے رہا ہے۔کتنی دیر تک میں تمہارے ساتھ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا ہوں۔بے ہنگم سے شور کے سوا مجھے تو کچھ بھی نہیں سنائی دیا۔آپ پتہ نہیں آنکھیں موند کر کونسا خواب دیکھ رہی تھیں؟“

”خواب نہیں وہ حقیقت تھی معیز۔کاش تم جان سکتے“ نایاب نے کہا اور اٹھ کر چل دی۔

”آؤ معیز بابا جی کے پاس چلتے ہیں اور ان سے درد دل کی دوا مانگتے ہیں“۔

نایاب کمرے میں جاتے ہی بابا جی کے قدموں میں سجدے کی صورت ادب سے جھک گئیں اور ان کے ہاتھوں کا بوسہ لے لیا اور رونے لگی۔

”کیا ہوا بابا۔دل کے محرم کو تو پا لیا۔اب بھی درد دل پانے کی طلب باقی ہے کیا۔؟“بابا جی نے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھا تو روح تک اتر گئی تاثیر مسیحائی کی۔

”جو آج میرے دل میں نور کا اجالا چمکا ہے بابا جی۔اس نے مجھے خود سے بیگانہ کر دیا ہے۔مگر میرا ساتھی ابھی نعمت سے محروم ہے۔اسے بھی اپنے نگاہ کرم کے فیض

سے نوازدیجئے باباجی"۔

"اس میں مقدر کا بھی بڑا عمل دخل ہے اور یہ بھی ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دل میں جلدی سما جاتا ہے۔ جس کی جتنی طلب بڑھ جاتی ہے۔ وہ اتنا ہی اس کے قریب ہونے لگتا ہے۔ یہ تو شوق اور طلب کی بات ہے بابا۔ ہم دعا کریں گے کہ اللہ تیرے ساتھی کا مقدر سنوار دے۔ ویسے وہ ابھی مجاز کی راہ میں بھٹک رہا ہے۔ جب اس کے مجاز کی منزل طے ہوگی تو پھر اگلی مسافت کا در کھلے گا"۔

"ہم بہت جلد مجاز کا مقام پار کرنا چاہتے ہیں۔ جلد ہی ہم اس کا فیصلہ کر کے آپ کو اطلاع دیں گے اور آپ کی شمولیت ہمارے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام ہوگا بابا جی۔ ہم آپ کو خود لینے آئیں گے یہاں"۔

"ہاں ضرور کیوں نہیں۔ آپ کی خوشیوں میں شریک ہو کر ہمیں خوشی ہوگی۔ بس اتنا خیال رکھنا بیٹا کہ اب تم ایک اعلیٰ سوسائٹی کی ایک آزاد خیال فرد نہیں ہو۔ ہر کام اور ہر بات میں اس کی حرمت کا پاس خیال رکھنا تمہارے لئے ضروری ہوگا۔ جو آپ کی دھڑکنوں کی آواز بن چکا ہے"۔

"جی حضور میں جانتی ہوں کہ چادر کا تقدس عورت کیلئے کس قدر اہم ہوتا ہے۔ ہم کلمہ گو مسلمان ہیں۔ تو ہمارا مذہب ہمیں زندگی گزارنے کیلئے کیا حکم دیتا ہے۔ جس رسول پاک ﷺ کے ہم امتی ہیں۔ جو عشق حقیقی کی رمز ہیں۔ ان کے اقوال اور ان کے افعال ہمارے لئے کتنے مشعل راہ ہیں"۔

"شاباش بیٹا۔ اللہ کے علم اور عشق نبی میں بے پناہ اضافہ کرے"۔

"تو باباجی آپ ہمیں اپنی بیعت کرلیں نا"۔

"ابھی نہیں بیٹا۔ پہلے مجاز عشق کو پالو۔ پھر بیعت کر کے تمہیں وصال حق سے بھی آشنا کر دیا جائے گا۔ کسی بھی کام کیلئے ارادہ اور نیت کرنا ہی اس کام کا آغاز ہوتا ہے اور وہ آپ کر چکی ہیں۔ اب جوں جوں وقت گزرے گا۔ آپ ہر قدم پر نئے انکشاف اور نئے رازوں سے آشنا ہوں گی۔ جو آپ کے ذوق کو دوبالا کرے گا اور آپ کے ایمان میں پختگی آئے گی۔ ہم اپنی تخلیق شدہ چند کتب آپ کو دے رہے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے سے نہ صرف آپ کے علم میں اضافہ ہوگا۔ بلکہ آپ مسلم اور مومن میں امتیازی فرق کی اہمیت کو جان سکیں گی۔ کیونکہ مسلم ہو جانا کوئی کمال نہیں رکھتا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے نماز، روزہ، حج، زکوۃ کی بھرپور انداز میں ادائیگی کرنے سے انسان مومن نہیں بن سکتا۔ بلکہ مومن کہلانے کا وہ حقدار ہوتا ہے۔ جو اپنے پیر کامل کی ہر بات پر ایمان لے آئے اور اسے دل و جان سے تسلیم کرلے۔ بس مان جانے والا ہی مومن کہلاتا ہے اور مومن کے بارے میں حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں قرآن
ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں، اللہ کی ہو برہان

جب تک مسلم مومن نہیں بنتا۔ تب تک اس کا ایمان مکمل نہیں ہوتا اور جب تک ایمان مکمل نہ ہو۔ اس پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ انسان جس قدر عاجزی اور انکساری میں آنے لگتا ہے۔ اسی قدر اس کے من میں چھپی کستوری کی وہ بند پڑیا کھلنے لگتی ہے۔ مہکنے لگتی ہے۔ جس کی مہک اس انسان کو اللہ اور اللہ کے حبیب کے قریب کر دیتی ہے اور تمام انسانوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دیتی ہے۔ عشق نبی ﷺ جس من میں اتر جائے۔ دونوں جہاں میں اس سے بڑھ کر کوئی خوش نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب بھی سجدے میں سر جھکاؤ۔ اللہ کی حمد و ثنا کرو اور جب بھی دعا مانگو عشق مصطفی ﷺ کی اللہ سے بھیک مانگا کرو۔ ہر حال میں اس ذات کا ذکر کرنے میں وقت گزارنے کی کوشش کرنا۔ دولت مندوں کی اس مصنوعی زندگی سے آزاد ہو جاؤ گی اور بوریا نشینوں کی سادگی میں شہنشاہی کا لطف اٹھاؤ گی"۔

بابا جی نے نصیحت کرتے ہوئے کتنی ہی باتیں بتا دیں۔ جو سب کیلئے مفید اور انمول تحفہ ہیں۔ کاش کوئی اس طرف دھیان دے اور اپنی عاقبت سنوار لے۔ نایاب نے بہت سی رقم نقدی کی صورت میں بطور نذرانہ پیش کی۔

"فرمایا گیا۔ اللہ کی راہ میں بانٹ دو۔ حاجتمندوں اور مفلسی میں بھی نا مانگنے والوں کو دیا کرو۔ زیادہ قبول کیا جاتا ہے اور اس عمل کے درجات بہت بلند ہوا کرتے ہیں"۔

نایاب اور معیز نے بہت ادب سے جھک کر سلام عرض کیا اور پھر گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"سچ بتانا معیز۔ یہاں آنا کیسا لگا آپ کو؟ میری تو دنیا ہی بدل گئی ہے اور اب یہاں سے جانے کو دل ہی نہیں مان رہا۔ جی چاہتا ہے قلندر کے در پہ پڑی رہوں۔ جن کی بدولت ہماری بگڑی بھی سنور گئی"۔

"مگر میں آپ کی باتوں سے اتفاق نہیں کرتا ہوں نایاب۔ یہ سچ ہے کہ یہاں بے پناہ سادگی ہے۔ اچھی باتوں کا درس ملتا ہے۔ یہ درویش لوگ بڑے مخلص اور ہمدرد انسان ہیں۔ مگر نایاب ہمارا طبقہ ان تمام جھمیلوں سے قطعی الگ تھلگ ہے۔ ہم نرم و گداز قالینوں، صوفوں اور گدوں پر شب بسری کرنے والے نازک اندام لوگ ہیں۔ یہ خاک نشیں زمین پر بوریا ڈال کر سونے کے عادی ہیں۔ ہم ایک بڑے شہر کے امیر ترین علاقے ڈیفنس کے شہری ہیں۔ یہ تمام انسانوں سے الگ تھلگ قبروں اور مزاروں کے پاس جھونپڑہ نما مکانوں کے مکیں ہیں۔ اب ان کی خوراک، ان کا لباس، ان کا تمام تر رہن سہن مختلف ہے۔ میرا تو یہاں دم گھٹنے لگا تھا۔ میں آپ کی وجہ سے یہاں رکا رہا۔ ورنہ عام حالات میں تو میں یہاں آنے کا سوچتا بھی نہیں۔ ہمارا تعلق ایک گریجویٹ خاندان سے ہے اور ہم بڑے باعزت معاشرے کے افراد ہیں۔ ہم ایک باشعور اور سمجھدار لوگوں کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ جاہل اور اجڈ قسم کے دیہاتی لوگ ہیں۔ جو جانوروں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں اور جانوروں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔

پیر پرست اپنے وڈیروں اور پیروں فقیروں کے قدموں میں سر جھکانے والے اور درباروں پر ٹکریں مارنے والے لوگ۔ جن کو ذرا بھی شعور نہیں کہ اللہ سے مانگا جاتا ہے۔ یہ بابا طرز کے لوگ بس سادھو ہوتے ہیں۔ ہوش و ہواس سے بیگانے لوگ۔ تھنگ یار تھنگ۔ آئی ایم ویری کنفیوژڈ"۔

معیز نے تو جیسے اپنے اندر کا سارا غبار ہی نکال دیا ہو اور نایاب کے خیالات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہو۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں معیز۔ میں حیران ہو رہی ہوں کہ یہ ساری باتیں آپ کہہ رہے ہیں۔ بہت دکھ ہوا ہے معیز مجھے۔ بہت تکلیف پہنچی ہے میرے دل کو۔ آپ کے یہ ویوز جان کر۔ آپ ان بزرگ ہستیوں کو جاہل اور اجڈ کہہ رہے ہیں۔ انہیں جانوروں سے تشبیہ دے رہے ہیں آپ۔ اُف مائی گاڈ۔ نو معیز نو آپ نے میری تذلیل کی ہے۔ آپ نے جتنا کچھ ان کی شان میں کہا ہے۔ وہ سب میری انسلٹ میں کہا ہے۔ ویری سیڈ آئی ایم ویری سیڈ معیز"۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں نایاب؟ میں نے کب آپ کو ایسا کہا؟ میں تو۔۔۔"

"اب اس سے آگے اور کچھ نہ کہنا معیز۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں چیخ کر گاڑی سے کود جاؤں گی۔ اُف خدایا" نایاب نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر چلانے کے انداز میں چھما چھم رودی ماحول کافی گمبھیر ہو گیا تھا۔ معیز بے حد کنفیوژن کا شکار ہو گیا۔

"پلیز نایاب۔ پلیز۔ یہ کیا بچگانہ حرکت ہے۔ آئی ایم سوری۔ آئی ایم سوری"۔

معیز کے لہجے میں تناؤ تھا۔ نایاب بہت جذباتی ہو رہی تھی اور گلا پھاڑ کر چیخنے کے انداز میں رو رہی تھی۔ جیسے بین کر رہی ہو۔ اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ اس کی چادر سر سے ڈھلک گئی تھی اور بال بکھر کر چہرے کو ڈھانپنے لگے تھے۔ معیز اس کی حالت پر بوکھلانے لگا تھا۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ قطعی دھیمی کر لی تھی۔ نایاب کو ہارٹ کی تکلیف ہو سکتی تھی۔

"اف خدایا میں کیا کروں؟" معیز اضطرابی کیفیت میں سر پیٹ کر رہ گیا اور گاڑی سڑک سے اتار لی۔ شاید وہ رکنا چاہتا تھا۔ نایاب کو سنبھالنا چاہتا تھا۔ نایاب چیخ اٹھی۔

"خدا کے لیے گاڑی روکو۔ میں میڈیسن لینا چاہتی ہوں"۔

معیز نے گاڑی روکی اور اس کا پرس کھول کر اس کی میڈیسن نکالی۔ نایاب کی طرف ٹیبلٹ کا پیکٹ کیا۔ پانی کی بوتل کا کیپ اُتار کر اس کے لبوں سے لگائی۔ نایاب نے چند گھونٹ پانی پیا اور گولی زبان کے نیچے رکھ لی۔ اسے ابکائی سی آئی۔ ٹیبلٹ اچھل کر ڈیش بورڈ پہ جا گری۔ معیز نے دوسری ٹیبلٹ نکال کر اسے دی۔ نایاب نے وہ منہ میں رکھ لی۔ پاؤں سامنے پھیلا دیئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اسے کھانسی سی آنے لگی تھی۔

معیز نے اس کے دونوں شانے زور زور سے دبائے اوراس سے سوسوری سوسوری بولے چلا جارہا تھا۔ دس منٹ کا دورانیہ قیامت خیز گزرا۔ پھراس کی حالت نارمل ہونے لگی۔ سیٹ کی پشت کو کھول کر پیچھے ڈال دیا گیا۔ نایاب سیدھے رخ پہ لیٹ گئی۔ اب معیز نے اسے فوری کسی ہاسپٹل لے جانے کا سوچا اور گاڑی کا رخ فیصل آباد کی طرف موڑ دیا۔

دیو ہیکل آرام دہ گاڑی روڈ پر سرپٹ دوڑنے لگی۔ الائیڈ ہاسپٹل فیصل آباد کے ایمرجنسی وارڈ پر اس نے گاڑی روکی۔ اسٹریچر پر نایاب کو اندر پہنچایا گیا۔ معیز نے ڈاکٹر کو چیخ کر بتایا تھا کہ ہارٹ پرابلم ہے پلیز۔ ہنگامی طور پر اسے بیڈ پر ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔ معیز کا گلا خشک ہو چکا تھا اور اس پر بدحواسی کی سی کیفیت چھارہی تھی۔

پھر اس نے نایاب کی مما کو کال کر کے بڑے ضبط اور تحمل بھرے انداز میں بتا دیا کہ واپسی پر نایاب کو ذرا سی تکلیف ہو گئی ہے اور میں اسے فیصل آباد کے الائیڈ ہاسپٹل میں لے کر پہنچا ہوں۔ اب اس کی حالت کافی بہتر ہے۔ امید ہے دو تین گھنٹے بعد ہمیں گھر جانے کی اجازت مل جائے گی۔ بیگم کامران بہت پریشان ہو گئیں۔

''نہیں بیٹا میں ابھی آرہی ہوں۔ کیا کروں نایاب کو سفر سے روکا بھی تھا مگر وہ کب کسی کی مانتی ہے۔ میں رابطہ کرتی ہوں۔ شاید مجھے فیصل آباد جانے والی کوئی فلائیٹ مل جائے تو''۔

معیز نے بھی پی آئی اے کے آفس میں رابطہ کیا مگر اسے بتایا گیا کہ آج صرف کراچی سے آنے والی ایک فلائٹ شام کو پہنچے گی اور پھر وہی لاہور کیلئے روانہ ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اور کسی فلائٹ کی آمد نہ ہو گی۔ معیز نے پھر آنٹی کو کال کر کے بتایا۔

''ادھر آنے والی کوئی فلائٹ آپ کو نہیں ملے گی۔ پلیز آپ رہنے دیں''۔

''نایاب ٹھیک ہے۔ ہم آجائیں گے''۔

''مگر بیٹا اس کو اس حالت میں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ کم از کم آج رات تو وہ وہیں ریسٹ کرے۔ میری اس سے بات کروا دیں۔ اس کا سیل آف جا رہا ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں''۔

''ٹھیک ہے تھوڑا ویٹ کریں۔ میں باہر ہوں۔ بات کرواتا ہوں آپ کی'' معیز نے کہا اور کال آف کر لی۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد اسے نایاب کے پاس جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک نرس اس کے سرہانے سٹینڈ پر اس کی فائل میں کچھ لکھ رہی تھی۔ نایاب پلکیں موند کر پرسکون لیٹی تھی۔

''سسٹر میں ان سے بات کر سکتا ہوں؟''

''ہاں مگر زیادہ ڈسٹرب نہیں کرنا۔ انہیں بہت ریسٹ کی ضرورت ہے''۔

نرس نے کہا اور اگلے مریض کی طرف بڑھ گئی۔ معیز نایاب کے بیڈ کے ساتھ لواحقین کیلئے رکھے گئے لکڑی کے بینچ پر ہی بیٹھ گیا۔ اب اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ نایاب کو مخاطب کرے یا اس سے کوئی بات کرے۔ وہ تذبذب میں تھا۔ کچھ دیر بعد نایاب نے ایک لمبی سی اونگھ بھری اور ذرا سا کسمسائی تو معیز اس پر جھک سا گیا۔

''ن۔۔۔۔۔نایاب۔۔۔۔۔ نیو دیکھو تو۔۔۔۔''

معیز نے اپنی ساری توانائی جمع کر کے بمشکل کہا۔ نایاب کی بند پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر معیز کا پریشان چہرہ دیکھا۔ ذرا سا چونکی۔ جیسے کچھ یاد آیا ہو۔ پھر زور سے پلکیں موند لیں اور لب کھول کر ایک دردبھری آہ بھری۔ ایسے میں اس کی آنکھوں کے کونوں سے دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے گالوں پر بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔ معیز کی جان پہ بن آئی۔

''خدا کیلئے مجھے معاف کر دو یار'' وہ دونوں ہاتھ باندھ کر روسا دیا اور پھر نایاب کے بہتے آنسوؤں کی لڑی کو اپنی انگلیوں سے سمیٹ لیا۔ ایسے میں نایاب کے ہاتھوں نے معیز کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اپنی ٹھوڑی کے نیچے انہیں بھینچ ڈالا۔ اس کے آنسوؤں کی قطار اس کے گالوں پر بہتی گئی۔ وہ لمحے معیز پر وزنی پہاڑ کی مانند گر رہے تھے اور وہ بہت کرب میں مبتلا تھا۔ درد سے اس کی آواز اس کے گلے میں رندھ گئی تھی۔

''ایسے تو نہیں کیا کرتے نا۔ دیکھو تو مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ اپنے بابا کے نام پر مجھے معاف کر دو پلیز''۔

ایسے میں نرس معیز کے قریب آن رکی۔

"یہ آپ کیا کررہے ہیں۔ میں نے کہا ہے ناکہ مریض کو ڈسٹرب نہ کریں۔ وہ نیم غنودگی کی حالت میں ہے۔ جب مکمل صحت بحال ہوگی تو خود ہی آپ سے بات کرلیں گی۔ آپ کیوں زبردستی اسے بات کرنے پر مجبور کررہے ہیں۔ پلیز۔ آپ ان کے پاس خاموشی سے موجود رہیں۔ کسی بک یا نیوز پیپر سے وقت گزاری کریں"۔

"ٹھیک ہے سسٹر" معیز نے کہا اور پلٹ کر اپنی جگہ بیٹھ رہا۔ تب اسے یاد آیا کہ بابا جی نے نایاب کو چند کتابیں مطالعہ کیلئے دی تھیں۔ جو گاڑی میں ہی پڑی تھیں۔ اگلے دس منٹ تک وہ کتابیں اٹھا لایا اور ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ شب کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ معیز کا دل پڑھنے پر مائل نہیں ہو رہا تھا۔ بس وہ ورق گردانی کرتے ہوئے ایک آدھ سطر پڑھتا۔ جس کا کچھ مفہوم اس کی سمجھ میں نہ آتا تو وہ اگلا ورق الٹ لیتا۔ پھر جب ایک جگہ اس نے پڑھا۔

"ناسمجھ لوگوں پر اچھی بات اثر نہیں کرتی۔ جیسے خشک لکڑی پر جتنا مینہ برس جائے اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ جبکہ سبز پودا ایک ایک بوند کو اپنے اندر جذب کر کے اس سے نئی زندگی حاصل کرتا ہے"۔

معیز یہ پڑھ کر چونک سا گیا اور پھر بغور آگے پڑھنے لگا۔

"جو انسان اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اس کی مثال اس جانور جیسی ہے۔ جس کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ ہرے بھرے کھیتوں اور پودوں کو تھوڑا تھوڑا چرتا جائے گا اور اگلے کھیت کی طرف بڑھ جائے گا پھر اس سے اگلے کھیت کی طرف دوڑ پڑے گا۔ وہ سب کچھ ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کبھی کر نہیں سکتا۔ اس کی ہوس اور بڑھتی جائے گی اور سب کچھ پانے کیلئے باؤلا بن کر بھاگتا چلا جائے گا۔

اب جو شخص ہر روز گوشت کھانے کا عادی ہو۔ اس کا نفس حیوانی بن جائے گا۔ اس کا دل سخت اور حریص بن کر دولت جمع کرنے اور دولت سے رنگ برنگے پکوان بنا کر کھانے اور آسائش کی چیزیں خریدنے پر مائل رہے گا اور ایک دن یہی ڈگر یہ چلتے چلتے ریت کے جھکڑ میں آ کر اس دنیا سے محروم چلا جائے گا۔ اس جانور کی طرح جو سبز

نیت

◻ ۔حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی لہٰذا جس نے دنیا حاصل کرنے کی نیت سے ہجرت کی اسے دنیا ہی ملے گی۔ جس نے کسی عورت سے نکاح کرنے کی غرض سے ہجرت کی اسے عورت ہی ملے گی پس مہاجر کی ہجرت کا صلہ وہی ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔ (بخاری)

نازش کنول......نارتھ کراچی

☆☆

دکھاوے کی نماز

◻ ۔حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کیا میں تمہیں دجال کے فتنے سے زیادہ خطرناک بات سے آگاہ نہ کروں؟ ہم نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ شرک خفی دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو اور نماز کو اس لیے لمبا کرے کہ کوئی آدمی اسے دیکھ رہا ہے۔ (ابن ماجہ)

شیخ ساجد تنویر......ڈیرہ غازی خان

☆☆

ایک اللہ والے کی حکایت

ایک چور ایک دین دار پرہیزگار آدمی کے گھر میں چلا گیا۔ اس نے بہت تلاش کیا مگر کچھ نہ ملا۔ رنجیدہ ہوا اور ناامید ہو کر واپس جانے کا ارادہ کیا۔ گھر والا سمجھ گیا وہ جس کملی پر سویا ہوا تھا چور کے راستہ میں ڈال دی تاکہ بالکل خالی ہاتھ نہ جائے۔

میں نے سنا ہے اس طرح اہل اللہ نے دشمنوں کے دلوں کو بھی رنجیدہ نہیں کیا۔ اے مخاطب! تجھ کو یہ مرتبہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے اس لیے کہ تیری تو دوستوں کے ساتھ بھی لڑائی کھٹ پٹ اور مخالفت چلتی رہتی ہے۔ (گلستان ص ۴۸)

مرسلہ: مہوش......راولپنڈی

چارے کی طلب میں جنگل جنگل بھاگتا رہا۔ پیٹ بھرتا رہا اور اک دن یہاں سے کوچ کر گیا۔

جو جانور پالتو رکھے جائیں۔ ان کی خواہشات تو حیوانی ہوتی ہیں مگر وہ پھر بھی اپنے مالک کی پہچان رکھتے ہیں اور جو انسان مالدار ہو۔ بے پناہ دولت سے اپنے جسم کی پرورش کیلئے زمانے بھر کے پکوان صبح شام حاصل کر کے پیٹ میں اتارنے کا عادی ہو۔ وہ کیونکر اپنے مالک حقیقی کی پہچان کرے گا۔

جس نے یہ سب کچھ اسے دے رکھا ہے۔ وہ تو سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی دولت سے حاصل کیا ہے۔

کاش وہ جان لے کہ یہ دولت دینے والا کون ہے۔ یہ ساری نعمتیں دینے والی ذات جب چاہے اس سے یہ سب کچھ چھین لے۔ اسے جسمانی طور پر معذور کر دے۔ اس کی بینائی اس کی قوت گویائی سے اسے محروم کر دے۔ ایسے شخص کی زندگی جانور سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ جانور تو بے شعور ہوتا ہے اور انسان باشعور اور اشرف المخلوقات ہے۔ وہ پھر بھی اپنے مالک کی پہچان نہ کرے تو اس سے بڑھ کر اور اس کی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے۔ اگر تعلیم حاصل کرنے کیلئے استاد کا ہونا ضروری ہے۔ ہنر سیکھنے کیلئے بھی استاد کے بغیر چارہ نہیں تو اللہ کی پہچان حاصل کرنے کیلئے مرشد کا دست بیعت حاصل کرنا ہمارے لئے قباحت ہے۔ صندل کے درخت کے قریب نیم بھی صندل بن سکتا ہے۔ جیسے مقناطیس جس لوہے کے ٹکڑے کو ٹچ کرے تو وہ لوہے کا ٹکڑا بھی مقناطیس بن کر چھوٹے ذروں کو اپنی جانب کھینچ سکتا ہے۔

بھگت کبیر جو ایک فلسفی شاعر تھے۔ ان کا فرمان درج تھا کہ اگر میرے سامنے مرشد اور خدا دونوں میں کسی کے پاؤں پڑوں۔ میں تو گرو (مرشد) کے صدقے ہوں کہ انہوں نے خدا کی پہچان کرا دی اور سادھو (مرشد) کی سنگت عطر فروش کی دکان میں ہوتی ہے۔ وہاں اگر عطر فروش عطر نا بھی دے تو بھی تمہیں خوشبو ملے گی اور جس کا کوئی مرشد نہ ہو۔ اس کا مرشد ابلیس ہوتا ہے۔ جو اس کو کبر اور انا کے رستے پر چلا کر اسکی زندگی عاقبت دونوں برباد کر دیتا ہے۔"

معیز کو لگا جیسے اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ سے سر تھام کر رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ ساری باتیں میری ذات کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں۔ کیونکہ میں دولت مند ہوں اور اپنی خواہش کی تکمیل کیلئے ہر چیز خریدنے کی سکت رکھتا ہوں۔ جانور کی طرح اپنا پیٹ پالنے کیلئے طرح طرح کے پکوان سے ہر روز دستر خوان سجاتا ہوں۔ آسائشیں ساری چیزیں میسر ہیں۔ مگر کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ جس مالک نے یہ سب کچھ ہمیں دیا ہے۔ وہ جب چاہے واپس بھی لے سکتا ہے۔ اُف میں تو جانور سے بھی بدتر ہوں۔

نایاب کتنی خوش نصیب ہے کہ بے پناہ دولت اور امارت کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی اپنے مالک کی پہچان کے لئے سرگرداں ہے اور اپنے لئے اپنا مرشد تلاش کر چکی ہے۔ مگر میں اس کے ساتھ رہ کر بھی اس شعور سے محروم رہا اور ایسی ہستیوں کے خلاف جانے کیا کیا بکتا رہا۔ جو نایاب کے دل پر اثر انگیز ہوا اور وہ اس حال کو آ پہنچی۔

آگے چل کر یہ جو لکھا تھا کہ جنگلی درندہ انسان کا شکار کر کے اسے نگل جائے۔ تو وہ درندہ آدم خور کہلاتا ہے۔ جبکہ انسان جانوروں کو ذبح کر کے ہر روز کھاتا ہے۔ تو کیا وہ حیوان خوری کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور گوشت کی کوئی نا کوئی ڈش تو ضرور ہر شام اس کے کھانے میں شامل رہتی ہے۔ پھر میری سوچ کیونکر حیوانی نا ہے۔ ہمارا امیرانہ طبقہ اعلیٰ سوسائٹی اور باشعور معاشرہ کہلانے کا روادار ہی نہیں جو ہر طرز کی تعلیم سے آراستہ ہے۔ دولت کے بل بوتے پر سب کو تسخیر کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ اتنی سی بات کے علم سے بھی محروم ہے کہ میرا مالک کون ہے اور وہ کیا کچھ عطا کر رہا ہے۔ ہم نے کبھی اس کا شکر ادا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ جب کہ ہم اپنے ملنے والوں کے ذرا سے کام پر اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

"او مائی گاڈ" معیز خود پر نادم ہونے لگا۔

"اے پروردگار ہم کو معاف فرما۔ ہم تیرے بڑے ناشکرے بندے ہیں"

اسے نایاب پر بے حد پیار آنے لگا۔ اس نے اتنی پیاری باتیں بتانے والی کتاب [illegible]۔ اس کے دل و دماغ میں ایک بھونچال سا گزر رہا تھا۔

اس کے من میں چھپی گھور تاریکی، جہل کے گھپ

اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن پھوٹ رہی تھی۔ اس کے اندر چھایا لاعلمی کا کفر ٹوٹنے لگا تھا۔ جانے اس پر کیا چیز اثر انگیز ہونے لگی کہ وہ بے اختیار ہو کر اسی لکڑی کے لمبے سے بینچ پر سجدہ ریز ہو گیا اور رو دیا۔ اُس کے اندر سے درد کا ایک سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ وہ رات بھر سو نا سکا۔ کبھی لیٹ کر سونے کی کوشش کرتا۔ کبھی نایاب کے بیڈ سے ٹیک لگا کر ستا لیتا۔

شب کے آخری پہر میں نایاب نے یوں جھپاک سے آنکھیں کھولیں۔ جیسے کسی خواب سے چونک کر بیدار ہوئی ہو۔ معیز اس لمحے اس کے قریب رکھے بینچ پر آنکھیں موندے لیٹ رہا تھا۔ چہرے پر اس نے کتاب پھیلا کر رکھی ہوئی تھی۔ نایاب اٹھ کر بیٹھ رہی۔ اپنے بال سنوارے۔ چادر سے سر ڈھانپا۔ معیز کو بے خبر لیٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان آئی۔ اسکے بیڈ سے اگلے بیڈ پر مریض کے سرہانے رکھا گلاس اچانک زمین پر گرا۔ چھنا کے کی آواز سن کر معیز ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نایاب کو بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر وہ حیرت میں آیا اور تیزی سے اُٹھ کر پوچھا۔

”آپ ٹھیک ہیں نا۔ کوئی تکلیف تو نہیں نا“۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں معیز۔ آپ تو میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ مگر میں آپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ بابا جی میرے خواب میں آئے تھے۔ انہوں نے میرے دل پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری اور مجھے دلاسہ دیا کہ اب تم ٹھیک ہو۔ اب تمہیں کبھی دل کی تکلیف نہیں ہوگی۔ کیونکہ تو نے دل میں اس کو بسا لیا ہے۔ جو پوری کائنات میں نہیں سما سکتا اور تمہارا ساتھی معیز ابھی اس رمز سے نا آشنا ہے۔ اللہ نے چاہا۔ تو وہ بھی جلد ہی حق سے آشنائی کرنے والوں کی صف میں ہوگا۔ مجھے یقین ہے معیز کہ اب میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میں اس وقت خود کو مکمل صحت مند محسوس کر رہی ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے۔ کہ میں اٹھ کر اللہ کے حضور سجدہ کرلوں۔ پلیز آپ مجھے بیڈ سے اترنے میں مدد دو۔ میں واش روم جانا چاہوں گی“۔

معیز نے اس کے بازو پکڑے۔ نایاب بیڈ سے اتری۔ خود ہی شوز پہنے اور چل دی۔ معیز نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی۔ مگر اس نے انکار کر دیا کہ میں بالکل نارمل حالت میں ہوں اور مجھے چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی۔ پھر بھی معیز اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اسے نایاب کی اس قدر صحت یابی پر بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ اور بابا جی سے لگاؤ کا ایک نیا جذبہ اس کے من میں جاگا تھا۔

”آئی ایم سوری نایاب۔ مجھے خود پر بے حد افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کس قدر آپ کی دل آزاری کی اور بابا سرکار کی شان میں گستاخانہ باتیں کیں۔ ویری سوری میں نادم ہوں۔ نادانستگی میں جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ مگر بابا جی کی لکھی ہوئی اس کتاب نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں تو اس دنیا اور اس سارے نظام کائنات کو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔ میں خود کو بڑا باشعور گریجویٹ اور زمانہ ساز شخصیت سمجھتا تھا۔ مگر مجھے تو اپنی اصلیت کا بھی آج پتہ چلا ہے کہ اپنی ہستی اور اپنی ذات میں صرف اس حد تک با اختیار ہوں کہ میں ایک وقت میں صرف ایک پاؤں اٹھا سکتا ہوں۔ دوسرا پاؤں اٹھانے کا مجھے نا اختیار ہے نا طاقت۔ میں فوراً گر جاؤں گا۔ اس کتاب کے خالق نے مجھے بتا دیا ہے کہ میری ہستی کیا ہے؟ میں خود میں ہوں کیا؟ میری اوقات ہی کتنی ہے؟

ایسی باتیں ہمارے پورے تعلیمی نصاب میں بھی نہیں ہیں۔ جو علم یہ بزرگ ہستیاں رکھتی ہیں۔ وہ ڈگریاں رکھنے والے مہان اساتذہ بھی نہیں جانتے۔ آپ نے سچ کہا تھا کہ تعلیم اور علم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں قائل ہو گیا ہوں ان بزرگ ہستیوں کا۔ یہ لوگ تو بھگوان ہیں۔ خدا کے بہت قریب ہیں اور ان کی صحبت اختیار نا کرنے والا قطعی محروم و محکوم، نادار اور بدنصیب ہے۔ یہ مال و دولت، یہ بنگلے کوٹھیاں، اعلیٰ پکوان، اعلیٰ لباس، عمدہ گاڑیاں سب دکھاوا ہے۔ سب نمائش ہے۔ ہماری یہ اعلیٰ سوسائٹیاں، پست اور نچلے درجے کی سوسائٹیز ہیں۔

بخدا ہم جگمگاتے قمقموں کی روشنیوں میں رہ کر بھی اندھیروں میں ہیں اور وہ لوگ کٹیا میں دیا جلا کر بھی اجالوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم تعلیم یافتہ ہو کر بھی جاہل اور گنوار اور وہ جاہل ہو کر بھی اپڈیشک، گیانی اور بھگوان ہستیاں ہیں۔ ان کا تخیل پرواز کرے تو ستاروں پر کمند ڈال دے۔ وہ بوریا نشینوں کی زندگی گزارتے ہیں۔ مگر پورے زمانے کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ وہ ابدی سفر کے بعد ہزاروں میں پردہ نشین ہو کر آنے والے زمانوں کو بھی

اپنے در پر جوق در جوق سر جھکانے پر مجبور رکھتے ہیں۔ واللہ یہ بے شک کمال ہستیاں ہیں اور ہماری زندگیوں کیلئے مشعل راہ ہیں۔

"ہاں معیز۔ دیکھ لیں۔ آپ نے ان کی کرامات۔ مان گئے کہ یہ لوگ کس قدر قابل ستائش ہیں۔ کتنے دلوں پر اثر کرنے والے اعمال اور افعال کے مالک ہیں۔ نا کسی سے اپنی بدحالی کا شکوہ کرتے ہیں۔ نا کسی کی حوصلہ شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کوئی ان کو کچھ برا کہے تو ان کی جبیں پہ شکن نہیں آتی۔ حوصلہ شکنی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کا شیوہ ہے۔ برائی کا جواب بھلائی سے اور گالی کے بدلے دعائیں دینا ان کی خصلت ہے۔ یہ اپنے کردار میں اور گفتار میں اچھائی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کا قرب خدا کے قرب کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان سے محبت عشق کی معراج ہے۔ یہ انسانیت کے مسیحا ہیں اور یہ قرآن وسنت کی جاگتی مثال ہیں۔ ان برگزیدہ ہستیوں کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"یہ میرے برگزیدہ بندے میری قباء کے نیچے ہیں۔ جس نے ان سے بغض رکھا۔ انہوں نے مجھ سے عداوت کی اور جنہوں نے مجھ سے عداوت رکھی۔ انہوں نے خدا سے بغاوت کی اور خسارہ پانے والوں کی صف میں شامل ہوئے"۔

نایاب نے معیز کو ان بزرگ ہستیوں کے متعلق ان تمام باتوں کی وضاحت کی اور اس کے دل میں ایمان کی نئی قندیل روشن کی۔ معیز دل وجان سے باباجی کا شیدائی ہونے لگا۔ نایاب کی مما کو کال کر کے انہوں نے بتادیا۔

"نایاب مکمل طور پر نارمل حالت میں ہے اور ہم واپس آرہے ہیں"۔

دوران سفر بھی ان کا موضوع گفتگو یہی رہا۔

"ہمارا المیہ یہ ہے معیز کہ ہم اپنے دین سے بہت دور رہ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے سارے چلن ہی الٹے ہیں۔ رات ایک دو بجے تک جاگنا اور دن بارہ ایک بجے اٹھنا۔ یہ نا تو ہماری صحت کیلئے صحیح ہے اور نہ ہی اللہ کی بندگی اور دین سے آشنائی کیلئے موزوں ہے۔ وقت سحر اٹھ کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونا خوش بختوں کیلئے بیکراں انعام ہے۔ رزق میں برکت، بیماری میں شفا اور بے سکون دلوں کیلئے باعث راحت ہے۔

مساجد میں پانچ وقت اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ہم کبھی اذان سننے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کرتے۔ مسجد جا کر نماز ادا کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ہمیں نا رمضان المبارک کے مہینے کے تقدس کا پتہ ہے۔ نا شب برات اور شب معراج کی فضیلت کی خبر۔ ہم تو بس عید کی چاند رات شب بھر خریداری کرنے، بے مقصد روپیہ خرچ کرنے اور زرق برق لباس میں خوشنما پکوان پکا کر دعوتیں کھانے، پکنک منانے، میوزک اور الیکٹرونک میڈیا سے لطف اندوز ہونے میں عید گزار کے خود کو مسلمان ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عیدین کی رنگ رلیاں منانے سے ہماری اعلیٰ سوسائٹی کی خصوصی طور پر ینگ جنریشن کی اکثریت نافرمانی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ گلیمر اور انٹرنیٹ کی دوڑ میں لگائے جانے والے پوسٹر مساجد کے میناروں سے بلندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئی نسل کو اپنے نیٹ ورک کی ریڈیائی لہروں میں الجھا رہے ہیں۔ دین کی پناہ گاہوں اور عبادت گاہوں کو آباد کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن وسنت اور نماز کی تبلیغ کرنے کا وقت ہے۔ گھر کے سربراہ خود بھی آنکھیں کھولیں اور اپنی اولاد کو بھی دین کی رغبت دلانے کی طرف دھیان دیں۔ وقت گزر گیا تو پچھتاوے کی آگ ہمیشہ جلاتی رہے گی"۔

......☆☆☆......

راولپنڈی کی مدیحہ جو اپنے بچوں کے ساتھ رینٹ کے مکان میں رہ کر جاب کرتے ہوئے زندگی کے دن بسر کر رہی تھی۔ اس کے شوہر خالد نے نئی شادی رچا کر اپنی من مانی کا سودا کیا تھا۔ مگر چھ ماہ کے عرصے میں ہی نئے عشق کا سارا بھوت سر سے اتر گیا۔ اس کی نئی بیوی بہت فضول خرچ سیر وسیاحت کی شائق اور ہوٹلنگ کی رسیا تھی۔ کچھ عرصہ تو خالد اس کے سبھی چونچلے پورے کرتا رہا۔ مگر جب مقروض ہونے لگا تو بیوی کو سمجھایا کہ اس قدر شاہ خرچی سے اجتناب کرے۔ مگر اس کے اطوار جوں کے توں رہے۔ پیار محبت کی باتیں تلخی میں بدلنے لگیں۔ تلخی میں تکرار اور تکرار جھگڑے کی صورت اختیار کرنے لگی۔ کوئی دو ماہ کا عرصہ دن رات کے لڑائی جھگڑوں میں بسر ہوا۔ پھر اس کی بیوی اپنے میکے آگئی اور خالد سے ڈائیوورس کا مطالبہ کرنے لگی۔ خالد

کا گھر برباد ہوا تو اسے احساس ہوا کہ میری پہلی بیوی مدیحہ کس قدر میرے ساتھ صبر وتحمل سے گزارا کر رہی تھی۔ اسے فیصلہ دے کر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ناہید کی طرف سے وہ پوری طرح بدظن ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے خرچ وغیرہ دینے سے بچنے کے لئے اپنی بیوی ناہید کو عدالت سے رجوع کر کے طلاق لینے کا مطالبہ کیا۔ کچھ روز تو ناہید انکاری رہی کہ میں تمہارے خلاف کوئی دعویٰ نہیں کروں گی بس آپ مجھے طلاق دے دیں۔ مگر اس عرصہ میں اس کی ملاقات آصف نامی شخص سے ہوگئی۔ جو مالدار تھا۔ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ مگر اس کے ہاں اولاد نہ تھی۔ اس لئے دوسری شادی کا متمنی تھا۔ ناہید نے اس شرط پر رضامندی دی کہ آپ مجھے علیحدہ گھر میں رکھیں گے اور کچھ پراپرٹی میرے نام کروائیں گے۔ آصف نے اس کی یہ شرط قبول کر لی تو ناہید نے خلع کا دعویٰ دائر کر کے خالد سے ڈائیورس لے لی۔

اب خالد بہت پریشان تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بھی بہت مس کر رہا تھا اور وہ دوبارہ مدیحہ سے رجوع کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس میں پہلی قباحت تو یہ تھی کہ مدیحہ کبھی بھی دوبارہ اس کے پاس آنے پر رضامند نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اس سے بدظن ہو کر دلی طور پر اس سے نفرت کرنے لگی تھی اور اگر کسی طرح سے اسے مجبور بھی کر لیا جائے تو شریعت کے مطابق پہلے اس کا کہیں اور نکاح ہونا ضروری تھا۔ پھر ادھر سے ڈائیورس کے بعد یہ اس کو اپنی زوجیت میں لے سکتا تھا۔ یہ ایک مشکل اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ اس کے بہن بھائی اور والدہ اس پر زور دے رہی تھیں کہ تم مدیحہ کو واپس لے آؤ۔ اپنے کسی دوست سے اس کا نکاح کر دو۔ دو تین ماہ بعد طلاق لے کر اُسے اپنی بیوی بنا کر گھر لے آؤ۔ کسی دوست سے بات کرنے سے پہلے وہ مدیحہ کی رائے لینا چاہتا تھا کہ وہ کیا فیصلہ کرتی ہے۔ بالآخر اس نے اپنی ماما اور بڑی بہن کو مدیحہ کے گھر بھیجا۔ مگر مدیحہ صاف انکاری ہوگئی کہ یہ زہر کا گھونٹ ہے اور میں کبھی بھی یہ نہیں پی سکتی۔ انہیں مایوس لوٹنا پڑا۔

ایسے میں مدیحہ نے معیز اور نایاب کو کال کر کے بتایا کہ "یوں خالد دوبارہ مجھ سے نکاح کا خواہش مند ہے۔ مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔ اب دیکھو وہ میرے ساتھ کیا

آوازِ ضمیر

وہ شخص اپنی قوم پر تباہی لاتا ہے جو کبھی بیج نہیں بوتا۔ نہ کبھی تعمیری اینٹ اٹھا کر اینٹ پر رکھتا ہے اور نہ کبھی کپڑا بنتا ہے لیکن سیاست کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔

آفاق اس چراغ کو تیل سے بھرتا ہے اور میں اسے روشن کر کے اپنے گھر کی کھڑکی میں رکھ دیتا ہوں تا کہ رات کی تاریکی میں راہگیر بھٹکنے نہ پائیں۔

جو گھر حاجت مند کو روٹی کا ایک ٹکڑا اور ضرورت مند کو ایک بستر کی جگہ دینے میں بخل سے کام لے وہ بربادی کے قابل ہے۔

ثوبیہ جہانگیر...... آزاد کشمیر

دلچسپ اور عجیب

انوکھا موسیقار۔ لندن کا موسیقار جان اسمتھ اپنی ٹھوڑی کو ڈھول کی طرح پیٹ کر برطانیہ کے تمام ہر دلعزیز گانوں کے سر نکال سکتا تھا۔

عجیب مینڈک۔ آسٹریلیا میں بلی جتنے بڑے مینڈک پائے جاتے ہیں جو کہ اٹھارہ فٹ لمبی چھلانگ لگاتے ہیں۔

شیشے کا آدمی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں چین میں ایک آدمی کا جسم اس قدر شفاف تھا کہ اس کے تمام اندرونی اعضا بخوبی نظر آتے تھے۔

دو دماغ والا بندر۔ امریکہ میں آج بھی ایسے بندر پائے جاتے ہیں جو دو دماغ رکھتے ہیں۔ ایک دماغ ان کے جسم کو اور دوسرا ان کی دم کو کنٹرول کرتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا چمگادڑ۔ فروٹ بیٹ دنیا کا سب سے بڑا چمگادڑ ہے۔ یہ ملائیشیا میں پایا جاتا ہے اور اس کی لمبائی پانچ فٹ ہوتی ہے۔

شبانہ صابر...... جتوئی

انتقامی کارروائی کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کا دماغ تخریب کار ہے اور وہ انا پرست اور کینہ رکھنے والا انسان ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی۔ میں کیا کروں؟ اگر میں لاہور چلی آؤں۔ تو کیا مجھے سپورٹ کریں گے آپ؟ میں وہاں رینٹ کے مکان میں رہ لوں گی اور کہیں جاب کرلوں گی"۔

"دیکھیں مدیحہ میں آپ کو اپنے گھر میں چند دن رہائش اور کھانا بھی دے سکتی ہوں۔ جب تک تمہیں مکان اور جاب نہ مل جائے۔ آپ میرے پاس رہ سکتی ہیں اور بھی جو ممکن ہوسکا۔ آپ کے ساتھ معاونت بھی کرتی رہوں گی۔ ویسے اس دور میں تنہا عورت کا زندگی گزارنا خاصا دشوار گزار ہے۔ اگر آپ کہیں کسی اور ہمسفر کا انتخاب کرلیتیں تو آپ کے لیے آسانی ہو جاتی۔ ابھی آپ جوان ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں۔ بہت مشکل ہوگا آپ کیلیے۔ باقی آپ مجھ سے بہتر سوچ سکتی ہیں"۔

"ہاں آپ کی بات درست ہے۔ یہاں بھی مجھے ایسے مسائل درپیش ہیں۔ مگر اس کا فیصلہ میں لاہور میں رہ کر کروں گی۔ یہاں کا نجوگ میرے لیے وہاں مسائل پیدا کرے گا۔ میں نے تو مستقل سکونت وہیں رکھنی ہے۔ تو پھر کیوں نہ ساتھ بھی مقامی ہو۔ آپ کا شکریہ۔ کہ آپ نے اس مشکل وقت میں مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ میں عنقریب ہی چلی آؤں گی اور آنے سے قبل آپ کو انفارم بھی کردوں گی"۔

نایاب دلی طور پر تو مدیحہ کو اپنے گھر میں ایک دن کے لیے بھی رکھنے کو تیار نہ تھی۔ مگر وہ تنہا عورت ذات کے ساتھ بطور ہمدردی اس نے چند روز کے لیے ہامی بھر لی تھی۔ پھر بھی معیز نے اس سے کہا تھا۔

"مدیحہ کا آپ کے گھر آنا کچھ مناسب نہیں ہے۔ خالد پہلے ہی ہمیں بہت ذہنی طور پر ٹارچر کر چکا ہے۔ اب اسے مدیحہ اور بچوں سے ملنے کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ تو وہ پھر کوئی نیا ڈرامہ رچائے گا"۔

مگر نایاب نے اسے ڈھارس دی کہ خالد کو اس گھر میں داخل ہونے کی قطعی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ بات میں پہلے ہی مدیحہ سے طے کرلوں گی اور مدیحہ نے صاف کہہ بھی دیا ہے کہ "آپ بے فکر رہیں۔ اگر خالد یہاں چلا آیا۔ تو میں اسے آپ کے گھر میں داخلے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی اور نا ہی وہ یہاں آنے کی جرات کرے گا"۔

لہذا اگلے ماہ کے پہلے ہفتے مدیحہ اپنے گھر کا مختصر سامان اور بچوں کو لیے نایاب کے گھر آن پہنچی۔ اسے علیحدہ دو کمرے کچن اور واش روم کی سہولت فراہم کر دی گئی۔ چوتھے دن اسے ایک جیولری کی دکان پر جاب مل گئی۔ معقول سیلری تھی۔ مکان کی تلاش میں پندرہ دن گزر گئے۔ پھر جو مکان ملا۔ اس کی پگڑی کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم بھی نایاب نے اپنے پلے سے خرچ کی۔ جو قابل واپسی تھی۔

مدیحہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے مکان میں چلی گئی۔ جو شوکت ٹاؤن میں ڈیفنس سے زیادہ دور نا تھا۔ یوں تو وہ ایک گنجان علاقہ تھا۔ مگر وہاں کا ماحول پرسکون تھا۔ مگر خالد جیسا مکار شخص اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ مدیحہ کو اپنے مکان میں ابھی دو ماہ مکمل نہیں ہوئے تھے۔ کہ ایک صبح نایاب اور مدیحہ کے نمبر پر کال کی گئی۔ ایس ایچ او تھانہ ڈیفنس بات کر رہا تھا کہ شوکت ٹاؤن چار نمبر گلی میں مدیحہ نامی عورت کو قتل کیا گیا ہے۔ مقتولہ کی ڈائری سے آپ کے نام اور نمبرز ملے ہیں اور مقتولہ نے اپنے قریبی جاننے والوں میں بھی آپ کا ذکر کیا تھا۔ لہذا تفتیش کے سلسلے میں آپ کو یہاں آنا پڑے گا۔ آپ فوری آئیں تا کہ موقعہ کی کارروائی مکمل کی جاسکے اور ڈیڈ باڈی کی تدفین کا آپ انتظام کرسکیں۔ نایاب اپنی جگہ ہکا بکا رہ گئی اور معیز اپنی جگہ چکرا سا گیا۔ یہ کام خالد کا ہی ہوسکتا تھا۔

تفتیشی آفیسر کو بتایا گیا کہ "اس عورت سے ہمارے رسمی سے تعلقات ہیں۔ اس کا شوہر دوبارہ اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ انکاری ہو گئی۔ اس کے دو بچے ہیں۔ وہ انہیں لے کر ہمارے پاس آئی۔ چند روز وہ ہمارے ہاں مقیم رہی۔ پھر اسے یہ مکان کرائے پر مل گیا۔ کسی جیولری کی دکان پر اس نے جاب کرلی۔ اس کے بعد نا تو یہ ہم سے ملنے گئی ہے اور نا ہی ہم یہاں اس کے گھر آئے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ نا اس کے پیرنٹس سے ہماری کبھی کوئی ملاقات ہوئی اور نا ہی ہم کبھی ان کے گھر گئے۔ ہاں خالد سے میری ملاقات ایک دو بار ہوئی ہے۔ میں اسے شکل سے پہچانتا ہوں"۔

"پھر تو آپ کو اس بارے میں ہماری مدد کرنا ہوگی۔

اب مقتولہ کے ورثا میں ہم کس کا نام درج کریں؟" تفتیشی نے سوالیہ پوچھا۔

"آپ کو مقتولہ کے سیل سے جو نمبرز بھی ملے ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کر کے دیکھیں۔ ممکن ہے اس کے کسی بھائی، بہن یا کسی اور قریبی عزیز سے بات ہو جائے۔"

"ہمیں ابھی تک مقتولہ کا سیل نہیں مل سکا۔ ممکن ہے وہ بھی قاتل اپنے ساتھ ہی لے گئے ہوں" تفتیشی افسر نے بتایا۔

"او..."۔ معیز نے چونک کر کہا اور اپنے سیل سے مدیحہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مگر سیل آف جا رہا تھا۔ اس نے خالد کے نمبر پر رنگ کی۔ مگر وہ بھی آف جا رہا تھا۔ تفتیشی افسر نے مدیحہ کی ڈائری نکالی اور اس پر درج تمام نمبرز معیز کو ڈائل کرنے کے لئے دیئے۔ معیز نے بغور جائزہ لینے کے بعد کالز کا سلسلہ شروع کیا۔ بالآخر اس کی یہ کوشش کامیاب رہی اور مدیحہ کے بھائی سے رابطہ قائم ہو گیا۔ جس کا نام فیروز علی ڈائری پر درج تھا۔ تفتیشی نے فیروز کو تمام واقعہ کی تفصیل فراہم کی اور فوری لاہور تھانہ ڈیفنس پہنچنے کی تاکید کی۔ اس کو مقتولہ کا وارث لکھا گیا۔ ڈیڈ باڈی ہاسپٹل کے سرد خانے میں بھیج دی گئی۔ شب دس بجے فیروز علی تھانے پہنچا۔ اس نے اپنے بیان میں درج کر دیا کہ "مدیحہ میری چھوٹی بہن ہے۔ اس کے شوہر خالد سے اس کی ناچاقی رہتی تھی۔ اس وجہ سے خالد نے اسے ڈائیورس دے کر نئی شادی کی۔ مگر اس کی نئی بیوی چھ ماہ بعد ہی خالد سے علیحدہ ہو گئی اور اس نے عدالت سے رجوع کر کے ڈائیوروس لے لی۔ اب خالد دوبارہ مدیحہ سے نکاح کرنے کا خواہشمند تھا۔ مگر مدیحہ صاف انکاری ہو گئی اور اس نے لاہور کا رخ اختیار کیا۔ کوئی دو ماہ قبل وہ یہاں شفٹ ہو گئی۔ ہمارے ساتھ بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ کیونکہ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ خالد سے اپنے بچوں کی خاطر ہی گزارہ کر لے۔ مگر اس نے میری بات نہیں مانی اور اسی وجہ سے اس نے مجھ سے رابطہ منقطع کر لیا تھا۔ اب اس کے قتل میں خالد کو بے گناہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دونوں بچے غائب ہیں۔ ان کو اگر اغوا کیا گیا ہوتا تو اب تک اس کے اغوا کار رابطہ کر کے اپنا مطالبہ بتا چکے ہوتے۔ لہذا خالد نے ہی مدیحہ کو راستے سے ہٹایا اور اپنے بچے حاصل کئے۔"

لہذا ایف آئی آر میں خالد کو اس قتل میں بطور قاتل درج کرایا گیا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش فیروز علی کے حوالے کر دی گئی۔ وہ اپنی بہن کی ڈیڈ باڈی ایمبولینس میں لے کر صبح منہ اندھیرے ہری پور روانہ ہو گیا۔ نایاب معیز کی زبانی یہ پوری روداد سن کر بہت رنجیدہ ہوئی۔ اس نے مدیحہ کی موت کا بے حد اثر لیا اور خالد کو ایک درندہ صفت اور سفاک انسان قرار دیا۔ جس کی مدیحہ سے محبت نفرت میں بدلی۔ تو اس کی جان لے لی۔ یہ بھی محبت کا ایک روپ تھا۔

......☆☆☆......

اپنے روحانی پیشوا حضرت نبی احمد ناز قلندر کے فیض و کرم سے نایاب خود کو مکمل صحت مند محسوس کر رہی تھی۔ اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ وہ پوری طرح ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی نایاب نہ رہی تھی۔ ہر وقت دوپٹہ نما بڑی سی چادر اوڑھے رکھتی۔ صبح شام اللہ کے حضور نماز میں سر بسجود رہتی۔ رات جلدی سو جاتی اور وقت سحر بیدار ہو کر اپنے مالکِ حقیقی کی حمد وثنا کرتی۔ معیز بھی اب مذہبی کتب پڑھنے اور کیبل پر مذہبی پروگرام دیکھنا پسند کرتا۔ کبھی مسجد میں اور کبھی اپنے کمرے میں نماز پڑھنے کا فرض بھی ادا کرتا۔ مگر اسے صحیح نماز کی ادائیگی اور کلام پاک پڑھنے کے لئے کسی مستند استاد کی ضرورت تھی۔ نایاب نے اس کی یہ مشکل آسان کی اور ایک عالم دین کی خدمات حاصل کرنے میں اس کی مدد کی۔ وہ روزانہ ان کی رہائش گاہ پر آتا اور نا صرف معیز بلکہ اس کے بھائی کے بچوں کو بھی قرآنی درس دے جاتا۔

معیز کو نئے سرے سے پوری نماز پڑھائی۔ نماز کی ادائیگی کا طریقہ سمجھایا۔ قرآن کی تعلیم شروع کی۔ نایاب اپنے مرشد سے ہر دوسرے تیسرے دن کال پہ بات کرتی۔ تو اس کا من گلاب کی طرح کھلا کھلا رہتا۔ پھر نایاب اور معیز کی شادی طے کی گئی۔ پندرہ دن بعد بارات کی روانگی کا وقت مقرر کیا گیا۔ شادی سے ایک ہفتہ قبل نایاب اور معیز برنالہ شریف اپنے پیر کامل سے ملنے پہنچے۔ انہیں بے شمار تحائف پیش کئے اور اپنی خوشیوں میں شرکت کی پر زور دعوت دی۔ ان کے پیر کامل نے انہیں بتا دیا کہ تمہاری شادی تمام شرعی تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیے۔

مگر جب انہیں یہ بات بتائی گئی کہ ''ہماری تمام ترفیملی اور حلقہ احباب نہایت امیر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔کئی نامور تاجر اور سیاسی لوگ بھی شامل محفل ہوں گے۔آپ ہمارا نکاح شرعی طرز پر اپنی نگرانی میں کروائیں گے۔ہم دونوں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔باقی تمام لوگوں کو آپ ان کے آزاد معاشرے کی رسومات کی ادائیگی پر کوئی اعتراض نا کریں۔ان سب کو قائل کر کے اپنے رنگ میں رنگنا بہت مشکل کام ہے۔ہم آپ کے پیروکار ہیں۔ہم دونوں ان کے سوالات اور ان کی طنزیہ باتوں کو فیس کر رہے ہیں۔امید ہے کہ آپ ہماری خاطر ان کے ہر فعل پر درگزر کریں گے۔'' معیز اور نایاب نے بڑے معذرت بھرے لہجے میں ریکوسٹ کی۔

''آپ بے فکر رہیں بیٹا۔آپ ان کی اولاد ہیں۔آپ کی خوشیوں میں ان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل کی تمام خواہشیں پوری کریں۔ہم تو بس آپ کے نکاح میں شامل ہوں گے اور زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔'' مرشد بابا نے فرمایا۔

پھر عین نکاح کے وقت پیر کامل کی گاڑی معیز کی بھیجی جانے والی گاڑی کے تعاقب میں ڈیفنس پہنچی اور پھر بارات کے ساتھ ساتھ پی سی ہوٹل کے کرسٹل ہال میں پیر کامل کو پورے اعزاز کے ساتھ لے جایا گیا۔سٹیج کا منظر بڑا دلفریب تھا۔جھلملاتے رنگین پردوں کی سجاوٹ، صدارتی طرز کی نشستیں ٹیبل پر سجے بڑے بڑے گلدستے، چھت پر جگمگاتے فانوس، دھیمی دھیمی آواز میں بجتا میوزک ، پورا ہال سرخ غلافوں سے ڈھکی دراز پشت کی کرسیوں سے سجا تھا۔تمام معزز مہمانوں سے پیر کامل کا تعارف کرایا گیا کہ نایاب اور معیز احمد کے پیرومرشد ہیں۔اعلیٰ سوسائٹی کے تمام مہمانوں نے جھک کر پیر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کو تعظیم دینا وہ بھی جانتے تھے۔

نایاب کو دلہن کے روپ میں سٹیج پر لا کر معیز کے ساتھ دوسری نشست پر بٹھایا گیا۔وہ سرخ چادر کی اوڑھنی میں لپٹی تھی۔جہاں اس پر گلابوں کی سرخ پتیاں نچھاور کی گئیں وہاں معیز کے ساتھ ساتھ ان کے پیرومرشد پر بھی پتیوں کی بارش کی گئی۔پھر پہلے تلاوت کلام پاک اس کے بعد نعت رسول مقبول ﷺ پڑھی گئی۔پھر نکاح پڑھا گیا۔

دُعا پیرومرشد نے کروائی اور پھر دلہا دلہن کو نا صرف پیار دیا بلکہ سلامی بھی دی۔تب اسٹیج کے تمام مہمانوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں اور پھر پورا ہال بھی تالیوں سے گونج گیا۔مبارکبادوں کی صدائیں ہر سو بازگشت کرنے لگیں۔

وہ سارے پل دید کے قابل تھے۔دو دلوں کا سنگم ہوا تھا۔ محبت کی ایک نئی داستان کامیابی سے اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔جس کو بے شمار کیمروں نے اپنی میموری میں بطور یادگار محفوظ کر لیا اور مووی کی صورت میں اسے محبت کرنے والوں کی تاریخ میں ریکارڈ کر دیا گیا۔

بے شک نایاب اور معیز کی شادی کی یہ تقریب بہت منفرد انداز میں منعقد ہوئی۔باباجی کی ضیافت کا اہتمام اسی جگہ اسٹیج کی ٹیبل پہ ہی کیا گیا۔پھر ان کی رخصتی پر سب نے باباجی سے ہاتھ ملانا باعث برکت سمجھا۔معیز نے ایک بند لفافہ بڑے ادب سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''حضور یہ ہماری طرف سے حقیر سا نذرانہ قلندر پاک کے نام قبول کریں۔پھر نایاب نے جھک کر قدموں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر جھکے ہوئے سر سے کہا۔

''حضور میری ایک عاجزانہ گزارش ہے کہ ہم آپ کی محبت میں اسی ماہ عمرہ کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقدس اور بابرکت سفر میں آپ کی قرابت ہمارے لیے ایک گرانقدر اعزاز ہوگا۔جلد ہی آپ کا ٹکٹ آپ کو موصول ہو جائے گا۔باقی تمام تر اخراجات بھی ہماری طرف سے آپ کو ہماری شادی کا گفٹ سمجھ کر پیش کیا جائے گا''۔

''آپ کا یہ خلوص بھرا گفٹ ہم قبول کرتے ہیں'' باباجی نے مسکرا کر کہا۔تو نایاب نے شدت جذبات سے اپنے رہبر ورہنما کے ہاتھ پر عقیدت سے بوسہ دے دیا۔

''آپ پر اللہ کی رحمت ہو۔یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ شادی کے فوری بعد اللہ اور اس کے محبوب محمد مصطفیٰ ﷺ کے در پہ حاضری کیلئے جا رہے ہیں۔ورنہ آپ لوگ تو ہنی مون منانے سوئٹزرلینڈ اور سنگاپور جانا پسند کرتے ہو۔اللہ نے آپ پر فضل وکرم کیا اور آپ کو اپنے گھر آنے کا شعور بخشا۔اللہ آپ لوگوں پر اور اپنی ساری مخلوق پر ہمیشہ اپنے فضل وکرم کا سایہ رکھے۔'' مرشد نے دعا یہ کہا۔

''آمین۔'' نایاب اور معیز نے آہستہ سے ایک ساتھ کہا اور ہاتھ باندھ کر جھکتے ہوئے اپنے سیدی کو رخصت

کیا۔

......☆☆☆......

آسمان کا آنچل ستاروں سے مزین تھا۔یوں تو سارے شہر سے جگمگاتی روشنیوں کی شعاعیں پوری فضاؤں کو منور کر رہی تھیں۔مگر مسجد نبوی اور اس کے چار سو گردو نواح نہایت روشن قمقموں اور تیز ترین لائیٹوں، مرکری بلبوں سے دن کا منظر لگ رہا تھا۔آسمان سے رحمتوں کی بارش ہو رہی تھی اور مسجد نبوی کے بلند میناروں سے عشاء کی اذان کی صدائیں اُحد پہاڑ کی چوٹیوں سے بازگشت کر رہی تھیں۔مسجد کے جنوب مشرقی کونے میں سجے گنبد خضراء کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی پرنور کرنیں مردہ دلوں کو بھی نئی زندگی دے رہی تھیں۔

معیز اپنے مرشد حضرت نبی احمد ناز قلندر کے ساتھ ساتھ مسجد کے اندرون ریاض الجنۃ میں نماز عشاء ادا کر کے کچھ وقت تقلید میں مراقبہ کرتے ہوئے گزارا۔عورتوں کو زیارت روضہ اقدس کی اجازت صبح اور عشاء کی نماز کے بعد دی جاتی ہے۔نایاب زیارت کے بعد باب النساء میں پہنچی۔تو ادھر مرشد نے معیز کو سرگوشی میں کچھ ارشاد فرمایا۔معیز نے نایاب کو کال کر کے بتایا کہ وہ باہر گیٹ پر پہنچے۔پھر کچھ دیر بعد معیز اور نایاب دونوں جنت البقیع کی سیڑھیوں سے ذرا مغربی جانب موجود تھے۔تھوڑی دیر بعد اُن کے باباجی وہاں آپہنچے۔وہاں سے صاف دکھائی دینے والے گنبد خضراء کی جانب رخ کئے بیٹھ رہے۔پھر ان دونوں کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

"دیکھو بیٹا! جس طرح انسان کو ٹھوکر کھائے بغیر سفر کرنے کے لئے زندگی میں بھی آنکھیں کھلی رکھنا پڑتی ہیں۔کیونکہ تاریکی میں داخل ہونے کے بعد آنکھیں کھلی ہوں یا بند ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اندھیرا ٹھوکروں کو ہماری زندگی کا مقدر بنا دیتا ہے۔اس طرح جب انسان زندگی کے سفر پر نکلتا ہے۔تو اسے قدم قدم پر بہت سوچ سمجھ کر چلنا پڑتا ہے۔مگر جس طرح ہم کہیں بھی جانے کا جب ارادہ کرتے ہیں۔تو منزل کا تعین کر کے ہی عازم سفر ہوتے ہیں نا۔کبھی ایسا ہوتا کہ ہم بے سمت چل پڑیں اور بے مقصد ٹھوکریں کھاتے پھریں۔

پھر اسے پچھتاوا لگے اور واپس اس موڑ پر آنا چاہیے۔جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔تب صرف ایک چیز اس کی مدد کر سکتی ہے۔کسی رہبر کی آواز جو اس کی رہنمائی کر سکے۔

زندگی کی رنگینیوں میں کھو جانا۔یا اپنی خواہشات اور اپنی ضروریات کے حصول کی خاطر زندگی گزار دینا زندگی کا مقصد نہیں کہلا سکتا۔زندگی کے ہنگاموں میں الجھ کر ساٹھ ستر سال کی عمر بسر کرنے والے نے سارا بے سمت سفر کیا۔جب موت کا وقت قریب آیا۔تو پچھتاوا ہونے لگا اور پھر سے لوٹ کر صحیح سمت کا سفر طے کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔تو وہ بے معنی ثابت ہوگی۔کیونکہ وقت کی سوئیاں صرف آگے کی سمت سفر کرتی ہیں۔پیچھے ہٹنا وہ جانتی بھی نہیں۔تو صحیح سمت کی طرف سفر کرنے کے لئے کسی رہبر کسی رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔جس کو ہادی، رہبر و راہنما کہتے ہیں اور آپ اس وقت ان خوش قسمت اور با نصیب لوگوں کی صف میں شامل ہیں۔جو اپنے مقدر پر جس قدر بھی رشک کریں۔کم ہے۔یہ وہ منزل مقصود ہے۔جس کا حصول ہی ابن آدم کا مقصد حیات ہے۔اللہ نے قرآن پاک میں فرمادیا۔

"بے شک اللہ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے اور اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہے۔طاق میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل ایسی صاف شفاف گویا موتی سا چمکتا ہوا تارہ"۔

اور اللہ کے پیارے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیا۔

"میں اللہ کے نور سے ہوں اور یہ کائنات میرے نور سے ہے"۔

ہم سب اس کائنات کا حصہ ہیں تو جو پوری کائنات کا منبع نور ہے۔وہ گنبد خضرا کے ادب میں اس وقت آپ کی نگاہ کے سامنے جلوہ فرما ہے اور یہ وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے۔جہاں دن رات فرشتے بھی سجدہ ریز رہتے ہیں۔جنت سے اتارا گیا۔ریاض الجنۃ کا ٹکڑا روضہ رسول سے جڑا ہے۔جہاں ابھی ہم نے نماز عشا ادا کی ہے۔یہ بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔یہ بڑے مقدر کا فیصلہ ہے۔جو آپ کے حق میں کیا گیا ہے۔

اس مالک کے فیصلے بڑے انوکھے ہیں۔وہ چاہے تو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

پوری سرزمین پر سجدہ کرنے والے کو لعین قرار دے دے اور چاہے تو کفر کرنے والے ایک شمشیر زن جیالے کو راہ ہدایت دے کر ایک پل میں عمر فاروقؓ بنا دے۔ یہ دکھائی دینے والی کائنات یہ انسان، یہ حیوان، یہ حجر، یہ شجر، چاند، سورج، ستارے یہ سب بکھرے ہوئے قطرے ہیں۔ جو مختلف صورتوں اور رنگوں میں بنے ہیں۔ ایک دن یہ سب قطرے سمندر سے جاملیں گے۔ یہ سب ایک ہیں۔

لا الہ الا اللہ ۔یہ وحدت کا دریا ہے اور یہ سارے منظر اور سب مادہ پرستی کی دنیا اس کی لہریں ہیں۔ یہ سب جاگتی آنکھوں کا خواب ہے۔ جب یہ خواب ٹوٹے گا تو وہ حقیقت کا جہاں ہوگا۔

پھر وہ لمحہ بھی آیا۔ جب معیز اور نایاب نے اپنا ہاتھ مرشد کی ہتھیلی پر رکھا۔ بابا جی نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا اور ان کو اپنی بیعت کر لیا۔ پھر دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔ ان دونوں نے بھی جھکے ہوئے سر سے ہاتھ بلند کر لئے۔

ایسے میں ایک دراز قد وقامت کا اعرابی ان کے پاس آیا اور کھجوروں کا ایک پیکٹ ان کے قریب رکھ کر چپکے سے آگے بڑھ گیا۔ نایاب اور معیز نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ وہ کون تھا؟ کدھر سے آیا اور کہاں چلا گیا؟ دعا اختتام کو پہنچی تو بابا حضور نے دونوں کے سر پر پیار سے دست شفقت رکھا اور فرمایا۔

''لو بیٹا۔ جو تم نے عقد کیا۔ وہ آپ کے مجازی آخری منزل تھی اور جو تم نے بیعت کا پیالہ پیا ہے۔ یہ عشق حقیقی کا آغاز ہے۔ یہ آج آپ نے وہ سنت نبوی ادا کی ہے۔ جس کی گواہی اللہ کا پاک کلام قرآن مجید یوں دے رہا ہے۔

''اور ہم نے اے محمد تم کو وحی ظاہر کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا اور خوف دلانے والا بنا کر بھیجا۔ تا کہ مسلمانو تم لوگ اللہ پر اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ۔ اس کی مدد کرو اور اس کو بزرگ سمجھو اور صبح شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔ اے محمد جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر جو اس عہد کو توڑے اس کا نقصان اسی کو ہے اور جو اس بات کو جس کا اس نے خدا سے عہد کیا ہے پورا کرے تو وہ اسے عنقریب اجر عظیم دے گا''۔

پھر بابا حضور نے کھجوروں کا پیکٹ کھولا۔ ان دونوں کو چار چار کھجور کے دانے دے کر فرمایا۔

''ان کو اللہ کا نام لے کر نوش کر لو۔ یہ چار دانے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی علامت ہیں اور باقی کھجور ان لوگوں میں بانٹ دو۔ بیعت کرتے ہوئے کسی نا کسی میٹھی چیز کا ہونا ضروری تھا۔ وہ اللہ نے کسی کے ہاتھوں ہمارے پاس کھجور کی صورت میں بھیج دی''۔

بابا جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو معیز اور نایاب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''یہ کھجوریں کون لایا تھا حضور؟ ہمیں تو خبر ہی نہیں ہوئی۔ آپ ہم سے کہتے تو ہم خود لے آتے'' دونوں نے حیرت سے پوچھا۔

''جب ہم دعا مانگ رہے تھے تو وہ شخص ہمیں دے گیا۔ جو میرے آقا ﷺ کا غلام تھا اور اسے یہ ہم تک پہنچانے کا حکم ملا تھا۔ ہم جس کے در پہ آئے ہیں۔ اس کی سب پہ نظر ہے۔ یہ ساری دنیا خود نہیں آتی۔ یہ میرے آقا کے بلائے ہوئے مہمان ہیں اور مہمانوں کا خیال رکھنا تو محبوب خدا کا پسندیدہ عمل ہے''۔

بابا جی نے بتایا تو معیز اور نایاب کے دل پر عشق نبوی چشمہ بن کر پھوٹ پڑا۔ ان پر رقت طاری ہو گئی۔ ہونٹ کھلے رہ گئے۔ دل بھر بھر آیا اور آنکھیں جھل جھل ہو گئیں۔ دونوں کی نظریں گنبد خضریٰ پر اٹھیں تو وہ چھلک گئے اور چھاتی پر دونوں ہاتھ باندھے وہ عقیدت سے پیچھے چلے گئے اور پھر ذرا دیر بعد وہ مواجد شریف میں روضے کی جالیوں کے سامنے وجد کی حالت میں درود و سلام کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے۔ آج ان کو پل صراط عشق سے پار لے جانے والا لاکھوں ہار جو مل گیا تھا۔ اے ختم الانبیاء تجھ پہ لاکھوں کروڑوں درود وسلام۔

ختم شد

⌘